www.Paksociety.com
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2012
معراج رسول
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
www.Paksociety.com

عزیزانِ من... السلام علیکم!

لیجیے، اپریل 2012ء کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ عین شباب بہار کے ایام ہیں۔ خزاں رسیدہ درختوں کے تنوں نے سبز پیراہن پہنے... گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلنے لگی مگر ہم کہ موسم بہار کی عنایتوں سے لطف اندوزی کی صلاحیت کھو بیٹھے... قدرت کی عطا کردہ مہربانیوں سے زندگی میں نئی تازگی بھر لینے کے بجائے ہم پاک زمیں والے سوختہ تن سوچ رہے ہیں کہ اب ایسے دورِ آشوب میں بسر کیسے ہو...؟ پچھلے کئی سالوں سے ہماری، آپ کی زندگی ماتموں کی گونج اور نوحوں کی صداؤں سے ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ کانوں میں مصائب کی سسکیاں گونجتی ہیں۔ سڑکیں درد و آلام سے تڑپتے مظاہرین کے دم قدم سے آباد ہیں۔ اس بار بھی موسم بہار کی فضائیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے خالی نہیں۔ بھری صبح میں کراچی کی سڑکوں پہ ایک ہی دن میں بڑی تعداد میں نذرِ آتش کی گئی گاڑیاں سورج کو چراغ دکھا رہی تھیں... نامعلوم دہشت گردوں کے ہاتھوں خاک و خون میں نہلائے گئے تن جو صرف انسان تھے کہ مرنے کے بعد وجود کی یہی شناخت باقی بچتی ہے... پنجاب کے دل لاہور اور اُس کی صنعتی زندگی کی شہ رگ فیصل آباد میں ہائے بجلی کہہ کر چلاتے، سڑکوں پر دوڑتے بھاگتے اور توڑ پھوڑ کرتے مظاہرین اور ان پر پولیس کے برستے ڈنڈے... اب کچھ کہنے کی کوئی بات نہیں رہتی کہ الیکٹرونک میڈیا وقت کے ہر لمحے کو بصارتوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے... اے خداوند...! زندگی کے ان بوجھل دنوں اور پُرآشوب راتوں کے ستم کو ختم نہ سہی تو کچھ ہلکا ہی کر دے! اب ہم سب کی برداشت جواب دے چکی ہے۔

حیرت ہے لوگ اب بھی اگر خوش عقیدہ ہیں
ہم ساکنانِ قریۂ آفت رسیدہ ہیں

چلیے آپ کی ہمراہی میں بڑھتے ہیں آپ ہی کی بزم نامہ میں، جہاں آپ سب بے چینی سے منتظر ہیں!

چشتیاں سے آصفہ صداقت کا مفصل خبرنامہ "ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی کی نمائندہ جاسوسی خبرنامے کے ساتھ خاص خاص اور سنجیدہ خبریں لیے چینی، بکتہ چینی میں حاضر ہے۔ (خوش آمدید) سب سے پہلے ہر مہینے کی عام خبر! جاسوسی سے اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ ہمیشہ کی طرح چھ تاریخ کو ملاقات ہوئی۔ اس بار ذاکر صاحب نے سرورق پر دھماکا کر ہی دیا جس پر صدرِ پاکستان نے انہیں ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کب، کہاں، کس وقت، بعد میں مطلع کیا جائے گا۔ ایک پھٹی آنکھوں، پھٹی ناک اور پھٹے منہ والے شخص کی تلاش جاری و ساری۔ اس کی خاص نشانی اس کے ہاتھ میں موجود ایک زنگ خوردہ ریوالور ہے جو چلانے پر پھٹ بھی سکتا ہے۔ (واؤ) اس کے بارے میں خبر کرنے والے کو خوب انعام دیا جائے گا۔ (کیا؟ رپورٹر کی جانب سے) باقی خبروں کی طرف بڑھنے سے پہلے ایک دلچسپ خبر۔ سرورق کے ریگستان میں ایک ڈھانچے کو کتاب ہاتھوں میں لیے اوندھے منہ ریت چباتے دیکھا گیا۔ باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے کہ یہ ڈھانچا صنفِ کرخت کا ہے۔ یہ مخلوق اکثر اپنی بھوک کی وجہ سے ریگستانوں میں ریت چاٹتی اور چبائی دیکھی گئی ہے۔ (ہمارے لیے یہ سنسنی خیز انکشاف ہے) سرورق کی ہی مس یونیورس نے اعلان کیا ہے کہ جو کوئی بھی ریگستان میں موجود پودے کا نام بتائے گا، اس کو مس یونیورس کے ساتھ شیرٹن میں کینڈل لائٹ ڈنر کرنے کا موقع ملے گا۔ عوام الجاسوسی نے فیصلہ کیا ہے کہ کوئی بھی اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا اور اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اب کچھ خبریں محفلِ جاسوسی کی۔ نومبر میں لگنے والی آگ کی بدولت تفسیر عباس صاحب اب تک کالا دھواں اگل رہے ہیں۔ جس کے نتائج ان کے حق میں کافی خراب نکل رہے ہیں۔ ہمایوں صاحب صنفِ نازک کے حوالے سے اپنے زریں خیالات اور پُرحکمت گفتگو کی بدولت کرسیٔ صدارت پر براجمان ہو گئے جن پر انہیں مبارک باد دی جاتی ہے۔ ماما ایمان کی ہنستی مسکراتی، خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتی واپسی۔ سب بہنوں کی طرف سے مبارک باد۔ مزید برآں انکل جی کی بدولت حاضر لائن ہونے والے کرسیٔ صدارت کے آس پاس کھڑے قدرت اللہ نیازی صاحب کی کھری کھری سنتے رہے اور ناک بھوں چڑھاتے رہے۔ مشہور و معروف قلم کار کاشف زبیر نے اس بار اکھاڑے کا اہتمام کروایا جس میں شانی اور تیمور کو خوب پہلوانی کروائی۔ ریفری کے فرائض جوجی نے ادا کیے اور اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں اور اشاروں سے قارئین کو ہنساتے رہے۔ اختتام پر وعدے کے مطابق مرغابیوں کے ڈنر کا انعام دینے کے بجائے نواب صاحب کی اسپیشل کڑاہی کھلائی گئی جس سے ان کے 14 طبق جو کہ پہلے ہی روشن تھے، مزید روشن ہو گئے اور ملک کا نام روشن کرنے کا بھی باعث بنے۔ سلیم فاروقی نے آثارِ جنوں جیسا کارنامہ سرانجام دیا جو شروع شروع میں کارنامہ رہا اور اینڈ پر جا کر صرف نامہ رہ گیا۔ (اُف... صد افسوس...) اے سی شہریار صاحب مار یا اور اس کی تکی می ستھیا کی ہوشیار فائرنگ سے گرداب میں گرنے سے بال بال بچے۔ اسما قادری نے میجر ذیشان کے ذریعے ان کی مدد کی جس پر مختلف اداروں نے ان کے لیے داد و تحسین کے ڈونگرے بجھوائے جو انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کیے۔ ناقدین کے مطابق ماریا کی اس بچکانا حرکت سے اس کے ستارے گردش میں آ گئے۔ 8 مارچ جو کہ خواتین کا دن ہے، اس کی یاد میں ماہ بانو نے آخرکار شادی کینسل کرنے کا فیصلہ کیا اور دھواں دھار رونے لگی۔ اس صدمے کو کم کرنے کے لیے مختلف این جی اوز تسلی و تشفی کے ساتھ ساتھ ہمدردی اور بہادری کے سرٹیفکیٹ بجھوانے کی تیاریوں میں مصروف۔ (اب کوئی فائدہ نہیں!) طاہر جاوید مغل کی پروڈکشن میں عمران بھائی اور تانی ایک ریشمی شو کھیلنے میں کامیاب رہے اور حریفوں کو ناک آؤٹ کر کے خاک چٹوانے میں کامیاب رہے۔ اگرچہ وہ شو جیتنے میں ناکام رہے مگر یہ ناکامی کچھ لوگوں کو زندگی بخش گئی جس سے متاثر ہو کر لوگوں نے اسے لکی کا خطاب دیا۔ جس کی خوشی میں انہوں نے

اپنی ڈراؤنی بائیک پر لاہور کی سیر کروائی اور اِکّا دُکّا لوگوں کو محظوظ کیا۔ آخر کار ایم اے راحت صاحب بہادر شاہ کے ذریعے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ داؤ صاحب اور ان کی بیگم کا چٹھا کھولتے ہوئے انہیں انجام کار تک پہنچایا۔ کہتے ہیں چور جتنا ہی بھاگ لے، آخر کار لنگوٹی ہی سہی پکڑی ضرور جاتی ہے۔ اب کچھ خبریں بیرونی دنیا سے۔ جمال دتی کو مغربی ساحل سمندر پر سانپ اور سنپولیے مارتے ہوئے پاپارازی والوں نے خوب کوریج دی۔ سلیم انور صاحب اپنے نظرباز کے ذریعے لوگوں میں خوف و دہشت پھیلانے میں کسی حد تک کامیاب رہے مگر کچھ نے ہمت کی اور پہاڑ کھود ڈالا۔ اس بار بابر نعیم کی چلتر باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑنے میں ناکام رہی اور اوسط بزنس کیا۔ بذریعہ جنگ جی مختار صاحب کو چھٹیاں منانے آئرلینڈ بھیجا گیا جس کے در پردہ مقصد تین مقتولوں کے قاتل کی تلاش تھا جس کا پتا انہوں نے اپنی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کی بدولت جلد ہی لگا لیا۔ دوسری طرف مریم کے خان عزتِ نفس کا جھنڈا اٹھائے تالیوں کی گونج میں پریڈ میں شامل ہو گئیں۔ بعض ادبی ماہرین کی رائے میں عزتِ نفس کو ترقی کے لیے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ باہر کی دنیا سے مزید خبریں ایک بریک کے بعد... اب ایک نظر آج کی آخری خبر پر۔ عوام کی رائے کے مطابق جاسوسی کو اس کے نئے پیٹرن اور اسٹائل کی وجہ سے کافی پسند کیا جارہا ہے۔ امید واثق ہے کہ رواں سال اور آئندہ سال اس میں مزید خوش آئند تبدیلیاں کی جائیں گی اور بجٹ کے اخراجات کو کنٹرول میں رکھا جائے گا۔ قارئین خبروں کا وقت ختم ہوا، اب ہمیں اجازت دیں اور حالاتِ جاسوسی سے باخبر رہیں۔"

محمد کبیر عرف شہزادہ کوہسار کی آمد" مارچ 2012ء کے شمارے پر تازہ تازہ اور فریش فریش تبصرہ حاضر ہے۔ ٹائٹل گرل پر کچھ اور محنت کی جاتی تو اچھی لگتی، ویسے! ماچے اور کتاب کو تجسس نظروں سے دیکھا اور پسندیدگی سے سر ہلا دیا۔ البتہ اوپر پستول بردار ہیولا دیکھ کر منہ بن گیا، یعنی بگڑ گیا۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے فہرست میں پہنچے۔ فہرست کا ملگجا سا ڈیزائن منفرد ہونے کی وجہ سے بھا گیا۔ اداریہ دل کو ہولا گیا۔ ہم تو الیکٹرانک میڈیا سے اس لیے دور دور ہی رہتے ہیں۔ اب آپ نے یہاں بھی ایسی خبریں شیئر کرنا شروع کر دیں۔ ہمایوں سعید! سچ سچ بتانا، یہ اپنی ہی صنف کے خلاف بولنے کے کتنے پیسے لیے ہیں؟ (کیوں آپ نے بھی لینے ہیں؟) صبا گل! اتنا غصہ پلیز... ذرا ہتھ ہولا رکھیں۔ تصویر الحسن! آپ بڑی ویلی معلوم ہوتی ہو۔ لگتا ہے کوئی اور کام کاج ہی نہیں آپ کو۔ ام ثمامہ! آپ کا ننھا شہزادہ کسی سردار جی کی کمپنی میں تو نہیں رہتا جو ایسا کمنٹ دیا۔ ماہ تاب گل! آپ نے ٹائٹل گرل کی آنکھوں میں گلابی ڈورے کیسے ڈھونڈ لیے، ہمیں تو کافی تلاشِ بسیار کے باوجود ایک ڈورہ بھی نہ ملا۔ سمیرا اقبال! سالگرہ مبارک، سدا خوش رہو۔ عائشہ رائی! ہم نہیں تھے نا اس لیے آپ کو سارے تبصرے ایویں لگے۔ اس دفعہ تو نہیں لگے نا؟ ماہا ایمان! بڑی بے ایمان ہیں آپ، ابھی تک بتایا نہیں کہ آپ روشانے صنم ہیں یا نوشی چودھری۔ نوی اور نور الہدیٰ! آپ دونوں کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ گرداب کی ایک اور خوب صورت قسط پڑھنے کو ملی۔ شکر ہے کہانی چودھری افتخار سے ہٹ کر دوسرے واقعات کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ یہ مثبت تبدیلی ہمیں بہت پسند آئی۔ للکار کا ٹوئسٹ زبردست لگا۔ ایم اے راحت کی آخر کار تجسس سے بھرپور تحریر تھی۔ اچھی لگی تاہم اینڈ جلدی میں کر دیا گیا۔ سائرہ شریکِ جرم تھی تاہم اسے تفتیش میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ کاشف زبیر کی اکھاڑا خلافِ توقع کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ کہانی میں کافی جھول تھے۔ سکے کی اہمیت... واضح کی ہی نہیں گئی اور جو تھوڑی بہت وضاحت کی گئی وہ قابلِ ہضم نہ تھی۔ مختصر تحریروں میں مقامی معلومات کی اہمیت کو اجاگر کرتی فریبی متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ مریم کے خان کی عزتِ نفس بھی مزے کی تھی۔ تین مقتول میں پلاٹ اور واقعات تو اچھے تھے تاہم تحریر میں پختگی کی کمی محسوس ہوئی۔ کترنیں تھوڑی اور پرانی تھیں (تو آپ ہمیں نئی چیزیں بھیجیں نا!) بعض کہانیوں کے پہلے صفحے کو تھوڑا مختلف طریقوں سے ڈیزائن کیا گیا، یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔"

فتح پور لیہ سے آمنہ پٹھانی کا عذر" مارچ کا شمارہ 2 تاریخ کو مارکیٹ میں دستیاب تھا مگر ہماری بدقسمتی کہ ہم ہی بروقت نہ خرید سکے۔ (پھر کس سے لے کے پڑھا؟) سائز پوز لیے ہنستی مسکراتی ماہ جبیں، پستول بدست غصے سے لال پیلا ہوتا آدمی، نیچے ہڈیوں کا ڈھانچا... ٹائٹل جاسوسی کے عین شایانِ شان تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو خیر سے کرسیٔ صدارت پر ہمایوں سعید نے قبضہ جما رکھا تھا۔ روایات کی پاسداری میں مبارک باد تو دینی پڑے گی، سو مبارک باد۔ صبا گل! وعلیکم السلام، ڈیئر! ہمارے خطوط شائع نہ ہونے میں زیادہ قصور محکمۂ ڈاک کا ہوتا ہے۔ پلیز! اتنا غصہ نہ کریں۔ تصویر الحسن! آپ کے تصوراتی خاکوں کو جاسوسی کی زینت بنا دیکھنے کے ہم بھی شدت سے منتظر ہیں اور دیکھنا کتنے حاسدین جلیں گے۔ ام ثمامہ اور سارہ راجپوت! آپ کا تبصرہ بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ سارہ جی! راجپوت نام کے ساتھ تو میری ویسے بھی جذباتی وابستگی ہے۔ ماہا ایمان! یار ہم چنڈال چوکڑی میں ہمیں اکیلا چھوڑ کے کہاں چلی جاتی ہو؟ شائستہ رائی! مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار تم نے مجھے بہن کہا تھا، بگی ایک بار پھر کہو نا۔ قمرتی! دوسروں کی لڑائی میں ٹانگ اڑانا ہمیشہ مہنگا پڑتا ہے۔ اگر زیادہ ہی شوق ہے تو جناب کی مرضی، میں بھی آمنہ پٹھانی ہوں۔ للکار میں عمران اور تابی ڈرامائی انداز میں لاہور پہنچے اور آتے ہی کو نز مقابلہ... موجودہ قسط کچھ پھیکی پھیکی اور بور بوری لگی۔ رسالہ تاخیر سے خریدنے کی وجہ سے مکمل تبصرہ نہیں کر سکی۔"

لاہور سے کرن کی نازک مزاجی اور خدشات" بہت عرصے سے جاسوسی پڑھتے ہیں۔ پہلی بار خط لکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو چینی، نکتہ چینی کے سب دوستوں کو سلام اور محفل میں شمولیت کی اجازت چاہیں گے۔ (اجازت ہے، بلا دھڑک چلی آئیں) خاص طور پر ماہا جی، جو کہ ہماری پسندیدہ ہیں۔ دراصل ہم تھوڑے نازک مزاج سے ہیں اس لیے ڈرتے ہیں کہ اگر خط شائع نہ ہوا تو ہماری جو حالت ہونی ہے، سو ہونی ہے پر گھر میں جو ہمارے ساتھ پھر چھیڑ خانی ہونی ہے، وہ الگ۔ پر اس بار ہم خود کو روک نہیں پائے اور سارے اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر خط لکھنے کی جسارت کر ہی ڈالی۔ (تو پھر آپ سب کو بتا دیں کہ ہماری محفل تمام قارئین کو ہمیشہ خوش دلی سے ویلکم کرتی ہے) اس دفعہ کا سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ آخر کار، ایک اچھی کہانی تھی۔ دیگر میں سنپولیا، عزتِ نفس اور فریبی کو پڑھنے میں مزہ آیا۔ ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ہم اپنی توجہ کسی دوسری جانب مبذول نہ کر سکے۔ (اچھا کیا...) سلیم انور کی نظرباز خاص پسند نہ آئی۔ شکستہ منطق ایک کہانی کے طور پر تو اتنی نہ بھائی پر مشلے کا کردار بہت پسند آیا۔ سرورق کے دونوں رنگ بہت بھائے۔ اکھاڑا کے لیے تو بس اتنا کہ واقعی کاشف زبیر کے قلم کا جادو ہر ایک کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ سلیم فاروقی کے آثارِ جنوں نے بھی متاثر کیا۔ گرداب کی اس قسط میں متوقع



صورتِ حال سے واسطہ پڑا۔ اب ہمارے خیال میں گرداب کی اگلی قسط خاصی سنسنی خیز رہے گی۔ طاہر جی کی للکار کی یہ قسط چونکہ زیادہ تر ہمارے ہیرو جی پر مبنی تھی، اس لیے تھرل اور سسپنس سے بھرپور اور ہمیشہ کی طرح اچھی رہی۔"

بالاکوٹ سے محسن علی موم کی انٹری" مارچ کا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ کے حسن کی تباہ کاریاں پیچھے موجود آدمی (جواب صرف ڈھانچا ہی رہ گیا ہے، غم یا خوف سے) کی شکل میں ملاحظہ کیں جو زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ بچنا ان چڑیلوں سے۔ کرسیٔ صدارت پر ہمایوں کو دیکھ کر ہم انکل کی اعلیٰ ظرفی کے مزید قائل ہو گئے جو کسی بھی قسم کے تبصرہ نگار کو مایوس نہیں کرتے۔ عمیر صاحب! آپ کی خفگی بجا ہے لیکن اگر سب کے تعرے شائع ہوں تو پھر کہانیوں کے صفحات کم پڑ جائیں۔ (بالکل ٹھیک کہا آپ نے) صبا گل! آپ سے کوئی ایک غلطی ہوئی ہو تو انکل بتائیں۔ ویسے اگر کہانیوں پر تبصرہ کریں تو امید کی جا سکتی ہے کہ آپ کا تبصرہ شائع ہوگا لیکن آپ...؟ تصویر الحسن، تفسیر عباس کی انٹری پر کچھ کے پیٹ میں مروڑ بھی اٹھی ہے، یقین نہ آئے تو ماہا سے پوچھ لیں۔ (حالانکہ اندرونِ خانہ معاملات کی خبر آپ دے رہے ہیں تو پھر آپ سے کیوں نہ پوچھیں!) ماہا ایمان! کبھی کبھی اناڑی بھی بڑے بڑے کھلاڑیوں کو مات دے جاتے ہیں آزمائش شرط ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس دفعہ کہانی کچھ سلو موشن میں رہی۔ گرداب اب کچھ بہتر سے بہترین ہوتی جارہی ہے۔ نظرباز بھی خوب تحریر رہی۔ ہمیں یہ تحریر غور سے پڑھنی چاہیے۔ ہر ٹائٹل کو گھور کے دیکھتے ہیں۔ (اپنے آپ کو اس طرح تو نہ رگیدیں) اکھاڑا، اس مرتبہ شاہی اور تیمور نے بالکل مختلف پھندے میں ٹانگ اڑائی۔ آثارِ جنوں میں واحد خان کا کردار پسند آیا۔ واحد خان کو اس کی وفاداری اور رحم دلی کا انعام خوب ملا اور جنہوں نے دولت کے لیے غلط طریقہ اختیار کیا انہیں حسرت ہی رہی دولت کی۔ پہلے صفحات پر ایم اے راحت صاحب نے بھی دلچسپ کہانی پڑھنے کو دی۔ بہادر شاہ نے الجھی ہوئی کہانی میں خوب کردار ادا کیا۔ مختصر کہانیوں میں چلتر، چھٹی کا دن اور فون کال خوب رہیں۔"

تصور سے علی آتش کی دوبارہ آمد" ایک اسال سی غیر حاضری کے بعد ہم پھر جاسوسی کی محفل چینی، نکتہ چینی میں شامل ہونے کی کوشش (گستاخی) کر رہے ہیں۔ اس دفعہ 2 مارچ کو جاسوسی مل گیا اس لیے تبصرہ لکھ پائے۔ سرورق پر موجود محترمہ کچھ جانی پہچانی لگی۔ وہ تو بعد میں پتا چلا کہ ماہا ایمان صاحبہ واپس آ گئی ہیں۔ ریوالور والے ہمایوں سعید راج اور جاسوسی کو پکڑے ہوئے ڈھانچا تفسیر عباس بابر لگے۔ مجموعی طور پر سرورق بہترین تھا۔ (پھر تو اچھا ہی لگے گا۔ اتنے شناسا جو مل گئے) اب چینی، نکتہ چینی میں پہنچے۔ ہمایوں سعید راج صاحب کو شاید صنفِ نازک کی وکالت کرنے کی وجہ سے کرسیٔ صدارت ملی۔ تبصرہ بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھا، مبارک باد۔ صبا گل تو بہت ہی غصے میں نظر آئیں، جاسوسی کی بے اعتنائی پر۔ چنیوٹ سے جعفر حسین، مری سے کبیر عباسی عرف شہزادہ، ماہا ایمان کے تبصرے زیادہ اچھے اور باقی تمام تبصرے بھی بہترین تھے۔ اپنے تفسیر صاحب بے چارے شاید ماہا ایمان کی واپسی کی وجہ سے منہ چھپاتے ہوئے بلیک لسٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ انکل نے ڈرامائی انداز میں ہیرو بھائی اور تابی کو لاہور پہنچایا۔ بس اس دفعہ کی قسط میں عمران کے جیسٹ لک والی بات اچھی لگی۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی سرورق پر مشتمل اسٹوری اکھاڑا پڑھی۔ انکل نے ہمارے پسندیدہ کرداروں شاہی اور تیمور کے ذریعے ہمیں بتایا کہ پاکستان پوری دنیا کے لیے ایک اکھاڑے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ نواب وقار الملک کی اپ ٹو ڈیٹ معلومات پر حیرت ہوئی اور شکیلہ کے کردار نے امپریس کیا۔ باقی اسٹوریز ابھی پڑھی ہی نہیں، اس لیے اجازت۔"

جھنگ سے مہر اے ڈی سیال کی وضاحت" اس مرتبہ تین تاریخ کو ہی جاسوسی کو اپنے دامن میں چھپائے گھر آکر کمرے میں چھپ گئے۔ حسینہ سرورق چہرے پر ایک خونی مسکراہٹ سجائے وجود زن سے ہے کائنات میں جنگ، کی موقع پر ہی عملی تصویر پیش کر رہی تھی۔ چیئرمین آف شوگر فیکٹری ہمایوں سعید راج، اپنی چیئر سے چمٹے ہوئے صنفِ نازک کی وفا پر اپنی ریسرچ پیش کر رہے تھے۔ جناب جاسوسی کے بنا تو ہم رہ نہیں سکتے مگر دو سال محفل میں حاضری نہ دے سکے۔ (کیوں، کن کاموں میں مصروف تھے؟) صبا گل جی! اپنا روایتی ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اسمبلی ہال میں اپنی سیٹ بنانے میں کامیاب رہیں۔ احتشام احسان بھائی! ہماری دلی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ سمیرا اقبال! آپ کا شعر کچھ زیادہ ہی مشکوک لگا۔ ہمارے خیال میں تو یہ شعر ہاتھی کے دانت والے معقولے پر پورا اترتا ہے۔ عثمان اینڈ فوزان! جناب اس پچھلی منڈی میں سب سے زیادہ ورش اسی صنف کے ٹھیلوں پر ہوتا ہے۔ انجانی بیگانی، ماہا ایمان جی! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارا اصل نام نعیم احمد تھا مگر ہمارے دادا جان کو ہمارا یہ نام بہت پسند ہے اور ہم خود بھی اسی پر فخر کرتے ہیں۔ رہی بات پردے میں چھپنے کی تو آپ کی صنف کے علاوہ کسی کا بھی ٹاپ پورشن اتنا خالی نہیں ہوتا کہ اس کو ہمارا نام معلوم نہ ہو سکے۔ ویسے تصدیق کے لیے آپ جھنگ میں ہمارے دادا جان کے پاس تشریف لا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ محمد نعمان پیارے اور شہزادہ کوہسار کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ ہمارے لڑکپن کے دوست اور یارِ جاسوسی، جناب اختر عباس تھراج صاحب! کہاں غائب ہو چکے ہو بھائی۔ یار! ہم آپ کی کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں، جلدی سے حاضری دو۔ اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی تو ٹاپ اسٹوری آف جاسوسی للکار اپنے اسٹیئرنگ کو 270 ڈگری پر گھماتے ہوئے ایک نئے ٹریک پر آرہی ہے مگر ہماری خواہش ہے کہ اسٹوری کے اس نئے موڑ پر ثروت اور تابی کو ملا دیا جائے۔ گرداب میں آخر کار ملی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ ماریا بھی سنتھیا کی آلۂ کار نکلی مگر چودھری سے یہ کیسے بلیک میل ہوتی رہی؟ اور شہریار سے شادی کر کے یہ اپنا کون سا مشن مکمل کرنا چاہتی تھی؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں پورا مہینا انتظار کرنا پڑے گا۔ اکھاڑے میں اس مرتبہ شاہی کا ٹاکرا ایک ابھرتی ہوئی سپر پاور اور ایک مستقبل کی ابھی [illegible] ہوا۔ نواب صاحب کی سرگرمیاں بہت اچھی لگیں۔ آثارِ جنوں والدین کے لیے ایک سبق آموز تحریر تھی۔ والدین کو بچوں میں ایسے آثارِ جنوں ظاہر ہونے پر مناسب اقدام کرنے چاہئیں۔ ورنہ سرفراز جیسے بچے ان کے لیے ایک تباہی لا سکتے ہیں اور اپنی زندگی میں بھی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ خصوصی معاملے پر آخر کار یاسر کامیابی سے اپنی چال چل گیا۔ مگر اس کے پکڑے جانے میں بہادر شاہ کی محنت سے زیادہ اس کی خوش قسمتی کو دخل تھا۔ ویسے پوری اسٹوری میں بیگم صاحبہ کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ تین مقتول جرمن نسل پرستوں کے متعلق ایک زبردست تحریر تھی مگر ہنی نے گیلو سے انتقام لینے اور اسے ختم

کرنے کے لیے جوراستہ اپنایا ہم اس سے بالکل اتفاق نہیں کرتے۔"

عمیر شہزاد انجینئر کی ضلع ہنگو سے خوشی" اس دفعہ جاسوسی 5 مارچ کو ملا۔ پہلی بار سرورق پر نظر پڑی تو ٹائٹل گرل نے اپنی آنکھوں کی جکڑ میں لیا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سب ایک فریب ہے۔ اچانک گرل کے پیچھے سے ایک شیطان صفت آدمی پستول ہاتھ میں لیے نمودار ہوا اور چلا رہا تھا کہ "ہینڈز اپ۔" جب نیچے نظر پڑی تو ایک مردہ شخص ہاتھ میں کتاب لیے پڑا ہوا تھا۔ تب میں نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔ (یہ بہت اچھا کیا!) اور بھاگتے بھاگتے دوستوں کی محفل میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ اس کے بعد جب دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے خط کو تلاش کیا تو اپنے تبصرے کو فرنٹ پیج پر پایا تو میں مارے خوشی کے بت بنا رہا اور اپنے خط کو دو تین بار پڑھا کہ شاید میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ لہٰذا میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے خوشی کا موقع دیا اور آپ کی وجہ سے میری رگوں میں ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ (ہمیشہ خوش رہیے، آمین) کہانیوں میں سب سے پہلے آخر کار پڑھی جس میں بہادر شاہ کی حالاتِ زندگی تھی۔ یہ ایک اچھی اور زبردست اسٹوری تھی جس میں شروع سے لے کر آخر تک خوب سسپنس میں رکھا۔ اس کے بعد جمال دستی صاحب کی سنپولیا پڑھی۔ میں تو بینڈی کو ایک جوان اور خوب صورت لڑکی سمجھ رہا تھا لیکن وہ تو ایک جوان بیٹے کی ماں نکلی۔ تیسرے نمبر پر جس کا ہر جاسوسی کے قاری کو پورے مہینے بے صبری سے انتظار ہوتا ہے، للکار پڑھی جس میں مسلسل کئی مہینوں سے ایکشن کا جو طوفان تھا، وہ اب تھم گیا تھا۔ عزت نفس میں چارلس اور اس کی بیوی نے نہایت ہی خوب صورتی اور چالاکی سے اپنی پوسٹ کو مستقل کیا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جن کے پاس عقل ہوتی ہے تو قسمت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے۔"

مونا گل آف بنوں کی رائے" آپ کے جاسوسی رسالے کے چٹکی، نکتہ چینی میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ (خوش آمدید) جاسوسی میں للکار اور گرداب زبردست تحریریں ہیں۔ للکار میں عمران کا کردار ناقابلِ بیان حد تک دلچسپ ہے۔ یہ شکر کہ اپنے ملک پہنچ گئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کیا رنگ و جنگ و جنگ شروع ہوگی۔ ساتھ ساتھ اسما قادری صاحبہ نے گرداب کو جس معیاری انداز میں لکھا ہے، گرداب کا ایک ایک لفظ فطری حیا سے بھرپور ہے۔ کہیں پر بھی اس کہانی میں اسما قادری صاحبہ نے ایسا کوئی غلط لفظ نہیں تحریر کیا جس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔ باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح کاشف زبیر صاحب کا اندازِ تحریر بہت نرالا پن لیے ہوئے ہوتا ہے۔ چٹکی، نکتہ چینی میں ایک بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ کہ کہانیوں پر تبصرہ اتنا نہیں ہوا ہوتا جتنا کہ ٹائٹل کی حسینہ اور محفل میں شریک دوستوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ ہمایوں سعید راج صاحب میں یہ عادت سرِفہرست رہی ہے۔ بہرحال، محفل میں حاضر ہونے والے ساتھی۔ مائنڈ نہ کریں، صرف میری ایک رائے ہے۔"

کلی مروت سے فرید اللہ معصوم کا سندیسہ" میں صبا گل کی طرح خیریت گئی بھاڑ میں والا نہیں ہوں بلکہ پہلے سب کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اگر یہ خط شاملِ اشاعت کیا گیا تو قوی امید ہے کہ میرا رابطہ برقرار رہے گا۔ (ان شاء اللہ، خوش آمدید) جاسوسی بہت عرصے سے پڑھتا آرہا ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں صرف ایک درخواست کرتا ہوں اور یہ ہے کہ للکار کی طرح گرداب کو بھی زیادہ صفحات پر جگہ دی جائے تو اچھا ہوگا۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ للکار تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہوتی ہے اور گرداب تیس سے بتیس۔ اب خود انصاف کریں۔ (ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے برخوردار!) باقی میں نے اب تک صرف للکار، گرداب اور شاہی، تیمور کی اکھاڑ پچھاڑ پڑھی ہیں۔ للکار ایک بار پھر تھوڑا سست ہوگئی ہے اور طاہر صاحب سے گزارش ہے کہ اس کو تھوڑا تیز کریں تو اچھا ہوگا۔ شاہی کی یہ بات اچھی لگی کہ زندہ قوموں کے لوگ بھی زندہ ہوتے ہیں۔ اب آتے ہیں گرداب کی طرف۔ اسما صاحبہ! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ اسلم کو اب کہانی سے ہٹا دو اور ماہ بانو کو شہریار کے ساتھ منسلک کرا دو۔"

لاہور سے سمیرا اقبال کی شمولیت" مارچ کے جاسوسی ڈائجسٹ کے ٹائٹل پر ہنستی مسکراتی لڑکی بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ پسٹل والا آدمی اپنے ایک خالو کی طرح لگا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا دیکھ کر دل سے یہ دعا نکلی، کاش! پاکستان کے دشمنوں کا بھی یہی حال ہو، آمین۔ اداریہ میں مدیرِ اعلیٰ کے انکشافات پڑھ کر ہم بھی ان ملعون اور انسان دشمن کمپنیوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ہمایوں بھیا کو بہت مبارک ہو دل کی گہرائیوں سے۔ بے شک ان کا تبصرہ ٹاپ پر آنے کا حق دار تھا۔ ان سے ایک بات پوچھنی تھی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ روح کیوں لگاتے ہیں؟ صبا گل جی! اتنا غصہ توبہ توبہ۔ منگنی کی مبارک ہو آپ کو۔ اللہ پاک آپ کے نصیب اچھے کرے، آمین۔ عمیر شہزاد، تصور الحسین، نعمان، مبشر، احتشام، نیازی صاحب، ام ثمامہ کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ماہا، آپ کو ویلکم بیک، سب آپ کو بہت مس کر رہے تھے۔ اب بات کی جائے کہانیوں کی۔ آخر کار، کہانی اچھی تھی لیکن بہت زیادہ اچھی نہیں۔ سنپولیا میں بینڈی کا کردار بہت پاورفل تھا۔ عزت نفس، پڑھ کر بہت ہنسی آئی چارلس کی چالاکی پر۔ للکار میں شاندار سے پرائیویٹ طیارے کے بارے میں پڑھ کر دل میں عجیب سی خواہش جاگی کہ کاش یہ میرے پاس بھی ہوتا۔ گرداب کی اگلی قسط بہت شاندار ہوگی کیونکہ ماہ بانو کی قسمت کا فیصلہ شاید اس قسط میں ہو جائے کہ وہ کس کی وائف بنتی ہے۔ شہریار کی یا اسلم کی۔ ویسے آپس کی بات ہے، ماہ بانو کا کپل شہریار کے ساتھ زیادہ اچھا لگے گا۔ دونوں ایک دوسرے کی پہلی چاہت ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی اکھاڑا بہت اچھی تھی۔ آثارِ جنوں کا ٹاپک پرانا تھا۔ پہلے بھی اس سے ملتی جلتی کہانی جاسوسی میں پڑھ چکے ہیں۔ آخر میں دل سے نکلی یہ دعا کہ آپ کا ادارہ ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتا رہے تاکہ اس کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں میں اچھی اچھی تبدیلیاں لاسکیں، آمین۔" (آپ کو ہم بتانا چاہیں گے کہ آپ کاغذ کے دونوں طرف لکھ سکتی ہیں اس طرح کاغذ ضائع ہونے سے بچ جائے گا)

تحصیل علی پور سے محمد جاوید کے جوابات" خود کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھا، اور کیوں پڑھا یہ میں جانوں یا پھر میرا خدا جانے کیونکہ خزانے دفن ہی رہیں تو اچھا ہے ورنہ اژدر کی پھیل جاتی ہے۔ کوک کی بوتل کے منہ والی لڑکی تو ہے مگر انگوٹھی میں جڑنے والا نگینہ ہرگز نہیں، ہمیں رجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ حد سے بڑھے ہوئے دانتوں والی کو کیا معلوم ہمارا معیارِ حسن تو چنچی ہوئی کلیاں ہیں۔ دل میں اب کیا ہوگا جیسے خیالات کو جنم دیتے



والی کہانی گرداب، ماہ بانو اور صراطِ مستقیم منتخب کرنے والے اسلم کا انجام کیا ہوگا، یہ پتا تو اگلے شمارے میں چلے گا۔ ماہ بانو کے لیے فیصلے کی یہ گھڑیاں دیدہ روح سے کم نہیں۔ لگتا ہے اسلم کی دنیا اندھیر اور شہریار کی پھوٹی قسمت جاگنے والی ہے۔ للکار میں کوئز پروگرام مزہ دے گیا۔ امید ہے اس بار تابش کو بھی طاہر جاوید صاحب کچھ کر گزرنے کا موقع دیں گے۔ آخر کار میں ایم اے راحت نے سنجیدگی میں بھی مزاح کا عنصر پیدا کر کے اسٹوری کو نیا پیراہن پہنایا۔ راؤ کا اپنی بیوی کو بار بار میٹھا کھلانے سے اس کی چالاکی سمجھ میں آ گئی تھی۔ جب دلوں میں محبت کی جگہ لالچ گھر کر لے تو انجام بد سے بدترین۔ عام سے عنوان کے نام کی یہ الجھی الجھی ہوئی کہانی کمال کی اسٹوری تھی۔ انتقام کی آگ لہو کے ایندھن سے جلتی ہے اور دشمن کے لہو سے بجھتی ہے۔ یہ الاؤ کیلین کے ناتواں وجود کو اتنی طاقت دے گیا کہ اس نے اپنی تباہی کا بدلہ گیلو سے لے لیا۔ تین مقتول خون سے تر بتر داستان کا انجام بھی خونی رہا۔ اکھاڑا میں نواب صاحب کا کردار خوش کر گیا۔ آثارِ جنوں سلیم فاروقی کی ایک فاسٹ اسٹوری تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اپنے معمول سے ہٹ کر تحریر لائے۔ دانش افتخار کی دریافت چھٹی کا دن انگلش لکھاریوں کی مہارت کا ایک اور منہ بولتا ثبوت۔ بابر نعیم کی چلتر، سلیم انور کی نظر باز، مریم کے خان کی عزتِ نفس بہترین مغربی کہانیاں تھیں۔ ہمایوں سعید راج لگتا ہے آپ تبدیلیِ جنس کے مراحل دھیرے دھیرے سے طے کر رہے ہیں۔ جس طرح آپ نے مرد، عورت کی وفا جفا کا مبالغہ آمیزی سے بھرپور فیصدی تجزیہ پیش کیا ہے پھر آپ کو تو اپنے مرد ہونے پر شرم محسوس کرنی چاہیے اور آئے روز اسی کاغذی پیکرِ وفا اپنی چشمِ حیا سے بے وفائی کا مرتکب ہوتے دیکھتا ہوں۔ صبا گل! بے شک دونوں ہاتھوں کی انگلیاں برابر نہیں ہوتیں مگر کان اور آنکھیں تو برابر برابر لگی ہوتی ہیں۔ بس اس بار آئینہ ذرا زاویہ بدل کر دیکھنا۔ راجن پور کا ماہ کامل ماہ تاب گل آپ کی میٹھی سی گستاخی بہت پیاری لگی۔ سردار ظفر اقبال! بہت پیارا دل ہے آپ کا جسے سب بھول جاتے ہیں، آپ انہیں ضرور یاد فرماتے ہیں۔ عثمان اینڈ فوزان! آپ کے جوابات سے خوب محظوظ ہوا۔ آمنہ پٹھانی اینڈ ماہا ایمان اور اے ڈی صاحب نے اپنا نام چھپایا ہے جنس تو نہیں چھپائی۔ گرداب فوبیا کے شکار جعفر صاحب! حقیقت یہ ہے کہ آپ کا تبصرہ اس بار ذرد کا تھا۔ مجھ جیسے کم پڑھے لکھے شخص کو خمیر کے پڑھنا پڑا۔ قمر تبی! گفتار اور کردار انسان کی باطنی شخصیت، حیثیت، کیفیت کا شیشہ ہوتے ہیں۔ بابر عباس، تفسیر عباس اور ہمایوں راج کا تو کچھ نہیں بگڑا مگر آپ کی محدود ذہنیت کا پول کھل گیا ہے۔ انسان کو قد کا تو چھوٹا ہونا چاہیے مگر سوچ کا ہرگز نہیں۔ ادارے کی جانب سے پیک شدہ دودھ کے متعلق کراہیت آمیز انکشافات پڑھ کر آئندہ دودھ نہ پینے کی قسم کھاتا ہوں۔ خدا ان کی لعنتی کمپنیوں کو غرقِ جہنم کرے۔"

ضلع قصور سے مقصود الحسن طاہر کی خوب صورت باتیں" جشنِ بہاراں کی آمد کے ساتھ اپنا پیارا جاسوسی ایک شاندار ٹائٹل کے ساتھ میرے ہاتھوں میں آیا۔ ایسا لگا کہ بہار کے سارے رنگ گویا ہماری مٹھی میں آ گئے۔ 19 فروری کو بدولت شادی جیسے حسین بندھن میں بندھ گئے۔ (مبارک ہو... مٹھائی کہاں ہے؟) طاہرہ یاسمین، تفسیر عباس، طاہرہ گلزار! آپ بھی پیار کرنے والے ہیں، اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔ ہمایوں سعید راج کرسیِ صدارت سنبھالے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ انہیں سلام کرتے ہوئے اور مبارک باد دیتے ہوئے بالاکنڈ پہنچے تو صبا گل بڑی خفا خفا نظر آئیں۔ اتنا حسین نام اور اوپر سے اتنی حسین جگہ پر رہتے ہوئے بھی آپ دکھی ہیں۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ منگنی تو آپ نے کروالی چوری چوری اور ہم سے مبارک باد ڈنکے کی چوٹ پر قبول کریں۔ شادی پر بھولنا نہیں ہے۔ اوکاڑہ والی بہن تصویر دلہن ٹائٹل پر آپ کی اپنی تصویر تھی اس لیے آپ کو پسند نہیں آیا لیکن ہم تو ذاکر انکل کو داد دیتے ہیں کہ جو انہوں نے بغیر دیکھے آپ کو ٹائٹل کی حسین زینت بنا دیا۔ محمد نعمان پیارے! بہاروں کی آمد کے ساتھ آپ کے ایس ایم ایس بھی آنے بند ہو گئے ہیں، کچھ تو خیال کریں۔ آپ کی خوشبو واقعی محفل میں ایئر فریشنر کا کام کرتی ہے۔ احتشام احسان آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا، یقین کریں انتہائی دکھ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے، آمین۔ قدرت اللہ نیازی آپ نے اتنی پیاری محفل کو مچھلی منڈی لکھ دیا۔ رہتے آپ خانیوال میں ہیں لیکن باتیں ساری کراچی کے سمندری ساحل کی ہیں۔ ام ثمامہ، بہن آپ نے ہماری کاوش کو پسند کیا، یو آر ویلکم لیکن ایک بات ہے، تبصرہ آپ نے بھی واقعی کمال کا لکھا ہے مونگ پھلی کھا کے۔ مبارک باد قبول کریں۔ ماہا ایمان! آپ بھی ہماری دعاؤں کے ساتھ آخر کار محفل کی زینت بن ہی گئیں۔ اس دفعہ کا ٹائٹل ذاکر انکل نے آپ کی خوشی کو دیکھتے ہوئے بنایا۔ آپ صرف اپنی پیاری تصویر دیکھیں کہ کس طرح خوب صورت معروفیت گزار کے خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔ اس خوب صورت معروفیت میں ہم سب کو بھی شامل کر لیتیں تو کتنا ہی اچھا ہوتا۔ بہرحال، آپ کی انٹری بھی واقعی خوب صورت رہی۔ قمر تبی! محفل میں سبھی بڑے پیار کرنے والے ہیں۔ سب کو آپ کا خیال ہے۔ آپ بھی اپنے دائیں بائیں کچھ پیار سے دیکھ لیا کریں۔ آپ کا گلہ دور ہو جائے گا۔ کبیر عباسی! شہزادہ تو شہزادہ ہوتا ہے۔ چاہے مری کا ہو یا اپنی اس خوب صورت محفل کا۔ آپ کے خوب صورت علاقے سے کچھ ہماری بھی محبتیں ہیں جو تاقیامت رہیں گی، ان شاء اللہ۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے تو اپنے پیارے طاہر جاوید مغل کی للکار سے ابتدا کی۔ تابی اور عمران کی لاہور میں بہار کے موسم میں انٹری اور پھر عمران کی بائیک بغیر سائلنسر کے لاہور کی شاہراہوں، مینارِ پاکستان کا حسین منظر، واقعی کہانی کو خوب صورت موڑ دینا ہی طاہر مغل کا خوب صورت اندازِ تحریر ہے۔ اسما قادری صاحبہ نے آخر کار ماہ بانو کو بھی دلہن کے رتبے پر فائز کر ہی دیا۔ کہانی کے حالات کے مطابق تو ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن کیا کریں، پہلی محبت آخر کہاں بھولتی ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

خانیوال سے محمد بلال حیدر کے شکوے" اس دفعہ رسالہ 2 تاریخ کو ملا۔ بڑا عجیب سرورق بنا دیا ذاکر انکل نے۔ پورے کا پورا سرورق ہی الٹا۔ [illegible] کے نیچے اوپر کھڑے بھائی کی مُردے کو دیکھ کر چیخ نکل رہی تھی اور صنفِ نازک ڈرنے کے بجائے قہقہہ لگانے کے اسٹائل میں کھڑی تھی۔ ہو گی ہم اہل [illegible] بار اتنی بہادر خاتون دیکھی (سرورق میں)۔ ہم فوراً اپنی محفل گل رنگ میں جا پہنچے اور صدارت کی کرسی پر ہمایوں صاحب کو پا کر خوشی ہوئی۔ [illegible] ماہا ایمان صاحبہ! آپ نے کہاں سے ہماری افسردگی کو دیکھ لیا۔ اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہم اب اپنا خط دیکھ کر خوشی سے آپ کی طرح [illegible] اور لوگ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کر دیں۔ قدرت اللہ صاحب! خانیوال ہمارا ضلع ہے۔ شہر تو عبدالحکیم ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ بہرحال، آپ [illegible] دوں گا۔ ہم بھی آپ کو خانیوال کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس کے بعد پہنچے جی اپنی فیورٹ کہانی للکار پر جواب کسی

تعارف کی محتاج نہیں۔ اس دفعہ تو کہانی نے سابقہ قسطوں کی کسر پوری کردی۔ اتنے انہماک سے کہانی پڑھی کہ پتا اس وقت چلا جب بقیہ قسط اگلے ماہ پر نظر پڑی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی، اب کہانی بہت اچھی جارہی ہے۔ ماریا کا کردار بھی سمجھ آرہا ہے اور اس کی ممی کا بھی جو لوگوں کی نظروں میں تو اس کی ممی ہے لیکن اصل میں ہے را کی ایجنٹ۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے اور اسامہ ذرا کشور اور آفتاب کو بھی منظر پر لائیے۔ اب تھوڑا شکوہ شکایت ہو جائے۔ ویسے تو کاشف صاحب بہت اچھے رائٹر ہیں لیکن کیا یہ شامی اور تیمور کے موضوع سے ہٹ کر نہیں لکھ سکتے؟ ٹھیک ہے شامی اور تیمور کی ایک دو کہانیاں لکھ بھی دیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک ہی کردار کے پیچھے پڑ جائیں۔ آج کل تو ویسے بھی سائنسی دور ہے۔ مصنفین کو سائنس فکشن پر مبنی معلوماتی ناول لکھنے چاہئیں۔ پھر دوسرا رنگ سلیم فاروقی صاحب کا۔ اُف اتنی مار دھاڑ والے ناول۔ ابھی کچھ تو خیال کریں فاروقی صاحب! ہمارا نوجوان طبقہ' خاص طور پر بے روزگار نوجوان پہلے ہی بہت مار دھاڑ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں اور پھر ان کے بعد ہم ہیں جو آپ کی کہانیاں پڑھ کے خیالی پلاؤ اور مار دھاڑ کے کون کون سے کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔ (خیالوں میں) پلیز تھوڑا اسٹائل چینج کریں۔ اس کے بعد انکل سے ایک بات پوچھنی ہے کہ میں نے جو کہانی بھیجی تھی کیا وہ اشاعت کے قابل تھی؟ یہ تو مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ انعامی کہانی کا ٹائٹل حاصل نہیں کرسکی۔ میں نے (رونگ کال) کے نام سے کہانی لکھ کر بھیجی تھی۔ پلیز اب بتا دیں کہ آپ کے کاغذوں میں وہ اشاعت کے قابل ہے یا نہیں۔" (معذرت، کہانی شائع نہیں ہوسکے گی)

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کی فکر انگیزی" پیارا جاسوسی تین مارچ کو ملا۔ لو جی اس مرتبہ تو ڈاکٹر انکل نے تو تھرپیسٹ کے اشتہار کی ماڈل کو سرورق پر بٹھا دیا۔ ابھی پچھلے دنوں میڈیکل کالج کی بائیو لیب سے ایک ڈھانچا اور ضخیم سی کتاب چوری ہوئی تھی، یہ تو وہی... اوپر والے آگ بگولہ صاحب کو ڈر کے مارے دوبارہ نہیں دیکھا۔ ابتدائیہ کے انکشاف نے دل بوجھل کر دیا۔ آج کل کون سا ایسا گھر ہے جہاں ڈبا پیک دودھ استعمال نہ ہوتا ہو۔ پتا نہیں کتنے معصوم اس سفاکی کی بھینٹ چڑھے ہوں گے۔ ہر روز نت نئے حادثات، اب تو آسمان نے بھی ماتم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ابابیل پرندہ کہاں سے آئے اور کس پر کنکر پھینکے؟ مرنے والا بھی مسلمان، مارنے والا بھی مسلمان، مرنے والا شہید، مارنے والا غازی۔ (اپنے خیال میں) کاش ہمارے جذبات میں اتنا اثر ہو جائے، ہماری دعائیں اتنی سحر انگیز ہو جائیں کہ کوئی محمود غزنوی، کوئی محمد بن قاسم اس سحر کے زیر اثر نجات دہندہ بن کر آئے۔ محفل کے صدر اپنے راج بھائی قرار پائے اس مرتبہ، مبارک ہو۔ ماہا ایمان اور ام ثمامہ کے تبصرے زبردست تھے۔ سب سے پہلے گرداب کو کھولا۔ آخر ہمارا اندازہ درست نکلا۔ ساری کہانی سمجھ میں آگئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ کاش کہ جاسوسی مہینے میں دو دفعہ ملتا ہوتا۔ للکار پڑھ کے تو مزہ ہی آگیا۔ آخر عمران اور تابش اپنے سوہنے شہر لاہور میں بلکہ لاہور میں آگئے ہیں۔ مغل انکل! آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتے ہیں؟ آپ کے ہاتھ میں آکر قلم کو فخر محسوس ہوتا ہوگا۔ سولیمن ڈالرز کے لگژری جہاز کے گیم نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ایک طرف لوگ ایک وقت کی روٹی کو ترستے ہیں اور ایک طرف لوگ محض شوق کی بنا پر اتنا کچھ اڑا دیتے ہیں۔ جس دن حیثیت کا یہ تضاد ختم ہوا، دنیا جنت ہی بن جائے گی۔ بہرحال، گیم دلچسپ تھا اور رائٹر انکل کی معلومات بھی۔ شامی، تیمور کے ساتھ کاشف زبیر تشریف لائے۔ اس مرتبہ تو کمال کر دیا۔ زبردست تخلیق تھی۔ اور جناب، اس معرکے میں نواب دادا حضور کی شمولیت نے مزہ دوبالا کر دیا۔ سلیم فاروقی کی دوسری تحریروں کی طرح تیز رفتار ایکشن سے بھرپور تھی۔ وہی ہیرو کا حادثاتی طور پر مجرم بننا اور ٹاف سی فرشتہ صفت انسان مل جانا جو ہاتھ پکڑ کر جرائم کی دلدل سے نکال لے اور وہی آخری صفحے پر یکدم سارا کچھ سیدھا ہو جانا۔ بس اس مرتبہ حالات کی ماری کوئی ہیروئن نہیں ملی۔ بابر نعیم کی چلتر کچھ خاص متاثر نہ کرسکی۔ ابتدائی صفحات پر ایم اے راحت کی تحریر تو ابھی نہیں پڑھی البتہ شاہد انکل کا اسکیچ بہت پسند آیا۔"

ڈاکٹر مرزا انتظار ندیر مغل کی حافظ آباد سے پہلی بار آمد "میری جاسوسی سے آشنائی بہت پرانی ہے۔ میرے بچپن میں والد صاحب لالٹین کی روشنی میں رات کو اس کا مطالعہ کرتے تھے تو میں تجسس کے مارے سرورق پر بنی حسیناؤں کے حسن میں کھو سا جاتا۔ امید ہے کہ چینی (شوگر) کی طرح نکتہ چینی کے بھاؤ آپ نہیں بڑھائیں گے اور جگہ عطا فرمائیں گے، چاہے صرف نام پر ہی ٹرخا دیں... لیکن کیوں؟ (خوش آمدید) ایم اے راحت کی آخر کار بے سروپا اسٹوری تھی۔ کہیں کہیں تشنگی کا احساس بہرحال غالب رہا۔ مریم کے خان کی عزت نفس میں سارہ اور چارلس نے خود ہی خط لکھ کر غیر کی مستقل پوسٹ حاصل کی، بہت خوب! فرجی میں نام جانسن ہا آخر میگ گور نکلا اور بہن کا انتقام وہب نے تینتیس سال بعد لے ہی لیا۔ مغل صاحب کی للکار جلدی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ عمران اور تابی کو لاہور میں خوش آمدید۔ دریان ولیم کی بدنصیبی جہاز تباہ ہونے کی صورت میں اور خوش نصیبی جان بچ جانے اور لاٹری ٹکٹ کی وجہ سے سامنے آئی۔ نظرباز میں محافظ ہی قاتل نکلا۔ شکست منطق میں آرچر کو ڈبل گیم مہنگی پڑ گئی لیکن اینجلے نے ورونچ گوئی کو خیرباد کہہ دیا۔ بابر نعیم نے چلتر میں صنف جواز بے دخلی جنت کے کر و فریب پر خوب قصہ گوئی فرمائی۔ گرداب میں اسامہ قادری اچھا جارہی ہیں۔ شہریار جلدی ہی اپنی منکوحہ کی حقیقت جان لے گا لیکن اس وقت تک اس کی بانو اس سے دور جا چکی ہوگی۔ سٹے کا بھاری بھرکم اخبار اتنا خطرناک ہوسکتا ہے جتنا دانش انبھار نے بتایا۔ آئندہ تمام باشندگان مملکت جاسوستان ذہن میں رکھیں۔ مختار آزاد کی تین مقتول میں جو رنگ و نسل کی وجہ سے نفرتیں دکھائی گئی ہیں، وہ اب ہمارے معاشرے میں بے تحاشا نظر آتی ہیں۔ اب آتے ہیں رنگوں کی طرف۔ پہلا رنگ میں کولنز آئی تے شامی، تیمور اور بے چارے جو جی کو وخت ڈالا۔ دوسرا رنگ باکمال تھا۔ قبائلی خون نے حق وفا ادا کر دیا۔ بے شک معاف کر دینے والے کا درجہ بلند ہے۔ پہلی دفعہ جھک مار رہا ہوں۔ امید ہے کہ اگر ماہا ایمان، شہزادہ کبیر عباسی، ام ثمامہ اور راج صاحب کے چھ چار کے تبصروں سے جگہ بچی تو ہم بھی اپنے دوستوں میں طرم خان بن سکیں گے، ہے نا؟" (آپ نے جاتے جاتے جس چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے تو اب آپ ہی جائیں)

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی ادھوری خواہش "مارچ کا شمارہ خلاف معمول دعائیں مانگے بغیر اور ہاکر صاحب کو فون کھڑکائے بغیر ہی موصول ہوگیا۔ سرورق بہت یونیک سا ہے۔ کوئی بہت خوب صورت ہے اور بڑے دل گردے والا ہے جو بھیانک ڈھانچے کے عقب میں قہقہے لگا رہی ہے۔ بہت فریش ٹائٹل ہے۔ لگتا ہے ڈھانچے کی رونمائی کر کے ڈاکٹر انکل حسینہ کے عاشقوں کو وارننگ دے رہے ہیں۔ خیر سانوں کی۔ تجزیاتی اداریہ بے حد فکر انگیز اور عبرت ناک ہے۔ محفل میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہمایوں سعید اپنی فطرت نیچر کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ حضرت اب بس کیجیے، ہمیں یقین آگیا۔ آپ کی مبارک باد کا شکریہ کو کہ



لڑائی ابھی ادھوری ہے۔ (کیوں... کیسے... کس لیے) ایم اے راحت کی طویل تحریر آخرکار سے آغاز کیا۔ چاہتوں، تمناؤں اور جذبات کے سیل رواں میں مسابقت، خلوص، محبت کے خوش رنگ جذبات کے بجائے دھوکا، فریب، لالچ کی کڑواہٹ شامل ہو جائے تو پھر تبدیلیوں کا عمل انسان کو مکافات عمل کے گھیرے میں بہت جلد لے آتا ہے۔ یہی سب کچھ زیر نظر کہانی میں ہوا۔ للکار میں مصنف نے ہمیں کون بنے گا کروڑ پتی کا پروفیشنل ورژن دکھایا۔ تابی کا اپنے بہن بھائیوں سے ملاپ بہت دل گداز رہا۔ کاشف زبیر صاحب میرے موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں لیکن اس دفعہ معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ شامی اور تیمور کی اسٹوری میں اب کوئی مزہ نہیں رہا۔ ہر دفعہ تقریباً ایک جیسے واقعات پر مشتمل کہانی نئے نام سے سامنے آتی ہے۔ بہت عرصے سے کوئی دھانسو قسم کی اسٹوری پڑھنے کو نہیں ملی۔ سلیم فاروقی صاحب کی تحریر بھی ہمیشہ کی طرح فلمی اور ایکشن سے بھرپور تھی۔ مختصر ترین البتہ بہت عمدہ رہی۔ جیسے مریم کے خان کی عزت نفس، چارلس نے ایک جا کھیلا جو کہ خوش قسمتی سے اس کے حق میں رہا۔ جمال دستی کی تحریر میں بینڈی نے نہایت مہارت سے دو سنپولیوں کے سر کچل ڈالے۔ سلیم انور کی نظرباز میں سیل جس کو قاتل سمجھتی رہی، وہ اس کا محافظ نکلا۔ قوم پرستی، نسل پرستی پر مبنی کہانی تین مقتول کا اختتام نہایت چونکا دینے والا تھا۔"

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کے خوب صورت الفاظ و تبصرے "اب کی بار جاسوسی کافی سے زیادہ تاخیر سے ملا۔ (اس بات کا اندازہ ہمیں آپ کے ہمارے نام علیحدہ لکھے گئے خط سے ہوا، آپ کی محبت اور خلوص کا شکریہ۔ ہم نے آپ کی گزارشات نوٹ کر لی ہیں اور ان پر عمل کرنے کی مزید کوشش کریں گے) دوشیزہ سرورق کو خوب صورت کہہ لینے میں کوئی عار نہیں۔ بس ذرا دانتوں کی بتیسی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہے جس کی نمائش بھی وہ خاصی فراخ دلی سے کررہی ہیں۔ ساتھ ہی ماہا ایمان کی ایکسپائر ہڈیوں کا ڈھانچا مقام توبہ ہے، جلنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور ہاتھ میں اعمال ناموں کا مجموعہ... فہرست کے بعد چیف نکتہ چینی میں آپ کا فکر انگیز اور دل خراش اداریہ حالات حاضرہ کا ایک اور المیہ۔ تخت طاؤس پر بنوں سے ہمایوں سعید، صنف نازک کی بھرپور توجہات دھڑا دھڑ حاصل کرنے کے لیے آپ نے اچھی اور سیاسی پالیسی اختیار کی ہے۔ کہیں آپ کا شمار بھی ان نوے فیصد افراد میں نہیں ہوتا جو سو فیصد خواتین کا... سو فیصد جذباتی استحصال کرتے ہیں کیونکہ زبان نہیں تجربہ بولتا ہے اور تجربہ، تجزیہ اور مشاہدہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ بہرحال فرسٹ پوزیشن کے لیے سوئٹس کی زحمت کیے بغیر مبارک باد وصول فرمائیے۔ مالاکنڈ ایجنسی سے صبا گل کے کرمچھ کے آنسوؤں نے مدیر اعلیٰ کا دل موم بتی کی طرح موم کر ہی دیا۔ اوکاڑہ سے تصور احسن! آپ کی خوب صورت غیر جانبدارانہ گفتگو اور مستقل آمد باعث صد مسرت و اطمینان ہے۔ بس چند بوڑھی... ناقص العقل بونگیوں کی تقلید اور شر سے محفوظ رہنا چونکہ مشورہ مفت ہے یقیناً اچھا ہے۔ تعلب سے بہت پیارے محمد نعمان پیارے! آپ ہمارے شہر اوکاڑہ سے جلوہ گر ہوئے اور شہر میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے آپ سے شرف ملاقات حاصل نہ ہوسکی۔ بہت زیادہ افسوس کے ساتھ تہہ دل سے معذرت۔ خانیوال سے قدرت اللہ نیازی، ملکۂ حسن بلقیس خان نے درست کہا لیکن وہ وضاحت نہ کرپائیں۔ دراصل ترس ظالم پر نہیں، ظالم کے انجام پر آتا ہے۔ جھنڈو سے ام ثمامہ! ہمارا بھی ایک اصول ہے کہ جو ہمیں چھیڑے ہم اسے نہیں چھوڑتے، خواہ وہ حاتمی ہو یا حاجن... اینٹ کا جواب پتھر سے اور پتھر کا پہاڑ سے دیتے ہیں۔ آپ سے تو احترام کا رشتہ ہے اور ہاں، ہم ڈکشنری نہیں، محنت محبت اور خلوص کے عناصر سے تحریر کو... تحریر کرتے ہیں۔ راجن پور سے مہتاب گل اور خانیوال سے سردار اللہ دتہ صاحب... آپ احباب کے خلوص و اپنائیت کے لیے شکریہ بہت چھوٹا لفظ ہے۔ ملتان سے عائشہ رانی! اپنے دماغ اور آنکھوں کی تسلی بخش مرمت کروائیں کہ آپ کو جو دکھائی دیتا ہے وہ سمجھ نہیں آتا اور جو سمجھ آتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان! امو جو ڈرو یا ہڑپہ کے کھنڈرات سے دریافت ہوئیں اور مردہ بولے تو کفن ہی پھاڑتا ہے وہ بھی اپنا... اور آپ کو تو طوطا چشمی کا آسکر ایوارڈ ملنا چاہیے کہ شادی ہوتے ہی ہمیں انکل کہنا شروع کر دیا۔ راول پنڈی سے محترم قمر تقی! ہم آپ کی زیر نگرانی اپنی اصلاح اور تربیت کی اپنی سی کوشش ضرور کریں گے اور حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ بولنے سے پہلے لفظ آپ کے غلام ہوتے ہیں اور بولنے کے بعد... آپ لفظوں کے غلام ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا بولنے سے پہلے تو اتنا بھی سیکھو کہ کب کہاں کس سے کیا کہنا ہے اور اگر ہم بھی جواباً... کچھ ایسا ویسا اول فول لکھ دیں تو پھر... آپ میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا، ادارے کی جانب سے آپ کو دل سے سالگرہ مبارک۔ کوہسار مری سے کبیر عباسی! آپ کا جواب درست ہے۔ کہانیوں کے [illegible] للکار نے حسب روایت اس ماہ بھی پورا میلا لوٹ لیا۔ گرداب خاصی دلچسپ رہی۔ ابتدائی صفحات کی [illegible] ایم اے راحت کا زبردست شاہکار... دو شاطروں کی اپنے اپنے مفادات و مقاصد کی بساط پر چلی گئی [illegible] کاشف زبیر کا پہلا رنگ اکھاڑا بھی بہت زبردست رہا۔ شامی تیمور اور لوشی کی شرارتیں، حماقتیں، محبتیں اور نوک جھونک [illegible] سلیم فاروقی کا دوسرا رنگ آثار جنوں نے بھی بور نہیں کیا۔ قسمت نے ہر گام پر سرفراز کا ساتھ دیا۔ رمشی نے جو بویا [illegible] ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی فون کال بس گزارے لائق رہی۔ تین مقتول مختار آزاد نے ایک نہایت روح فرسا واقعہ قلم بند کیا۔ [illegible] کی انتہا پسندی۔ دانش انبھار کی چھٹی کا دن بھی خاصی دلچسپ رہی۔ سیرینا راش کی پُراثر و دلچسپ روداد شکست منطق بہت شاندار تحریر [illegible] کی منطقیں اور میری کی حاضر دماغی اور روگ کی پلاننگ سب کچھ لاجواب۔ مگر جرم جتنا بھی خوب صورت اور دلکش ہو، اس کا انجام [illegible] بھی لاجواب رہی۔ مریم کے خان کی شاندار کاوش عزت نفس مارچ کا تحفۂ خاص تھی۔"

ان کے [illegible] گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہوسکے۔

[illegible] محمد رضا شاہ، لودھراں۔ [illegible] میانوالی۔ ملک عاشق حسین ساجد، مظفر گڑھ۔ ساحل دعا بخاری، بصیر پور۔ شاہین تبسم، کراچی۔ [illegible] پشاور۔ صبا گل، مالاکنڈ ایجنسی۔ ایم احمد ہاشمی، بونیر۔ افشاں ذوالفقار، ضلع لیہ۔ اے ایم چودھری [illegible] مالاکنڈ۔ [illegible] گنگ۔ ہمایوں سعید راج، بنوں۔ ہمایوں یونس، لاہور۔ جعفر [illegible] چکوال۔ احسان سحر، میانوالی۔ رانا حبیب الرحمان، لاہور۔ حسنین عباس بلوچ، سرگودھا۔ مشاء نعیم، صوابی۔ محمد [illegible] بہاولپور۔ مظفر حسن، [illegible]۔ سردار اللہ دتہ، سردار ظفر اقبال وڑائچ، خانیوال۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔

# جنون

کاشف زبیر

جوش وجذبہ ہمیشہ کامرانی کا زینہ بنتا ہے۔ آدمی ہوش وحواس کے ساتھ برق رفتاری اختیار کرتا ہے لیکن یہی جوش جب حد سے بڑھ کر جنون کی سرحدوں میں داخل ہوجائے تو سارے نتیجے منفی ہوجاتے ہیں۔ انہیں بھی ایسے ہی جنون نے اپنے چُنگل میں جکڑلیا تھا۔ خون آشام شوق نے انہیں ایسی سرحدوں میں دھکیل دیا جہاں خون کے رشتے بھی شرماگئے۔ جرم کرنے والا صرف مجرم ہوکر رہ جاتا ہے وہ کسی کا باپ، بھائی یا بیٹا نہیں رہتا... یوں بھی ہوتا ہے کہ خون کے یہی رشتے مجرم کو کیفرِکردار تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرنے پر تُل جاتے ہیں مگر قانون کا اپنا کردار ہوتا ہے وہ کسی کو سزا دینے کا اختیار نہیں دیتا۔ مجرم کو انجام تک پہنچانے والے بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر مجرم بن جاتے ہیں۔

بوڑھا آدمی مہاگنی کی میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک پارسل رکھا تھا اور پارسل کے خاکی کاغذ پر سُتلی مضبوطی سے بندھی تھی۔ بوڑھا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے پیپر نائف اٹھا کر پہلے سُتلی کاٹی اور پھر خاکی کاغذ بھی کاٹ ڈالا۔ اندر سے سخت گتے کا ڈبا برآمد ہوا۔ اس نے ڈبے پر لپٹا ٹیپ بھی کاٹ دیا اور اسے کھولا۔ اندر ایک گلاس فوٹو فریم تھا اور اس فریم میں ہاتھ سے بنا ہوا ایک اسکیچ موجود تھا۔ بوڑھا ساکت ہو گیا اور اس کے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہوگئیں۔ کچھ دیر وہ ایسا ساکت رہا جیسے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہو۔ پھر وہ چونکا اور اس نے فون اٹھا کر کسی سے کہا۔ ”وکیل سے کال ملاؤ... جلدی۔“

☆☆☆

لیلیٰ رچرڈ تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ آج اسے دو جگہوں پر جانا تھا۔ ایک جگہ اسے کام تھا اور دوسری جگہ جانا اس کی مجبوری تھی۔ بس سے اتر کر وہ اس کثیرالمنزلہ عمارت کی طرف بڑھی جس میں اکثر تجارتی دفاتر تھے، وہ دوسرے فلور پر واقع ایک دفتر میں داخل ہوئی۔ چپڑاسی نے اس کی میٹنگ روم تک راہنمائی کی اور پھر اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ لیلیٰ نے اپنے بڑے سے بیگ سے ایک فائل فولڈر نکالا اور اسے سامنے میز پر رکھ لیا۔ پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور جلدی جلدی کش لینے لگی۔ وہ تقریباً پچیس چھبیس سال کی دل کش اور کسی قدر سفید فام نقوش کی حامل لڑکی تھی۔ بال سنہری مائل سرخ اور آنکھیں ہلکی نیلی تھیں لیکن رنگت میں ہلکی سی ملاحت تھی۔ اس نے اسکن فٹ جینز اور لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ چند لمحے بعد میٹنگ روم میں دو افراد داخل ہوئے، ان میں سے ایک معمر اور بالوں سے فارغ لیکن مضبوط

جسامت کا شخص تھا۔ دوسرا اپنے حلیے اور انداز سے کوئی بزنس ایگزیکٹو لگ رہا تھا۔

"شہاب علی۔" بزنس ایگزیکٹو نے معمر شخص کا تعارف کرایا۔ "تم سے یہ کام ان کے لیے لیا گیا ہے۔"

"کام ہو گیا ہے۔" لیلیٰ نے فائل فولڈر پر ہاتھ رکھا۔ "میرا معاوضہ... مسٹر نجیب...؟"

شہاب علی نے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ لیلیٰ نے لفافہ ذرا سا کھول کر اندر دیکھا اور فائل فولڈر شہاب علی کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے فولڈر کھولا اور اس میں موجود پرنٹ آؤٹس دیکھنے لگا۔ وہ مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ شخص ہمارے کام آئے گا؟"

"میں نہیں جانتی۔" لیلیٰ نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا اور کھڑی ہو گئی۔ "تم نے مجھ سے اس شخص کے بارے میں معلومات مانگی تھیں، وہ میں نے مہیا کر دیں۔"

اس نے لفافہ جیکٹ کی جیب میں ٹھونسا اور وہاں سے نکل آئی۔ اب اسے جس شخص کے پاس جانا تھا، اس کے پاس جانے کے خیال سے اسے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس جانا لیلیٰ کی مجبوری تھی۔ اسے کل ہی پتا چلا تھا کہ اس کا سابق گارجین انتقال کر گیا ہے اور اس کا نیا گارجین مقرر کیا گیا ہے۔

☆☆☆

خالد احمد کار سے اترا تو اسے کسی قدر دشواری پیش آئی۔ دشواری اس لیے کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ ائرپورٹ تک لانے والے پولیس افسر نے اس کے ہاتھ سے ہتھکڑیاں کھولیں اور اسے ائرپورٹ حکام کے حوالے کر کے رخصت ہو گیا۔ خالد احمد کا تمام سامان اس بیگ میں تھا جو اس کے پاس تھا۔ اسے بھرے گھر کے سامان سے بس یہی چیزیں اٹھانے کی مہلت ملی تھی۔ ائرپورٹ سیکیورٹی حکام اسے لاؤنج میں لے آئے جہاں سے وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے جا سکتا تھا۔ خالد احمد بیزاری کے عالم میں ایک سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا بیگ پاس رکھا تھا اور اس کے لیپ ٹاپ کا کیس اس کے شانے سے لٹک رہا تھا۔

صرف تین ہفتے پہلے وہ مڈل ایسٹ کے اس ملک میں ایک معزز صحافی تھا۔ اس کا نام اور ساکھ تھی۔ اس کے لکھے مضامین اور رپورٹس عرب ممالک میں لاکھوں افراد بہت غور سے پڑھتے تھے۔ لیکن صرف تین ہفتے میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس نے پہلی بار عرب دنیا میں سیاسی بیداری پر ایک مضمون لکھا اور اس مضمون نے سب تبدیل کر دیا۔ اسے عوام کو اکسانے، حکمرانوں کے خلاف بے بنیاد الزامات عائد کرنے اور مقامی اقتدار کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر ایک مقامی عدالت میں مقدمہ چلا اور اسے ملک سے نکل جانے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ اس پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوا تھا لیکن یہ مقامی عدالت کا استحقاق تھا کہ اگر وہ کسی غیر ملکی کو ملکی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھے تو اسے ملک سے نکال سکتی تھی اور آئندہ کے لیے ملک میں اس کے داخلے پر پابندی بھی لگا سکتی تھی۔ خالد احمد کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اخبار اور اس کے چینل کی انتظامیہ اس کی طرف دار تھی لیکن ملکی قانون کے سامنے بے بس تھی۔ خالد احمد کو حراست سے اب رہائی ملی تھی۔ اس لاؤنج میں وہ اپنی مرضی سے جانے کے لیے آزاد تھا، سوائے ائرپورٹ سے باہر جانے کے۔

"مسٹر خالد احمد۔" پاس سے آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک عبا پوش جوان مقامی شخص اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس سے ذرا پیچھے ایک معمر آدمی کھڑا تھا۔ اس نے آف وہائٹ سفاری سوٹ پہنا ہوا تھا۔ عبا پوش نے خالد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے احمد صبا الاشعر کہتے ہیں۔ یہ مسٹر شہاب علی ہیں۔" اس نے سفاری سوٹ والے کی طرف اشارہ کیا۔

خالد نے ہاتھ ملایا۔ "احمد صاحب! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

شہاب علی آگے آیا، اس نے خالد سے ہاتھ ملایا۔ "مسٹر خالد! آپ میرے کلائنٹ کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟"

خالد احمد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کا کلائنٹ؟"

"مسٹر جیکب مائر... وہ مائر فیملی کے سربراہ ہیں اور میں ان کا وکیل ہوں۔" شہاب علی نے تعارف کرایا۔

"جیکب مائر... مائر اولیو آئل اسٹیٹ کا مالک؟" خالد نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہی... مسٹر خالد۔"

"انہیں مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟"

شہاب علی نے خاص نظروں سے احمد صبا کی طرف دیکھا تو وہ فوراً ان سے دور چلا گیا۔ شہاب علی بولا۔ "مسٹر خالد! ہمیں معلوم ہے کہ آپ اس وقت مشکل وقت سے گزر رہے ہیں اور آپ کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، لبنان کا سفر آپ کے لیے بہت خوش گوار اور سود





مند رہے گا۔"

خالد نے پہلی بار اس معاملے میں دلچسپی محسوس کی۔ "سود مند سے کیا مراد ہے؟"

"اگر آپ فگرز میں سننا چاہتے ہیں تو ایک ملین امریکی ڈالرز۔"

☆☆☆

بیروت کا ہوائی اڈا جو اسرائیلی جارحیت کا شکار ہو کر تباہ ہو گیا تھا، اسے پھر سے تعمیر کر لیا گیا تھا۔ خالد اس سے پہلے بھی کئی بار لبنان آ چکا تھا۔ پہلی بار وہ اس وقت لبنان آیا تھا جب اسرائیلی جارحیت اور خلیج کی جنگ کے بعد بیروت امن کی راہ پر نظر آیا اور اس کی رونقیں بحال ہو رہی تھیں۔ اس کے اخبار کا ایک دفتر یہاں پر بھی تھا اس لیے بعد میں بھی آنا جانا لگا رہا۔ خالد احمد کا کیریئر صحیح معنوں میں یہیں سے شروع ہوا تھا۔ اس نے علاقے کی سیاست اور اس میں بین الاقوامی کردار پر کچھ ایسے مضامین لکھے جنہوں نے دھوم مچا دی۔ بنیادی طور پر خالد انگریزی میں صحافت کرتا تھا لیکن اس کے اخبار میں عربی ایڈیشن بھی چھپتا تھا اس لیے عرب قارئین کے لیے اس کا نام اجنبی نہیں رہا۔ چند سالوں میں خالد احمد نے اپنی شناخت ایک ایسے صحافی کے طور بنا لی تھی جس کے کالم کھرے اور بے باک ہوتے تھے، وہ نہ مغرب سے مرعوب ہوتا تھا اور نہ ہی مقامی انتہا پسندوں سے دبتا تھا۔ وہ جو بات سچ اور ٹھیک محسوس کرتا، اسے بیان کر دیتا تھا۔

خالد احمد کی عمر بیالیس سال تھی لیکن صحت مند، کسی قدر ہلکے جسم، بے داغ سرخی مائل سفید چہرے اور مناسب نقوش کی وجہ سے وہ تیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اس کے بال بھی کریو کٹ تھے جس سے کم عمری کا تاثر جھلکتا تھا۔ باقاعدگی سے جم جانے سے اس کا جسم مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ وہ مالی لحاظ سے زیادہ خوش حال نہیں تھا۔ اس کے اثاثوں میں سوائے ایک چھوٹے فلیٹ اور ایک گاڑی کے کچھ نہیں تھا۔ یہ دونوں چیزیں وہیں رہ گئی تھیں۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں ہمیشہ بس اتنی رقم ہوتی تھی جو ملازمت جانے کی صورت میں دو تین مہینے گزارے کے لیے کافی ہو۔ گزشتہ بیس سال میں اس نے جو کمایا تھا، اس کا زیادہ تر حصہ اس نے پاکستان میں موجود اپنے بھائی کو بھجوا دیا تھا۔ اس کا بھائی مجتبیٰ احمد اکاؤنٹنٹ تھا اور ایک [illegible] مناسب جاب پر تھا لیکن وہ بھائی کی مدد کے بغیر نہ تو [illegible] بنا سکتا تھا، نہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلا سکتا تھا۔

[illegible] کے باہر جیکب مائر کا ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔ شہاب علی اس کے ساتھ ہی آیا تھا لیکن وہ ائرپورٹ سے رخصت ہو گیا... اسٹر ماڈل کی یہ لنکن پرانی لیکن نہایت شاندار کار تھی۔ خالد اس کی صوفہ نما نشست پر آرام سے بیٹھا باہر گزرنے والے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اسرائیل کی بمباری کا اثر شمالی لبنان پر کم ہوا تھا۔ پھر بھی کہیں کہیں تباہ شدہ عمارتوں اور دوسری تعمیرات کا ملبا نظر آ رہا تھا۔ یہ زیادہ تر پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں ہر طرف انگور، زیتون اور دوسرے پھلوں کے باغات بکھرے ہوئے تھے۔ جہاں صنوبر اور شاہ بلوط کے درخت نمایاں تھے۔ پہاڑوں پر سیدھے تنے والے بلند قامت درخت تھے۔ خالد تصور کر سکتا تھا کہ بہار میں یہ جگہ کس قدر حسین نظر آ سکتی ہے۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر چھوٹے چھوٹے قصبات بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں عالی شان ولاز اور پیلس بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دور سے یہ کھلونا نما عمارتیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ سڑکوں کا نظام یہاں باقی لبنان سے کہیں بہتر تھا اس لیے سفر پُرسکون اور آرام دہ تھا۔ بیروت سے روانگی کے دو گھنٹے بعد وہ مائر اسٹیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ خالد نے اس کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن دیکھا پہلی بار تھا۔

چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جن پر زیتون کے باغات بکھرے ہوئے تھے اور ان پہاڑیوں کے گرد ایک تیز رفتار ندی یوں بل کھاتی ہوئی گزرتی تھی جیسے کسی بہت بڑے سانپ نے ناتراشیدہ زمرد اپنی کنڈلی میں جکڑ رکھے ہوں۔ ندی اتنی تیز رفتار تھی کہ اس میں کشتی چلانے یا تیراکی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ گھوم کر نشیب میں آنے کے بعد یہ ایک کھائی میں جھیل بناتی تھی اور پھر اس جھیل سے چھوٹے چھوٹے جھرنے نکل کر مزید نیچے نشیب کی طرف سفر کرتے تھے۔ جھیل اور ندی کے بل کھاتے کنارے کے درمیان ایک چھوٹا سا معلق راستہ تھا جس پر سڑک بنی تھی اور یہی معلق سڑک مائر اسٹیٹ میں داخل ہونے کا واحد راستہ تھا۔ معلق راستہ کوئی پانچ سو گز کا تھا اور اس سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ راستے کے دونوں جانب چیک پوسٹس تھیں۔ پہلی چیک پوسٹ کے گارڈ نے گاڑی اور ڈرائیور کو شناخت کرنے کے باوجود خالد کے بارے میں پوچھا۔

"یہ مسٹر جیکب کے مہمان ہیں۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "مسٹر خالد احمد۔"

"کاغذات دکھائیں۔" گارڈ نے اطلاع سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

خالد نے اسے اپنا پاسپورٹ پیش کیا۔ اس نے نام اور پھر خالد کی تصویر دیکھی اور مطمئن ہو کر بریکر ہٹانے کا اشارہ

کیا۔ کیبن میں بیٹھے گارڈ نے بٹن دبا کے مشینی بریکر کھول دیا۔ دوسری چیک پوسٹ پر بھی وہ اسی مرحلے سے گزرے۔ برقی آلات کی مدد سے کار کا معائنہ بھی ہوا کہ اس میں کوئی خطرناک چیز تو نہیں ہے۔ ان مراحل سے گزر کر کار دوبارہ پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ خالد نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا یہاں سیکیورٹی اسی طرح ہوتی ہے؟''

''جی جناب!'' ڈرائیور نے ادب سے کہا۔ ''یہ یہاں کی معمول کی سیکیورٹی ہے۔''

خالد نے دیکھا کہ اسٹیٹ کے آخری حصے میں تقریباً ہر پہاڑی پر ولا زیا کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ ان کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ زیتون کے درخت تھے۔ اسے زیتون کے علاوہ نہ تو کوئی درخت دکھائی دیا اور نہ ہی کھلی جگہ پر کوئی پودا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسٹیٹ کا ایک ایک مربع فٹ زیتون کے درختوں کے لیے مخصوص تھا۔ بالآخر کار ایک ولا کے راستے پر چڑھنے لگی۔ وہ پہاڑی کے سب سے اوپری حصے میں تھا۔ سفید اور سبز سنگِ مرمر سے بنا یہ ولا دیکھنے میں ہی بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ ڈرائیور نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ مسٹر جیکب کی رہائش گاہ ہے۔''

''خاندان کے باقی افراد الگ رہتے ہیں؟'' خالد نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جی جناب!'' ڈرائیور نے اس بار مختصر جواب دیا۔ کار پیلس کے پورچ میں رکی اور ایک باوردی بٹلر نے کار کا دروازہ کھولا۔ خالد نیچے اتر آیا۔ یہاں سردی کی شدت بیروت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی کیونکہ یہ زیادہ شمال اور زیادہ بلندی پر تھا۔ مائر اسٹیٹ جن پہاڑیوں پر تھی، ان کی اونچائی سطح سمندر سے ہزار میٹرز سے زیادہ تھی۔ خالد گرم اوور کوٹ میں ہونے کے باوجود ایک لمحے کو لرز اٹھا۔ اوور کوٹ اس نے ائرپورٹ کی ڈیوٹی فری شاپ سے لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لبنان میں ان دنوں شدید سردی ہے اور اس کے پاس کوئی گرم لباس نہیں تھا۔ بٹلر اسے ایک پرتعیش نشست گاہ میں لے آیا۔

''آپ یہاں تشریف رکھیں، میں مسٹر مائر کو آپ کی آمد سے مطلع کرتا ہوں۔'' بٹلر نے کہا اور چلا گیا۔ خالد نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک طرف آتش دان کے ساتھ دیوار پر تصویریں لگی تھیں۔ خالد نزدیک جا کر تصویریں دیکھنے لگا۔ مائر خاندان اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ کم سے کم جیکب مائر اس کا صورت آشنا تھا اگرچہ آمنے سامنے ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ اچانک عقب سے آواز آئی۔

''مسٹر خالد احمد!''

خالد نے مڑ کر دیکھا، جیکب مائر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس کے اندازے سے زیادہ معمر ثابت ہوا۔ اگرچہ اس کے چاندی جیسے بال اس کے سر کا مکمل احاطہ کیے ہوئے تھے اور چہرہ سرخی مائل تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بہت تیز تھی۔ عمر نے انہیں ذرا بھی نہیں دھندلایا تھا۔ اس کے باوجود خالد کا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم بھی اسی سال کا ہے۔ اس نے گرم جوشی سے خالد سے ہاتھ ملایا۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ جس کام کے لیے تمہیں زحمت دی گئی ہے، اس سے قطع نظر میں تمہارے کالمز کا گرم جوش مداح ہوں۔ تم اپنا نقطۂ نظر بہت اچھے اور مناسب انداز میں بیان کرتے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں ہوا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے تمہارے کیریئر پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔''

جیکب مائر انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ اس کا بٹلر اور ڈرائیور بھی انگریزی میں بات کرتے تھے۔ گویا اسٹیٹ میں انگریزی رائج تھی۔ فرانسیسی قبضے کی وجہ سے یہاں کی غیر ملکی زبان فرانسیسی تھی لیکن آزادی کے بعد یہاں امریکی اثر رسوخ بڑھا اور اسی مناسبت سے یہاں انگریزی نے بھی رواج پا لیا تھا۔ ویسے مقامی طور پر سب عربی بولتے تھے۔ مائر خاندان فرانسیسی نژاد تھا اور بڑی حد تک خالص ہی چلا آ رہا تھا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر مائر۔'' خالد نے عربی میں جواب دیا۔ ''آپ چاہیں تو مجھ سے عربی میں بات کر سکتے ہیں۔''

''یہ اور اچھی بات ہے۔'' جیکب نے بھی عربی میں ہی کہا اور اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس وقت چائے پیتا ہوں لیکن اگر تم پسند کرو تو کوئی دوسرا مشروب بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔''

''شکریہ... میں بھی چائے پسند کروں گا۔'' خالد نے مسکرا کر کہا۔ ''ہمیں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک ان کی دی ہوئی بہت سی عادتیں ہمارے معمولات میں شامل ہیں۔''

جیکب نے بٹلر کی طرف دیکھا تو وہ کمرے سے رخصت ہو گیا۔ اسٹڈی میں تین طرف چھت تک بنی الماریوں میں کئی ہزار کتابیں موجود تھیں اور جیکب جس طرف بیٹھا تھا، اس کے عقب میں دیوار کا بڑا سا حصہ شیشے پر مشتمل تھا۔ یہ کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی اسے گلاس وال کہا جا سکتا تھا۔ اس





سے دور مزید اونچی ہوتی پہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ منظر بہت خوب صورت تھا کیونکہ برف کی سفیدی اس پر حاوی تھی۔ خالد نے کہا۔ ''میں نے آپ کی اسٹیٹ کی تعریف سنی تھی لیکن اسے دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا ہے۔''

جیکب خوش ہو گیا۔ شاید یہ اس کا پسندیدہ موضوع تھا اس لیے وہ فوراً شروع ہو گیا۔ ''سلطنتِ عثمانیہ نے اس علاقے میں امن و امان قائم رکھنے اور مذہبی رواداری کو فروغ دینے کے سلسلے میں مائر خاندان کو یہ جاگیر بخشی تھی۔ شروع میں اس کا کل رقبہ تین مربع میل تھا لیکن بعد میں مختلف وقتوں میں اتنی ہی زمین ہم نے مزید حاصل کی۔ اب یہ اسٹیٹ چھ مربع میل رقبے پر محیط ہے۔ اس کے چار زون ہیں، ان میں سے تین زون اسی علاقے میں جونڈی کے احاطے میں ہے اور ایک زون اس سے باہر ہے۔ ہمارے آبا و اجداد نے بے پناہ محنت سے اس اونچی نیچی زمین کو زیتون کے بہترین باغات میں بدل دیا۔ خوش قسمتی سے یہ علاقہ زیتون کی کاشت کے لیے ویسے ہی مثالی ہے۔ رفتہ رفتہ ہم نے یہاں اپنی ایجاد کی ہوئی زیتون کی فصلیں اگائیں اور آج دنیا میں سب سے بہتر زیتون اس اسٹیٹ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس زمین پر زیتون کے پچیس لاکھ پودے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک پودا چنا ہوا ہے۔'' جیکب کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔ خالد حیران ہوا۔

''پچیس لاکھ پودے...! ان کی دیکھ بھال کیسے کی جاتی ہے؟''

''اس کام کے لیے یہاں ایک ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل تجربہ کار عملہ ہے۔ ان میں ہر فرد اپنی جگہ بہترین ہے۔ میں اپنے کارکنوں کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھتا ہوں۔''

اس دوران میں بٹلر چائے اور اس کے لوازمات لے آیا اور اس نے جیکب اور خالد کو ان کی پسند کے مطابق چائے بنا کر سرو کی۔ اس کے جانے کے بعد خالد نے پوچھا۔ ''مائر اسٹیٹ مکمل طور پر آپ کی ملکیت ہے؟''

''نہیں، یہ خاندان کی مشترکہ ملکیت ہے لیکن اسٹیٹ کی سربراہی میرے خاندان میں ہے۔ وصیت کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہی اسٹیٹ کا سربراہ بنتا ہے۔''

''اگر بڑے بیٹے کا سربراہ بننے سے پہلے انتقال ہو جائے تو؟''

''اس صورت میں اس سے چھوٹا بیٹا ہے اور اگر کسی سربراہ کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو تو اس سے چھوٹے بھائی کا بڑا بیٹا خاندان کا سربراہ بنتا ہے۔ وہی تمام امور کی دیکھ بھال کرتا ہے اور فیصلے کرتا ہے۔ ابھی تک سربراہی میرے خاندان میں ہے لیکن میرے بعد یہ چھوٹے بھائی کے بڑے بیٹے کو منتقل ہو جائے گی۔ نفع میں حصہ ایک مخصوص تناسب سے سب کو ملتا ہے۔ اس وقت بھی خاندان کے کوئی بیس بائیس کے قریب ممبرز یہاں اسٹیٹ میں موجود ہیں اور اتنے ہی یہاں سے باہر لبنان اور دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔''

خالد سوچ رہا تھا کہ بوڑھا اسے یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہا ہے۔ ویسے کوئی خاص بات اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی لیکن وہ واضح نہیں تھی۔ جیکب کی دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ ان میں سے ایک بھائی اور ایک بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ جیکب مائر کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی بلکہ اس کی سرے سے کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اس کے بعد خاندان کی سربراہی اس کے چھوٹے بھائی ہنری کے اکلوتے بیٹے رونن کو منتقل ہو جاتی۔ ہنری کا انتقال ہو چکا تھا۔ جیکب نے اچانک کہا۔ ''تم سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہیں یہ سب کیوں بتا رہا ہوں؟''

خالد چونکا پھر اس نے اعتراف کیا۔ ''آپ نے درست کہا، میں یہی سوچ رہا تھا۔''

''تم نے روتھی مائر کی گم شدگی کے کیس کے بارے میں سنا ہوگا؟''

جیکب کی زبان سے روتھی مائر کا ذکر سنتے ہی وہ بات جو یہاں آتے ہوئے مستقل خالد کے ذہن میں چبھ رہی تھی، سامنے آ گئی۔ یہ روتھی مائر کیس ہی تھا جس نے اولیو اسٹیٹ سے زیادہ مائر خاندان کو شہرت بخشی تھی۔ روتھی مائر کوئی تیس برس پہلے پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی اور پولیس کے خیال میں کسی نے اسے قتل کر کے لاش غائب کر دی تھی... کیونکہ اس کا کوئی سراغ سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ کیس اتنا مشہور ہوا کہ اس کی رپورٹنگ یورپ اور امریکا تک کی گئی۔ اس پر کتابیں لکھی گئیں اور کچھ ٹی وی پروگرام بھی نشر ہوئے۔ خالد نے ایک لبنانی صحافی کی کتاب دیکھی تھی۔ اس نے تمام حالات و واقعات کو اپنی کتاب میں بیان کیا تھا لیکن وہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

جیکب ذرا آگے جھکا۔ ''پولیس اور لوگوں کا خیال ہے کہ روتھی کو کسی نے قتل کر کے غائب کر دیا تھا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ روتھی غائب ہے لیکن اسے کسی نے قتل نہیں کیا ہے... وہ زندہ ہے۔''

''اس خیال کے پیچھے کوئی وجہ تو ہوگی؟''

جیکب نے سر ہلایا اور پھر اٹھ کر میز کی دراز سے ایک خاکی لفافہ نکالا جس میں کوئی چیز تھی پھر اس نے وہ چیز نکال کر خالد کے سامنے رکھ دی۔ یہ ایک چھ بائی آٹھ انچ کے پلاسٹک شیشے کے فریم میں ہاتھ سے بنا اسکیچ تھا جس میں زیتون کا درخت پنسل سے بنایا گیا تھا۔ کام میں صفائی اور مہارت تھی۔ خالد نے اس کا معائنہ کیا اور سوالیہ نظروں سے جیکب کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ”یہ مجھے ڈاک سے ملا ہے، میری سالگرہ کا تحفہ ہے۔ اسے الٹ کر دیکھو تو اسکیچ میں تمہیں میرا نام بھی لکھا نظر آئے گا۔“

واقعی اسکیچ میں جیکب کا نام عربی زبان میں لکھا تھا۔ جیکب نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”یہ ایک ایسی ہستی کی طرف سے بھیجا گیا ہے جسے میں نے آخری بار تیس برس پہلے دیکھا تھا۔“

خالد چونکا۔ ”آپ کا اشارہ روتھی کی طرف ہے جو تیس برس سے غائب ہے؟“

جیکب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ ٹھیک دو سال بعد اسی دن غائب ہوئی جب اس کا باپ ندی میں ڈوب گیا تھا۔“

”گم شدگی۔“ خالد نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق نہ تو کوئی لاش ملی اور نہ ہی کوئی ایسا سراغ ملا جس سے پتا چلے کہ وہ زندہ ہے؟“

جیکب نے سر ہلایا۔ ”پولیس نے برسوں اس کیس پر کام کیا ہے لیکن وہ روتھی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔“

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسکیچ روتھی نے بنایا اور بھیجا ہے؟“

”وہ مجھے ہر سال سالگرہ پر اسی طرح اسکیچ بنا کر تحفے میں دیتی تھی۔ پہلی بار اس وقت تحفے میں اسکیچ دیا جب وہ صرف بارہ سال کی تھی، اس کے بعد اپنی گم شدگی تک باقاعدگی سے میری ہر سالگرہ پر اسکیچ بنا کر مجھے تحفے میں دیتی رہی۔ وہ اپنی اٹھارویں سالگرہ سے ایک مہینے بعد غائب ہوئی تھی، اس دن اسکول میں اسناد تقسیم کی جا رہی تھیں اور مقامی گورنر اسناد دینے آیا تھا۔“

”ٹھیک ہے مگر کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسکیچز روتھی ہی بھیج رہی ہے؟“

”ایک منٹ کے لیے میرے ساتھ آؤ۔“ بوڑھا جیکب اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ اسے اسٹڈی کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا جس میں آتش دان کی دیوار پر ایسے کوئی تین درجن اسکیچز لگے تھے۔ ان کا سائز ایک ہی تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ زیتون کے درختوں کے مختلف اسکیچ تھے۔ سب میں اتنی مشابہت تھی کہ صاف لگتا تھا انہیں کسی ایک ہی شخص نے بنایا ہے۔ جیکب نے ایک خالی جگہ آنے والا اسکیچ بھی لگا دیا۔ جگہ پہلے سے طے شدہ تھی۔ ”یہ کل سینتیس اسکیچز ہیں۔ سات روتھی نے مجھے خود پیش کیے تھے اور باقی تیس مجھے ہر سال کوریئر سے ملے ہیں۔“

وہ واپس اسٹڈی میں آ گئے۔ ”پارسل کس پتے سے آتے ہیں؟“

”کوئی ایک جگہ نہیں ہے۔ مختلف ملکوں سے آتے ہیں اور کسی پر بھیجنے والے کا پتا نہیں ہوتا۔ تقریباً ہر پارسل ایک مختلف ملک سے آیا ہے... جیسے یہ ہانگ کانگ سے آیا ہے۔“

”آپ نے پولیس کو اس بارے میں بتایا ہے؟“

”بالکل... لیکن پولیس کا خیال ہے کہ کوئی میرے ساتھ بھونڈا مذاق کر رہا ہے۔ روتھی کا ان اسکیچز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”پولیس نے اس بارے میں کوئی تفتیش نہیں کی کہ آپ کو کون یہ اسکیچز بھیج رہا ہے؟“

”تفتیش تو کی ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ہر جگہ سے پارسل براہِ راست کوریئر آفس پہنچایا گیا اور دینے والے نے اپنا نام پتا کچھ نہیں دیا۔ مختلف جگہوں پر مختلف افراد پارسل دینے آئے جن کی شناخت صرف مرد یا عورت کے طور پر کی جا سکی ہے، اس سے آگے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

”آپ یا آپ کے خاندان نے روتھی کی تلاش اپنے طور پر کرنے کی کوشش کی ہوگی؟“

”کیوں نہیں کی... میں نے اٹلی کی ایک جاسوس فرم کی خدمات حاصل کیں اور وہ دو سال تک کام کرتی رہی لیکن وہ بھی ناکام رہی۔ پھر میں نے اخبارات میں اشتہار دیا۔ یہ اشتہار ہر سال روتھی کی گم شدگی کے دن دیا جاتا ہے، اس کی تصاویر اور دیگر کوائف کے ساتھ۔ انعام کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ اس سال یہ رقم بڑھ کر پانچ لاکھ امریکی ڈالرز تک پہنچ گئی ہے۔“

خالد حیران ہوا۔ ”پانچ لاکھ امریکی ڈالرز... یہ خاصی بڑی رقم ہے، اب تک کسی نے اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

جیکب پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”درجنوں لوگوں نے... لیکن وہ سب فراڈ نکلے۔ چند سال پہلے ایک شخص روتھی سے ملتی جلتی اور تقریباً اسی عمر کی نیم پاگل عورت کو لے آیا۔ میں بھی دھوکا کھا جاتا لیکن ڈی این اے ٹیسٹ نے حقیقت کھول دی۔“

”ایسا لگتا ہے آپ کو روتھی کے زندہ ہونے کا یقین





ہے؟“

اس سوال پر جیکب ہچکچایا۔ ”اگر مجھے باقاعدگی سے یہ اسکیچز نہ ملتے تو میں بھی دوسروں کی طرح یہی سمجھتا کہ روتھی اپنے باپ کی طرح ندی میں ڈوب کر مر گئی ہے۔“

”اس خیال کی وجہ؟“

”روتھی اسٹیٹ سے باہر جانے والے راستے سے نہیں گزری تھی۔ چیک پوسٹس سے بغیر چیکنگ کے کوئی نہیں گزر سکتا۔ وہ اکثر ندی کے اس مقام پر جاتی تھی جہاں اس کا باپ ڈوبا تھا، وہاں ڈھلان بہت خطرناک ہے۔ آدمی کا ذرا سا پاؤں پھسلا اور وہ ندی میں گیا۔ بہاؤ اتنا تیز ہے کہ ماہر تیراک بھی نہیں تیر سکتا۔“

خالد خاموش ہو گیا۔ چائے دوبارہ آئی اور اس بار جیکب نے خود چائے بنا کر خالد کو دی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم روتھی کی گم شدگی کا معما حل کرنے کی کوشش کرو۔“

”اتنے عرصے بعد آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟“

جیکب نے گہری سانس لی۔ ”میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں آدمی کسی وقت بھی موت سے ملاقات کر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے جان لوں کہ روتھی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ممکن ہے وہ زندہ ہو یا جو بھی صورتِ حال ہو میں اس حقیقت سے واقف ہونا چاہتا ہوں... اسی لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔“

”میں ہی کیوں؟“

”کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم ذہین آدمی ہو اور تحقیق کر سکتے ہو۔ میں نے تمہاری وہ رپورٹ دیکھی ہے جس میں تم نے مڈل ایسٹ میں قتل ہونے والے ایک فلسطینی لیڈر کے مرڈر کی تحقیق کی اور اس کا تعلق موساد سے ثابت کیا۔ بعد میں پولیس نے انہی خطوط پر تفتیش کر کے اپنی رپورٹ تیار کی تھی.... درحقیقت انہوں نے تمہارا کام استعمال کیا تھا۔“

”وہ الگ بات تھی۔ تفتیش کے بغیر بھی ساری دنیا جانتی تھی کہ لیڈر کے قتل میں اسرائیل ملوث ہے۔“

”وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی تم حقائق کو بہت اچھی طرح اور مدلل انداز میں سامنے لائے۔ تمہارا تخیل بہت اچھا ہے۔ تم اپنے ذہن میں کسی واقعے کو جانچنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اس لیے مجھے امید ہے تم روتھی کی گم شدگی کا معما بھی حل کر لو گے۔“ جیکب کے لہجے میں اصرار تھا۔

خالد سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”بات بہت پرانی ہو گئی ہے۔ اب لوگوں سے اس معاملے میں شاید مدد نہ مل سکے گویا اگر میں کوشش کرتا ہوں تو مجھے صرف ریکارڈ پر گزارہ کرنا ہوگا۔“

”تقریباً ایسا ہی ہے۔ البتہ اس کیس کا تفتیشی انچارج زید الکافی اب یہاں کا پولیس چیف ہے۔ اس وقت وہ نیا نیا پولیس آفیسر بنا تھا۔ اس سے بھی مدد مل سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے مسٹر مائر... میں اس بارے میں غور کروں گا۔“

جیکب نے سر ہلایا۔ ”اگر تم یہ ذمے داری قبول کرتے ہو تو تمام اخراجات اور تمہاری فیس بھی ادا کی جائے گی۔ اس کے علاوہ کامیابی کی صورت میں ایک ملین امریکن ڈالرز کا انعام ہے۔“

ایک ملین ڈالرز خاصی بڑی رقم تھی اور خالد ضرورت مند تھا۔ یہ رقم اسے سالوں کے لیے فکرِ معاش سے آزاد کر سکتی تھی۔ وہ مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے اسے فکرِ معاش سے آزادی درکار تھی۔ جیکب مائر کی پیش کش پُرکشش تھی پھر بھی وہ اس معاملے پر سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ جیکب اسے غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔

”تم آرام سے جواب دے سکتے ہو۔ جب تک دل چاہے یہاں قیام کرو۔ میں نے کہا نا، اس معاملے سے قطع نظر میں تمہارا مداح بھی ہوں اور تمہاری میزبانی کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ تم مشکل وقت دیکھ کر آ رہے ہو اور تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔“

”میں شکر گزار ہوں۔“

جیکب کھڑا ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے تم آرام کرو گے۔ تم سے رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔“

بٹلر نے خالد کو ایک پُرتعیش کمرے میں پہنچایا جو مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ خالد نے اپنا سامان رکھا اور لیپ ٹاپ کھول کر انٹرنیٹ کنکشن چیک کیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہاں کوئی وائرلیس روٹر موجود تھا جو وائی فائی کی مدد سے انٹرنیٹ کنکشن دے رہا تھا۔

☆☆☆

لیلیٰ دفتر میں داخل ہوئی تو اندر موجود ابھری آنکھوں والے اس ادھیڑ عمر شخص نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرانے لگا۔ ”لیلیٰ! تم بہت تاخیر سے آئیں، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی حسین نکلو گی۔“

آدمی کا نام ماجد مائیکل تھا۔ عرفِ عام میں ایم ایم کہلانے والا یہ شخص لبنان کے جانے پہچانے سیاست دانوں اور سماجی لیڈروں میں شامل تھا۔ ہر سیاست داں اور سماجی

لیزر کی طرح اس کے بارے میں بھی بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ لیکن کبھی ان کہانیوں کو ثابت نہیں کیا جا سکا تھا۔ ایک بار وزیر بھی رہ چکا تھا۔ لیلیٰ خاموش کھڑی رہی تو اس نے اشارہ کیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ تم جانتی ہو، اب میں تمہارا گارجین ہوں۔''

وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور سرد لہجے میں بولی۔ ''تمہیں کس نے میرا گارجین مقرر کیا ہے؟''

''تمہارے پچھلے گارجین نے۔ اسے معلوم تھا کہ جلد کینسر اس کی جان لے لے گا۔ اسے تمہاری فکر تھی۔''

لیلیٰ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے سابق گارجین کو اس کی کتنی فکر تھی۔ یہ سال خوردہ گدھوں کا ٹولہ تھا جو اس کی دولت اور جوانی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اگر لیلیٰ ان کی بات مان جاتی تو اسے فکرِ معاش کے لیے یوں جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔ بہرحال، وہ اس زندگی سے زیادہ ناخوش نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ ایک ایسے ادارے کی تحویل میں رہی جہاں اسے عمارت سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہیں سے اس نے ہائی اسکول پاس کیا تھا اور پھر اسے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن یہ اجازت مشروط تھی۔ اس کا ایک گارجین تھا جو اس کی دولت کا نگران تھا۔ اس کا باپ گیری رچرڈ اس کے لیے بہت دولت چھوڑ گیا تھا لیکن وہ اس میں سے ایک ڈالر بھی اپنی مرضی سے خرچ کرنے کی مجاز نہیں تھی۔

لیلیٰ نے سگریٹ سلگایا اور ماجد سے پوچھا۔

''پینٹ ہاؤس میں اب تم رہتے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''نہیں۔۔۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، تم چاہو تو وہاں رہ سکتی ہو لیکن۔۔۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

لیلیٰ جانتی تھی کہ اس ''لیکن'' کے آگے کیا ہے۔ وہ اپنا بیگ سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ عقب سے ماجد نے پکار کر کہا۔ ''تمہیں جب رقم یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم یہاں آ سکتی ہو۔''

لیلیٰ کوئی جواب دیے بنا باہر نکل آئی۔

☆☆☆

خالد کو خلافِ توقع رات بہت اچھی اور گہری نیند آئی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ اور جیکب کافی کی میز پر شطرنج کھیلتے رہے۔ جیکب ماہر تھا لیکن خالد نے اسے آسانی سے جیتنے نہیں دیا۔ وہ حیران تھا۔ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود خالد شطرنج کی چالوں کو سمجھ جاتا تھا۔ اس نے خالد کو مشورہ دیا کہ وہ باقاعدگی سے اس کھیل کی طرف توجہ دے۔ ناشتا خالد نے اپنے کمرے میں کیا اور پھر اوورکوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔ آسمان پر سفید بادل تھے اور ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ برف باری کا امکان نہیں تھا۔ وہ لان میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ جیکب۔۔۔ بھی آ گیا۔ وہ گرم کپڑوں میں ملبوس تھا۔ وہ خالد کو دیکھ کر خوش ہوا۔ ''واک ہو رہی ہے؟''

''ہاں، میں کوشش کرتا ہوں کھانے کے بعد چلتا پھرتا رہوں۔''

''صحت کا اولین اصول۔'' جیکب نے سر ہلایا۔ ''میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں۔ اگر تمہارا موڈ ہے تو تمہیں اسٹیٹ کے رہائشی حصے کی سیر کراتا ہوں۔''

خالد اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ ولا والی پہاڑی سے نیچے آئے۔ جیکب نے سامنے والی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر نظر آنے والی عمارت روتھی کے باپ ہنری کی ملکیت ہے۔ اب یہاں اس کا بیٹا رونن رہتا ہے۔ اس کے برابر والی پہاڑی کی عمارت میری بہن مارین کی ملکیت تھی، اب یہاں اس کی اکلوتی بیٹی نتاشا رہتی ہے۔ اس سے پچھلی والی پہاڑی پر اس سے چھوٹی بہن ریتا کا گھر ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، وہ اکیلی رہتی ہے۔''

وہ پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ ذرا آگے آ کر جیکب نے ایک نسبتاً چھوٹی پہاڑی پر بنے لکڑی کے سفید رنگ کے دو منزلہ کاٹیج کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرے دوسرے بھائی جوزف کی قیام گاہ ہے۔ اس کے تین بچے ہیں لیکن وہ سب اسٹیٹ سے باہر رہتے ہیں۔''

آس پاس کی دوسری پہاڑیوں پر جیکب کے دوسرے رشتے دار آباد تھے۔ یہاں کل ملا کر ایک درجن کے قریب ولاز اور مکانات تھے۔ وہ اتنا آگے آ گئے تھے کہ خالد نے محسوس کیا کہ جیکب تھکنے لگا ہے۔ ''میرا خیال ہے آپ تھک گئے ہیں۔''

''نہیں، میں ابھی نہیں تھکا ہوں۔'' جیکب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ایک خاص جگہ دکھانا چاہتا ہوں۔''

خالد خاموش ہو گیا۔ وہ چلتے رہے۔ جب وہ کسی جگہ کے پاس سے گزرتے تو جیکب اس جگہ کے بارے میں بتاتا۔ اس کی سانسوں کی رفتار بڑھ رہی تھی لیکن وہ رکا نہیں۔ بالآخر ایک چھوٹی سی ترچھی پہاڑی کے پاس رکا اور تیز سانسوں کے درمیان بولا۔ ''وہ اوپر۔۔۔ بنا ہوا لکڑی کا۔۔۔ ہٹ دیکھ رہے ہو۔۔۔ وہ ہنری کی ملکیت تھا۔۔۔ جوانی میں وہ بہت سا۔۔۔ وقت یہیں گزارتا تھا۔۔۔ اس پہاڑی کے دوسری طرف۔۔۔ ندی کا وہ حصہ ہے جس میں۔۔۔ ڈوبنے سے اس کی جان گئی تھی۔''

''ہنری کی موت حادثاتی تھی؟''

''سو فیصد۔'' جیکب نے زور دے کر کہا۔ ''اس طرف سوائے اس کے کوئی اور نہیں جاتا تھا۔ اور جس وقت وہ ندی میں گرا اس نے شراب پی رکھی تھی۔ الکوحل معمول سے پانچ گنا زیادہ مقدار میں اس کے خون میں شامل تھی۔''

''ہنری اپنا گھر چھوڑ کر زیادہ تر یہاں رہتا تھا تو اس جگہ کی کیا اہمیت ہوئی؟''

''میں نہیں جانتا لیکن ہنری کے مرنے اور رونن کے یہاں سے جانے کے بعد یہ جگہ ویران ہو گئی یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ البتہ ایک بار میں نے روتھی کو اس ہٹ سے نکلتے دیکھا تھا۔''

''رونن کہاں گیا تھا؟''

جیکب اس کا جواب دیتے ہوئے ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم لیکن وہ فرانس گیا تھا اس نے اینا ٹومی کا کورس بھی وہیں سے کیا تھا۔''

''روتھی یہاں کیا کر رہی تھی اور یہ اس کے غائب ہونے سے کتنے دن پہلے کی بات تھی؟''

''میں نے پوچھا نہیں اور اس نے بتایا بھی نہیں۔ اور یہ شاید ایک مہینے پہلے کی بات تھی۔ میں یہ سب باتیں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر تم یہ معما حل کرنے پر راضی ہو گئے تو بہت ساری چیزیں پہلے سے تمہارے علم میں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ اٹھا کر گھڑی دیکھی اور مڑا تو عقب سے ایک چھوٹی کار چلی آ رہی تھی، یہ گالف کورس میں استعمال ہونے والی گاڑی تھی جو چھوٹے فاصلوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اس نے روانگی سے پہلے اپنے بٹلر کو گاڑی لانے کا کہہ دیا تھا۔ بٹلر نے گاڑی پاس آ کر روکی اور جیکب اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا، اس نے خالد سے پوچھا۔ ''تم چلو گے؟''

''نہیں، میں اسی طرح پیدل چلنا پسند کروں گا۔''

جیکب نے سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

لیلیٰ محو قدموں سے جا رہی تھی کہ اس کی نظر فٹ پاتھ [illegible] اخبار [illegible]۔ وہ ایک جھٹکے سے رک [illegible] لے کر اخبار خریدا [illegible] آگے بڑھ [illegible] منٹ بعد وہ اس عمارت میں داخل ہوئی جس کے پانچ فلور تھے اور آخری فلور پر اس کا فلیٹ تھا۔ لفٹ نہیں تھی، وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ یہ ایک بڑے سے کمرے کا فلیٹ تھا جس میں ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک بڑی سی میز پر کمپیوٹر کے مختلف آلات رکھے تھے اور اس کے سامنے دیوار پر روتھی مائر کی ایک بڑی تصویر پن کی ہوئی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر روتھی کی تصویر دیکھتی رہی پھر اس نے اخبار میز پر پھینکا اور بیگ سے لیپ ٹاپ نکال کر اس میں انٹرنیٹ وائر لگایا۔ سسٹم آن کر کے اس نے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ چند لمحے بعد اسکرین پر اسی شخص کی تصویر ابھری جس کی تصویر اخبار میں دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔ تصویر کے ساتھ ہیڈ لائن بھی تھی۔

''مڈل ایسٹ کا معتوب صحافی لبنان پہنچ گیا۔ وہ مائر فیملی کے سربراہ جیکب مائر کا مہمان ہے۔''

لیلیٰ نے اخبار اٹھا کر دیکھا۔ رپورٹر نے یہاں بھی مختصر خبر دی تھی کہ خالد احمد اچانک بیروت پہنچا اور یہاں سے وہ مائر اسٹیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی آمد پُراسرار تھی خاص بات یہ تھی کہ اسی پرواز سے جیکب مائر کا وکیل شہاب علی بھی واپس آیا تھا۔ لیلیٰ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے اخبار اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور لیپ ٹاپ پر جھک گئی۔ اب وہ ماجد مائیکل کے بارے میں انٹرنیٹ پر موجود مواد کھنگال رہی تھی۔ جلد اسے معلوم ہو گیا کہ ماجد ایک بڑی امپورٹ ایکسپورٹ فرم میں شراکت دار تھا۔ یہ فرم بحیرۂ روم کے ممالک کے درمیان تجارت کرتی تھی۔ اس کی تجارت تین براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی۔ فرم کا دفتر قبرص میں تھا اور یہ لبنان میں بھی رجسٹرڈ تھی۔ کام کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر روتھی کی تصویر پر گئی اور وہ رک گئی۔۔۔۔ تصویر اخبار سے کاٹی ہوئی تھی اور اس کے نیچے پانچ لاکھ امریکی ڈالرز کے انعام کا اعلان بھی تھا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان تھی جیسے وہ چیلنج کر رہی ہو کہ یہ معما حل کر کے دکھاؤ۔ وہ چند لمحے تصویر کو گھورتی رہی اور پھر شانے جھٹک کر دوبارہ لیپ ٹاپ پر جھک گئی۔

☆☆☆

جیکب مائر خوش تھا۔ اس نے خالد سے کہا۔ ''تو تم اس کام کے لیے آمادہ ہو۔ مجھے یہی امید تھی۔''

خالد نے سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے کام کے لیے کوئی الگ جگہ چاہیے۔ بے شک چھوٹی ہو اور زیادہ سہولتیں نہ ہوں لیکن وہاں کوئی میرے کام میں مداخلت نہ کرے۔''

''ایک ایسی جگہ ہے اور اسٹیٹ میں ہی ہے۔ وہاں کوئی نہیں جاتا ہے۔ تمہارے کام کے لحاظ سے بہت موزوں ہے۔ تم دیکھو گے تو یقیناً پسند کرو گے۔''

ایک گھنٹے بعد جیکب اسے اسٹیٹ کے بیرونی حصے میں لایا جہاں اسٹیٹ کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور یہ جیکب کی ملکیت تھا۔ اس سے آگے خودرو جنگل تھا اور یہاں شکار بھی ملتا تھا۔ خاص طور سے خرگوش اور ایک خاص نسل کے ہرن کا شکار ہوتا تھا۔ یہ سفیدے اور شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان لکڑی سے بنا ہوا چھوٹا سا کیبن تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی عام آدمی نے خود بنایا ہے۔ تعمیر میں صفائی نہیں تھی۔ خالد کا اندازہ درست نکلا۔ جب جیکب نے کیبن کے دروازے کا تالا کھولا اور اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ ”جوانی کے دنوں میں میں نے اسے خود بنایا تھا پھر جب تک عمر نے اجازت دی، میں یہاں آتا رہا۔“

کیبن بڑا اور ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا۔ البتہ بیڈروم کو کارڈبورڈ کی دیوار سے باقی کیبن سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی باتھ روم تھا۔ کیبن میں ایک صوفہ سیٹ اور اس کے ساتھ ہی بڑی سی میز تھی جو کام کے لیے بہترین تھی۔ دیواروں کے ساتھ کئی الماریاں بنی ہوئی تھیں جن کے شیلف فی الحال خالی تھے۔ خالد کو یہ جگہ پہلی نظر میں پسند آگئی۔ تحقیقی اور علمی کاموں کے لیے ایسی ہی جگہ مناسب ہوتی ہے۔

”تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کھانے پینے کا انتظام میرے پاس سے بھی ہوسکتا ہے۔“

”یہی مناسب رہے گا۔“ خالد نے کہا۔ ”میں آج ہی یہاں منتقل ہو جاتا ہوں لیکن پہلے مجھے کچھ خریداری کرنا ہو گی۔ مجھے آنے جانے کے لیے کوئی سواری مل سکتی ہے؟ میرے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس ہے۔“

”تم آرام سے کام کرو، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ جیکب نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”میرے پاس کئی کاریں ہیں لیکن بہتر ہوگا، تم کرائے پر گاڑی لے لو۔ یہ بھی اخراجات میں شامل ہوگی۔“

”یہ زیادہ بہتر رہے گا۔“

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ خالد نے اچانک پوچھا۔ ”اگر روتھی کو قتل کیا جاچکا ہے تو آپ کے خیال میں اس کا قاتل کون ہوسکتا ہے؟“

”خاندان کا کوئی فرد۔“ جیکب نے بلا جھجک کہا۔ ”کیونکہ جس وقت وہ غائب ہوئی، یہاں کوئی غیر متعلقہ فرد نہیں تھا۔“

”آپ کو کسی پر شک ہے؟“

”کسی پر نہیں ہے...“ جیکب نے اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس کا ڈرائیور دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اندر بیٹھنے سے پہلے جیکب نے خالد کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے بولا۔ ”سب پر ہے۔“

خالد خاموش کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

لیلیٰ نے کتابوں اور رسائل کا ایک ڈھیر میز پر رکھا ہوا تھا۔ یہ سب کتابیں روتھی مائر کے بارے میں تھیں۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اس کے خیال میں اس کی جیب میں کہیں کچھ رقم ہوگی لیکن اس کے ہاتھ صرف چند سکے آئے۔ اس نے چند دن پہلے جو رقم کمائی تھی، وہ خرچ ہو چکی تھی۔ اب اس کے پاس بس اتنی رقم تھی جس سے رات کا کھانا کھا سکتی۔ اس پر اکثر ایسی نوبت آجاتی تھی اور زندگی کی بے شمار راتیں اس نے بھوک سے کروٹیں لیتے ہوئے گزاری تھیں۔ اس نے سکے واپس جیب میں ڈال لیے اور کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ کتابیں اور رسائل دیکھتی رہی۔ ایک لفافے میں بے شمار اخباری تراشے تھے۔ کئی گھنٹے بعد اس نے انگڑائی لی اور سر کرسی کی پشت سے لگالیا۔

اچانک اسے خالد کا خیال آیا۔ وہ مائر اسٹیٹ کیوں آیا تھا؟ اسٹیٹ کے سربراہ جیکب مائر کا وکیل شہاب علی اس میں کیوں دلچسپی لے رہا تھا؟ اور اس نے خالد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ کیا جیکب مائر خالد سے روتھی مائر کی گم شدگی کے بارے میں کوئی کام لینا چاہتا تھا؟ یہ خیال آتے ہی وہ سیدھی ہوگئی۔ چند لمحے بعد اسے لگنے لگا کہ یہی بات ہوسکتی ہے۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا۔ اس نے مخصوص چیٹ سافٹ ویئر پر خالد احمد کو نام سے تلاش کیا اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا نام آگیا تھا۔ یعنی وہ بھی میک بک ہی استعمال کرتا تھا۔ اس نے خالد کو پیغام بھیجا کہ وہ اسے ایڈ کرلے تاکہ وہ اس سے چیٹ کر سکے۔ خالد اس وقت آف لائن تھا، وہ آن لائن ہوتا تو اسے یہ پیغام مل جاتا۔ اس نے نوٹ بک بند کر دی اور اب اسے پھر سے رقم کا خیال ستانے لگا... اور رقم فی الحال ایک ہی جگہ سے مل سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ماجد مائیکل کی طرف سے رقم کس شرط پر ملے گی اور وہ کسی صورت اس کی یہ شرط ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے کوئی دوسرا ذریعہ ہی تلاش کرنا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا۔ اس نے ماجد مائیکل کی زندگی کے خفیہ گوشوں کے بارے میں تحقیق نہیں کی ہے۔

☆☆☆



خالد ایک پرانی کرسلر کار سے اترا۔ پرانی ہونے کے باوجود یہ بہت اچھی کنڈیشن میں تھی اور اسے ایک ہفتے کے لیے مناسب کرائے پر مل گئی تھی۔ وہ کچھ خریداری کر کے آیا تھا۔ اسے یہاں کے موسم کی مناسبت سے کپڑوں اور بعض دوسری چیزوں کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس رقم تھی پھر بھی جیکب نے اسے پیشگی رقم دے دی تھی۔ اندر آکر اس نے سامان رکھا اور سب سے پہلے بھٹی میں مزید لکڑی ڈالی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے الیکٹرک کیتل میں کافی کے لیے پانی گرم ہونے رکھ دیا۔ اس نے چیزیں ترتیب دے لی تھیں۔ میز پر لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر سے متعلق دوسرے آلات سیٹ کرلیے تھے۔ اچانک کیبن کا دروازہ کھلا اور جیکب مائر اندر آیا۔ اس نے کیبن کا معائنہ کیا اور سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے کہ تم کام کے لیے تیار ہوگئے ہو۔ میں تمہاری مدد کے لیے کچھ چیزیں لے آیا ہوں۔“

جیکب مائر کے عقب میں اس کے آدمی بڑے بڑے کارٹن اٹھا کر لا رہے تھے۔ انہوں نے کارٹن سلیقے سے ایک طرف لگانا شروع کر دیے۔ خالد نے کافی بنا کر جیکب مائر کو بھی دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”ان کارٹن میں روتھی مائر کیس سے متعلق ہر ممکن دستاویز موجود ہیں۔ ایک کارٹن میں اخباری تراشے ہیں۔“

”مجھے زیدالکافی کی مدد بھی چاہیے۔“

”تم اس سے اس کے دفتر میں مل سکتے ہو۔ میرا حوالہ دو گے تو وہ تم سے تعاون کرے گا۔ ویسے وہ بہت ذہین اور فرض شناس پولیس افسر ہے۔“

جیکب مائر نے کافی کا خالی مگ میز پر رکھا اور اپنے آدمیوں سمیت رخصت ہوگیا۔ خالد دوبارہ سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس میں سے گرم کپڑے نکال کر الماری کے ایک خانے میں رکھے اور دوسرے خانے میں ضرورت کا دوسرا سامان رکھا۔ وہ لنچ لے آیا تھا اور یہاں کھانا گرم کرنے کے لیے ایک مائکروویو اوون بھی تھا۔ مگر لنچ سے پہلے وہ غسل کرنا چاہتا تھا اور اس سے پہلے اس نے اپنی میل چیک کر لینا مناسب سمجھا۔ خاصی تعداد میں ای میل آئی ہوئی تھیں۔ اس نے سرسری نظر سے دیکھا پھر میک بک کا چیٹ سافٹ ویئر [illegible] تو اسے کسی لڑکی ...... کی جانب سے پیغام ملا۔ وہ [illegible] تھی کہ خالد اسے ایڈ کرلے۔ خالد نے اس کی پروفائل [illegible] تو اس میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ اسے اکثر [illegible] آتی رہتی تھیں اور وہ ان کو مسترد کر دیتا تھا۔ ان آئی ڈیز کے ساتھ معلومات بھی نہیں تھیں۔ وہ انکار کرنے جا رہا تھا کہ اسے خیال آیا اور اس نے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

جواب بھیج کر وہ روتھی مائر کیس کی تحقیقات کی طرف متوجہ ہوا۔ اس میں پولیس رپورٹ جامع تھی۔ روتھی مائر اٹھارہ سال کی عمر میں عین اس دن غائب ہوئی جب اس کے اسکول میں ہائی اسکول پاس کرنے والے طلبہ کو اسناد دی جا رہی تھیں۔ طلبہ کے مشترکہ گروپ میں اس کی تصویر موجود تھی۔ یہ تصویر صبح نو بجے کے قریب لی گئی تھی۔ ساڑھے نو بجے روتھی واپس اسٹیٹ آئی اور آخری بار اسے اس کے باپ کے گھر میں دیکھا گیا۔ اس کے بعد کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلی گئی۔ شام چار بجے جیکب مائر کی طرف سے پولیس کو روتھی کی گم شدگی کی اطلاع دی گئی۔ پولیس نے اسٹیٹ اور آس پاس کے سارے علاقے کو چھان مارا۔ ندی اور جھیل میں بھی دیکھ لیا گیا... اگر روتھی ندی میں گری تھی تو اس کی لاش یقیناً جھیل سے آگے کسی ندی میں بہہ گئی تھی لیکن پولیس کو کہیں سے بھی کسی نوجوان لڑکی کی لاش ملنے کی اطلاع نہیں ملی۔

روتھی مائر نرم مزاج، ہنس مکھ لڑکی تھی۔ جیکب مائر اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ بھی باپ کی نسبت اپنے تایا کے زیادہ نزدیک تھی۔ نتاشا سے بھی روتھی قریب تھی لیکن یہ قربت اتنی نہیں تھی کہ نتاشا اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرسکتی۔ ویسے بھی جب روتھی غائب ہوئی تو نتاشا صرف آٹھ برس کی تھی۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ وہ بالکل نہیں جانتی کہ روتھی کب اور کیسے غائب ہوگئی۔ نہ ہی وہ اس امر سے واقف تھی کہ روتھی کے ساتھ کیا گزری تھی۔ ہنری کا اس واقعے سے دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور روتھی کا بھائی رونن باپ کے مرنے کے بعد فرانس چلا گیا تھا۔ گم شدگی والے دن روتھی کے اسکول میں اسناد کی تقسیم ہو رہی تھی اور گورنر مہمانِ خصوصی تھا۔ پولیس نے اس موقع کی تصاویر حاصل کی تھیں۔ یہ سرکاری فوٹوگرافر کی لی ہوئی تصاویر تھیں۔ ان میں روتھی اپنے ساتھیوں کے درمیان موجود تھی۔ اگلی تصویر میں وہ سامنے دائیں طرف دیکھ رہی تھی اور پھر اس سے اگلی تصویر میں وہ گروپ سے نکل کر جاتے ہوئے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ تصاویر پولیس رپورٹ کے ساتھ موجود تھیں۔ اسٹیٹ کے چیک پوسٹ نگرانوں کے مطابق روتھی واپس آئی تھی۔ وہ نو بج کر پینتیس منٹ پر اسٹیٹ میں داخل ہوئی تھی۔

روتھی کے سامان میں سے کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ اس کے کپڑے اور تمام ذاتی سامان موجود تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دستاویزات تک موجود تھیں۔ صرف وہی اسکول کا لباس نہیں

تھا جو اس نے اس وقت پہن رکھا تھا۔ خالد نے پولیس رپورٹ کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا اور اس نے محسوس کیا کہ اسے اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ وہ سوچنے لگا کہ آغاز کہاں سے کرے؟ انسانوں سے یا اس مواد سے جو جیکب مائر نے لاکر دیا تھا۔ شاید اسے دونوں سے آغاز کرنا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ جیکب مائر نے اسے کیس پر اس وقت تک کام کرنے کو کہا تھا جب تک وہ اسے حل نہیں کر لیتا یا ناکامی تسلیم نہ کر لیتا۔ وہ کارٹن سے دستاویزات نکال کر شیلف میں رکھ رہا تھا کہ لیپ ٹاپ سے میسنجر کی مخصوص بیپ سنائی۔ اس کے لیے پیغام آیا تھا۔ اس نے دیکھا یہ اسی لڑکی ..... کا پیغام تھا۔ اس نے خالد کے سوال کے جواب میں لکھا تھا۔

”میں بھی تمہاری طرح ہوں۔“

خالد نے پوچھا۔ ”تم صحافی ہو؟“

اس کا فوری جواب آیا۔ ”ہاں لیکن تمہاری جیسی نہیں ہوں۔ میں معلومات چرا لیتی ہوں۔“

”تم ہیکر ہو؟“

”صحافی بھی تو یہی کرتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”تم مجھے ایڈ کرلو۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”ابھی تو اتنا چاہتی ہوں کہ تم مجھے ایڈ کرلو۔“

خالد نے سوچا اور پھر اسے اپنے پاس ایڈ کر کے میسنجر بند کر دیا اور دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

لیلیٰ خوش تھی۔ اس نے اپنی میک بک بند کر دی۔ اب وہ جان سکتی تھی کہ خالد یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ ویسے اسے کسی حد تک یقین تھا کہ خالد یہاں روتھی مائر کیس کے سلسلے میں ہی آیا تھا۔ جیکب مائر کو کسی باہر کے آدمی سے ایک ہی کام ہو سکتا تھا۔ وہ اسی کام کے لیے گزشتہ کئی برسوں سے بے شمار لوگوں سے رابطہ کر چکا تھا اور اسے ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیلیٰ پچھلے ایک سال سے روتھی مائر کیس کے بارے میں سوچ رہی تھی اور معلومات جمع کر رہی تھی۔ اب روتھی مائر کی پُراسرار گم شدگی سے پردہ اٹھانے یا اس کے انجام کے بارے میں بتانے کا انعام پانچ لاکھ امریکی ڈالرز تک پہنچ گیا تھا۔ لیلیٰ کے لیے پانچ لاکھ ڈالرز بہت بڑی رقم تھی۔ اس کی مدد سے وہ عدالت میں کوئی اچھا وکیل کر کے گارجین سے نجات حاصل کر کے اپنی دولت اور جائداد حاصل کر سکتی تھی۔

اچانک اسے خیال آیا۔ اس کے پاس رقم بالکل نہیں رہی اور اسے رقم کی اشد ضرورت تھی تاکہ وہ روتھی مائر کیس پر کام جاری رکھ سکے۔ اس نے ماجد کے بارے میں کچھ چیزیں حاصل کی تھیں اور یہ خاصی دلچسپ تھیں۔ اسے امید تھی کہ جب ماجد انہیں دیکھے گا تو اس کا مطالبہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرے گا اس لیے اس نے ماجد کو کال کر کے ملاقات کے لیے وقت لے لیا۔ وہ ٹھیک وقت پر اس کے دفتر میں داخل ہوئی۔ ہوس زدہ بوڑھا اسے سامنے پا کر کھل اٹھا۔ لیلیٰ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”مجھے فوری طور پر کچھ رقم کی ضرورت ہے۔“

”رقم تمہیں مل جائے گی۔“ وہ اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس کے لیے تمہیں میری خواب گاہ....“

”اسے بھول جاؤ اور یہ دیکھو۔“ لیلیٰ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ماجد نے لفافہ کھولا اور اس میں سے نکلنے والے چند کاغذات پر نظر ڈالی تو خاصے سرد موسم کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ اس نے کاغذات سے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔

”یہ تم نے کہاں سے حاصل کیے؟“

”یہ بیکار سوال ہے... اور تم نے جواب نہیں دیا۔ مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔“

”کتنی؟“ ماجد نے مردہ لہجے میں کہا۔

”کم سے کم بیس ہزار۔“

”یہ بہت بڑی رقم ہے۔“

”مسٹر مائیکل۔“ لیلیٰ نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ رقم میری ہے۔ تم اپنی جیب سے نہیں دے رہے ہو۔“

ماجد نے ایک بار پھر کاغذات کی طرف دیکھا۔ اس میں اس کی آمدنی سے متعلق کچھ اعداد و شمار تھے جو اس کے ٹیکس گوشواروں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اگر یہ اعداد و شمار منظرِ عام پر آ جاتے تو وہ بہت دشواری میں پڑ جاتا۔ اس نے سرد آہ بھر کر سر ہلایا اور اپنی چیک بک نکالی۔

”نہیں، مجھے کیش چاہیے۔“

ماجد نے اسے گھور کر دیکھا پھر اٹھ کر دفتر میں موجود سیف کھول کر اس میں سے بیس ہزار نکال کر لیلیٰ کے سامنے پٹخ دیے۔ ”یہ لو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

لیلیٰ نے گڈیاں اٹھا کر پرس میں رکھیں اور مسکرائی۔ ”تم یقیناً اچھے گارجین ہو اور مجھے امید ہے کہ اب ہماری اچھی نبھے گی۔“

ماجد مائیکل دانت پیس کر اسے جاتا دیکھتا رہا اور جیسے ہی لیلیٰ کمرے سے نکلی، اس نے زیرِ لب اسے گالی دی۔



”کتیا... دیکھ لوں گا تجھے... میرا نام بھی ماجد ہے۔“

☆☆☆

خالد اور جیکب اسٹڈی میں تھے۔ خالد، جیکب سے انٹرویو کر رہا تھا۔ ”روتھی کے غائب ہونے پر خاندان کے افراد کا ردِعمل کیسا تھا؟“

”تم قریبی رشتے داروں کی بات کر رہے ہو؟“

”بالکل... میں قریبی رشتے داروں کی بات کر رہا ہوں۔“ خالد نے جواب دیا۔

”روتھی کی ماں شمیل اس وقت ہنری سے الگ ہو گئی تھی جب روتھی صرف چار سال کی تھی۔ شمیل پیرس چلی گئی اور مائر اولیو یورپ کی انچارج وہی ہے۔“

”گویا روتھی کی ماں ابھی زندہ ہے؟“

”بالکل، وہ ستر برس کی عمر میں بھی پوری طرح چاق و چوبند ہے اور بزنس کو بہترین انداز میں دیکھ رہی ہے۔“

”روتھی کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟“

”شمیل نے اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی لیکن ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہمیں اب روتھی کا باب بند کر دینا چاہیے۔ وہ واپس نہیں آئے گی۔“

”آپ نے اس خیال کی وجہ پوچھی تھی؟“

”نہیں اور نہ اس نے وضاحت کی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسے روتھی کے بارے میں جاننے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ روتھی کے بارے میں جانتی ہو۔“ خالد نے آہستہ سے کہا تو جیکب مائر چونک گیا۔

”کیا مطلب؟“

”اگر میں کسی کے بارے میں دلچسپی نہیں لیتا تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں... یا تو مجھے اس کے [illegible]

[illegible]

[illegible] اور وہ اس سے

[illegible] میں مادام شمیل

[illegible] بتائے گی۔“

[illegible] نظروں سے اس کی طرف

[illegible] ہو گیا ہے۔ میں نے تمہارا

[illegible] شاید تم اس معمے کو حل کر لو لیکن اس

[illegible] کرنا ہو گی۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ

[illegible] میں کچھ جانتی ہے تو تمہیں یہ بات اس سے

[illegible] ہو گی۔“

مالکن بہت اداس اور خاموش تھی۔ بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی مگر چند منٹ بعد پھر وہاں نمی تیرنے لگتی۔

نوجوان ملازمہ کافی دیر سے مالکن کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا۔ اس نے قریب جا کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ”بیگم صاحبہ! آج آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“

مالکن نے غم زدہ نظریں اٹھائیں اور دکھی لہجے میں بولی۔ ”تمہارے صاحب آج کل اپنے دفتر کی ایک عورت کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں... پتا نہیں کیا گل کھلنے والا ہے!“

”نہیں نہیں۔“ ملازمہ بے ساختہ بولی۔ ”یہ ہو ہی نہیں سکتا، کوئی اور بات ہے۔ آپ یہ کہانی مجھے جلانے کے لیے سنا رہی ہیں۔“

(کھیالہ شیخاں سے طیب شاہین کا تحفہ)

خالد نے سر ہلایا۔ ”دوسرے لوگوں کا کیا ردِعمل تھا؟“

”معمول کے مطابق۔ وہ روتھی کے لیے پریشان اور فکرمند تھے اور انہوں نے پولیس کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہیں کیا۔ پولیس اپنی تفتیش میں کسی رشتے دار کے بیان میں تضاد تلاش نہیں کر سکی تھی۔ ان بیانات کی نقول کاپیاں تمہارے پاس موجود ہیں۔“

”میں نے ابھی آپ کا اور رونن کا بیان دیکھا ہے۔ رونن کا کہنا ہے کہ اسے بھی نہیں معلوم کہ اس کی بہن کہاں گئی اور اس کے ساتھ کیا ہوا۔“

”رونن شروع سے خود میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ وہ اسٹیٹ میں کم ہی ہوتا تھا۔ اس نے اسکول کی تعلیم بیروت میں مکمل کی اور پھر اناٹومی پڑھنے کے لیے فرانس چلا گیا۔ اسٹیٹ پر وہ کم ہی رہا ہے۔“

”وہ فرانس کب گیا؟“

”اپنے باپ کے مرنے سے دو سال پہلے گیا تھا لیکن

وہ اکثر چھٹیوں میں گھر آجاتا تھا۔ جن دنوں ہنری کی موت کا واقعہ پیش آیا، وہ اسٹیٹ میں تھا۔"

"گویا جب روتھی غائب ہوئی تو رونن اسٹیٹ میں تھا؟"

"بالکل، وہ یہیں تھا۔"

خالد کھڑا ہوگیا۔ "میں کچھ وقت ہنری کے کیبن میں گزارنا چاہتا ہوں۔ کوئی اعتراض تو نہیں کرے گا؟"

"نہیں کیونکہ وہ جگہ اب میری تحویل میں ہے۔" جیکب مائر نے کہا اور میز کی دراز سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ اس کے تالے کی چابی ہے۔ تم اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔"

خالد باہر آیا تو سورج سر پر آگیا تھا۔ اس نے تاخیر سے ناشتا کیا تھا اس لیے فی الحال کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ وہ پہاڑی سے نیچے آیا اور کیبن والی پہاڑی کی طرف بڑھا۔ کیبن سب سے اوپری حصے میں تھا اور وہاں تک جاتے ہوئے وہ ہانپ گیا۔ یقیناً یہاں ہر کوئی نہیں آتا ہوگا۔ یہاں سرد ہوا بہت تیز تھی۔ برآمدے میں لکڑیاں اور کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ برسوں سے نہ تو یہاں کسی نے قدم رکھا تھا اور نہ ہی یہاں کی صفائی کی گئی تھی۔ البتہ تالا بہت آسانی سے کھل گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ بُری طرح چرچرایا اور اس پر جمی دھول اڑی۔ خالد اندر آیا۔ کیبن کے اندر بھی ہر طرف گرد جمی تھی۔ ایک طرف کتابوں کی بڑی سی الماری تھی جو اوپر سے لے کر نیچے تک کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ شاید ہنری کو مطالعے کا شوق تھا اور اس نے اسی لیے یہ کیبن بنایا تھا۔ خالد نے شیشے کا دروازہ کھولا۔ اندر موجود کتابوں پر بھی دھول جمی ہوئی تھی۔ اس نے سامنے موجود کتاب اٹھائی تو یہ بائبل نکلی۔

زبان فرانسیسی تھی۔ خالد نے اسے کھولا تو اندر ہارڈ کور کی پشت پر ہنری مائر کا نام تین زبانوں عربی، فرنچ اور انگریزی میں لکھا تھا۔ پھر خالد کی توجہ اس کے سامنے والے خالی صفحے پر اوپر سے نیچے لکھے پانچ ناموں اور ان کے سامنے لکھے ہندسوں پر گئی۔ یہ پانچ نام ارمانہ، شیلا، میگڈا، ڈیلا اور روبی تھے۔ ہر نام کے ساتھ ہندسے درج تھے۔ یہ چار اور پانچ اعداد والے ہندسے تھے۔ خالد نے بائبل کی ورق گردانی کی۔ ہنری یقیناً باقاعدگی سے بائبل پڑھتا تھا کیونکہ جابجا حاشیوں میں اس نے فرنچ میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اسے تعجب ہوا کیونکہ جیکب کے مطابق ہنری الکوحل پیتا تھا اور اس کی موت بھی شاید اسی وجہ سے ہوئی تھی۔ دوسری طرف وہ اتنا مذہبی تھا کہ باقاعدگی سے بائبل پڑھتا تھا۔ یہ تضاد خالد کو انوکھا لگا۔ اس نے بائبل ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا اور اسے کوٹ میں رکھ لیا۔ وہ دوسری کتابوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان میں سے زیادہ تر مذہب کے بارے میں تھیں اور عیسائیت سے تعلق رکھنے والی ممتاز مذہبی شخصیات نے لکھی تھیں۔ خالد کا علم اس بارے میں زیادہ نہیں تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ کتابیں زیادہ تر دائیں بازو کے قدامت پرستوں نے لکھی ہیں۔

کیبن میں کوئی خاص چیز نہیں تھی، سوائے چمڑے کے ایک کاؤچ کے۔ ایک چھوٹا صوفہ سیٹ تھا اور باقی کیبن خالی تھا۔ خالد باہر آیا۔ اس نے تالا بند کیا اور کیبن کے پیچھے آیا۔ یہاں پہاڑی بہت زیادہ ڈھلواں تھی اور اس کے اختتام پر تیز رفتار ندی تھی جس کا پانی اس موسم میں بھی بہت تند و تیز تھا۔ ندی تک جانے کے لیے بڑے پتھروں سے ترچھی سیڑھی بنائی گئی تھی لیکن دیکھنے میں یہ بھی کم خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ خالد سیڑھی سے اترتا ہوا نیچے آیا۔ یہ سچ مچ بہت خطرناک تھی۔ برف کی وجہ سے پھسلواں ہو رہی تھی اور ذرا سا پاؤں بگڑتے ہی وہ سیدھا ندی میں جا گرتا۔ ندی کوئی بیس گز چوڑی اور خاصی گہری تھی۔ اس کے جھاگ اڑاتے پانی میں تہہ کے پتھر نظر نہیں آرہے تھے۔ خالد محویت سے ندی میں دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے عقب سے کہا۔

"اے... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

خالد اچھل پڑا اور ندی میں گرنے سے بچا۔ خود کو سنبھال کر اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے جیکب کا بھتیجا اور روتھی کا بھائی رونن دکھائی دیا۔ خالد اس کی تصویر دیکھ چکا تھا اور وہ اپنی تصویر سے کسی قدر مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی خالد نے اسے پہچان لیا۔ وہ سنبھل کر اوپر پہنچا اور رونن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ گول چہرے اور سامنے سے اڑے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جسم مضبوط اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ اس نے گرم جوشی سے خالد کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تمہیں یہاں دیکھ کر حیران ہوا ہوں مسٹر خالد۔"

"تم مجھے جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں... تمہیں یہاں کون نہیں جانتا۔" رونن بولا۔ "تم مشترکہ طور پر مائر خاندان کے پسندیدہ صحافی ہو۔"

"اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" خالد نے کہا۔ "لیکن اس طرح آواز دے کر تم نے مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اس طرح آواز نہیں دی تھی۔" رونن نے کہا۔ "میں حیران تھا





کہ وہ یہاں ندی کے کنارے کیا کر رہا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ انکل جیکب نے تمہیں روتھی کی گمشدگی کا معما حل کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"میں اسی پر کام کر رہا ہوں۔" خالد نے کہا اور وہ دونوں پہاڑی کے دوسری طرف اترنے لگے۔ رونن نے خالد سے دوبارہ نہیں پوچھا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا، اس کے بجائے وہ اپنے بارے میں بتانے لگا۔ وہ مقامی اسپتال میں ینالوجی کے ماہر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ یہ اس کا پیشہ نہیں بلکہ شوق تھا۔ ذاتی طور پر وہ اتنا دولت مند تھا کہ چاہتا تو اپنا اسپتال قائم کر لیتا لیکن وہ بغیر تنخواہ کے کام کر رہا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اکیلا رہتا تھا اور کوئی ملازم بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ سارے کام خود کرتا تھا۔ اس نے خالد سے کہا۔

"میں کھانا بہت اچھا بناتا ہوں، کیوں نہ آج شام کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ۔"

خالد ہچکچایا۔ "نہیں، تمہیں زحمت ہوگی۔"

"بالکل بھی نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں مسلم دکان سے حلال گوشت لاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں مسلمان حلال گوشت کھاتے ہیں۔"

"پھر بھی تمہیں زحمت ہوگی۔"

"ہرگز نہیں، میں اکیلا رہتا ہوں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی میرے ساتھ کھانا کھائے۔ مجھے تمہاری میزبانی کر کے خوشی ہوگی۔"

"ابھی تو ڈنر میں خاصا وقت ہے۔"

"تب تک ہم گپ شپ کریں گے۔ تم پیتے ہو؟"

"میں نہیں پیتا۔"

"میں کافی بھی بہت اچھی بناتا ہوں۔"

خالد کچھ کام نمٹانا چاہتا تھا لیکن رونن کے اصرار پر وہ مان گیا۔ وہ دونوں اس پہاڑی کی طرف بڑھے جس پر رونن کا مکان تھا۔ رونن خاصا خوش مزاج شخص ثابت ہوا۔ مختلف موضوعات پر اس کی معلومات بہت وسیع تھیں...... خالد کو اس کے ساتھ لطف آنے لگا۔ وہ کافی اچھی بناتا تھا اور جس وقت وہ کافی پیتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کی آئندہ سیاسی و معاشی صورتِ حال پر بحث کر رہے تھے تو کال بیل بجی۔ [illegible] اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ نتاشا تھی۔ قریب سے وہ اپنی تصویر کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت [illegible] ہوئی۔ وہ روتھی سے دس سال چھوٹی تھی، یعنی وہ اڑتیس برس کی تھی لیکن خود کو اتنا سنبھال کر رکھا تھا [illegible] میں وہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس نے اسکن فٹ جرسی اور اس کے اوپر ہلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اندر آنے کے بعد اس نے جیکٹ اتار دی۔ جرسی میں اس کے خدوخال اتنے نمایاں تھے کہ خالد چند ثانیے کے لیے دم بخود رہ گیا۔ وہ خالد کی یہاں موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی اس لیے کسی قدر حیران ہوئی۔

"تم یقیناً مسٹر خالد احمد ہو؟"

"میں ہی خالد احمد ہوں۔" اس نے اعتراف کیا تو نتاشا پُرجوش ہوگئی۔

"میرے خدا! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہوگی۔"

"خالد یہاں دو دن سے ہے۔" رونن نے اسے آگاہ کیا۔ "انکل جیکب نے اسے ایک خاص کام کے لیے بلایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ انکل اور اسٹیٹ کا مہمان بھی ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔" نتاشا جلدی سے بولی۔ "مسٹر خالد! میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم روتھی مائر کے کیس کو حل کرنے کے لیے یہاں مدعو کیے گئے ہو؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔"

نتاشا نے گہری سانس لی۔ "گویا انکل جیکب کے ذہن سے یہ بات نکلی نہیں کہ روتھی زندہ ہے۔"

خالد نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "کیا تمہارا خیال اس سے مختلف ہے؟"

"میرا کیا، سب کا یہی خیال ہے۔" نتاشا کا لہجہ کسی قدر تیز ہوگیا۔ "ٹھیک ہے، اس کی لاش نہیں ملی لیکن اگر وہ زندہ ہوتی تو یہاں سے دور کیوں جاتی؟"

وہ تینوں لاؤنج میں آتش دان میں بھڑکتی آگ کے سامنے آبیٹھے..... رونن نے خالد کے لیے دوبارہ کافی نکالی لیکن اپنے اور نتاشا کے لیے برانڈی لے آیا۔ "اگر تمہاری بات مان لی جائے، تب بھی تو لاش ملنی چاہیے تھی۔"

"ممکن ہے قاتل نے اسے مار کر اسٹیٹ یا آس پاس کہیں دفن کر دیا ہو۔ تم جانتی ہو یہاں میلوں دور تک سوائے زیتون کے درختوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسٹیٹ میں سوائے مائر خاندان کے اور کوئی نہیں رہ سکتا۔ حد یہ کہ اسٹیٹ میں موجود.... ملازمین کو بھی یہاں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ آس پاس کے قصبوں میں رہتے ہیں۔"

خالد نے کافی کا گھونٹ لیا۔ "اگر کسی نے روتھی کو قتل کر دیا تھا تو اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"

"دولت۔" نتاشا بولی۔ "مائر خاندان سکڑ رہا ہے۔ ایک صدی پہلے اس کے افراد کی تعداد ایک سو سے زیادہ تھی

اور اب صرف اٹھائیس افراد رہ گئے ہیں جبکہ دولت بڑھ کر کم سے کم دس ارب ڈالرز تک جا پہنچی ہے۔ یوں ایک فرد کا حصہ کم سے کم پچیس کروڑ ڈالرز بنتا ہے۔ ایک فرد کے کم ہونے سے بھی دوسروں کے حصے میں خاصی دولت آسکتی ہے۔"

"یعنی قاتل کوئی بھی ہوسکتا ہے؟"

"موجودہ حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ روتھی کے بعد خاندان کے افراد میں مزید کمی آئی ہے اور چار مختلف لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور امکان ہے کہ آنے والے دس سالوں میں کم سے کم ایک درجن افراد مزید انتقال کر جائیں گے جبکہ متبادل افراد کے دنیا میں آنے کا امکان اس سے کم ہی ہے، خاندان میں آخری بچہ آج سے چار سال پہلے دنیا میں آیا تھا۔"

نتاشا کی بات میں وزن تھا۔ اگر قاتل روتھی سے عمر میں بڑا بھی تھا، تب بھی وہ اپنے بچوں کے لیے دولت میں اضافہ کر گیا تھا۔ خالد نے پوچھا۔ "روتھی کے غائب ہونے کے بعد خاندان کے کن افراد کا انتقال ہوا ہے؟"

"سب سے پہلے میری ماما مارین کا انتقال ہوا۔ انہیں بریسٹ کینسر ہو گیا تھا۔ وہ لندن میں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد میرے رشتے کے ایک انکل اور ان کے بعد ایک دور کے کزن کا انتقال ہوا۔ انکل کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ کزن بائیک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا، وہ صرف بائیس برس کا تھا۔"

جیکب مائر کی فیملی میں اب صرف تین بڑے اور ان کے پانچ بچے تھے۔ دور کے مزید اکتیس رشتے دار تھے۔ خالد نے پوچھا۔ "دور کے رشتے دار بھی اسٹیٹ میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں؟"

"ہاں، جائداد اور دولت میں سب برابر کا حصہ رکھتے ہیں، صرف آمدنی کی تقسیم میں فرق ہے اور وہ بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔" رونن نے کہا۔ "اسٹیٹ کی سالانہ آمدنی تمام ٹیکس نکال کر ایک ارب ڈالرز ضرور ہے۔"

خالد حیران ہوا۔ ایک ارب ڈالرز کا مطلب تھا کہ تمام خاندان کے اراکین کے حصے میں کم سے کم بائیس چوبیس ملین ڈالرز ضرور آتے ہوں گے۔ "اگر کوئی فرد اسٹیٹ کی دولت اور جائداد میں اپنا حصہ نکالنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟"

"کوئی فرد واحد ایسا نہیں کرسکتا۔ وصیت کی رو سے صرف اکثریتی اراکین کی حمایت سے اسٹیٹ کی دولت اور جائداد تقسیم ہوسکتی ہے اور اس صورت میں اسے فروخت کر کے یا پبلک لمیٹڈ کمپنی بنا کر شیئرز کی صورت میں سب کو حصہ دے دیا جائے گا۔"

"یعنی کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب زیادہ افراد نے اپنے حصے کا مطالبہ کیا ہو؟"

"زیادہ کیا، ایک فرد کی طرف سے بھی حصے کا سوال عرصے بعد سامنے آتا ہے۔ موجودہ اراکین میں سے شاید دو تین سے زیادہ لوگ حصہ الگ کرنے کے حامی نہیں ہوں گے۔"

"تم دونوں میں سے کوئی اس کا حامی نہیں؟"

"میں تو نہیں ہوں۔" نتاشا نے کہا۔ "کیونکہ میں بغیر کسی جھنجٹ میں پڑے ہر سال اتنی آمدنی حاصل کر لیتی ہوں جو میرے تصور سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے مجھے کیا ضرورت ہے کہ حصہ الگ کرنے کا سوچوں۔"

"میری بھی ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔" رونن نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے جو مل رہا ہے، میں اس سے بہت خوش ہوں۔"

"جیکب مائر کے بعد اسٹیٹ کی سربراہی تمہارے حصے میں آئے گی؟"

"ہاں اور مجھے اس کی فکر ہے کیونکہ اس صورت میں مجھے اپنا کام چھوڑ کر ساری توجہ بزنس کو دینا پڑے گی۔"

خالد نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم اپنا ٹو لو جسٹ ہو، کیا تم ایک بڑے بزنس کو چلانے کی صلاحیت رکھتے ہو؟"

"میرا خیال ہے رونن ایسا کر لے گا۔" رونن کے بجائے نتاشا نے کہا۔ "کیونکہ اسٹیٹ کا تمام نظام ماہرین کی ایک ٹیم چلاتی ہے۔ سربراہ کو صرف کام کی نگرانی کرنا ہوتی ہے۔"

رونن اپنا گلاس خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔ "میرا خیال ہے، اب ہمیں کچن میں جانا چاہیے۔"

وہ کچن میں آ گئے۔ نتاشا اور خالد نے میز سنبھال لی۔ رونن کھانے کی تیاری میں لگ گیا۔ اس کا کچن بہت صاف ستھرا اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھا۔ اس نے گوشت کے پارچے نکالے اور انہیں بھوننے کی تیاری کرنے لگا۔ ساتھ میں اس نے رشین سلاد کے لوازمات بھی نکال لیے تھے۔ پارچے سرکے اور ایک خاص چٹنی کے ساتھ کھائے جاتے۔ نصف گھنٹے میں ڈنر تیار تھا، جو خاصا مزے دار تھا۔ رونن واقعی بہترین کک تھا۔ ڈنر کے بعد وہ دوبارہ لاؤنج میں آ گئے۔ اس بار کافی نتاشا نے بنائی۔ گفتگو کے دوران میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ نتاشا اور رونن خاصی پی گئے تھے اور ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ خالد نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔





"اب مجھے چلنا چاہیے تاکہ صبح وقت پر اٹھ کر اپنا کام کرسکوں۔"

"میں بھی چلوں گی۔" نتاشا اٹھی اور ذرا سی لڑکھڑائی لیکن فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ رونن نے اسے جیکٹ پہننے میں مدد دی۔ خالد نے کوٹ پہنا۔ دروازے سے باہر آتے ہی شدت کی سردی نے ان کا استقبال کیا۔ نتاشا لرز کر اس کے پاس ہو گئی۔ "سردی بڑھ گئی ہے۔"

خالد نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیے۔ اس نے رسماً بھی نتاشا کو سہارا دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ رونن نے ان کو اندر ہی سے خدا حافظ کر دیا تھا۔ اس کا باہر سردی میں آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ نتاشا نے ساتھ چلتے ہوئے جیکٹ سے ایک چھوٹا سا مفلر نکال کر گردن اور کانوں پر لپیٹ لیا۔ پھر اس نے خالد سے پوچھا۔

"تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں۔"

"کوئی گرل فرینڈ ہے؟"

"بدقسمتی سے میں اس سے بھی محروم ہوں۔"

نتاشا چلتے ہوئے اس کے بالکل پاس آ گئی اور اس کا جسم خالد سے ٹکرانے لگا۔ درمیان میں بھاری کپڑوں کے باوجود وہ اس کی نزاکت اور نرمی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ خالد کو خیال آیا، کیا نتاشا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے؟ نتاشا کے گھر والی پہاڑی قریب آ گئی تھی۔ خالد اسے چھوڑنے آیا تھا۔ ورنہ اس کی گاڑی دور کھڑی تھی۔ نتاشا چلتے چلتے رکی اور اس کے سامنے آ گئی۔ "میں بھی اکیلی ہوں۔"

"اوہ..." خالد نے بس اتنا ہی کہا۔

"ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نتاشا کا لہجہ ترغیب آمیز تھا۔

خالد ہچکچایا۔ "میرا خیال ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

نتاشا مایوس ہو گئی۔ "شاید تم ایک ایسی ہستی کے ساتھ جانے سے ہچکچا رہے ہو جو روتھی کی ممکنہ قاتل ہوسکتی ہے۔"

خالد نے اس کی بات پر غور کیا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔" نتاشا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "کیا ڈیڈ نے تمہیں بتایا نہیں کہ روتھی کی گمشدگی یا قتل کا شک خاندان والوں پر ہے؟"

"ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے۔" خالد نے کہا۔

"تب میں بھی مشکوک ہوئی... اینی وے گڈ بائے۔" نتاشا کہتے ہوئے پہاڑی کی طرف مڑ گئی۔ خالد اسے جاتا دیکھتا رہا پھر کندھے جھٹک کر واپس چل پڑا۔ اس نے اس ملاقات کے دوران رونن اور نتاشا کے رویے کا بغور جائزہ لیا تھا لیکن اسے کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک بات اس نے واضح محسوس کی تھی۔ ان دونوں کے خیال میں اتنے پرانے کیس کو پھر سے اٹھانا درست نہیں تھا اور اب اس پر مٹی ڈال دینی چاہیے تھی۔ وہ واپس کیبن پہنچا۔ اس کا موڈ بدل گیا تھا اس لیے اس نے کام کل پر چھوڑ دیا۔ گرم پانی سے غسل کیا اور سو گیا۔ اگلے دن وہ جاگنگ کر کے آیا۔ ابلے انڈوں اور کافی سے ناشتا کر کے وہ کام میں لگ گیا۔ اسے لیپ ٹاپ پر کام کرنے کی عادت تھی اس لیے اس نے سب سے پہلے اہم دستاویزات کو اسکین کر کے کمپیوٹر میں ڈالا۔ اس طرح اسے کام کی چیز دیکھنے کے لیے بار بار کاغذ کھنگالنے نہیں پڑتے۔ اس نے ہنری کی بائبل بھی اسکین کر ڈالی۔ دوپہر تک وہ اسی کام میں لگا رہا۔ اب وہ تھک گیا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے باقی کام لنچ کے بعد تک ملتوی کر کے وہ کیبن سے نکل آیا اور نزدیکی قصبے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک اچھا ریستوران تھا۔ وہاں کھانا بہت اچھا اور تازہ مل جاتا تھا۔

☆☆☆

لیلیٰ کمپیوٹر کے سامنے تھی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں اور اس وقت وہ خالد کے لیپ ٹاپ میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے دقت پیش آ رہی تھی۔ خالد نے اپنے کمپیوٹر کی سیکیورٹی سخت کی ہوئی تھی۔ مگر کمپیوٹر بالآخر لیلیٰ کے سامنے ہار مان گیا اور اس نے اپنے دروازے کھول دیے۔ لیلیٰ جانتی تھی کہ اسے زیادہ وقت نہیں ملے گا۔ اگر خالد اس وقت سسٹم کے پاس نہیں ہے، تب بھی اسے پتا چل جائے گا اور اس نے انٹرنیٹ بند کر دیا تو لیلیٰ کا کام ادھورا رہ جائے گا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ خالد مائر اسٹیٹ میں کیا کر رہا تھا اور اگر وہ روتھی مائر کے کیس پر کام کر رہا تھا تو وہ کس حد تک جان چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے روتھی مائر کے نام سے سرچ کیا، ایک پورا فولڈر سامنے آ گیا۔

لیلیٰ پُرجوش ہو گئی۔ اس نے چند بٹن دبائے اور یہ فولڈر اس کے پاس ڈاؤن لوڈ ہونے لگا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ فولڈر ڈاؤن لوڈ ہونے میں آدھ گھنٹا لگا اس میں خاصی دستاویزات اور دوسری چیزیں تھیں۔ جیسے ہی ڈاؤن لوڈنگ مکمل ہوئی، اس نے خالد کے سسٹم میں مداخلت بند کی اور فولڈر میں موجود فائلوں کا معائنہ کرنے لگی اور فوراً ہی چند

تصاویر نے اس کی توجہ حاصل کر لی۔ اس نے تصویریں کھولیں۔ یہ روتھی مائر کی وہ گروپ تصاویر تھیں جو اسکول کی تقریب میں لی گئی تھیں۔ لیلیٰ نے ایک سوفٹ ویئر کی مدد سے ان تصاویر کو واضح کیا۔ ان تین تصویروں میں روتھی مائر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پہلی تصویر میں وہ فوٹو گرافر کے پیچھے دائیں طرف دیکھ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں اس کے تاثرات بدلتے دکھائی دیتے ہیں اور تیسری تصویر میں وہ پلٹ کر گروپ سے نکل رہی ہے۔ لیلیٰ نے اپنے طور پر روتھی مائر کیس میں خاصی تحقیق کی تھی لیکن یہ تصاویر وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی کیونکہ یہ پولیس ریکارڈ کا حصہ تھیں اور انہیں کہیں شائع نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ خالد چند دن میں اس سے خاصا آگے نکل گیا تھا۔ تصویروں کے بعد اس نے دوسری فائلیں دیکھیں۔ ان میں اسے ایک بائبل بھی دکھائی دی۔ اس کا نام بھی ہنری کی بائبل تھا۔ اس نے اولین صفحہ کھولا تو اس میں ہاتھ سے لکھے عورتوں کے نام اور ان کے آگے ہندسے دکھائی دیے۔

اچانک اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے نام دیکھا لیکن نام کی جگہ ایک نمبر تھا۔ اس نے کال منقطع کر دی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ بیل بجنے لگی۔ کال کرنے والا نہایت مستقل مزاج تھا۔ اس نے تیسری بار کال کی تو لیلیٰ نے جھنجلا کر کال ریسیو کی۔ ''کون ہے؟''

''ڈیئر! میں ہوں۔'' ماجد کی آواز آئی۔

''کیا بات ہے؟'' لیلیٰ کا لہجہ مزید کھردرا ہو گیا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''پلیز۔'' ماجد کا انداز ملتجی ہو گیا۔ ''یہ بہت ضروری ہے اور تمہارے لیے فائدہ مند بھی ہوگی۔''

اس بات نے لیلیٰ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اسے خیال آیا کہ شاید ماجد مائیکل خوف زدہ ہو کر اس کی وراثت اس کے حوالے کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں آجاؤں گی۔''

''لیکن میرے دفتر نہیں... میرا ایک اپارٹمنٹ ہے، وہاں آنا۔ معاملہ رازداری کا ہے۔''

لیلیٰ چونکی پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ماجد مائیکل! اگر تمہارے ذہن میں کوئی احمقانہ بات ہے تو یاد رکھنا میں تمہیں جہنم رسید کر سکتی ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' ماجد نے اسے یقین دلایا۔ لیلیٰ نے موبائل بند کر دیا۔ وہ فکرمند نظر آنے لگی تھی۔

پھر اس نے شانے جھٹکے اور کمپیوٹر پر جھک گئی۔

☆☆☆

خالد لنچ کر کے واپس آیا۔ اس نے رات کے لیے کھانا پیک کروا لیا تھا۔ کیبن میں بجلی کے چولہے اور مائکروویو اوون تھا۔ یہ چائے، کافی بنانے یا کھانا گرم کرنے کے لیے بہترین تھا۔ آسمان پر گہرے سرمئی بادل جمع ہونے لگے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ پھر برف باری ہوگی۔ روز ایک ٹرالی والا کیبن کے سامنے جلانے والی لکڑی ڈال جاتا تھا۔ خالد اس سے ضرورت کی لکڑی اٹھا لاتا۔ وہ جو سامان لایا تھا، اس میں ایک بڑا کارڈ بورڈ بھی تھا۔ اس کا سائز چھ ضرب چار فٹ تھا۔ اس نے کیلوں کی مدد سے کارڈ بورڈ ایک طرف دیوار میں ٹانگ دیا اور اس کے وسط میں روتھی مائر کی تصویر لگائی پھر اس کے اردگرد اس کے نزدیکی رشتے داروں کی تصاویر لگائیں۔ ہر تصویر پر مارکر سے سن پیدائش اور تصویر والے کی موجودہ حیثیت لکھی۔ بورڈ کے ایک طرف اس نے مائر اسٹیٹ کا نقشہ لگایا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ دستاویزات اسکین کر کے کمپیوٹر میں ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسکین ہونے والی دستاویزات کو مخصوص سب فولڈرز بنا کر ان میں محفوظ کر رہا تھا تاکہ بعد میں تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کمپیوٹر کا کیشے صاف کرنا چاہا تو چونک گیا۔ کیشے اس کے اندازے سے زیادہ تھا۔ کیشے ایسی فائلوں کو کہتے ہیں جو کمپیوٹر استعمال کرتا ہے تو اس کی عارضی یادداشت میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ جب تک ان کو اڑایا نہیں جائے یہ محفوظ رہتی ہیں اور بلاوجہ جگہ گھیرتی ہیں۔ صبح اپنا کام کر کے اس نے کمپیوٹر آف نہیں کیا تھا۔ سیکیورٹی سافٹ ویئر چیک کیا تو اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ اس کے کمپیوٹر میں کہیں باہر سے مداخلت ہوئی تھی اور اسے یہ جاننے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی کہ مداخلت کار نے اس کے کمپیوٹر سے روتھی مائر کا فولڈر ڈاؤن لوڈ کیا تھا۔

☆☆☆

جب تک لیلیٰ کو احساس ہوتا کہ وہ پھنس چکی ہے اس وقت تک تاخیر ہو گئی تھی۔ ماجد کا اپارٹمنٹ ایک ایسی بلڈنگ کے آخری فلور پر تھا جس پر کوئی دوسرا اپارٹمنٹ نہیں تھا اور اس کی لفٹ بھی الگ سے تھی۔ جیسے ہی وہ لفٹ میں داخل ہوئی اس کا دروازہ ازخود بند ہو گیا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی لیلیٰ نے لفٹ روکنے والا بٹن دبایا لیکن وہ کام نہیں کر رہا تھا اور لفٹ بدستور اوپر کی طرف جاتی رہی۔ ایک منٹ بعد وہ خود بہ خود رک گئی اور دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی ماجد کھڑا تھا۔ اس

نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
"خوش آمدید۔"
لیلیٰ خود کو سنبھالتی ہوئی باہر آگئی۔ "اس حرکت کا مطلب؟"
"کس حرکت کا؟" ماجد نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔
"لفٹ کے بٹن کام نہیں کر رہے تھے۔ تم نے انہیں بیکار کر دیا ہے۔"
"اگر میں نے ایسا کیا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟"
لیلیٰ خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس وقت ماجد کے رحم و کرم پر ہے اور تقدیر ہی اسے یہاں سے محفوظ واپس لے جا سکتی ہے۔ اسے اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ ماجد کے ساتھ ٹیرس تک آئی۔ یہاں سے شیشے کے پار بیروت کا ساحل اور سمندر دور تک واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ماجد نے ایک بوتل سے دو گلاسوں میں وہسکی نکالی اور ایک اس کی طرف بڑھا دیا۔
"ڈرو مت... تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ میں تم سے صرف ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔"
"کیسی ڈیل؟" لیلیٰ نے اس سے گلاس لے لیا۔ وہ پیتی تھی لیکن عادی نہیں تھی۔
"میں تمہاری ساری دولت اور جائداد تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"
"وہ کیسے؟ یہ کام صرف عدالت کر سکتی ہے۔"
"میں بھی کر سکتا ہوں۔ عدالتوں میں میری واقفیت ہے۔ بہت آسانی سے تمہیں ذہنی طور پر صحت مند قرار دیا جا سکتا ہے۔"
"ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"
ماجد مکروہ انداز میں مسکرایا۔ "اس کے لیے تمہیں میری صرف ایک خواہش ایک بار پوری کرنا ہو گی۔"
"اگر میں انکار کر دوں تو...؟"
"تب بھی یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔" ماجد نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن اس صورت میں بات صرف ایک بار پر نہیں ٹلے گی۔"
"کیا مطلب؟" لیلیٰ بولی۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے۔ وہ گلاس کی طرف دیکھ کر ہکلائی۔ "یہ... یہ... کیا اس میں کچھ شامل... ہے؟"
ماجد ہنسا۔ "ہاں، اس میں کچھ شامل ہے۔"
لیلیٰ نے اٹھنا چاہا لیکن چکرا کر گر پڑی۔ ماجد کی مکروہ ہنسی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

☆☆☆

خالد نے جیکب بائز سے بات کی تھی۔ اسے کسی ہیکنگ کے ماہر فرد کی ضرورت تھی۔ جیکب نے اس کا مطالبہ سن کر کہا۔ "کوئی مسئلہ نہیں ہے، میرا وکیل شہاب علی تمہارا یہ کام کر دے گا۔"
اسی شام کو شہاب علی کی کال آگئی۔ اس نے خالد سے کہا۔ "ایک لڑکی ہے لیکن وہ موڈی ٹائپ کی ہے۔ میں تمہیں اس کا سیل نمبر دے سکتا ہوں، اس سے بات تمہیں خود کرنا ہو گی۔"
"ٹھیک ہے تم نمبر دے دو، میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔"
شہاب علی نے نمبر نوٹ کرا دیا۔ خالد نے کال منقطع کر کے لیلیٰ کا نمبر ملایا۔ شہاب علی نے لڑکی کا یہی نام بتایا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ بیل بند ہو گئی تو خالد نے دوبارہ نمبر ملایا۔ وہ بہر صورت جاننا چاہتا تھا کہ اس کے کمپیوٹر میں کس نے مداخلت کی تھی۔ دوسری بار بھی دیر تک بیل جاتی رہی۔ تیسری بار ملانے کے بعد جب کال ریسیو نہیں ہوئی تو اس نے کوشش ترک کر دی۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے لیلیٰ کہیں مصروف ہو۔ چند منٹ بعد وہ پھر اس کا نمبر ملا رہا تھا۔

☆☆☆

ماجد، لیلیٰ کو ایک ایسے کمرے میں لایا جہاں صرف ایک بڑا سا جہازی سائز بیڈ تھا اور کمرے میں چاروں طرف اوپر کونوں پر تیز روشنی والی سپاٹ لائٹس لگی تھیں۔ اسی طرح ان لائٹوں کے نیچے ویڈیو کیمرے لگے تھے۔ یہ لوازمات بتا رہے تھے کہ ماجد اس کمرے کو کن مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیلیٰ بے سدھ تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا انداز میں کھلی تھیں لیکن ان میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ دوا زود اثر تھی لیکن شاید اس کی تاثیر دیر تک برقرار نہیں رہتی تھی۔ ماجد نے چالاکی سے پہلے ہی دوا اس کے گلاس میں شامل کر دی تھی اس لیے لیلیٰ کو شبہ نہیں ہوا اور وہ آسانی سے اس کے دام میں آگئی۔ ماجد نے حریص نظروں سے لیلیٰ کا جائزہ لیا اور اس کی جیکٹ اتار دی لیکن مزید کسی حرکت سے گریز کیا۔ شاید وہ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد لیلیٰ کو ہوش آنے لگا۔ اچانک ہی اس کی جیکٹ سے موبائل فون کی آواز آئی۔ ماجد نے جھپٹ کر جیکٹ اٹھائی اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ایک جیب سے





موبائل اٹھا لیا۔ اس پر اجنبی نمبر سے کال آرہی تھی۔ ماجد فکر مند ہو گیا۔ کیا لیلیٰ کسی کو بتا کر آئی تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اور جیکٹ اس نے لیلیٰ کے پاس ہی ڈال دی تھی۔ بیل بج کر بند ہو گئی لیکن فوراً ہی دوبارہ بجنے لگی۔ کال کرنے والا نہایت مستقل مزاج لگ رہا تھا۔
مسلسل بجنے والی بیل کی آواز لیلیٰ کو جلد ہوش میں لے آئی۔ اس کے ذہن پر اب بھی غبار چھایا ہوا تھا لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے خفیف سی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ موبائل ماجد کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کی طرف سے غافل تھا۔ لیلیٰ نے اپنی جیکٹ تلاش کی تو اسے اپنے پاس ہی پایا۔ وہ خوش ہو گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ آہستگی سے جیکٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ بیل دوسری بار بند ہو کر تیسری بار بج رہی تھی۔ ماجد بدستور موبائل کی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیلیٰ کا ہاتھ جیکٹ تک پہنچا اور آہستہ سے اس کی جیب میں رینگ گیا۔ جب وہ باہر آیا تو اس میں چھوٹا اور سنہری رنگ کا سگریٹ کیس تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچ کر اپنی پشت کی طرف کر لیا۔ اسی لمحے بیل بند ہو گئی اور شاید ماجد نے اس کی حرکت بھی محسوس کر لی۔ وہ لیلیٰ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ ساکت ہو گئی۔ اس کی آنکھیں معمولی سی کھلی تھیں۔
ماجد نے جھک کر اس کی سنہری گردن پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر سے تم اتنی خوب صورت نکلو گی۔" اس کا ہاتھ نیچے کی طرف رینگنے لگا۔ لیلیٰ صبر کر کے لیٹی رہی اور اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔ آنے والے چند منٹوں تک اسے خاصے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ ماجد کے اندر کا شیطان باہر نکل آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایک حد سے آگے بڑھتا، موبائل کی بیل دوبارہ بجنے لگی۔ ماجد نے جھنجلا کر گالی دی اور موبائل اٹھا لیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ لیلیٰ کی طرف سے غافل ہو گیا۔ لیلیٰ پھرتی سی اٹھی۔ اس نے سگریٹ کیس کا اگلا حصہ ماجد کی گردن سے لگا دیا اور ماجد یوں لرزنے لگا جیسے اسے شدید قسم کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ لرزتے ہوئے اس کا ہاتھ لیلیٰ کے ہاتھ پر آگیا تھا۔ اسے بھی ایسا ہی جھٹکا لگا اور وہ اچھل کر بستر پر جا گری۔

☆☆☆

خالد نے شہاب علی کو کال کی اور اس سے لیلیٰ کا پتا پوچھا۔ شہاب علی نے کہا کہ وہ اسے معلوم کر کے بتاتا ہے۔ دس منٹ بعد اس نے لیلیٰ کا پتا بتا دیا۔ وہ بیروت میں رہتی تھی۔ خالد کے پاس کوئی اور کام نہیں تھا اس لیے وہ...... دو گھنٹے کی ڈرائیو پر روانہ ہو گیا۔ یہ فاصلہ اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر لیا اور بیروت پہنچ گیا۔ لیلیٰ کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے میں کچھ دشواری ہوئی تھی کیونکہ اس علاقے میں ایک سیاسی جماعت کی ریلی نکل رہی تھی۔ اسرائیل کے حملے کے بعد لبنان کی سیاست میں تیزی آگئی تھی۔ آئے دن ریلیاں اور جلسے ہو رہے تھے۔ خالد بہ مشکل اس عمارت تک پہنچا جس کی آخری منزل پر لیلیٰ کا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ تھا۔ لفٹ نہیں تھی، خالد کو سیڑھیوں سے اوپر جانا پڑا۔ دوسرے فلور پر اسے ایک نوجوان لڑکی کراہتی اور لڑکھڑاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دی۔ خالد رک گیا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ "مس! تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے؟"
"دفع ہو جاؤ۔" وہ عربی میں غرائی۔ "مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"
خالد نے شانے اچکائے اور اوپر کی طرف روانہ ہو گیا لیکن جب وہ بتائے ہوئے پتے پر پہنچا تو اس نے اپارٹمنٹ کو مقفل پایا۔ پھر بھی اس نے یہ سوچ کر دستک دی کہ شاید لیلیٰ اندر سے لاک کر کے بیٹھی ہو۔ آخر وہ کال بھی تو ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے دستک دے رہا تھا کہ عقب سے اسی لڑکی کی آواز آئی۔ "اے... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
خالد چونکا۔ "میں لیلیٰ سے ملنے آیا ہوں۔"
"میں ہی لیلیٰ ہوں اور ابھی میں کسی سے نہیں مل سکتی۔" وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھی اور لرزتے ہاتھوں سے پرس میں چابی تلاش کرنے لگی۔
"پلیز! میں بہت دور سے آیا ہوں۔"
"میں نہیں مل سکتی۔" وہ تند لہجے میں بولی۔ اس کے ہاتھ سے پرس چھوٹ گیا اور وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی تو خود بھی ڈھیر ہو گئی۔ خالد بے ساختہ آگے بڑھا۔ اس نے لیلیٰ کو سیدھا کیا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ خالد کو احساس ہوا کہ وہ نہایت نازک پوزیشن میں تھا۔ اگر کوئی یہاں آنکلتا تو نہ جانے کیا سمجھتا۔ اس نے جلدی سے اس کا پرس اٹھا کر اس میں سے چابی نکالی اور دروازے کا لاک کھول دیا۔ وہ پہلے لیلیٰ کو اٹھا کر اندر لایا اور کاؤچ پر لٹا دیا پھر اس کا پرس اٹھا لایا۔ دروازہ بند کر کے اس نے کمرے کا جائزہ لیا تو چونک گیا۔ ایک طرف دیوار پر روتھی بائز کی تصویر لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی لگے کارڈ بورڈ پر ہاتھ سے اس کے کیس کے بارے میں کچھ نوٹس تحریر تھے۔ ایک طرف میز پر اسی ماڈل کی میک بک رکھی تھی جو خالد کے پاس بھی تھی۔ میز پر موجود دوسری اشیا سے اندازہ ہو رہا تھا کہ لیلیٰ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے

استعمال کی ماہر ہے۔ خالد نے کمپیوٹر آن کیا اور پھر ڈیسک ٹاپ پر موجود روتھی مائر کے نام کا فولڈر دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور پھر اسے لیلیٰ کی اصلیت جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ صرف روتھی مائر نہیں بلکہ کمپیوٹر میں اس کے نام کا ایک فولڈر بھی تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' عقب سے لیلیٰ کی تیز آواز آئی۔

خالد نے مڑے بغیر کہا۔ ''مجھے ایک کمپیوٹر ہیکر کی تلاش تھی لیکن تم تو میری توقع سے بڑھ کر نکلیں۔''

لیلیٰ اٹھ کر آئی اور اس نے ہاتھ مار کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ''تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم .... دوسرے کی ذاتی چیزیں دیکھو۔''

''اور تمہیں حق ہے کہ تم دوسروں کے کمپیوٹر سے معلومات چرالو؟'' خالد نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

وہ بپھر گئی۔ ''دفع ہو جاؤ... نکل جاؤ یہاں سے۔''

خالد نے دیوار پر لگی روتھی مائر کی تصویر کی طرف دیکھا۔ ''شاید تم بھی اس کیس میں دلچسپی لے رہی ہو۔''

لیلیٰ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''مسٹر خالد... تم یہاں سے جا سکتے ہو۔''

''چلو تم نے اعتراف تو کیا کہ تم مجھے جانتی ہو۔'' خالد مسکرایا۔ ''بہر حال، میری پیش کش اب بھی موجود ہے۔ جیکب مائر نے مجھے روتھی مائر کیس دیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ایک ماہر ہیکر کی ضرورت ہے۔ شہاب علی نے تمہارا نام تجویز کیا ہے اور میں نے ابھی تمہارے کمپیوٹر میں جو دیکھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم میں مطلوبہ اہلیت ہے۔ تم نے میرے ہی کمپیوٹر میں نقب لگائی ہے تھیف گرل۔''

''تم جا سکتے ہو۔'' لیلیٰ کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔

خالد نے اس کا لہجہ نظر انداز کر دیا۔ ''میں تمہیں گیارہ اور ساڑھے گیارہ کے درمیان کال کر رہا تھا۔ میرا نمبر تمہارے موبائل میں آ گیا ہو گا۔ اگر تم چاہو تو بعد میں میرے نمبر پر مجھے کال کر سکتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ فیصلہ مالی لحاظ سے بہت اچھا ہو گا۔''

لیلیٰ ساکت کھڑی رہی۔ خالد باہر آ گیا۔ اس کے باہر آتے ہی لیلیٰ نے دروازہ بند کیا اور پھر تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں رکھا اور دوسرا سامان جمع کر کے ایک بڑے بیگ میں ٹھونسنے لگی۔ جس وقت وہ ماجد کے اپارٹمنٹ سے نکلی تھی، وہ بے بس پڑا تھا۔ سگریٹ کیس اصل میں برقی جھٹکا مارنے والا آلہ تھا۔ آدمی اس کے جھٹکے سے مرتا نہیں تھا لیکن برقی جھٹکا اس کے اعصاب کو کئی گھنٹے کے لیے مختل کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ ماجد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اس لیے اسے بھی جھٹکا لگا تھا اور وہ اب تک اس کا اثر محسوس کر رہی تھی۔ بعد میں وہاں سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ماجد کو آلہ لگایا تھا تاکہ وہ کئی گھنٹے سے پہلے حرکت نہ کر سکے۔ ماجد کھل کر سامنے آ گیا تھا اور وہ دوبدو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے پہلے کہ ماجد حرکت میں آتا، اس کا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ جب وہ سامان سمیٹ کر نکل رہی تھی تو اسے یاد آیا کہ اس کے پاس رقم نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور رقم کے لیے اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے لیپ ٹاپ اور اس کی بعض چیزوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ چیزیں وہ کسی صورت فروخت نہیں کر سکتی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے خالد احمد اور اس کی پیش کش کا خیال آیا۔ اسے کوئی محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنا تھی جہاں وہ ماجد کی پہنچ سے باہر ہوتی۔ وہ انتقاماً اس پر کوئی الزام لگا کر اسے پھر سے نفسیاتی علاج گاہ پہنچا سکتا تھا۔ نیچے گلی میں آ کر اس نے آس پاس دیکھا اور پھر ایک چھوٹی گلی میں مڑتے ہوئے اس نے اپنا موبائل نکالا اور خالد احمد کا نمبر دیکھ کر اسے کال کرنے لگی۔

☆☆☆

خالد وہاں سے گیا نہیں تھا بلکہ کچھ ہی دور اپنی گاڑی سمیت موجود تھا اور یہاں سے لیلیٰ والی عمارت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کے اپارٹمنٹ سے نکل رہا تھا تو اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ لیلیٰ خوف زدہ ہے اور شاید وہ یہاں سے نکل جائے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ دس منٹ بعد ہی لیلیٰ ایک ہینڈ کیری اور ایک لیپ ٹاپ بیگ کے ساتھ گلی میں اترتی دکھائی دی پھر وہ ایک طرف چل پڑی۔ خالد گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے جانے لگا۔ لیلیٰ ایک چھوٹی سی گلی کی طرف مڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ خالد گلی تک پہنچتا، اس کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے جلدی سے رک کر دیکھا۔ اس کا یہ نمبر بس چند افراد ہی جانتے تھے۔ وہ لیلیٰ کا نمبر دیکھ کر چونک گیا۔

''ہیلو۔''

''میں لیلیٰ بات کر رہی ہوں۔'' اس نے بدستور ناراض لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم رابطہ ضرور کرو گی۔''

''سنو، مجھے رقم کے علاوہ کسی ٹھکانے کی ضرورت بھی ہے۔''

''جیکب مائر نے مجھے ایک کاٹیج دے رکھا ہے اور اس میں ایک چھوٹا سا بیڈ روم بھی ہے۔ وہ تم لے لینا۔''





''معاوضہ کیا ملے گا؟''

''تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔''

''سو امریکی ڈالرز روزانہ۔ لبنانی کرنسی کا بھروسا نہیں ہے کہ کب اس کی قیمت گر جائے۔''

''منظور ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''رہائش کے ساتھ طعام اور دوسرے اخراجات بھی میرے ذمے ہوں گے۔''

''تم کہاں ہو؟''

''اس گلی کے سرے پر جہاں سے تم نے مجھے کال کی ہے۔ واپس آ جاؤ، میں جب تک گاڑی لا رہا ہوں۔''

چند منٹ بعد خالد گاڑی لایا تو لیلیٰ گلی کے ساتھ کھڑی دھواں اڑا رہی تھی۔ بیگ اس کے پیروں میں پڑا تھا۔ خالد نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس نے بیگ عقبی نشست پر ڈال دیا اور خود اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

''کرائے کی کار ہے؟''

''میں غیر ملکی ہوں۔ شاید گاڑی نہیں خرید سکتا۔'' خالد نے کہا۔ ''ویسے اس کا کرایہ بھی جیکب مائر کے ذمے ہے۔''

''اس نے تمہیں فری ہینڈ دے رکھا ہے؟''

''وہ روتھی کی گم شدگی کا معما حل کرنے کے لیے کوئی بھی رقم خرچ کرنے کو تیار ہے۔''

''اور پانچ لاکھ ڈالرز کا انعام بھی دے رہا ہے۔''

''مجھے اس نے ایک ملین ڈالرز کی پیش کش کی ہے۔''

لیلیٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''واقعی... اور تم مجھے بتا رہے ہو۔ اگر تم کامیاب رہے تو تمہیں اس میں سے مجھے بھی حصہ دینا ہو گا۔''

''میں صحافی ہوں۔ اگر ایسی باتیں سوچتا تو بینکر یا بزنس مین ہوتا۔ ویسے تمہارا حصہ کس لیے؟ میں تمہیں منہ مانگے معاوضے پر ہائر کر کے لے جا رہا ہوں۔''

''میں تمہارے بہت کام آ سکتی ہوں۔''

''فی الحال تو میں تمہارے کام آ رہا ہوں۔'' خالد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا اور اچانک پوچھا۔ ''تم کس کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر بھاگی ہو؟''

لیلیٰ جواب میں باہر دیکھنے لگی۔ خالد نے دوبارہ سوال نہیں کیا، سفر خاموشی سے گزرا۔ کاٹیج کے نزدیک پہنچ کر خالد نے گاڑی اس ریستوران کے سامنے پارک کر دی جہاں وہ کھانا کھاتا تھا۔ لنچ کا وقت ختم ہونے والا تھا اس لیے انہیں لنچ پر گزارہ کرنا پڑا۔ لیلیٰ نے جس بے تابی سے کھایا، اس سے خالد نے اندازہ لگایا کہ وہ کئی وقت سے بھوکی تھی۔

کافی پی کر وہ باہر آئے تو لیلیٰ نے سگریٹ سلگا لیا اور کار کے بونٹ کے ساتھ ٹک گئی۔ اس نے کہا۔

''تمہارے ساتھ مزید سفر کرنے سے پہلے میں چند باتوں کی وضاحت کر دوں۔ اوّل یہ کہ میں تمہارے ساتھ ایک جگہ رہوں گی لیکن تم مجھ سے مزید کسی تعلق کا مطالبہ نہیں کرو گے۔''

''لاحول ولا...'' خالد نے بے ساختہ کہا۔ ''میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

لیلیٰ اس کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر بولی۔ ''دوسرے یہ کہ معاوضہ مجھے ہر روز پیشگی درکار ہو گا۔''

خالد نے پرس سے سو ڈالرز کے مساوی لبنانی کرنسی نکال کر لیلیٰ کی طرف بڑھا دی۔ ''مزید کچھ؟''

''نہیں، فی الحال اتنا کافی ہے۔'' اس نے شکریہ ادا کیے بغیر رقم لے کر جینز کی جیب میں ٹھونس لی اور جلدی جلدی کش لے کر سگریٹ ختم کرنے لگی۔ خالد گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ کیبن کے سامنے رکے تو لیلیٰ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''کام کے لحاظ سے یہ بہترین جگہ ہے لیکن یہاں انٹرنیٹ کنکشن موجود ہے؟''

''بالکل ہے، ورنہ اس کے بغیر تمہیں ہائر کرنے کا فائدہ؟''

وہ اندر آئے۔ خالد نے سب سے پہلے بھٹی میں لکڑی ڈالی۔ لیلیٰ کیبن کا معائنہ کر رہی تھی۔ وہ بورڈ کی طرف آئی اور اس نے تصویروں کا معائنہ کیا۔ اس نے خالد سے پوچھا۔ ''میں نے ہنری کی بائبل میں پہلے صفحے پر کچھ عورتوں کے نام دیکھے ہیں۔ کیا اس نام کی عورتیں مائر خاندان میں پائی جاتی ہیں یا تھیں؟''

خالد نے بھٹی کا دروازہ بند کیا اور اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری تحقیق کیا کہتی ہے؟''

''مجھے مائر خاندان کی تاریخ میں یہ نام نہیں ملے۔ تم نے ناموں پر غور کیا، ان میں کیا چیز مشترک ہے؟''

خالد نے سر ہلایا۔ ''یہ سب یہودی نام ہیں۔ آج بھی یہودی عورتوں میں یہ نام عام ملتے ہیں لیکن عیسائیوں میں بہت کم عورتوں کے یہ نام ملیں گے۔''

''تم نے ٹھیک نتیجہ نکالا ہے۔'' لیلیٰ نے پھر سگریٹ سلگایا۔ ''لیکن نمبروں کا معما میں نہیں سمجھ سکی ہوں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے، ابھی ہمارے پاس خاصا وقت ہے، اس معمے کو حل کرنے کے لیے۔ آؤ، میں تمہیں تمہارا بیڈروم دکھا دوں، سامان بھی وہیں رکھنا، واش روم تمہیں شیئر کرنا

پڑے گا۔"

"نو پرابلم۔" اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور بیگ اٹھا کر بیڈ روم کی طرف چل دی۔ خالد نے جیکب مائز کو کال کر کے اسے اطلاع دی کہ اس نے اپنی معاونت کے لیے ایک لڑکی کو ہائر کیا ہے۔

"میں جانتا ہوں، اس نے تمہارے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کی تھیں اور یہ اپنے کام کی ماہر ہے۔" جیکب مائز نے کہا۔ "ویسے مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں فری ہینڈ دے رکھا ہے۔"

"شکریہ جناب!"

لیلیٰ اپنا بیگ رکھ کر آ گئی تھی اور اب میز پر اپنا لیپ ٹاپ سیٹ کر رہی تھی۔ خالد نے انٹرنیٹ وائی فائی پر سیٹ کر لیا تھا۔ اب وہ بغیر تار لگائے انٹرنیٹ استعمال کر سکتا تھا۔ ایک عدد لیزر جیٹ پرنٹر اور ایک عدد اعلیٰ قسم کا اسکینر بھی وہاں موجود تھا۔ خالد صوفے پر بیٹھا لیلیٰ کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے خالد کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔ "تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟"

"روتھی مائز کیس کی بہت ساری تفصیلات مختلف سرکاری کمپیوٹروں میں محفوظ ہیں۔ اگر میں یہ معلومات براہِ راست حاصل کرنا چاہوں گا تو وہ مجھے نہیں ملیں گی یا بہت مشکل سے ملیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ معلومات ہیک کر لو۔"

"یہ چوری ہوگی۔"

"اور تم نے میرے کمپیوٹر میں گھس کر جو معلومات نکالی ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" خالد کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، یہ بھی چوری ہے، پر تم اس پر مجھے جیل نہیں بھیجو گے۔ لیکن سرکاری کمپیوٹرز میں چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے تو جیل جائیں گے۔"

"کیا تم ڈر رہی ہو؟"

"میں صرف تمہیں خبردار کر رہی ہوں، ورنہ میں سو ڈالرز روزانہ کے عوض یہ خطرہ مول لے چکی ہوں۔"

خالد اٹھ کر بورڈ کے پاس آیا۔ اس نے ہنری کی بائبل سے ملنے والی عورتوں کے نام اور ان کے آگے لکھے نمبروں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اس نے خود لکھ کر یہاں پن کیے تھے۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ان نمبروں کا مطلب کیا ہے؟"

"تمہارے خیال میں ان عورتوں کے ناموں اور نمبروں کا تعلق روتھی مائز کیس سے ہو سکتا ہے؟"

"ہم بالکل اندھیرے میں ہیں اس لیے جب تک ہر چیز کو کلیو نہیں سمجھیں گے، آگے کس طرح بڑھ سکتے ہیں؟"

لیلیٰ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ "تم نے جیکب یا مائز خاندان کے دوسرے لوگوں سے ان ناموں کے بارے میں معلوم کیا ہے؟"

"نہیں۔"

"معلوم کرو، ممکن ہے کسی کو ان کے بارے میں علم ہو۔"

"تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔" خالد نے سر ہلایا اور اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے کیبن سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی لیلیٰ نے جلدی سے لیپ ٹاپ کھول کر آن کیا لیکن اس پر پاس ورڈ آ گیا تھا۔

☆☆☆

جیکب مائز کا چہرہ اتنا تازہ نہیں تھا جتنا ایک دن پہلے تھا۔ وہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس نے خالد کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، میں ان عورتوں کو نہیں جانتا۔ میرے جاننے والوں میں اس نام کی عورتیں نہیں ہیں۔"

"ممکن ہے ہنری کے جاننے والوں میں ہوں۔"

جیکب چونکا۔ "ہنری اس معاملے میں کہاں سے آ گیا؟"

"یہ نام اس کی بائبل پر لکھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ہندسے بھی درج ہیں۔ ہر نام کے آگے ایک ہندسہ ہے۔"

جیکب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہنری عورتوں سے میل جول پسند نہیں کرتا تھا، وہ عورتوں سے نفرت کرتا تھا۔ رونن اور روتھی کی ماں شمیل سے اس کے تعلقات برسوں پہلے ختم ہو چکے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے ہنری کے بارے میں سنا ہو کہ وہ کسی عورت سے ملتا ہے یا اس کے کسی عورت سے کسی بھی قسم کے تعلقات ہیں۔"

"مذہبی لحاظ سے وہ کیسا تھا؟"

"تم اسے انتہا پسند کہہ سکتے ہو۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہ یورپ میں تھا اور وہاں وہ مذہب سے متاثر ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے عقائد کیا تھے کیونکہ بہ ظاہر تو ہم کیتھولک ہیں۔ مگر ایک بار ندی کے اوپر والے کیبن میں، میں نے ہنری کے ذخیرے کو دیکھا تھا۔ اس میں کئی ایسی کتابیں نظر آئیں جو مذہبی انتہا پسندی کو اجاگر کرتی تھیں۔ یہ کتابیں کیتھولک چرچ میں ممنوع ہیں۔ حالانکہ تین صدی پہلے تک کیتھولک چرچ بھی انتہا پسند سمجھا جاتا تھا۔"





"بعض معاملات میں اس کی انتہا پسندی برقرار ہے۔" خالد نے کہا۔

جیکب مائز مسکرایا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ بہرحال، میں نے محسوس کیا کہ ہنری کسی غلط سمت میں نکل گیا ہے مگر یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اس کے بعد وہ محدود ہوتا گیا۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ وہ بہت پینے لگا تھا اور اکثر ندی والے کیبن میں وقت گزارتا تھا۔ اتنے پاس رہنے کے باوجود دوسروں سے اس کی ملاقات مہینوں میں ہوتی تھی۔"

"ہنری کی لاش ندی سے نکلی تھی؟"

"نہیں، اسے ایک نگران نے برج سے جھیل میں تیرتے دیکھا تھا۔ اگر اس کی نظر نہیں پڑتی تو لاش آگے کہیں بہہ جاتی اور شاید روتھی کی طرح اس کا بھی سراغ نہ ملتا۔"

"آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ یا دوسرے ہنری کے زیادہ قریب نہیں تھے لیکن یہاں کوئی ایسا ہوگا جو ہنری کے قریب سمجھا جاتا ہوگا۔"

جیکب نے سر ہلایا۔ "صرف اولیور کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ اولیور ہمارا فرسٹ کزن لگتا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔ ہنری کی طرح وہ بھی مذہب کی طرف رجحان رکھتا ہے اور اسی کی طرح وہ دوسروں سے میل جول پسند نہیں کرتا۔ جہاں پہاڑیوں پر مکانات شروع ہوتے ہیں، وہیں سرخ رنگ کا لکڑی سے بنا دو منزلہ مکان اولیور کی رہائش گاہ ہے۔"

"اولیور ان عورتوں کے بارے میں بتا سکتا ہے؟"

"شاید... لیکن میں تمہیں بتا دوں، وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ تمہیں دروازے سے ہی بھگا دے۔"

"میں کوشش ضرور کروں گا۔" خالد اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

لیکن جیکب کا اندیشہ درست نکلا.... کال بیل کے جواب میں اولیور کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ خالد کئی بار بیل بجا کر اور دس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد وہاں سے مایوس لوٹ آیا۔ اس نے رونن اور نتاشا سے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن صرف نتاشا سے ملاقات ہو سکی۔ رونن اسپتال میں تھا۔ نتاشا نے کہا۔ "نہیں، میں نے کبھی ان عورتوں کا نام نہیں سنا اور نہ ہی میرے علم میں ایسی کوئی بات ہے کہ انکل ہنری کا کسی عورت سے تعلق رہا ہو۔ جہاں تک میں جانتی ہوں، وہ عورتوں سے نفرت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ خاندان کی عورتوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔"

"اولیور مائز کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ممکن ہے ان کے پاس تمہارے سوال کا جواب ہو لیکن وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ اکثر گھر میں ہوتے ہیں اور کال بیل کا جواب بھی نہیں دیتے۔ خیالات کے لحاظ سے تم انہیں دوسرا انکل ہنری کہہ سکتے ہو۔"

"یعنی مذہبی انتہا پسندانہ خیالات اور عورتوں سے نفرت کے معاملے میں وہ ہنری کی طرح ہیں؟"

"میرا یہی خیال ہے۔" نتاشا نے جواب دیا۔ اب نتاشا کے انداز میں خالد کے لیے لگاوٹ نہیں تھی۔ وہ معمول کے انداز میں بات کر رہی تھی۔ شاید ایک ہی بار میں اسے خالد کی فطرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ "ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"نہیں، شکریہ! مجھے اب واپس جانا ہے۔" خالد نے انکار کر دیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اس سلسلے میں بہت محنت کر رہے ہو۔"

"میں اس کا معاوضہ لے رہا ہوں۔" خالد نے کہا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ وہ کیبن میں واپس آیا تو لیلیٰ واش روم میں تھی اور شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ گیلے بالوں سے پانی نچوڑتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے باتھ روب پہن رکھا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے خالد کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر دراز ہو گیا۔

"کام نہیں ہوا۔ جیکب اس نام کی عورتوں سے واقف نہیں ہے اور نہ ہی وہ یہ جانتا ہے کہ ہنری کے کن عورتوں سے تعلقات تھے۔ ویسے کام کی بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ ہنری مذہبی انتہا پسند تھا اور عورتوں سے نفرت کرتا تھا۔"

"مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے۔" لیلیٰ نے کہا۔ "یہ نمبروں والا معاملہ میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔"

"یہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، نمبر بائبل کی آیات کے نمبر ہیں۔ اصل اہمیت ان عورتوں کے ناموں کی ہے۔ ہنری کی بائبل میں ان کے نام کیوں لکھے ہیں؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" لیلیٰ نے سوچ کر کہا اور.... بیڈ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لباس بدل کر آئی۔ "ڈنر کا کیا ہوگا؟"

"ہم اسی ریستوران میں چلیں گے، وہاں کھانا اچھا ملتا ہے۔"

راستے میں خالد نے ریڈیو ٹیون کیا اور ایک جگہ سے بیتھوون کی سمفنی آ رہی تھی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہونے

لگا۔ لیلیٰ کچھ دیر سنتی رہی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر چینل بدل دیا۔ اس چینل سے اسپینش پاپ جاز آرہا تھا۔ اس نے وہی لگا دیا۔ خالد نے اسے گھور کر دیکھا اور کچھ دیر بعد دوبارہ بیتھوون کی سمفنی لگا دی۔ لیلیٰ کا موڈ آف ہوگیا اور اس نے جھنجلا کر ریڈیو ہی بند کر دیا۔ لیکن ڈنر کے وقت اس کا موڈ کسی قدر بحال ہوگیا۔ شاید اسے اپنے رویّے پر ندامت ہوئی تھی لیکن اس نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ کھانے کے بعد انہوں نے کافی لی۔ خالد نے اس سے پوچھا۔

''تم پیتی ہو؟''

''ہاں لیکن کبھی کبھی۔''

''اگر تم چاہو تو اپنے لیے کچھ منگوا سکتی ہو۔''

''نہیں، میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''تم پیتے ہو؟''

''نہیں، میں نے کبھی نہیں پی اور نہ آئندہ کے لیے ارادہ ہے۔'' خالد نے بل کی رقم پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ وہ تھک گیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ گرم پانی کا شاور لے کر سو جائے گا۔ لیلیٰ کیبن میں آتے ہی کمپیوٹر آن کر کے اس میں مصروف ہوگئی۔ خالد شاور لے کر آیا اور کمبل میں گھس کر لیٹ گیا۔ لیلیٰ نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم رات کو کام نہیں کرتے؟''

''جب تک مجبوری نہ ہو۔ میرا خیال ہے، رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے اور دن کام کے لیے۔''

لیلیٰ نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم خدا کا زیادہ ہی ذکر نہیں کرتے؟''

''ہاں کیونکہ اسی کا پیدا کیا ہوا ہوں۔'' خالد نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ''تم کیا کر رہی ہو؟''

''اب میں ان عورتوں کو انٹرنیٹ پر تلاش کر رہی ہوں۔''

خالد چونک کر بیٹھ گیا۔ ''وہ کیسے؟''

''دیکھو اگر ہنری نے ان عورتوں کا نام بائبل میں لکھا ہے تو اس کا امکان ہے کہ ان کے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش آچکا ہے۔ ممکن ہے یہ کوئی حادثہ ہو اور اس صورت میں اسے انٹرنیٹ پر تلاش کرنا آسان ہوگا۔''

خالد کمبل سمیت اس کے پاس چلا آیا۔ ''تم کیسے تلاش کرو گی؟''

''پہلے تو لبنان کی حد میں تلاش کروں گی۔'' وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر یہاں نہیں ملا تو دنیا میں تلاش کروں گی۔''

''لبنان کی حد میں کیسے تلاش کرو گی؟''

''پولیس ریکارڈ میں گھس کر۔'' وہ بولی۔ ''اب خاموش رہو۔''

لیلیٰ نے سگریٹ سلگا لیا اور پوری طرح کام میں مگن ہو گئی۔ خالد چھوٹے صوفے میں سمٹا ہوا اسکرین دیکھ رہا تھا۔ اس پر یکے بعد دیگرے مختلف پیجز کھل رہے تھے۔ لیلیٰ لبنان پولیس کے سینٹرل ریکارڈ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی اور اب وہاں ناموں کی مدد سے کیس فائلیں دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے جوش سے کہا۔ ''مل گئی۔''

خالد اٹھ کر آگے آیا۔ یہ ایک چھوٹی فائل تھی جس میں لبنان کی آزادی کے بعد وہ کیس تھے جو حل نہیں ہو سکے تھے۔ یہ تمام تر قتل کے کیسز تھے۔ ناموں کی ایک طویل فہرست تھی۔ ارمانہ کا نام شروع میں مل گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیلا، میگڈا، روبی اور شیلا کے نام تھے۔ لیلیٰ نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ''میرے خدا! یہ تمام عورتیں ماری جا چکی ہیں اور ان کے نام ہنری نے اپنی بائبل میں لکھے ہیں۔''

''یہ عورتیں کب اور کس طرح قتل ہوئی ہیں؟''

لیلیٰ پھر کام میں لگ گئی۔ چند منٹ بعد اس نے مزید چند فائلیں تلاش کر لیں۔ ان پانچ عورتوں کے کیسز کے بارے میں معلومات محدود تھیں لیکن جو تھیں، ان کے مطابق ان عورتوں کو آبرو ریزی کے بعد شدید نوعیت کے تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کیا گیا تھا۔ ان کو جلایا گیا تھا۔ ان کے اعضا کاٹے گئے تھے اور مختلف آلات سے انہیں مختلف قسم کے زخم لگائے گئے تھے... اور آخر میں ان کے منہ پر پلاسٹک شیٹ لپیٹ کر انہیں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے انیس سال کی ڈیلا کو ہلاک کیا گیا تھا۔ یہ قتل کوئی چالیس برس پہلے ہوا تھا۔ پھر ارمانہ اور باقی تین عورتیں ماری گئی تھیں۔ آخری عورت شیلا کوئی بتیس برس پہلے ماری گئی تھی۔ تاریخ بارہ فروری تھی۔ خالد غور سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور اس میں ہنری کی موت سے متعلق اسکین شدہ دستاویزات نکالیں۔ ان کے مطابق ہنری چودہ اپریل کے دن ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔ خالد نے کہا۔

''آخری عورت ہنری کے مرنے سے صرف دو مہینے پہلے ماری گئی تھی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، ہنری ان عورتوں کا قاتل تھا؟''

''ممکن ہے لیکن پہلے پولیس کے ریکارڈ کو دیکھنا ہوگا۔''





''کیا پولیس والے ایک صحافی کو ریکارڈ دکھا دیں گے؟''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

☆☆☆

علاقے کا پولیس چیف زید الکافی تقریباً پچپن برس کا اسمارٹ اور صحت مند شخص تھا۔ باریک ترشی مونچھوں اور نفاست سے بنے بالوں کے ساتھ وہ بہت تیز بین اور ذہین نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے گرم جوشی سے خالد اور لیلیٰ سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے جیکب مائر نے تمہارے بارے میں اطلاع دی تھی۔ ویسے بھی تمہارا نام اجنبی نہیں ہے۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھے چند کیسز کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔'' خالد نے کہا۔ ''آج سے چالیس سے بتیس برسوں کے درمیان شمالی لبنان میں کم سے کم پانچ خواتین کو تشدد آمیز قتل کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ان کے قاتل آج تک نہیں پکڑے جا سکے ہیں۔''

زید نے غور سے اسے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم روتھی مائر کی گم شدگی کا معما حل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''بالکل، یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔''

''تمہیں شبہ ہے کہ ان میں سے کوئی عورت اصل میں روتھی مائر تھی؟''

''نہیں، پولیس صرف قاتل کے بارے میں نہیں جان سکی ورنہ عورتوں کے بارے میں سب معلوم کر لیا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ تمام قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں جو شاید جنسی جنونی تھا اور اس نے ایک ہی طریقے سے ان عورتوں کو قتل کیا تھا۔''

زید چونک گیا۔ ''ہاں، مجھے یاد آگیا۔ ان میں سے ایک مرڈر میرے علاقے میں ہوا تھا۔ عورت کا نام شاید میگڈا تھا اور وہ یہودی تھی۔''

''تمام قتل ہونے والی عورتیں یہودی ہیں۔'' لیلیٰ بولی۔ ''یہ کسی مذہبی جنونی کا کام بھی ہو سکتا ہے۔''

''مذہبی جنونی۔'' زید نے گہری سانس لی۔ ''لبنان اس لحاظ سے دنیا کا مشکل ترین ملک ہے کہ یہاں نہ صرف تین الگ الگ مذاہب کے ماننے والے ملتے ہیں بلکہ ان مذاہب کے ذیلی فرقے بھی ہیں اور یہ سب آپس میں شدید قسم کے اختلافات بھی رکھتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق چالیس فیصد جرائم کا تعلق انہی اختلافات سے ہوتا ہے۔ میرا ابھی یہی اندازہ ہے کہ یہ قتل کسی مذہبی جنونی کا کام ہیں لیکن وہ کون ہے، اس کا اندازہ تقریباً ناممکن ہے۔ مسلمان یا عیسائی ہونا قرین قیاس ہے لیکن کوئی یہودی بھی قاتل ہو سکتا ہے۔''

''مجھے ان کیسز کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔''

''روتھی کیس سے ان کا کیا تعلق بنتا ہے؟''

''فی الحال تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی ایسا نکتہ مل جائے جس سے تعلق بن جائے۔''

زید نے ان کے لیے قہوہ منگوایا اور ساتھ میں فائل منگوائی۔ تمام قتل الگ الگ علاقوں میں ہوئے تھے۔ زید نے کہا۔ ''تمہیں متعلقہ پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ میں کال کر کے بتا دوں گا۔ وہاں کا انچارج تم سے مکمل تعاون کرے گا۔ میرے علاقے کا جو کیس ہے، اس کی فائل تم دیکھ سکتے ہو۔''

میگڈا ایک متوسط یہودی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جو کئی صدیوں سے یہاں آباد تھا۔ میگڈا مقامی ہائی اسکول کی طالبہ تھی اور قتل سے دو دن پہلے غائب ہوئی تھی۔ اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکا تھا۔ دو دن بعد اس کی عریاں اور ایک ٹانگ کٹی لاش نزدیکی جنگل سے ملی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اسے قتل کرنے سے پہلے کئی بار زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ زندہ حالت میں کسی تیز دھار آلے سے اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی تھی اور پھر اس کے منہ پر پلاسٹک لپیٹ کر اسے ہلاک کیا گیا تھا۔ پولیس قاتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ فائل واپس کر کے خالد نے زید الکافی کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکرایا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے... لیکن میرا خیال ہے تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ روتھی مائر کا کیس تیس سال پہلے بند ہوگیا تھا اور اب اس کے حل ہونے کی کوئی امید باقی نہیں ہے۔''

''جیکب مائر کو اب بھی امید ہے اور اس نے اسی امید پر مجھے ہائر کیا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا کوئی خیال نہیں ہے، بس میں کام کر رہا ہوں۔'' خالد نے کہا۔

وہ باہر آئے، گاڑی میں بیٹھتے ہوئے لیلیٰ بولی۔ ''پولیس چیف کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔''

''ظاہر ہے، وہ کیوں پسند کرے گا کہ جو مُردہ اپنے طور پر دفن کر چکا ہے، ہم اسے پھر سے اکھاڑتے پھریں۔''

اس دن وہ شمالی لبنان کے مختلف حصوں میں گھومتے

رہے اور ماری جانے والی باقی چار عورتوں کی پولیس تفتیش کی فائلیں دیکھیں۔ یہ تمام عورتیں بائیس سے سترہ سال کے درمیان میں تھیں۔ تمام متوسط یہودی گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور تمام اسکول میں پڑھتی تھیں یا پڑھ چکی تھیں۔ یہ عورتیں قتل ہونے سے دو تین دن پہلے غائب ہوئی تھیں اور ان کی لاشیں کسی نزدیکی جنگل سے ملی تھیں۔ واپس آتے ہوئے خالد شمالی لبنان کا ایک تفصیلی نقشہ لے آیا تھا۔ اس نے نقشہ بورڈ پر پن کر دیا اور اس پر پین سے ان مقامات پر نشانات لگائے جہاں عورتیں غائب ہوئی تھیں اور پھر ان کی لاشیں ملی تھیں۔ پھر اس نے مائر اسٹیٹ سے ان کا فاصلہ دیکھا۔

''ان میں سے کوئی جگہ مائر اسٹیٹ سے تیس میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔''

لیلیٰ بولی۔ ''کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان عورتوں کو ہنری نے قتل کیا ہے؟''

''اگر اس نے نہیں کیا ہے تو اس کے مرنے کے بعد ایسی لاشیں ملنا کیوں بند ہو گئی تھیں؟''

لیلیٰ نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''اگر یہ بات مان لی جائے تب بھی روتھی کی گم شدگی سے اس کا کیا تعلق بن سکتا ہے... وہ اپنے باپ کے مرنے کے دو سال بعد غائب ہوئی تھی۔''

''یہ ظاہر نہیں ہے لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اس کا روتھی کی گم شدگی سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔''

وہ رات کے لیے کھانا پیک کرا لائے تھے۔ خالد نے کھانا گرم کیا اور میز پر لگایا۔ لیلیٰ کو اس قسم کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کھانا کھایا۔ پھر خالد نے کافی بنائی اور وہ دونوں صوفوں پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ ''اس کام کے بعد تم پاکستان واپس چلے جاؤ گے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''ممکن ہے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے کئی برس تک کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور میں وہ کتابیں لکھ سکوں گا جو میں لکھنا چاہتا ہوں۔''

''یعنی تم صحافی رہنا چاہتے ہو؟'' لیلیٰ نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا۔ خالد نے اسے غور سے دیکھا۔

''تم کیا چاہتی ہو؟''

لیلیٰ نے اس سوال کا جواب صرف شانے اچکا کر دیا اور سگریٹ سلگا لیا۔ خالد نے کہا۔ ''تم اسموکنگ زیادہ کرتی ہو۔''

اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور میں اس بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتی۔''

''مرضی ہے تمہاری۔'' خالد نے شانے اچکائے۔ ''کینسر کا خطرہ تمہارے حصے میں آئے گا۔ ویسے تم بتا دو کہ تم اور کس کس بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتی ہو؟''

''کوئی دوسرا شخص میرے بارے میں بات کرے، یہ بھی مجھے ناپسند ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' خالد نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں ایک کام کے لیے ہائر کیا ہے لیکن میں تمہاری وجہ سے کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کیا تمہارے ماضی میں کوئی ایسی چیز ہے جو کسی طرح بھی میرے لیے مشکل کا باعث بنے؟''

لیلیٰ نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔ وہ بے چین نظر آنے لگی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ خالد نے پھر پوچھا۔ ''تم کس سے خوف زدہ ہو کر اپنے فلیٹ سے بھاگی تھیں؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' وہ تند لہجے میں بولی اور اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ خالد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح اس کی آنکھ حسبِ معمول چھ بجے کھل گئی اور وہ لباس تبدیل کر کے جاگنگ کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ موسم بدل رہا تھا۔ فروری کی آمد کے ساتھ ہی سردی میں کسی قدر کمی آئی تھی۔ پھر بھی یہ صبح نہایت سرد تھی۔ خالد واپس آیا تو لیلیٰ بدستور سو رہی تھی۔ وہ رات دیر تک جاگنے اور دیر سے سونے کی عادی تھی۔ خالد نے اپنے لیے کافی بنائی اور لیپ ٹاپ کھول لیا۔ اس نے روتھی کی تصاویر نکالیں۔ یہ تین تصاویر تھیں۔ اس نے ایک سافٹ ویئر کی مدد سے انہیں واضح کیا۔ پہلی تصویر میں روتھی سامنے دائیں طرف دیکھ رہی تھی، دوسری تصویر میں اس کے چہرے پر خوف نمایاں ہو رہا تھا اور تیسری تصویر میں وہ مڑ کر وہاں سے جانے لگی تھی۔ خالد نے محسوس کیا کہ یہ تصاویر ناکافی تھیں۔ پولیس نے جہاں سے یہ تصاویر حاصل کی تھیں، وہاں یقیناً اور تصاویر بھی ہوں گی مگر ریکارڈ کا حصہ بس یہی بنی تھیں۔ لیلیٰ اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آئی۔ اس نے خالد کے شانے سے جھک کر روتھی کی تصویر کو دیکھا۔

''یہ کسے دیکھ کر خوف زدہ ہوئی تھی؟'' خالد نے پوچھا۔

''قاتل کو دیکھ کر۔'' لیلیٰ نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔ خالد چونک اٹھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اب اس بات نے اس کے ذہن میں





کئی دریچے کھول دیے تھے۔ لیلیٰ کے واش روم سے آنے سے پہلے اس نے چند فون کالز کیں اور جب وہ واپس آئی تو خالد نے اس سے کہا۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ، ناشتا کر کے ہمیں مقامی میونسپل لائبریری جانا ہے۔''

انہوں نے مخصوص ریستوران میں ناشتا کیا اور پھر مقامی میونسپل لائبریری روانہ ہو گئے۔ یہ خاصی بڑی اور شان دار لائبریری تھی اور اس کی تعمیر اور کتابوں کی فراہمی میں مائر خاندان کا بڑا ہاتھ تھا۔ جیکب مائر اور روتھی مائر کا نام سن کر لائبریرین میتھر گولڈ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ روتھی مائر کا نام سن کر اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''روتھی بڑی پیاری بچی تھی۔ اسکول کے دنوں میں وہ کئی بار لائبریری آئی تھی۔ میں ان دنوں نیا نیا لائبریری میں آیا تھا اور اسسٹنٹ بنا تھا۔''

''پولیس چیف زید الکافی نے بتایا ہے کہ تمام تقریبات جو سرکاری طور پر ہوں یا ان میں کوئی سرکاری شخصیت ہو، اس تقریب کے فوٹو گرافس یہاں لائبریری میں محفوظ ہوتے ہیں۔''

''یہ درست ہے۔'' میتھر گولڈ نے سر ہلایا۔ ''یہاں ایک سیکشن صرف فوٹو گراف نیگیٹوز کا بھی ہے۔''

''ہمیں اس تقریب کے فوٹو گرافس چاہئیں جس میں مقامی گورنر اسکول اسناد کی تقسیم کے لیے آیا تھا۔ اس تقریب میں روتھی مائر کو سند دی گئی تھی اور وہ گروپ فوٹوز میں شامل ہے۔''

''مجھے یاد آ گیا۔ پولیس نے بھی اس تقریب کے فوٹو گرافس کے نیگیٹو لیے تھے، بعد میں یہ نیگیٹو لائبریری کو واپس مل گئے تھے۔''

خالد نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے اس تقریب کے مکمل فوٹو گرافس کے نیگیٹو درکار ہیں۔ میرا مطلب ہے، میں یہیں انہیں دیکھوں گا۔''

''یہاں نیگیٹوز دکھانے والا پروجیکٹر ہے لیکن وہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ تمہیں کھڑے ہو کر کام کرنا پڑے گا۔''

''کیا ہم ان کا ای پرنٹ لے سکتے ہیں؟'' لیلیٰ نے مداخلت کی۔ ''میرے پاس نیگیٹو سے پرنٹ اٹھانے والا اسکینر ہے۔''

میتھر گولڈ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ''اگرچہ میں اس کا مجاز نہیں ہوں لیکن مسٹر جیکب مائر کی وجہ سے میں تمہیں اس کی اجازت دے دوں گا۔''

''تم فکر مت کرو، ان نیگیٹوز کو ہم صرف تحقیق کے لیے استعمال کریں گے۔ یہ کہیں پیش نہیں ہوں گے۔'' خالد نے اسے تسلی دی۔

میتھر گولڈ انہیں لائبریری کے فوٹو گرافس والے حصے میں لے آیا۔ یہاں دیوار گیر شیلفس میں بڑے بڑے فولڈرز رکھے تھے۔ ان پر سال اور مہینے لکھے ہوئے تھے۔ میتھر گولڈ اس شیلف تک آیا جس میں تیس سال پہلے والے فوٹو گرافس کے نیگیٹوز تھے۔ اس نے ایک منٹ میں وہ فولڈر نکال دیا جس میں تقریب کے نیگیٹوز تھے۔ وہ انہیں نیگیٹوز دیکھنے والی مخصوص میز پر لایا اور انہیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ فولڈر میں شفاف پلاسٹک کے صفحے تھے جن میں نیگیٹوز محفوظ تھے۔ ہر صفحے پر کوئی سو تصاویر کے نیگیٹوز تھے اور تقریب کے کوئی دس صفحے بنتے تھے۔ یعنی ہزار کے قریب تصاویر لی گئی تھیں۔ لیلیٰ نے اپنے بیگ سے نیگیٹو اسکینر اور لیپ ٹاپ نکالا اور وہ پورے پورے رول اسکین کر کے کمپیوٹر میں منتقل کرنے لگی۔

## سگ گزیدہ

اسکاٹ لینڈ اور جنوبی انگلستان کے رہنے والوں میں چشمک رہتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ والوں کی کنجوسی کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا ہے مگر کہیں کہیں اسکاٹ لینڈ والے بھی ذہانت کی جھلک دکھا دیتے ہیں۔

اسکاٹ سے پوچھا گیا۔ ''تم تیرنا جانتے ہو؟''

جواب ملا۔ ''نہیں!''

''تم سے بہتر تو کتا ہے جو اچھی طرح تیرتا رہتا ہے۔''

اس چوٹ پر اسکاٹ بوکھلا گیا۔ سنبھالا لے کر اس نے لمحہ بھر بعد اپنے حریف سے پوچھا۔ ''کیا تم تیرنا جانتے ہو؟''

لندن کے باسی نے فخر سے کہا۔ ''بالکل... ہمارے خاندان میں بچے کو پیدا ہوتے ہی تیراکی سکھائی جاتی ہے۔''

''پھر تم میں اور کتے میں کیا فرق ہوا؟'' اسکاٹ نے طنز سے پوچھا۔

(پھالیہ-ذیشان احمد طارق کی تیزیاں)

لیلیٰ مستقل کے ساتھ نیگیٹوز کی کوالٹی بھی چیک کر رہی تھی۔ چیک کرنے کی وجہ سے انہیں کئی گھنٹے لگ گئے۔ لنچ کا وقت ہوا تو خالد اسے کام کرتا چھوڑ کر باہر کھانے کو کچھ لینے چلا گیا۔ وہ کھانا لے کر واپس آیا۔ انہوں نے باری باری کھایا اور اسکین کا کام جاری رکھا۔ شام سے ذرا پہلے یہ کام مکمل ہو گیا۔ وہ میسز گولڈ کا شکریہ ادا کر کے لائبریری سے نکل آئے۔ اس نے کہا۔ ”شکریے کی ضرورت نہیں ہے، تمہیں جس وقت بھی کام ہو تم لائبریری آسکتے ہو۔ یہ چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہے۔“

موسم بدل گیا تھا۔ تیز اور سرد ہوا چل رہی تھی اور آسمان سے روئی کے ٹکڑوں جیسی برف گرنے لگی تھی۔ لیلیٰ نے اوپر دیکھا۔ ”یہ شاید موسم کی آخری برف باری ہے۔“

”میں اتنے سرد موسم کا عادی نہیں ہوں۔ بچپن سے اب تک جن علاقوں میں رہا ہوں، وہاں تو سرما بھی مشکل سے آتا ہے۔ برف باری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”لیکن تمہارے ملک کے شمال میں موسم شدید ہوتا ہے اور یہاں لبنان سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن اس کی وجہ ہمالیہ کا سلسلہ ہے۔ شمال میں بلندی بہت زیادہ ہے اس لیے سردیاں شدید ہوتی ہیں۔ بعض علاقے تو ایسے ہیں جہاں چھ مہینے تک لوگ گھروں سے نکل نہیں سکتے کیونکہ برف ہوتی ہے۔“

لیلیٰ تصویروں کے لیے اتنی متجسس تھی کہ وہ راستے میں ہی لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔ پولیس ریکارڈ کی تین تصویروں کے علاوہ بھی گروپ اور اس کے منتشر ہونے کی کوئی ایک درجن تصویریں تھیں۔ آنے والی تصویروں میں سے دو میں روتھی پلٹ کر جاتی نظر آئی تھی۔ لیکن اس میں اور اس کے ساتھ دوسری تصویروں میں سڑک کے پار کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ کیبن واپس پہنچتے پہنچتے لیلیٰ تمام تصاویر دیکھ چکی تھی اور ان میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس نے صرف تین تصویریں چن کر اپنے ریکارڈ کا حصہ بنائی تھیں۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”اس میں تو کچھ نہیں ہے۔“

”اتنی جلدی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی انہیں دوبارہ دیکھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ نکل آئے گا۔“

برف باری ہلکی تھی لیکن اس کے ساتھ ہوا اتنی تیز تھی کہ طوفان کا گماں لگتا تھا۔ اسی مناسبت سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ٹھٹھرتے ہوئے کیبن میں پہنچے اور بھٹی کے سامنے بیٹھ کر جان میں جان آئی۔ لیلیٰ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”میں آج کسی صورت باہر نہیں جاؤں گی... کھانے کے لیے بھی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں، آج گزارہ کریں گے۔“ خالد نے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے کہا اور بلوٹوتھ سے لیلیٰ کے لیپ ٹاپ میں موجود تصاویر اپنے پاس ڈاؤن لوڈ کرنے لگا۔ پھر اس نے اٹھ کر کیتلی میں انڈے ابلنے کے لیے رکھ دیے۔ ڈبل روٹی موجود تھی، وہ سینڈوچز بنا سکتا تھا۔ لیلیٰ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”فرض کرو کہ ان پانچ عورتوں کے قتل کا ذمے دار ہنری ہے، تب بھی وہ روتھی کی گمشدگی کا ذمے دار نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں کیونکہ وہ روتھی کے غائب ہونے سے دو سال پہلے مر چکا تھا۔“ خالد نے ڈبل روٹی کاٹتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ جب سوچتی یا ٹینشن میں ہوتی تو سگریٹ سلگا لیتی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اس کا مطلب ہے معاملہ ہنری سے ہٹ کر ہے۔“

”ہمیں کسی نتیجے تک پہنچنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔“

”لیکن کوشش تو کرنی چاہیے۔“

”دیکھو، تم شاید صرف ہیکر ہو، صحافت اور تفتیشی صحافت بہت صبر آزما چیز ہے۔ اس میں نتیجہ حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ معما اتنا آسان ہوتا تو تیس سال سے لاینحل نہ ہوتا۔ اس لیے ہمیں جلد بازی سے گریز کرنا چاہیے۔“

خالد سینڈوچز کی پلیٹ اٹھا لایا۔ کھانے کے بعد جب وہ پلیٹ اٹھا رہا تھا تو لیلیٰ نے کہا۔ ”لاؤ، میں دھو دیتی ہوں۔ کافی ابھی پیو گے؟“

خالد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں بنانی آتی ہے؟“

”مجھے سب آتا ہے۔ میں اٹھارہ سال کی عمر تک جہاں رہی، وہاں مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی سب سیکھنا پڑا تھا۔“

”تم کہاں رہی تھیں؟“

لیلیٰ نے جواب نہیں دیا اور جا کر کافی کا پانی رکھ دیا پھر برتن دھونے لگی۔ خالد تصویریں دیکھنے لگا۔ اس دوران میں لیلیٰ نے اس کے لیے کافی لا کر رکھ دی اور خود بیڈ روم میں چلی گئی۔ ایک گھنٹے تک تمام تصویریں دیکھنے کے بعد خالد نے فیصلہ کیا کہ ان میں کام کی تصویریں صرف وہی تھیں جو گروپ کی تھیں اور ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ خالد نے ان تصویروں کو الگ کر لیا اور بار بار گھما کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس نے ممکن حد تک روتھی کا چہرہ واضح کیا۔ یہ اچھے معیار





کی تصویریں تھیں لیکن ان کے پکسل ایک حد سے آگے جا کر پھٹنے لگتے تھے۔ روتھی کا چہرہ بہت واضح نہیں تھا، اس کے باوجود اس کے تاثرات میں آنے والا خوف واضح محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ کس سے خوف زدہ تھی؟ اس نے سڑک کے دوسری طرف کسے دیکھا تھا؟ یہ خوف ہی تھا جو وہ فوراً وہاں سے چلی گئی اور پھر اس کے بعد ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔

خالد نے تصویروں کا سلائیڈ شو لگایا ہوا تھا اور یہ بار بار اسکرین پر آ رہی تھیں۔ اچانک اس کی توجہ ایک تصویر پر گئی۔ اس میں تصویروں والا گروپ منتشر ہو گیا تھا۔ لڑکے لڑکیاں پھیل گئے تھے اور ان میں سے بعض اب دوسروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ دوسرے اسکول فیلوز کے علاوہ تھے اور زیادہ تر رشتے دار تھے۔ اس تصویر میں روتھی کے سر کا ایک چھوٹا سا حصہ آیا تھا اور اس سے ذرا دور ایک مرد ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکا کھڑے تھے۔ لڑکے نے اسکول یونیفارم پہن رکھا تھا۔ یہ تینوں ایک گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ مرد کے ہاتھ میں ایک کیمرا تھا اور وہ آنکھ سے لگائے سڑک کے دوسری طرف کی تصویر لے رہا تھا۔ کم سے کم اس کے انداز سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ ان تینوں کے درمیان گاڑی کی نمبر پلیٹ تھی لیکن وہ تصویر میں بالکل بھی واضح نہیں تھی۔ اگلی تصویر میں وہ تینوں اسی گاڑی میں بیٹھتے دکھائی دیے تھے۔

خالد نے اسے واضح کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس حد تک صاف نہیں ہو سکی کہ اس پر لکھے ہندسے اور حروف سمجھ میں آ جاتے۔ خالد کے پاس تصویروں کے لیے جو سافٹ ویئر تھا، وہ اتنا کارآمد نہیں تھا اور وہ گرافک سافٹ ویئرز کا ماہر بھی نہیں تھا۔ اچانک اسے اپنے اخبار میں کام کرنے والے احمد شکیل کا خیال آیا۔ وہ گرافک ڈیزائننگ کے شعبے میں تھا اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ خالد کی اس سے بے تکلفی تھی کیونکہ دونوں پاکستانی تھے۔ اس نے تصویر شکیل کو ای میل کر دی اور اس سے کہا کہ وہ گاڑی کی نمبر پلیٹ واضح کر دے یا بتا دے۔ ای میل کر کے اس نے گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اٹھنے لگا تھا کہ بیڈ روم کی طرف سے لیلیٰ کے کراہنے اور رونے کی آواز آئی۔ وہ نیند میں تھی۔ خالد دبے قدموں بیڈ روم تک آیا اور آہستہ سے دروازہ کھولا۔ لیلیٰ کسی ننھی سی بچی کی طرح سمٹ کر لیٹی ہوئی تھی اور نیند میں بول رہی تھی۔ انداز رونے جیسا تھا، خالد صرف ایک جملہ سمجھ سکا۔

”میری ماما کو مت مارو... مت مارو...“

روتے روتے وہ چپ ہو گئی اور پھر شاید گہری نیند میں چلی گئی۔ خالد ایک گہری سانس لے کر پلٹ آیا۔ انسان اپنے اندر کیسی کیسی دنیائیں آباد رکھتا ہے اور اس کے بہت پاس رہنے والوں کو بھی ان دنیاؤں کا علم نہیں ہوتا۔ خالد کمبل لے کر صوفے پر لیٹ گیا اور کچھ دیر میں سو گیا۔ صبح وہ چھ بجے اٹھا، اس نے کپڑے بدلے اور باہر آ گیا۔ طوفان رات کسی وقت ختم ہو گیا تھا اور ہر طرف تازہ برف پڑی تھی۔ خالد عقبی جنگل کی طرف بڑھا۔ یہاں زمین کچی تھی لیکن خالد کو ایسی زمین پر جاگنگ کا مزہ آتا تھا۔ ناہموار راستوں پر دوڑتے ہوئے اس کا جسم ذرا دیر میں کہیں زیادہ ورزش کر لیتا تھا۔ اس جنگل میں زیادہ تر سدابہار درخت تھے جو ہر موسم میں سبز رہتے تھے۔ اس لیے یہاں آ کر سرما کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ خالد دوڑتا ہوا ایک چھوٹی پہاڑی کے دامن تک آ گیا اور یہاں ایک درخت سے ٹک کر ستانے لگا۔

ابھی وہ آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے لگا جیسے اس کی کنپٹی پر لوہے کی گرم سلاخ رگڑ دی گئی ہو۔ وہ پلٹ کر درخت کے ساتھ موجود گڑھے میں جا گرا جس میں برف کا پگھلا ہوا پانی موجود تھا۔ فوراً ہی کسی رائفل کے فائر کی آواز گونجی۔ فائر سامنے پہاڑی سے ہوا تھا۔ گرنے اور تکلیف کے باوجود خالد کو اتنا ہوش تھا کہ وہ گرتا پڑتا درخت کی آڑ میں چلا گیا ورنہ دوسرا فائر اسے چاٹ جاتا۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ کر چہرے پر آ رہا تھا۔ اس نے ذرا جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی کہ فائر کرنے والا کہاں ہے اور مرتے مرتے بچا۔ اس بار گولی اس کے چہرے کے سامنے سے گزر کر تنے سے لگی۔ وہ آڑ میں ہو گیا اور زمین پر بیٹھ کر پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی ایسی صورت حال نہیں تھی۔ ذرا پیچھے ہونے کے بعد وہ یک دم اٹھا اور تیزی سے بھاگا۔ اس بار بھی فائر ہوا اور گولی اس سے ذرا دور زمین پر لگی لیکن وہ رکا نہیں اور گرتا پڑتا جنگل سے نکل کر کیبن کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چولہے کے سامنے کھڑی لیلیٰ چونک گئی۔ اس کا خون سے تربتر چہرہ دیکھ کر وہ چیخ اٹھی۔

”یہ کیا ہوا؟“

”کسی نے جنگل میں مجھ پر فائرنگ کی ہے۔“ خالد نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا اور ٹھنڈے پانی کا نل کھول کر سر اس کے نیچے کر دیا۔ سرد ترین پانی نے جلد خون بند کر دیا لیکن خالد کی حالت خراب تھی۔ لیلیٰ نے جلدی سے اسے ٹب میں بٹھا کر گرم پانی کھول دیا۔ وہ خود سرد پانی میں

شرابور تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گرم پانی میں بیٹھا تو اسے کسی قدر سکون ملا۔ لیلیٰ اس کا زخم دیکھنے لگی۔ یہ لمبا اور کھال کو رگڑتا ہوا گیا تھا۔ خون معمولی سا رس رہا تھا۔ لیلیٰ نے روئی پر ٹنکچر لگایا اور اسے صاف کرنے لگی۔ خالد کی سسکاریاں نکل گئیں۔ چھوٹے تولیے سے سر خشک کر کے لیلیٰ نے زخم پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑکا اور چکنی پٹی رکھ کر اوپر سے ٹیپ کر دیا۔ اس نے خالد سے کہا۔

''تمہیں ٹانکے لگوانے پڑیں گے۔''

وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ''میرا موبائل کہاں ہے؟ میں پولیس کو رپورٹ کروں گا۔ ممکن ہے حملہ آور ابھی جنگل میں ہو۔''

''بیکار ہے۔'' لیلیٰ نے مخالفت کی۔ ''وہ اب تک جا چکا ہوگا۔''

لیکن خالد نے زید الکافی کو کال کر دی اور جب تک خالد نے کپڑے بدل کر کافی لی، زید الکافی اپنے آدمیوں سمیت وہاں آ گیا تھا۔ خالد نے اسے جنگل میں لے جا کر وہ جگہ دکھائی جہاں اس پر فائر ہوا تھا۔ پولیس کو صرف ایک جگہ درخت کے تنے میں دھنسی گولی ملی۔ زید نے اسے چاقو کی مدد سے نکالا اور بولا۔ ''بارہ بور کی ہے۔ یہاں شکاری عام طور سے اسی بور کی رائفل استعمال کرتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے، مجھ پر کسی نے حملہ نہیں کیا ہے۔ یہ کسی شکاری کی چلائی ہوئی گولیاں تھیں جو بھٹک کر میری طرف آ گئیں؟''

زید الکافی نے سر ہلایا۔ ''میرا یہی خیال ہے ورنہ تم خود سوچو تم پر یہاں کون حملہ کر سکتا ہے۔ خانہ جنگی کے بعد یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''لیکن مجھ پر حملہ ہوا ہے۔'' خالد نے اصرار کیا۔ ''تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں روتھی مائر کیس پر کام کر رہا ہوں اور ممکن ہے کوئی مجھے کام سے روکنا چاہتا ہو۔''

زید الکافی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اپنے تخیل سے کچھ زیادہ ہی کام لے رہے ہو، یہ صرف ایک حادثہ ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم واپس چلے جاؤ۔ روتھی مائر کیس میں کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' خالد نے سرد لہجے میں کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس چیف اسے حادثے سے زیادہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔ زید اپنے آدمیوں سمیت واپس چلا گیا۔ اس نے خالد کے اصرار پر اتفاقی واقعے کی رپورٹ لکھ لی۔ کچھ دیر بعد جیکب مائر کی کال آ گئی۔ خالد کیبن میں واپس آ گیا تھا۔ وہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کسی نے جان کر خالد پر حملہ کیا ہے۔ اس نے کہا۔

''بہتر ہوگا اب تم جنگل میں جانے سے گریز کرو۔ وہاں اکثر اناڑی قسم کے شکاری اندھا دھند فائرنگ کرتے رہتے ہیں۔''

''میں احتیاط کروں گا۔'' خالد نے سوچ کر کہا۔ ''مائر خاندان میں کسی کو شکار کا شوق ہے؟''

''ادلیور کو ہے لیکن میرا خیال ہے چند سال سے اس نے رائفل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہوگا۔''

''وہ کس بور کی رائفل استعمال کرتا ہے؟''

''اس کے پاس بارہ بور کی دو رائفلیں ہیں اور یہ خاصے عرصے سے اس کے پاس ہیں... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایسے ہی...''

''میں روئن کو کال کرتا ہوں کہ وہ آ کر تمہیں دیکھ لے۔'' جیکب نے کہا۔

''شکریہ۔'' خالد نے فون بند کر دیا۔ لیلیٰ صوفے پر دراز سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ تم پر حملہ ہوا ہے۔''

''شکر ہے کسی ایک فرد نے تو یقین کیا۔''

''اب ایسا لگ رہا ہے کہ روتھی مائر کی گمشدگی میں کوئی ایک فرد ملوث نہیں ہے بلکہ یہ ایک سے زیادہ افراد ہیں اور انہیں ابھی بھی معاملے کے افشا ہونے کا خوف ہے۔ اس لیے جب انہوں نے محسوس کیا کہ تم تفتیش میں ایک حد سے آگے بڑھ گئے ہو تو انہوں نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔''

''لیکن میں بچ گیا۔'' خالد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ ایک بار کوشش کر سکتے ہیں تو دوبارہ بھی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں۔'' لیلیٰ نے سگریٹ بجھا دیا۔ ''یا تو جیکب سے سوری کر کے یہاں سے چلے جاؤ یا بہت محتاط رہ کر اپنا کام جاری رکھو۔''

''تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

اس بار لیلیٰ ہچکچائی۔ ''میں کنفیوز ہوں... اگر بات میری ہوتی تو میں کبھی اس طرح سے میدان چھوڑ کر نہیں جاتی لیکن میں نہیں جانتی کہ تم کس طرح سوچتے ہو۔''

''اتفاق سے میری بھی یہی سوچ ہے۔ مجھے اپنی جان پیاری ہے لیکن جب معاملہ آن کا ہو تو پیچھے ہٹنا اچھا نہیں لگتا۔''





''بس تو تم بہت محتاط رہو۔'' لیلیٰ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ذرا کام ہے، کیا میں تمہاری گاڑی لے جا سکتی ہوں؟''

''لے جاؤ۔'' خالد نے اجازت دے دی۔ لیلیٰ چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور روئن اپنا میڈیکل بیگ اٹھائے اندر آیا۔

''یہ کیسے ہوا؟'' اس نے خالد سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

خالد اسے بتانے لگا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور کوئی اسے حملہ ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس دوران میں روئن اس کے زخم کا معائنہ کرتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر زخم صاف کیا اور اس پر تین عدد ٹانکے لگا دیے۔ یہ پٹی کے ساتھ لگنے والے ٹانکے تھے جو زخم کو ڈھانپ لیتی ہے۔ پھر اس نے خالد کو دو انجکشن دیے۔ ''ایک اینٹی سیپٹک ہے اور دوسرا ٹی ٹی کا ہے۔ زخم معمولی ہے، دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔''

خالد مسکرایا۔ ''اگر گولی ایک انچ بھی اس طرف ہوتی تو تم اس وقت میرے پوسٹ مارٹم کی تیاری کر رہے ہوتے۔''

روئن نے اپنا بیگ بند کیا۔ ''جو نہیں ہوا اس کا ذکر کرنے کا فائدہ بھی نہیں ہے۔ اچھا، میں دفتر سے اٹھ کر آیا ہوں، مجھے جانا ہے۔''

خالد اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ پھر اس نے کافی بنائی اور ای میل چیک کی۔ شکیل کی جوابی میل موجود تھی۔ اس نے تصویر واضح کر کے واپس نہیں کی تھی لیکن کسی طریقے سے گاڑی کا نمبر معلوم کر لیا تھا۔ وہ نمبر اسے میل کیا تھا۔ خالد نے زید الکافی کو کال کی۔ ''کیا کسی گاڑی کے نمبر کی مدد سے اس کے مالک کا نام اور پتا مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم نمبر بتاؤ۔''

خالد نے اسے نمبر بتایا۔ ''لیکن یہ نمبر کم سے کم تیس برس پرانا ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں گاڑیوں کے رجسٹریشن آفس میں ایک صدی پہلے کے نمبر بھی مل سکتے ہیں۔ میں دس منٹ میں بتاتا ہوں۔''

زید کا رویّہ اس سے سرد تھا لیکن وہ اس سے مکمل تعاون کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد اس نے سچ مچ اسے مالک کا نام اور پتا بتا دیا۔ نام احد مالک تھا اور وہ مائر اسٹیٹ سے کوئی بیس میل کی دوری پر ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا تھا۔ اس کا موجودہ اسٹیٹس نامعلوم تھا۔ اب خالد کو لیلیٰ کا انتظار تھا کہ وہ واپس آئے تو وہ دونوں اس قصبے میں جا کر گاڑی کے مالک سے ملیں۔ ممکن ہے، اس کے پاس وہ تصاویر محفوظ ہوں۔ لیلیٰ کی واپسی دوپہر تک ہوئی۔ وہ آتے ہوئے لنچ پیک کرا لائی تھی۔ خالد نے اسے پیش رفت سے آگاہ کیا۔ ''اب ہمیں اس قصبے تک جانا ہے اور گاڑی کے مالک سے ملنا ہے۔''

''ممکن ہے اس کی تصویروں سے ہمیں کوئی مدد مل سکے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مدد نہ مل سکے۔''

''دونوں امکانات ہیں۔'' خالد نے کہا۔ انہوں نے لنچ کیا اور روانہ ہو گئے۔ سڑکوں پر سے برف صاف کر دی گئی تھی لیکن پھر بھی کہیں کہیں برف موجود تھی اور خالد کو محتاط رہ کر ڈرائیونگ کرنا پڑ رہی تھی۔ یہ علاقہ زیادہ پہاڑی تھا۔ وہ ایک گھنٹے بعد مطلوبہ قصبے تک پہنچے۔ وہاں انہیں احد مالک کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی لیکن مکان تک رسائی سے پہلے انہیں پتا چل گیا تھا کہ احد مالک کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور اس مکان میں اس کی بیوہ رہتی ہے۔ اس کا بیٹا سعودی عرب میں کسی آئل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ احد مالک کی بیوہ سعدیہ نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور انہیں کچن میں لے آئی۔ اس نے گرم قہوے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھیں۔ اس گرم جوشی کی وجہ خالد کا جھوٹ تھا۔ اس نے بتایا کہ پندرہ سال پہلے اس کی احد مالک سے یہاں ملاقات ہوئی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے اس سے احد کا پتا گم گیا اور پندرہ سال تک یہاں آنا بھی نہیں ہوا۔

''مجھے بہت افسوس ہے، میرا خیال تھا کہ احد مجھے ملے گا۔ اس کی عمر تو زیادہ نہیں تھی؟''

''نہیں، وہ صرف پچپن برس کا تھا جب وہ جگر کے کینسر میں اس دنیا سے چلا گیا۔'' مسز احد نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے پہلے وہ پوری طرح صحت مند تھا۔ اسے معمولی بیماریاں بھی بہت کم ہوتی تھیں۔''

''ایک بار پھر میری طرف سے تعزیت قبول کریں۔''

مسز احد نے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔ ''لیکن اس نے کبھی مجھ سے آپ کا ذکر نہیں کیا؟''

''ہماری ایک ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔'' خالد نے کہا۔ ''دراصل ایک مشترکہ شوق اس ملاقات کی وجہ بنی تھی۔ مجھے بھی فوٹوگرافی میں دلچسپی ہے۔''

مسز احد نے سر ہلایا۔ ''احد بہت اچھا فوٹوگرافر تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار تصویریں لیں اور کئی بار اسے فوٹوگرافی کے مقابلے میں انعامات بھی ملے۔''

”مجھے معلوم ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا کلیکشن بہت اچھا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ جب یہاں آنے کا موقع ملا تو اس کا کلیکشن ضرور دیکھوں گا لیکن افسوس...“ خالد نے سرد آہ بھری۔

”ہاں، اب احد نہیں ہے۔“ مسز احد نے کہا۔ ”لیکن اس کی لی ہوئی تصاویر موجود ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اس کی البمز دکھا سکتی ہوں۔“

”کیوں نہیں، یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہو گی۔“ خالد نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔ مسز احد کے جانے کے بعد لیلیٰ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”تم اس بے چاری کو بے وقوف بنا رہے ہو۔“

”ہاں لیکن میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔“ خالد نے خشک لہجے میں کہا۔ کچھ دیر میں وہ چار عدد جہازی سائز البمز کے ساتھ لوٹ آئی۔ ان کا وزن اتنا تھا کہ وہ بہ مشکل انہیں سنبھالے ہوئے تھی۔ خالد نے اس کی مدد کی اور البمز لے کر میز پر رکھ دیے۔ پھر اسے مطلوبہ تصاویر تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگا اور اس دوران میں مسز احد سے ان تصویروں کی ساری تاریخ بھی سننا پڑی۔ بالآخر وہ مسز احد اور احد کے اکلوتے بیٹے کی ہائی اسکول کی سند کی تقریب تک پہنچے۔ خاتون نے اس کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے خالد کی نظریں تصاویر پر دوڑ رہی تھیں۔

پھر وہ ایک تصویر دیکھ کر چونکا۔ یہ یقیناً اس تقریب میں لی گئی تھی کیونکہ پیچھے اسکول کی عمارت نمایاں تھیں اور سند حاصل کرنے والوں کا گروپ فوٹو اس کے سامنے مخالف سمت میں ہوا تھا۔ اسکول کے سامنے تماشائیوں اور طلبہ کے ماں باپ اور دوسرے رشتے داروں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں ایک شخص نمایاں تھا۔ لمبے چہرے اور پیچھے کی طرف بنے بالوں کے ساتھ وہ کسی قدر دراز قد تھا۔ اس نے افقی دھاریوں والا سویٹر پہن رکھا تھا اور وہ براہ راست گروپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی سڑک کے دوسری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ خالد نے باریک بینی سے اس موقع کی ان چاروں تصاویر کا معائنہ کیا جو احد مالک نے سڑک کے دوسری جانب کی لی تھیں۔ پہلی دو تصویروں میں گروپ اپنی جگہ موجود تھا یعنی منتشر نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سڑک پار سے یہی شخص گروپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خالد نے ذہن میں پولیس ریکارڈ کی تصاویر کو واضح کیا اور اسے لگا کہ یہ عین ان لمحات کی تصاویر تھیں جب روتھی مائر خوف زدہ ہو کر گروپ سے نکل رہی تھی۔ منتشر ہونے والے دوسرے طلبہ کی پوزیشن تقریباً وہی تھی جو پولیس ریکارڈ کی تصویر میں تھی۔ فرق صرف تصاویر کے زاویے کا تھا۔ ان تصاویر میں بھی کوئی دوسرا فرد خاص طور سے گروپ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ مسز احد اس کی دلچسپی بھانپ گئی۔ اس نے خالد سے کہا۔

”لگتا ہے یہ تصاویر تمہیں اچھی لگی ہیں۔“

”ہاں، میں نے اتنے اچھے گروپ فوٹو گرافس کم ہی دیکھے ہیں۔ آپ کے شوہر واقعی اپنے کام کے ماہر تھے۔“

تعریف ایک ایسا ہتھیار ہے جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ مسز احد خوش ہو گئی اور جب خالد نے ان تصاویر کو اسکین کرنے کی اجازت مانگی تو وہ بلا جھجک مان گئی۔ اس نے بہت احتیاط سے تصویریں نکال کر اسے دیں۔ لیلیٰ نے انہیں اسکین کر کے کمپیوٹر میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ مسز احد کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر نکل آئے۔ لیلیٰ نے باہر آتے ہی کہا۔ ”مجھے اس معصوم عورت کو بے وقوف بنا کر اچھا نہیں لگا۔“

خالد کا اچھا موڈ خراب ہو گیا۔ ”تب تم واپس جا کر اسے اصل بات بتا کر معافی مانگ سکتی ہو۔“

لیلیٰ چپ ہو گئی۔ راستے میں اس نے اچانک خالد سے پوچھا۔ ”تم رات بیڈ روم میں آئے تھے؟“

”صرف دروازے تک۔“ خالد نے وضاحت کی۔ ”تم رو رہی تھیں اور شاید سوتے میں اپنی ماں کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔“

لیلیٰ باہر دیکھنے لگی پھر اس نے اچانک خالد کی طرف مڑ کر اس کا بازو پکڑا۔ ”سنو، آئندہ جب میں سو رہی ہوں تو... بیڈروم میں مت آنا۔“

خالد نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور تند لہجے میں بولا۔ ”مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے۔ اگر تمہیں کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے تو مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

اس کے بعد راستہ خاموشی سے کٹا۔ خالد کو اپنے سخت رویے پر افسوس تھا لیکن اس نے لیلیٰ سے معذرت نہیں کی۔ ریستوران پر رک کر اس نے کھانا پیک کرایا۔ لیلیٰ گاڑی میں بیٹھی سگریٹ پھونکتی رہی۔ کیبن میں پہنچ کر خالد لیپ ٹاپ کھول کر ان تصویروں کا معائنہ کرنے لگا جو اس نے مسز احد کے شوہر کی البم سے حاصل کی تھیں۔ اس نے پرنٹر سے ممکن حد تک واضح کر کے تصویروں کو پرنٹ کیا۔ پھر انہیں بورڈ پر روتھی کی گروپ تصویروں کے ساتھ لگا دیا۔ آمنے سامنے دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے روتھی اسی شخص کو دیکھ کر وہاں سے نکلی تھی۔ اس شخص کا انداز خود کو نمایاں کرنے والا تھا جیسے وہ روتھی کو





دکھانا چاہ رہا ہو کہ وہ وہاں موجود ہے۔ خالد نے گہری سانس لی۔ انہیں نشان ملا تو وہ بھی ادھورا تھا۔ تصویر میں اس آدمی کا چہرہ واضح نہیں تھا۔ بس اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ تیکھے نقوش کا جوان عمر کا آدمی ہے۔ اس کی عمر پچیس سے تیس کے درمیان میں ہو سکتی تھی۔ اس نے تصویر شکیل کو ای میل کر دی اور اس سے کہا کہ وہ اس شخص کا چہرہ نمایاں کرنے کی کوشش کرے۔ شکیل رات بارہ بجے تک اخبار کے دفتر میں رہتا تھا اور اس کے بعد اپنے گھر میں تقریباً صبح تک کمپیوٹر پر بیٹھا رہتا تھا۔ لیلیٰ بیڈ روم میں تھی، کچھ دیر بعد وہ وہاں سے نکلی۔

”اگر پتا چل جائے کہ یہ کون ہے، تب بھی اس سے روتھی کی گم شدگی کا معما حل نہیں ہو گا۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ خالد نے کہا۔ ”کوئی بھی معما مرحلہ وار ہی حل ہوتا ہے۔ اگر ہمیں پتا چل جائے کہ یہ شخص کون ہے تو بہت ساری چیزیں سامنے آ سکتی ہیں کہ روتھی اس سے خوف زدہ کیوں تھی۔ ممکن ہے اس سے اس کے انجام پر بھی روشنی پڑے۔“

”میرا تو یہ خیال ہے کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو تم جا سکتی ہو۔ اس طرح کم سے کم تمہارا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔“

لیلیٰ کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر... بیڈروم میں چلی گئی۔ خالد کو محسوس ہوا کہ وہ ابھی بیگ اٹھائے گی اور کیبن سے نکل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بیڈ روم میں گھسی رہی اور سگریٹ پیتی رہی کیونکہ اس کا دھواں باہر تک آ رہا تھا۔ خالد کا کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ وہ کافی پی کر صوفے پر دراز ہو گیا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی کے بعد اس کی چوٹ والی جگہ شدت سے دکھنے لگی تھی۔ اس کے پاس پین کلر گولیاں تھیں۔ اس نے دودھ کے ایک گلاس کے ساتھ دو گولیاں لیں۔ بھٹی میں مزید لکڑی ڈالی اور روشنی بجھا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی وقت اسے نیند آ گئی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کمبل پر بوجھ سا آ گیا ہے۔ وہ کچھ دیر لیٹا رہا پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ لیلیٰ تھی جو صوفے پر سکڑ سمٹ کر آ گئی تھی اور تقریباً اس پر لدی ہوئی تھی۔

”یہ... یہ کیا حرکت ہے؟“ خالد نے ہکلا کر پوچھا۔

جواب میں لیلیٰ اس کے کمبل میں آ گئی۔ خالد جلدی سے صوفے سے اتر آیا۔ اس نے روشنی کی تو لیلیٰ سرخ آنکھوں اور خشک ہونٹوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ خالد نے اس کے لیے جگ سے پانی نکالا اور اپنے ہاتھ سے پلایا۔ وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ خالد نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”لیلیٰ! کیا بات ہے؟ اگر تمہیں کوئی پریشانی ہے تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔“

اس نے ویران نظروں سے خالد کی طرف دیکھا۔

”میں بہت اکیلی ہوں... میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہے، خدا نے کسی شخص کو اس دنیا میں اکیلا نہیں چھوڑا ہے۔ ہر آدمی کے لیے کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔“

”میرے لیے کوئی نہیں ہے۔“

”یہ کہنے کے بجائے تم اپنے لیے اس فرد کو تلاش کرو جو تمہارے لیے ہو۔ لیکن یہ تم نے کیا حرکت کی تھی؟“

”شاید میں نے اس فرد کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن تمہارے ردِعمل نے بتا دیا کہ تم وہ شخص نہیں ہو۔“ وہ کہتے ہوئے بہت تلخ انداز میں ہنسی۔

”لیلیٰ! میں جس معاشرے کی پیداوار ہوں، وہاں مرد عورت کا اس قسم کا تعلق قابلِ قبول نہیں ہے۔ میرا ردِعمل میری تربیت کے مطابق ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں ناپسند کرتا ہوں۔ تمہیں شاید کوئی ناپسند نہیں کر سکتا۔“

”تب تم میری طرف توجہ کیوں نہیں دیتے؟“ لیلیٰ کے لہجے میں شکوہ تھا۔ ”کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“

”تم خوب صورت ہو لیکن میں سمجھتا تھا کہ تمہیں خود پر کسی کا توجہ دینا اچھا نہیں لگتا۔“

”حالانکہ میں بھی انسان ہوں۔“

”اس کے لیے تمہیں اس خول سے باہر آنا ہو گا جو تم نے خود پر چڑھا رکھا ہے، تب ہی میں یا کوئی بھی فرد تمہیں نارمل انسان کے طور پر لے سکے گا۔“

لیلیٰ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کس سے؟“

”سب سے... میں باجد مائیکل سے بھی ڈرتی ہوں۔“

”باجد مائیکل کون ہے؟“

”میرا گارجین ہے۔“

خالد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہارا گارجین...؟ تمہیں گارجین کی کیا ضرورت ہے؟“

”عدالت کے خیال میں مجھے گارجین کی ضرورت ہے۔ میں خود اپنے معاملات کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔“

”میرے خیال میں تو تم میں ایسی کوئی کمی نہیں ہے۔“

”یہ تو تمہارا خیال ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”میرے نام نہاد سرپرستوں کا خیال اس سے مختلف ہے۔ میرے نام

کے اکاؤنٹس میں بہت بڑی دولت ہے لیکن میں اس میں سے ایک نوٹ بھی اپنی مرضی سے نہیں نکلوا سکتی۔ ایک پینٹ ہاؤس اور دوسری جائداد ہے، وہ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟"

"نہیں، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"ماجد مائیکل سے تمہیں کیوں ڈر لگتا ہے؟"

"وہ ایک ہوس زدہ شخص ہے۔" لیلیٰ نے کہا اور پھر خالد کو خود پر گزرنے والی سنائی۔ وہ کس طرح خود کو اس سے بچا کر بھاگی تھی۔ "تم بار بار میرے نمبر پر کال کر رہے تھے اور وہ موبائل کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا اس لیے مجھے اس پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ تم پر اعتماد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تمہارے کال کرنے کی وجہ سے میں بچ گئی۔"

"تم پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ کروا سکتی ہو۔"

لیلیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری کوئی نہیں مانے گا۔ وہ ثابت کر دے گا کہ میں نفسیاتی مریض ہوں۔"

"تب تم پہلے کسی اچھے ماہرِ نفسیات کے پاس جاؤ۔ اس سے اپنا مکمل چیک اپ کراؤ اور جب وہ تمہیں صحت یاب قرار دے دے تو اس کا سرٹیفکیٹ لے کر عدالت جاؤ۔"

"جب تک عدالت کے ماہرین مجھے صحت یاب قرار نہیں دیں گے، مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ لیکن عدالت میں جانے کے لیے بہت ساری رقم کی ضرورت ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اسی لیے تو میں روتھی مارٹیس کی طرف متوجہ ہوئی۔"

"تم کوشش تو کرو... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ یہاں لبنان میں میرے جاننے والے صحافی ہیں۔ وہ تمہارے لیے مہم چلائیں گے تو تمہیں تمہارا حق مل جائے گا۔"

لیلیٰ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ "میں اس بارے میں غور کروں گی۔"

"گڈ! اب تم جا کر سو جاؤ۔ اگر نیند نہیں آ رہی ہے تو دودھ گرم کر کے پی لو، نیند آ جائے گی۔"

لیلیٰ کھڑی ہوئی پھر خالد کے سینے سے لگ گئی۔ "تم ان تمام لوگوں میں سب سے اچھے ہو جن سے میں آج تک ملی ہوں۔"

لیلیٰ اس سے جدا ہوئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ لیلیٰ خوب صورت اور دلکش لڑکی تھی۔ اس کا قرب کسی بھی مرد کو بے قابو کرنے کے لیے کافی تھا۔ خالد کو خود پر اعتماد تھا لیکن وہ کسی آزمائش میں پڑنے سے ڈرتا تھا۔ صبح وہ جاگنگ کے لیے ضرور نکلا لیکن جنگل کی طرف جانے کے بجائے اس نے اسٹیٹ کا رخ کیا۔ چیک پوسٹ پر موجود گارڈز نے اسے آگے جانے دیا۔ وہ جاگنگ کرتا ہوا اسٹیٹ کے رہائش والے حصے میں پہنچا۔ یہاں اس نے بوڑھے اولیور کے دو منزلہ سرخ کاٹیج کا معائنہ کیا۔ برف کی وجہ سے اس کی چھت کی سرخی چھپ گئی تھی۔ البتہ دیواروں کا رنگ نمایاں تھا۔ خالد کو حیرت ہوئی، عام طور سے لوگ یہ رنگ پسند نہیں کرتے لیکن اولیور نے پورے مکان پر خون جیسا سرخ رنگ کرایا تھا۔ وہ ذرا آگے آیا تو اسے جیکب کے ولا کے سامنے ایمبولینس اور چند دوسری گاڑیاں دکھائی دیں پھر ولا سے ایک اسٹریچر لا کر ایمبولینس میں رکھا گیا اور وہ سائرن بجاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ خالد کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی سے اوپر پہنچا تو نتاشا، رونن اور چند دوسرے لوگ موجود تھے۔ خالد نے نتاشا سے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"جیکب انکل۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہارٹ اٹیک ہے، شدید قسم کا۔ ڈاکٹر انجیو پلاسٹی کا کہہ رہا ہے۔"

"ہے نتاشا۔" ایک شخص نے نتاشا کو آواز دی تو وہ اس کی طرف چلی گئی۔ وہاں خاندان کے لوگ تھے۔ خالد خود کو اس ماحول میں مس فٹ محسوس کر رہا تھا اس لیے پلٹ آیا۔ وہ کہیں رکا نہیں۔ واپس آیا تو لیلیٰ جاگ گئی تھی اور ناشتا تیار کر رہی تھی۔ خالد نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ بہت لمبی جاگنگ نے اس کا حشر کر دیا تھا اور وہ خاصی دیر صوفے پر پڑا ہانپتا رہا۔ سانس قابو میں آنے کے بعد اس نے اپنی ای میل چیک کی تو اس میں شکیل کی میل موجود تھی۔ اس نے تصویر میں موجود شخص کا چہرہ ممکن حد تک واضح کر کے بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ ابھی اتنا واضح نہیں تھا کہ خدوخال صاف نظر آتے لیکن پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ شکیل نے بتایا کہ اس سے زیادہ واضح کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیلیٰ نے ناشتا لا کر رکھا۔

"آج کے لیے کیا ارادہ ہے؟"

"آج میرا ارادہ رات کے وقت اولیور کے گھر کی سیر کا ہے۔"

"غیر قانونی طور پر؟"

"ہاں کیونکہ وہ ویسے کسی کو گھسنے نہیں دیتا۔"

"یہ خطرناک ہوگا۔" لیلیٰ فکرمند ہو گئی۔





"ہاں لیکن اتنا نہیں۔ اگر بات بگڑی تو جیکب سنبھال لے گا۔" خالد نے کہا تو اسے خیال آیا اور اس نے لیلیٰ کو بتایا۔ "جیکب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسے ابھی اسپتال لے جایا گیا ہے۔"

"اوہ... تب تم کیا کرو گے؟"

"اپنا کام کروں گا۔" خالد نے شانے اچکائے۔ "جیکب مر جاتا ہے یا مجھے اس کام سے منع کر دیتا ہے، تب ہی میں رک سکتا ہوں۔ تم کیا کرو گی؟"

"کام۔" لیلیٰ مسکرائی۔ "آج میں لائبریری جاؤں گی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے لیکن پہلے میں اس پر عمل کر کے دیکھ لوں۔ اگر بات بنی تو میں تمہیں بتاؤں گی۔"

"سسپنس!" خالد ہنسا۔ "لیکن تم جاؤ گی کیسے؟ گاڑی تو ایک ہے... میں جیکب مائر کو دیکھنے اسپتال جاؤں گا۔"

"میں کوئی دوسری کار کرائے پر لے لوں گی۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" خالد نے سر ہلایا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ لیلیٰ کے ساتھ نکلا۔ جہاں سے اس نے یہ گاڑی کرائے پر لی تھی، اسی رینٹ اے کار سے لیلیٰ کے لیے ایک چھوٹی کار کرائے پر لی۔ لیلیٰ وہیں سے لائبریری کی طرف روانہ ہو گئی۔ خالد نے رونن سے رابطہ کیا۔ "مسٹر جیکب کس اسپتال میں ہیں؟"

رونن نے اسے اسپتال کا پتا سمجھایا۔ "انکل کی انجیو پلاسٹی ہو چکی ہے اور ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔"

خالد اسپتال پہنچا تو جیکب مائر کو کچھ دیر پہلے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا لیکن جاگ رہا تھا۔ خالد کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "فکر مت کرو... روتھی کے بارے میں جانے بغیر مجھے موت نہیں آئے گی۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے کہ آپ ابھی خاصے عرصے زندہ رہیں گے۔"

جیکب مائر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اب جینا نہیں چاہتا، میں بہت تھک گیا ہوں۔"

"لیکن کوئی شخص اس وقت سے پہلے دنیا سے نہیں جا سکتا جو اس کے لیے مقرر ہے۔"

"میں جانتا ہوں... اس لیے صبر سے اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"آپ آرام کریں، میں بس آپ کو دیکھنے آیا تھا۔"

جیکب نے سر ہلایا۔ "خالد! اگر میں زندہ نہ رہوں، تب بھی تم نے یہ کام جاری رکھنا ہے۔ میں نے وکیل شہاب علی کو ہدایت کر دی ہے۔ تمہیں یہ کام اس وقت تک جاری رکھنا ہے جب تک تم خود کو ناکام محسوس نہ کر لو۔"

"ایسا نہیں ہوگا مسٹر مائر... جلد میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔ کچھ نئی پیش رفت ہوئی ہے۔ جب آپ گھر آ جائیں گے تو میں اس بارے میں بتاؤں گا۔"

خالد جانے کے لیے مڑا تو اس نے دروازے پر رونن کو موجود پایا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "کیسے ہو مسٹر خالد... میں یہیں انکل کے ساتھ ہوں۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" خالد اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، مسٹر مائر کے بارے میں؟"

"فی الحال حالت بہتر ہے لیکن دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اگر انہوں نے احتیاط نہیں کی تو کسی وقت بھی دوسرے ہارٹ اٹیک کا خطرہ موجود ہے۔"

"کیا یہ بات مسٹر مائر کے علم میں ہے؟"

"نہیں، ابھی ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔" رونن اس کے ساتھ پارکنگ تک چلا آیا۔ "ساری دنیا سے مائر خاندان کے لوگ آج شام تک اسٹیٹ پہنچ رہے ہیں۔"

"اوہ۔"

رونن تلخی سے بولا۔ "انہیں انکل کی پروا نہیں ہے، وہ اسٹیٹ کے لیے فکرمند ہیں۔"

خالد نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم نہیں ہو... اگلا سربراہ تمہیں ہی بننا ہے۔"

رونن نے گہری سانس لی۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ انکل جیکب بہت دنوں تک زندہ رہیں۔ کاش! یہ وصیت کا چکر نہ ہوتا۔"

خالد واپس چلا آیا۔ شام تک وہ دستاویزات میں الجھا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ نئی پیش رفت کی روشنی میں شاید ان دستاویزات کو دیکھنا مفید رہے گا مگر وہ کوئی خاص نکتہ تلاش نہیں کر سکا۔ لیلیٰ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ خالد نے اسے کال کی تو اس نے کہا کہ شاید اسے دیر ہو جائے، وہ کام میں الجھی ہوئی ہے۔ سات بجے خالد کو رونن کی کال آئی۔ "کیا تم نو بجے انکل جیکب کے ولا آ سکتے ہو؟ فیملی کے لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں آ سکتا ہوں لیکن معاملہ کیا ہے؟"

رونن ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مام سمیت کوئی اس تفتیش کو پسند نہیں کر رہا ہے۔ وہ اسی بارے میں تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"یعنی مجھے روکنا چاہتے ہیں؟" خالد نے سوچتے

ہوئے کہا۔ ”لیکن اس سے فائدہ ... مجھے کام پر مسٹر جیکب نے لگایا ہے، وہی مجھے منع کر سکتے ہیں۔“

”میں یہ بات سمجھتا ہوں لیکن وہ لوگ تو نہیں سمجھتے۔ ممکن ہے تمہیں سخت لہجے سننے کو ملیں۔“

”تم فکر مت کرو، ایک صحافی کی حیثیت سے مجھے لوگوں کے لہجے برداشت کرنے کی عادت ہے اور میں ان کو جواب بھی دے سکتا ہوں۔“ خالد نے کہا اور فون بند کر دیا۔ آج اس نے لنچ نہیں کیا تھا اس لیے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے جیکب کے ولا جانے سے پہلے کھانے کا فیصلہ کیا۔ ریستوران سے ڈنر کر کے وہ ولا کی طرف روانہ ہوا۔ آج ولا کے پورچ میں کوئی درجن بھر گاڑیاں موجود تھیں اور ان میں سے بیشتر گاڑیوں میں ڈرائیور بھی تھے۔ لگ رہا تھا کہ مائر خاندان کے تمام بڑے آگئے ہیں۔ بٹلر نے خالد کو نشست گاہ تک پہنچایا جہاں یہ تمام بڑے موجود تھے۔ انہوں نے خشمگیں نظروں سے خالد کا استقبال کیا۔ کسی نے ذرا بھی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ جو اسے خشمگیں نظروں سے نہیں دیکھ رہے تھے، ان کے چہرے بے تاثر تھے۔ خالد نے نوٹ کیا کہ ان میں بوڑھا اولیور نہیں ہے۔ کسی نے اسے بیٹھنے کو نہیں کہا اس لیے وہ کھڑا رہا۔ پہل ایک طویل قامت بوڑھے نے کی، وہ کرخت لہجے میں بولا۔

”مسٹر خالد! تم یہ کیا کر رہے ہو؟“

”میں وہ کر رہا ہوں جو مجھے مسٹر جیکب مائر نے کہا ہے۔“

”جیکب بیمار ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ خالد نے اس بار بے پروائی سے کہا۔ ”مسٹر جیکب اور میرا خیال مختلف ہے۔“

”سنو جوان آدمی۔“ اس بار روتھی کی ماں شمیل نے کہا۔ صورت کی طرح اس کا لہجہ بھی سخت تھا۔ ”روتھی میری بیٹی تھی اور میرے خیال میں اب اس کی تلاش بے مقصد ہے، وہ زندہ نہیں ہے۔“

”مسٹر جیکب کا بھی یہی خیال ہے لیکن وہ جاننا چاہتے ہیں کہ روتھی مائر کے ساتھ کیا ہوا تھا۔“

”لیکن ہم نہیں جاننا چاہتے۔“ شمیل کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ”یہ واقعہ اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اب اس کی راکھ کریدنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

خالد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہت معذرت کے ساتھ مادام... انسان ہزاروں سال پرانی مسٹریز بھی جاننا چاہتا ہے، یہ تو صرف تیس سال پہلے کی بات ہے۔ اور روتھی مائر کے تمام ہی نزدیکی رشتے دار بھی موجود ہیں۔“

”ان میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ اس معاملے کو دوبارہ چھیڑا جائے۔“

”میں نہیں جانتا کہ باقی لوگ کیوں نہیں چاہتے کہ روتھی مائر پر گزرنے والے واقعے کا سراغ لگایا جائے۔“ خالد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن مسٹر جیکب چاہتے ہیں۔“

وہاں موجود لوگ خالد کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ وہ جیکب مائر سے معذرت کر لے اور یہ کام چھوڑ کر چلا جائے۔ ڈھکے چھپے انداز میں اسے پیش کش بھی ہوئی کہ اسے نقصان نہیں ہو گا بلکہ اسے اس کے تصور سے بھی زیادہ دیا جائے گا۔ مگر خالد اپنی جگہ جما رہا۔ آخر شمیل نے اپنے پرس سے ایک چیک نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس رقم سے تمہاری تسلی ہو جائے گی۔“

خالد نے چیک لے کر دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ ایک بین الاقوامی بینک کا چیک تھا اور اس پر ایک ملین ڈالرز کی رقم درج تھی۔ گویا شمیل اسے انعامی رقم دے رہی تھی، اگر وہ کام سے انکار کر دے۔ اس نے سوچا اور چیک واپس مادام شمیل کی طرف بڑھا دیا۔ ”اگر یہ کام کا انعام ہے تو کام میں نے ابھی کیا ہی نہیں ہے... اور اگر اس سے ہٹ کر ہے تو میں معذرت چاہوں گا۔ میں نے آج تک کبھی سے اس طرح رقم وصول نہیں کی۔ رقم کمانے کے معاملے میں میرے کچھ اصول ہیں۔“

شمیل کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا۔ خالد باہر نکل آیا۔ اس کا دوران خون تیز ہو گیا تھا اور باہر آنے کے باوجود اسے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ گہرے سانس لے کر اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ رونن بھی اس کے پیچھے آیا۔ اس نے خالد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”مجھے افسوس ہے لیکن مجھے یہی اندیشہ تھا۔“

”تم فکر مت کرو، میں دوران ملازمت اس سے بھی زیادہ بُرے حالات دیکھ چکا ہوں لیکن مجھے تمہاری فیملی کے لوگوں پر حیرت...“

”حیرت فضول ہے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک اصل اہمیت اسٹیٹس اور دولت کی ہے۔ رشتوں کی اہمیت یہ بہت پہلے بھول چکے ہیں۔“ رونن نے تلخی سے کہا۔ ”تم ان کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھو۔“

رونن اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد نتاشا نکلی۔ وہ خالد کو دیکھ کر ٹھٹکی پھر اس کی طرف آئی۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ خالد ہنسا۔ ”تمہاری کافی کی آفر برقرار ہے؟“

نتاشا کھل اٹھی۔ ”کیوں نہیں۔“

”اگر گاڑی نہیں ہے تو میرے ساتھ آجاؤ۔“

”میں آج بھی پیدل ہی آئی تھی۔“ نتاشا نے بتایا، دونوں گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

لیلیٰ کو لگ رہا تھا کہ اس کی کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی ہے۔ وہ تقریباً چھ گھنٹے سے تصاویر دیکھنے والے اسٹینڈ کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور کام کھڑے رہ کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ اس چھوٹی سی راہداری میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ اسٹول رکھا جاتا۔ اس نے جب لائبریرین میٹر گولڈ کو مطلوبہ تصویروں کے بارے میں بتایا تو اس نے نیگیٹو فولڈرز کا ایک ڈھیر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اب وہ ان میں سے فوٹوز کھنگال رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے خالد نے اس سے واپسی کا پوچھا تھا لیکن وہ اپنا اطمینان کر کے ہی واپس جانا چاہتی تھی۔ دوپہر کو اس نے کھڑے کھڑے ہلکا پھلکا کھایا تھا اور اس وقت اس کا بھوک سے برا حال تھا لیکن باہر کھانے پینے کے تمام اسٹال بند ہو چکے تھے۔ اب اسے واپسی میں کسی ریستوران سے ہی کچھ مل سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سامنے کوئی درجن بھر فولڈرز کا ڈھیر تھا۔ اس نے تھکی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور ایک فولڈر اٹھا لیا۔

☆☆☆

نتاشا کی آنکھوں کا خمار گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے خالد کے لیے کافی بنائی لیکن اپنے لیے وہسکی نکال لائی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک تہائی بوتل خالی کر دی تھی۔ خالد کو اس کی بلانوشی پر حیرت تھی۔ اس نے خالص وہسکی پی تھی اور ابھی تک ہوش و حواس میں تھی۔ بس اس کے لہجے میں ایک اچھل کرتی ترنگ آگئی تھی اور وہ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ وہ خالد کو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس نے کالج اور یونیورسٹی کے دور میں دو بار محبت کی تھی اور دونوں بار یہ تجربہ ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے شادی کی اور چند مہینوں بعد وہ پھر سے اکیلی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے شادی کا تجربہ دہرانے کی ہمت نہیں کی۔

”شادی ایک وبال ہے۔“ اس نے خالد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”انسان اس کے بغیر بھی اپنی خواہشات پوری کر سکتا ہے۔“

”ہاں لیکن اس صورت میں انسان اور جانور میں فرق نہیں رہ جاتا۔“ خالد نے نرمی سے کہا۔

”کم آن۔“ نتاشا ہنسی۔ ”یہ کتابی باتیں ہیں۔“

”کتابیں انسان کے بعد آئی ہیں اس لیے یہ ٹھیک کہتی ہیں۔ انسان جو محسوس کرتا ہے، وہی کتابوں میں بیان کرتا ہے۔ گویا تجربہ پہلے ہوتا ہے اور اس کا تجزیہ بعد میں۔“ خالد نے کہا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ ”میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔“

”باہر بہت سردی ہے۔“ نتاشا نے آہستہ سے کہا۔ ”تم چاہو تو رات یہاں رک سکتے ہو۔ تمہیں کوئی تکلیف...“

”نہیں شکریہ... مجھے جانا ہے۔“ خالد کھڑا ہو گیا۔

نتاشا کا چہرہ بجھ گیا پھر اس نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم نے کوئی اسسٹنٹ رکھی ہے۔“

”ہاں، مجھے کچھ کاموں میں مدد درکار تھی۔“

نتاشا اس کے ساتھ باہر تک آئی۔ ”اتفاق سے میں نے دیکھا تھا، وہ بہت خوب صورت ہے۔“

”میں نے کبھی غور نہیں کیا۔“ خالد کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ”مجھے صرف اس کے کام سے مطلب ہے۔“

خالد نیچے آیا جہاں اس کی کار موجود تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو نتاشا واپس اندر.... جا چکی تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر اولیور کے مکان کی طرف چل پڑا لیکن اس نے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے زیتون کے باغات کے درمیان سے گزرنا مناسب سمجھا جہاں تاریکی تھی اور اس کے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ وہ مکان کے عقبی حصے میں پہنچا تو وہاں بھی تاریکی تھی۔ مکان میں کہیں روشنی نہیں تھی۔ وہ اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ پیچھے کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا لیکن تہ خانے میں جانے والا راستہ کھلا تھا۔ وہ تختہ اٹھا کر خاموشی سے اندر اتر گیا۔ اس کے پاس پنسل ٹارچ موجود تھی۔ تہ خانہ اصل میں سامان رکھنے کا اسٹور تھا اور یہاں چھت تک چیزیں بھری ہوئی تھیں۔

وہ سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ خوش قسمتی سے تہ خانے سے باہر آنے والا دروازہ بند نہیں تھا۔ نیچے کوئی نہیں تھا۔ نشست گاہ، ڈائننگ روم، اسٹڈی اور کچن خالی تھا۔ وہ پہلی منزل پر آیا۔ یہاں کئی کمرے تھے۔ اس نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا، اچانک ہی وہاں روشنی ہو گئی اور خالد کے سامنے ایک کرخت صورت بوڑھا خود سے بھی زیادہ خوفناک بارہ بور کی رائفل تانے کھڑا تھا۔ یہ اولیور مائر تھا اور اس کی آنکھوں میں

دیوانگی تھی۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی وحشت تھی۔ "تمہاری جرأت کیسے ہوئی اندر آنے کی؟"

خالد کو خطرہ محسوس ہوا کہ یہ بوڑھا کہیں گولی نہ چلا دے۔ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میری بات سنو۔ میں کسی غلط نیت سے اندر نہیں آیا ہوں۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔ تم خاموشی سے اندر آئے ہو۔ تم نے ٹریس پاس کیا ہے اور اگر میں تمہیں گولی مار دوں تو قانون مجھے کچھ نہیں کہے گا۔"

بوڑھے نے رائفل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ مارے جوش و غصے کے وہ ہانپ اور کانپ رہا تھا۔ خالد کو ڈر لگا کہیں غلطی سے ٹریگر دب جائے اور وہ مارا جائے۔ اولیور کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اسے شوٹ کرنے کو بے تاب ہے۔ خالد کا سانس رکنے لگا۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ نائٹ شفٹ کا انچارج آ گیا تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور مسز گولڈ نے آف کر کے جانے سے پہلے اسے لیلیٰ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لیلیٰ کے سامنے بس آخری فولڈر رہ گیا تھا۔ ان فولڈرز میں ان تصاویر کے نیگیٹوز تھے جن میں مائر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد کسی سرکاری شخصیت کے ساتھ تصویر میں شامل تھا۔ لیلیٰ ایک موہوم سی امید کے سہارے ہزاروں کی تعداد میں نیگیٹوز دیکھ چکی تھی۔ اگر اس آخری فولڈر میں بھی اس شخص کی تصویر نہ نکلتی جو سڑک کے پاس سے روتھی کو دیکھ رہا تھا تو اس کی تھیوری ناکام ہو جاتی۔ لیلیٰ کو خیال آیا تھا کہ جس شخص کو دیکھ کر روتھی خوف زدہ ہوئی تھی، اس کا تعلق یقیناً مائر خاندان سے تھا۔ اس صورت میں مائر خاندان کی تصاویر میں اس شخص سے شباہت رکھنے والے شخص کو تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اس نے فولڈر سے نیگیٹوز نکال کر انہیں باری باری نیگیٹوز دکھانے والے پروجیکٹر پر لگانا شروع کیا۔ پانچواں رول ایک اسکول کے افتتاح کا تھا۔ بیروت سے ایک وزیر اور سرکاری حکام مائر خاندان کی مالی مدد سے تعمیر ہونے والے اس اسکول کا افتتاح کرنے آئے تھے۔

لیلیٰ ایک ایک کر کے تصویروں کو آگے کرنے لگی۔ چھٹی تصویر سامنے آتے ہی وہ اچھل پڑی۔ کیونکہ مائر خاندان کے افراد اور سرکاری حکام کے درمیان وہی شخص کھڑا تھا۔ وہی انداز، ویسے ہی پیچھے کی طرف بنے بال اور حد یہ کہ اس نے ویسا ہی دھاری دار سویٹر پہن رکھا تھا۔ لیلیٰ نے جلدی سے البم کی فہرست میں اس تصویر کا نمبر دیکھا۔ اس میں تصویر کے درمیان میں موجود اس شخص کا نام دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔ اسے یقین نہیں آیا کیونکہ وہ شخص بہت بدل گیا تھا۔ لیلیٰ نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور خالد کو کال کرنے لگی۔ بیل جانے لگی لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے پروجیکٹر سے رول نکالا اور اسے اپنی جیکٹ میں رکھ کر لائبریری کے نائٹ انچارج کو اطلاع دے کر وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

خالد ساکت کھڑا تھا۔ اولیور کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس پر گولی چلانے سے گریز نہیں کرے گا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کرتا، پاس سے رونن کی آواز آئی۔ "انکل اولیور... رائفل نیچے کر لو۔"

خالد نے رونن کی طرف دیکھا۔ وہ اولیور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بوڑھے نے بدستور غراتے ہوئے کہا۔ "میں اسے چھوڑوں گا نہیں... قانون مجھے کچھ نہیں کہے گا۔"

"انکل اولیور! میں کہتا ہوں رائفل ہٹا لو۔" رونن اس کے پاس پہنچ گیا تھا اور اس نے اچانک ہی بوڑھے سے رائفل چھین لی۔ خالد کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ رونن نے رائفل اَن لوڈ کر کے ایک طرف ڈال دی اور خالد کی طرف دیکھا۔ وہ کڑے لہجے میں بولا۔ "تم نے یوں آ کر اچھا نہیں کیا۔ نیچے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔"

"میرا کوئی غلط ارادہ نہیں تھا۔" خالد نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "یہ بوڑھا خوامخواہ ناراض ہو رہا تھا۔"

اولیور غرا کر اس کی طرف بڑھا لیکن رونن نے اسے روک لیا۔ "پلیز! تم نیچے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔" خالد نیچے آ گیا۔ چند منٹ بعد رونن بھی آ گیا۔ اس کا چہرہ سخت ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آج میں اتفاق سے نہ آ جاتا تو تم مارے جاتے۔ انکل سچ مچ تمہیں شوٹ کر دیتے۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں... تم نشست گاہ میں بیٹھو، میں ذرا انکل کو دیکھ آؤں۔ وہ اعصابی مریض ہیں اور کسی قسم کے خلافِ معمول حالات میں ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

خالد نشست گاہ میں آیا تو حیران رہ گیا۔ وہاں دیوار پر کوئی درجن اقسام کا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ اولیور اسلحے کا شوقین تھا۔ ان میں نایاب شکاری رائفلیں بھی تھیں اور انسانوں کو نشانہ بنانے والا اسلحہ بھی تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس پر جنگل





میں جس ہتھیار سے فائر کیے گئے تھے، وہ بارہ بور کا تھا اور اولیور کے پاس بھی بارہ بور کی رائفل تھی۔ کیا اس پر فائرنگ اولیور نے کی تھی؟... لیکن کیوں؟ اس کی خالد سے کیا دشمنی تھی؟... اگر وہ اسے روتھی مائر کیس پر کام کرنے سے روکنا چاہتا تھا تو کیوں روکنا چاہتا تھا؟... وہ سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کوئی اس کے پیچھے آ گیا ہے اور جب آہٹ محسوس کر کے اس نے مڑنا چاہا تو ایک ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔ ہاتھ میں ایک کپڑا تھا اور کپڑے سے کلوروفارم کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے تڑپ کر خود کو چھڑانا چاہا اور بے اختیار سانس لیا۔ فوراً ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

لیلیٰ گاڑی کو انتہائی رفتار سے دوڑاتی ہوئی کیبن تک آئی۔ باہر سے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ خالد وہاں نہیں ہے۔ اس کی گاڑی نہیں تھی اور کیبن بھی تاریک تھا۔ اس کے باوجود اس نے اتر کر تسلی کی۔ کیبن لاک تھا اور اندر کوئی نہیں تھا۔ وہ واپس آئی اور اسٹیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ لائبریری سے آتے ہوئے تیز رفتاری کی وجہ سے کئی بار حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچی تھی لیکن اس بار بھی اس نے رفتار کم نہیں کی۔ اس کی چھٹی حس اسے مسلسل خبردار کر رہی تھی۔ خالد کو اس وقت تک کیبن میں آ جانا چاہیے تھا۔ وہ کال بھی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ لیلیٰ راستے میں اسے مسلسل کال کرتی رہی تھی۔ وہ اسٹیٹ میں داخل ہونے والے پل کے پاس پہنچی تو چیک پوسٹ کا نگران باہر آ گیا۔ لیلیٰ نے کار ایک طرف کر کے روک لی۔

"یس میڈم!" گارڈ نے مہذب انداز میں پوچھا۔

"مجھے اسٹیٹ میں جانا ہے۔"

"اپنی شناخت کرائیں۔ اسٹیٹ میں کوئی بھی شخص اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔"

"میرا نام لیلیٰ رچرڈ ہے اور میں خالد احمد کے ساتھ ہوں۔ وہ اس وقت اسٹیٹ میں موجود ہے؟"

"ہاں، وہ اسٹیٹ میں ہیں۔" گارڈ نے کہا۔ "لیکن مجھے پتا... داخلے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"اجازت کون دے سکتا ہے؟"

"مائر خاندان کا کوئی بھی فرد۔" گارڈ نے جواب دیا۔ "مسٹر خالد احمد اجازت نہیں دے سکتے۔"

لیلیٰ مایوس ہو گئی۔ "میں اسے کال کر رہی ہوں لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا۔ پلیز... میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"تب تم اس کا انتظار کرو۔" گارڈ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور واپس چیک پوسٹ کے کیبن کی طرف چلا گیا۔ لیلیٰ جانتی تھی کہ اسٹیٹ میں داخل ہونے کا اس پل کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے کہ اچانک پل کے دوسری طرف سے ایک وین نمودار ہوئی اور دوسرے بیریئر سے گزرتی ہوئی آگے چلی گئی۔ جب لیلیٰ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھا تو اچھل پڑی۔ ڈرائیور نے توجہ بھی نہیں دی تھی کہ پل کے ساتھ ایک کار بھی کھڑی ہے۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ لیلیٰ نے وین کے آگے جاتے ہی کار اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

خالد کو لگ رہا تھا کہ اس کا سر گردن پر بغیر کسی سہارے کے گھوم رہا ہے، جیسے اس کی گردن ٹوٹ گئی ہو اور اسے سہارا نہیں مل رہا ہو۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں تو سامنے کا منظر لہرا رہا تھا۔ ہر طرف سفیدی تھی اور چیزیں گھوم رہی تھیں۔ کوئی اس کے سامنے تھا لیکن وہ اس پر نظریں مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔ سامنے موجود شخص نے کوئی چیز اس کی ناک سے لگائی تو وہ بہت تیزی سے ہوش میں آ گیا۔ امونیا کی بُو اس کی ناک میں بس گئی تھی اور یہی بُو اسے ہوش میں لائی تھی۔ سامنے رونن موجود تھا اور وہ اس وقت شاید رونن کے اینا ٹومی روم میں ایک کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر مضبوط ٹیپ سے بندھے تھے اور پیر بھی اسی ٹیپ سے باندھے ہوئے تھے۔ خالد نے کسمسا کر پوچھا۔

"رونن! یہ سب کیا ہے؟"

رونن اس کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ اس نے رک کر جواب دیا۔ "تم سمجھے نہیں کیا...؟ میرا تو خیال ہے تم بہت کچھ جان چکے ہو اور اسی وجہ سے تم یہاں نظر آ رہے ہو۔"

"میں کیا جان گیا ہوں؟"

رونن اس کی طرف جھکا اور اچانک اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ خالد کا سر گھوم گیا اور فوراً ہی اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ اس نے سر جھٹکا تو خون کے قطرے اس کی شرٹ پر گرے۔ رونن اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ "میں ارمانہ، ڈیلا، روبی، شیلا اور میگڈا کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں بالکل نہیں سمجھ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"اس کے برعکس تم خوب سمجھ رہے ہو۔ میں بھی پاپا کی طرح عورتوں سے نفرت کرتا ہوں لیکن مجھے لاشیں چھوڑنے

سے نفرت ہے کیونکہ لاشیں آدمی کو کبھی نہ کبھی پکڑوا دیتی تھیں۔"

"تت... تمہارا مطلب ہے کہ ان لڑکیوں کو ہنری نے ہلاک کیا تھا؟"

رونن نے سر ہلایا۔ وہ پھر اس کے سامنے ٹہلنے لگا۔ "ہاں، انہیں پاپا نے ہلاک کیا تھا؟"

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ وہ اسی قابل تھیں۔ عورت اسی انجام کی مستحق ہوتی ہے۔" رونن کے انداز میں نفرت آگئی۔ "وہ صرف ایک خوب صورت ناگن ہوتی ہے جو بالآخر مرد کو ڈس لیتی ہے۔ اس لیے اس کے پھن اٹھانے سے پہلے اسے ہلاک کر دینا ضروری ہے۔"

"ان لڑکیوں کا کیا قصور تھا ... اور وہ بھی یہودی لڑکیاں..."

"تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔" رونن اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "تم عیسائیت اور صیہونیت سے واقف نہیں ہو اس لیے تم نہیں سمجھو گے۔ تم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن تم خطرناک حد تک جان گئے ہو۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں پاپا کی رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔ صرف اس وجہ سے میں ان کی موت کی اصل وجہ بھی چھپا گیا ورنہ..." رونن چپ ہو گیا لیکن اس کا چہرہ غصے سے عنابی ہو رہا تھا۔

"ہنری کی موت کی اصل وجہ...؟"

"ہاں، پاپا کی موت حادثاتی نہیں تھی۔ انہیں قتل کیا گیا تھا۔" رونن ہانپنے لگا۔ "مجھے ان کے نظریات سے اختلاف نہیں تھا لیکن ان کے طریقۂ کار سے اختلاف تھا۔"

خالد گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ "یعنی تم دونوں، عورتوں کو بلا کسی قصور کے مار رہے تھے۔"

"ہاں، ہم نے بہت ساری عورتوں اور لڑکیوں کو مارا ہے۔" رونن کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔

"روتھی کو بھی جو تمہاری بہن تھی؟"

"نہیں، روتھی کو میں نے نہیں مارا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تب وہ کہاں گئی؟"

"میں نے کہا نا میں نہیں جانتا۔"

رونن کہتے ہوئے خالد کے عقب میں چلا گیا۔ اچانک کوئی موٹی سی چیز خالد کے گلے میں آگئی اور فوراً ہی سخت ہو گئی۔ رونن نے کرسی کو ٹھوکر ماری تو وہ فرش پر گر پڑا۔ خالد نے دیکھا کہ اس کے گلے میں رسّا پڑا تھا اور اس کا دوسرا سرا ایک ہائیڈرولک جیک سے بندھا تھا۔ یہ بھی اینا ٹومی میں کام آتا تھا۔ رونن چرخی گھمانے لگا۔ رسّا لپٹنے لگا اور گلے پر زور آیا تو خالد خود اٹھ گیا۔ وہ لرزتے قدموں سے کھڑا ہوا لیکن جلد رسّا اتنا بلند ہو گیا کہ اس کے پاؤں بہ مشکل فرش کو چھو رہے تھے۔ وہ فضا میں جھولنے لگا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر آتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ رونن سامنے موجود شیلف کی طرف بڑھا اور پھر اس نے پتا نہیں کیا کیا کہ شیلف دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے پیچھے دیوار پر بے شمار تصاویر تھیں اور یہ سب عورتوں اور لڑکیوں کی تھیں۔

"تم نے دیکھا۔" رونن فخر سے بولا۔ "ان کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے لیکن کوئی لاش بھی نہیں ہے۔ ان کی کسی کو تلاش نہیں ہے۔ کم سے کم مقتولہ کی حیثیت سے تلاش نہیں ہے۔ میرا پاپا سے اسی بات پر اختلاف تھا اور میں نے اینا ٹومی کی تربیت بھی اسی لیے لی۔ اب ان کا وجود کہیں نہیں ہے۔ ان کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل چکا ہے۔ کسی کو ایک معمولی سا ٹکڑا بھی نہیں ملے گا۔"

خالد سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی سانس رک گئی تھی اور گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ رونن نے چرخی کو مزید گھمایا تو وہ فرش سے تقریباً اٹھ گیا۔ رونن اس کے پاس آیا۔ "کل تک تمہارا بھی وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہاں برقی بھٹی ہے، وہ صرف چند گھنٹوں میں تمہارے ایک سو ستر پونڈ وزنی جسم کو چند کلوگرام راکھ میں بدل دے گی اور یہ راکھ کسی کھیت یا ندی کا حصہ بن جائے گی۔ کوئی نہیں جان سکے گا کہ تم کہاں چلے گئے۔"

خالد کی سانس بالکل رک گئی تھی اور نظروں کے سامنے رہ رہ کر اندھیرا چھا رہا تھا۔ رونن مڑ کر شیلف بند کرنے لگا، تب خالد نے لیلیٰ کو اندر آتے دیکھا۔ اس نے لوہے کی ایک پتلی اور لمبی سلاخ اٹھا رکھی تھی۔ وہ دبے قدموں رونن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی پاس پہنچی، رونن کو احساس ہو گیا۔ اس نے مڑنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی لیلیٰ نے سلاخ گھما کر ماری جو اس کے بازو پر لگی۔ رونن چیخ مار کر نیچے گرا تو لیلیٰ نے پے در پے وار کیے۔ ہر وار پر رونن چیخا۔ پھر لیلیٰ سلاخ پھینک کر خالد کی طرف آئی اس نے اوزاروں کے شیلف سے ایک چاقو اٹھایا اور خالد کے گلے سے بندھی رسّی کاٹ دی۔ وہ دھڑام سے نیچے گرا اور گردن پر گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ دیوانہ وار سانس لینے لگا۔ لیلیٰ نے اس کی ہاتھوں اور پیروں کی بندشیں کاٹ دیں۔ خالد نے گلے سے پھندا نکالتے ہوئے رونن کی طرف دیکھا تو وہ اسے نظر نہیں آیا۔





"یہ... کہاں گیا؟"

لیلیٰ نے مڑ کر دیکھا۔ رونن وہاں نہیں تھا جہاں ایک لمحہ پہلے پڑا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بھاگ گیا حرامزادہ... تم پولیس کو کال کرو۔ میں اسے دیکھتی ہوں۔"

لیلیٰ باہر کی طرف بھاگی۔ خالد اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن اس وقت اس پر غصہ طاری تھا۔ اس نے رونن کی باتیں سنی تھیں اور اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رونن اتنا بڑا درندہ ثابت ہوگا۔ اسے عورتوں سے نفرت تھی اور لیلیٰ کو ان لوگوں سے نفرت تھی جو عورتوں سے نفرت کرتے ہیں یا ان سے غلط سلوک کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے رونن کی باتیں سن کر اس پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ رونن مسلح ہو سکتا ہے اور وہ اسے شوٹ کر سکتا ہے۔ اسے بس ایک ہی خیال تھا کہ اتنی عورتوں کا یہ قاتل درندہ نکلنے میں کامیاب نہ ہو۔ راستے میں وہ ایک موقع پر اس کا سراغ کھو بیٹھی تھی اور پھر اسے اسپتال تلاش کرنے میں کچھ دیر لگی۔ رونن کا شعبہ اسپتال کی باقی عمارت سے الگ تھا اسی لیے وہ بڑے آرام سے خالد کو ٹھکانے لگانے وہاں لے آیا تھا۔ لیلیٰ اس وقت وہاں پہنچی جب وہ خالد کو موت کے پھندے پر لٹکا کر اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ لیلیٰ کو لوہے کی سلاخ مل گئی تھی اور اس کی مدد سے اس نے رونن پر قابو پا لیا لیکن وہ اس کی ذرا سی غفلت کا فائدہ اٹھا کر نکل بھاگا۔

وہ باہر آئی تو رونن کی وین کی روشنیاں غائب ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی کار کی طرف لپکی اور اسے اسٹارٹ کر کے رونن کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا اور لیلیٰ کو دشواری ہو رہی تھی۔ اس کی کار کا انجن اتنا طاقتور نہیں تھا۔ بس ایک فائدہ تھا کہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ تنگ موڑ بھی آسانی سے مڑ رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ رفتہ رفتہ وین کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ ایک تنگ موڑ کاٹتے ہوئے کار وین کے نزدیک پہنچ گئی۔ لیلیٰ اتنے جوش میں تھی کہ وین کو قریب پا کر اس نے سوچے سمجھے بغیر اسے پیچھے سے ٹکر ماری اور وین ڈھلان سے اتر گئی۔ رونن نے ایسا سوچا نہیں تھا اس لیے وہ وین پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ قلابازیاں کھانے لگی اور خاصی دور جا کر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ لیلیٰ نے کار روکی اور اتر کر بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ وین الٹی پڑی تھی اور رونن اس میں سیٹ بیلٹ کی وجہ سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ وین کا ٹینک ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ایندھن کے ٹینک سے پیٹرول گر رہا تھا اور ایک ذرا سی چنگاری پوری گاڑی کو آگ کے گولے میں بدل سکتی تھی۔ رونن نے اس کی موجودگی محسوس کر لی تھی، وہ چلّایا۔

"میری مدد کرو، مجھے یہاں سے نکالو۔"

لیلیٰ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن کے پردے پر وہ شخص ابھرا جو ہفتے میں ایک بار اس کے گھر آتا تھا اور وہ جتنی دیر گھر میں رہتا، اس کی ماں کی زندگی عذاب بنی رہتی تھی۔ تشدد کا ایسا کون سا حربہ تھا جو وہ اس کی ماں پر استعمال نہیں کرتا تھا۔ لیلیٰ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔ وہ اسے مار دینا چاہتی تھی تاکہ اس کی ماں کی جان چھوٹ جائے۔ ایک دن وہ اپنی شان دار کار میں ان کے گھر کے سامنے رکا تو لیلیٰ کٹورا لے کر باہر آگئی اور جیسے ہی اس نے کار کا شیشہ نیچے کیا، لیلیٰ نے کٹورے میں بھرا مائع اس پر پھینک دیا۔ پیٹرول کی بُو محسوس کرتے ہی وہ چلّایا۔

"لیلیٰ! یہ کیا کیا... احمق لڑکی۔"

لیکن جب اس نے لیلیٰ کو ماچس جلاتے دیکھا تو لرز اٹھا۔ اس نے لیلیٰ کو روکنا چاہا۔ اس نے کار سے اترنا چاہا مگر لیلیٰ نے جلتی تیلی اس پر پھینک دی اور وہ چشم زدن میں شعلوں میں گھر گیا۔ اس کی چیخیں سن کر چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے لیکن کوئی اس کی مدد نہیں کر سکا۔ جب تک اس کی آگ بجھائی گئی، وہ سر سے پاؤں تک جل چکا تھا اور اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں دم توڑ گیا۔ وہ لیلیٰ کا باپ تھا۔ وہ مر گیا لیکن لیلیٰ اور اس کی ماں کی زندگی آسان نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ماں پہلے ہی نفسیاتی مریضہ تھی۔ بیٹی کو باپ کے قاتل کے روپ میں دیکھ کر وہ بالکل ہی حواس گنوا بیٹھی اور لیلیٰ کو کم عمری کی رعایت دیتے ہوئے عدالت نے ایک ایسے ادارے کے سپرد کر دیا جہاں نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ لیلیٰ اٹھارہ سال تک اسی ادارے میں رہی۔ اس کا باپ بہت دولت مند تھا لیکن اس کی دولت اس کے کام نہیں آئی اور اسے گزر اوقات کے لیے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے۔

اس وقت لیلیٰ کو لگا جیسے اس کے سامنے اس کا درندہ صفت باپ بے بس پڑا ہے اور اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے لیکن وہ جانتی تھی جیسے ہی وہ طاقتور ہوا، اس پر جھپٹ پڑے گا اور وہ اس پر ہرگز رحم نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ بھی اس پر رحم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر جلائی۔ رونن کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا، اس نے پھر کہا۔ "پلیز! میری مدد کرو۔"

"میں تمہاری مدد ہی کر رہی ہوں ذلیل اور گھٹیا

انسان۔" لیلیٰ نے نفرت سے کہا اور تیلی جلتے پیٹرول پر پھینک دی۔ اس نے بھک کی آواز کے ساتھ آگ پکڑلی اور چند لمحے بعد سناٹے میں رونن کی چیخیں گونجنے لگیں۔ لیلیٰ پیچھے ہٹ گئی اور پھر سڑک کی طرف جانے لگی۔ عقب میں رونن کی چیخیں دم توڑ رہی تھیں۔

☆☆☆

جیکب مائر کا چہرہ راکھ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک اسپتال میں تھا اور اس کی حالت اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ ڈاکٹروں نے اسے بات کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ خالد کو یہ سب بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا تھا لیکن بتانا بھی ضروری تھا۔ رونن کی جلی ہوئی لاش وین سے مل گئی تھی اور پولیس نے اسے حادثہ قرار دیا تھا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے وین الٹ گئی تھی اور اس میں آگ لگ گئی۔ لیلیٰ کا اس سارے معاملے میں کہیں ذکر نہیں آیا تھا۔ خالد نے ہر چیز کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس سے لڑائی کے بعد رونن اسپتال سے بھاگ نکلا تھا۔ اسپتال کے اس خفیہ شیلف کے پیچھے دو درجن سے زائد عورتوں اور لڑکیوں کی تصاویر تھیں۔ رونن نے گزشتہ تیس برسوں میں ان کو لبنان کے مختلف حصوں میں قتل کیا تھا اور پھر ان کی لاشوں کو اس طرح سے ضائع کیا تھا کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہنری لاش چھوڑ دیتا تھا۔ رونن لاش نہیں چھوڑتا تھا لیکن وہ ان عورتوں اور لڑکیوں کی تصاویر ضرور اس خانے میں لگاتا تھا۔ ہر تصویر اس کے لیے ایک ٹرافی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر سے مقتولہ خواتین کے کپڑے اور دوسری چیزیں بھی نکلی تھیں۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے خاندان میں ایسے درندے پل رہے ہیں اور ہمارے درمیان دندناتے پھر رہے ہیں۔" جیکب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہنری اور رونن کا مسئلہ مذہبی انتہا پسندی بھی تھی۔" خالد نے دبے انداز میں کہا۔ "ہنری نے بائبل کی آیات کا حوالہ بھی دیا تھا۔ وہ چن کر ایسی آیات پر نشان لگاتا تھا۔"

جیکب نے سر ہلایا۔ "میں جانتا ہوں، ہنری انتہا پسندانہ مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ خاص طور سے عورتوں کے بارے میں... لیکن وہ اس حد تک چلا جائے گا کہ عورتوں کو قتل کرنے لگے گا۔ رونن اس سے بھی آگے نکل گیا اپنی ہی بہن کو قتل کر دیا۔ تم نے یہ معما حل کر دیا۔"

خالد، جیکب کو رپورٹ دے چکا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "نہیں جناب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ میں نہیں جان سکا کہ روتھی مائر کے ساتھ کیا ہوا۔ رونن نے مجھ سے کہا کہ اس نے ان تمام عورتوں اور لڑکیوں کو قتل کیا ہے جن کی تصویریں اس نے محفوظ رکھی تھیں لیکن اس نے روتھی کو قتل نہیں کیا ہے۔"

"وہ جھوٹ بول رہا ہوگا۔"

"نہیں جناب! وہ اس وقت جھوٹ نہیں بول رہا تھا کیونکہ وہ ویسے ہی میرے سامنے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر چکا تھا اس لیے اسے صرف روتھی مائر کے بارے میں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔"

"تب روتھی کے ساتھ کیا ہوا؟"

"میں اسی ناکامی کا اعتراف کر رہا ہوں۔"

خالد باہر آیا تو راہداری میں نتاشا اس کی منتظر تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔ "میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا بات کرنا چاہتی ہو؟"

وہ ہچکچائی پھر بولی۔ "میں تم سے روتھی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی خالد کی جیپ مشرقی ترکی کے علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ اس کی منزل دان نامی قصبہ تھا جو ایک جھیل کے کنارے تھا۔ یہاں پانی کی وجہ سے آبپاشی کی سہولت تھی اور وہاں سبزہ نظر آتا تھا۔ دھول اڑاتے راستوں سے گزرتی جیپ بالآخر ایک فارم ہاؤس تک پہنچی۔ خالد فارم میں داخل ہوا۔ کچھ دور ہی چند افراد کام کرتے دکھائی دیے۔ خالد کی جیپ کی آواز سن کر ان میں سے کچھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نیچے اتر آیا۔ ایک مزدور آگے بڑھا۔ "کون ہو مسٹر اور کس سے ملنا ہے؟"

"مسز گارنر۔" خالد نے کہا۔

مزدور نے ذرا دور انگور کی بیلوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک عورت دو نوجوانوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ خالد اس کی طرف بڑھا۔ اس نے عقب سے عورت کو آواز دی لیکن اس نے مسز گارنر کے بجائے کہا۔

"روتھی مائر..."

عورت چونک کر گھومی اور غور سے خالد کو دیکھا۔

☆☆☆

جیکب مائر آتش دان کی دیوار کے سامنے کھڑا اس پر لگے فریم شدہ اسکیچز کو دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور خالد اندر آیا

مگر وہ آگے آنے کے بجائے کھلے دروازے کے ساتھ ہی رہا۔ جیکب نے گرم جوشی سے کہا۔ ”خالد... میرے بیٹے... میں آج ہی اسپتال سے آیا ہوں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ دوبارہ اسپتال نہیں جائیں گے تو میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔“

”کیا مطلب؟“

خالد دروازے سے ذرا ہٹا اور اس نے کسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ایک عورت اندر آئی۔ بڑھاپے کی دلیز نے اس کے خدوخال بدل دیے تھے۔ اس کے باوجود جیکب کو اسے پہچاننے میں ایک لمحہ لگا تھا اس نے حیرت آمیز بے تابی سے کہا۔ ”روتھی...“

عورت آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور کسی ننھی بچی کی طرح سسک رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر... خالد باہر نکل گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ جیکب مائر بھی رو پڑا۔ چند منٹ بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور روتھی بتا رہی تھی کہ اس پر کیا گزری۔ ”پاپا کو ماما کی بے وفائی نے بدل دیا۔ وہ ہر عورت سے نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ دیوانگی اور درندگی کی آخری حد کو پہنچ گئے تھے۔ ماما چالاک نکلیں، وہ پیرس چلی گئیں اور پاپا سے الگ ہو گئیں۔ لیکن وہ مجھے یہاں چھوڑ گئی تھیں۔ پاپا نے ان کا بدلہ بھی مجھ سے لیا۔ ایک دن نشے میں دھت انہوں نے مجھ سے زیادتی کی۔ پھر یہ معمول بن گیا۔ وہ مجھے ندی والے کاٹیج لے جاتے تھے اور... رونن بھی وہاں آ جاتا۔“ روتھی کا سر جھک گیا۔ جیکب بہت صبر سے یہ سب سن رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مستقل روتھی کے ہاتھ پر تھا۔ ”وہ مجھ پر تشدد بھی کرتے تھے۔ ایک دن پاپا مجھے ندی والے کاٹیج لے گئے۔ انہوں نے مجھے مارا تو میں وہاں سے بھاگی اور ندی کی طرف آ گئی۔ پاپا بھی وہاں آ گئے اور مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے انہیں ندی میں دھکا دے دیا۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کیا میری بچی... وہ شخص دس بار اس سزا کا مستحق تھا۔“ جیکب نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”اس وقت میرا بھی یہی خیال تھا اور میں خوش تھی کہ کسی نے یہ سب نہیں دیکھا ہے لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ کاٹیج کے پاس رونن موجود تھا اور اس نے مجھے پاپا کو ندی میں دھکا دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ پیچھے آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ ابھی وہ فرانس جا رہا ہے لیکن جب وہ آئے گا تو مجھ سے پاپا کی موت کا بدلہ لے گا۔ ابھی وہ مجھے صرف اس وجہ سے چھوڑ رہا ہے کہ اگر اس نے میرے خلاف کچھ کیا تو ساری بات کھل جائے گی اور پاپا کی بدنامی اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھی۔

”دو سال بعد جس دن میرے اسکول میں سند کی تقریب تھی، عین تقریب کے دوران میں نے رونن کو دیکھا۔ وہ تماشائیوں کے ہجوم میں کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دھمکی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ سلسلہ وہیں سے شروع ہو جائے گا جہاں پاپا کی موت کے بعد ٹوٹا تھا۔ میں بہت خوف زدہ تھی اور میں نے اسٹیٹ سے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے مارین آنٹی کو سب بتایا ہوا تھا۔ میں نے ان سے مدد مانگی اور انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں چھپا کر اسٹیٹ سے نکال دیا۔“

”کاش کہ تم مجھے بتا دیتیں۔“

”انکل! میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اور میں یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی ورنہ باپ کے بعد اپنے بھائی کو بھی قتل کر دیتی۔“

”پھر تم کہاں گئی تھیں؟“

”ترکی۔“ روتھی نے جواب دیا۔ ”اسکول میں میرے ساتھ ایک ترک امیر زادہ طغرل گازی بھی پڑھتا تھا۔ وہ دو سال پہلے ہائی اسکول پاس کر کے واپس ترکی چلا گیا تھا۔ میں نے بیروت سے اسے خط لکھا اور وہ اگلے دن میرے پاس آ گیا۔ وہ مجھے ترکی لے گیا۔ اس نے مجھے شادی کی پیشکش کی۔ میں نے اس سے شادی کر لی اور ماضی بھول کر اس کے ساتھ رہنے لگی لیکن ماضی کی ایک ہستی ایسی تھی جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ انکل! وہ ہستی آپ ہیں اسی لیے میں ہر سال آپ کی سالگرہ پر اپنے ہاتھ سے اسکیچ بنا کر آپ کو بھیجتی تھی۔ جب تک طغرل زندہ رہا، وہ اسکیچ پوسٹ کرتا رہا۔ چار سال پہلے ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا تو یہ کام میرے بڑے بیٹے فرید نے سنبھال لیا۔“

”تمہارا بیٹا!“ جیکب مائر نے شوق سے کہا۔ ”تمہارے کتنے بچے ہیں؟“

”میرے چھ بچے ہیں... تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔“ روتھی کا لہجہ تفاخر سے بھر گیا۔ ”طغرل کے نہ ہونے کے باوجود میں ان کے ساتھ بہت خوش ہوں۔“

”انسان کی اصل دولت اس کے بچے ہوتے ہیں۔“ جیکب نے سرد آہ بھری۔ ”افسوس کہ مائر خاندان والے یہ بات بھلا چکے ہیں۔ ان کے نزدیک دولت ہی سب کچھ بن گئی ہے اس لیے وہ اپنی دولت کے ساتھ رفتہ رفتہ مرتے جا رہے ہیں اور بعد میں کوئی ان کا نام لینے والا بھی نہیں ہوتا ہے۔“

”اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں کبھی واپس نہیں آؤں گی اور نہ کسی سے رابطہ کروں گی۔ اگر آپ کا یہ آدمی خالد مجھے تلاش نہ کر لیتا اور آپ کے بارے میں نہ بتاتا تو میں مرتے دم تک واپس نہ آتی۔ اب بھی میں نے یہی سوچا ہے کہ میرا اور میرے بچوں کا مائر اسٹیٹ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم جہاں ہیں، وہاں بہت خوش ہیں۔ اب تو میرے چار بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں اور ان کے بھی بچے ہیں۔“

جیکب مائر کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اور یہی بہتر ہے لیکن میری بچی... میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لیے ایک اکاؤنٹ کھولوں اور اس میں رقم جمع کرا دوں تاکہ کبھی تم پر کوئی مشکل وقت آئے تو تم اسے خرچ کر سکو۔“

روتھی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انکل! میں یہ دولت نہیں لینا چاہتی۔ ویسے میرے پاس کوئی کمی نہیں ہے اگر ہوتی تب بھی میں اس دولت سے کچھ لینا پسند نہ کرتی۔ سچ کہوں تو مجھے اسٹیٹ سے نفرت ہے۔ بس آپ ایک ہی ایسی ہستی ہیں جس کے لیے میرے اندر جگہ ہے۔ آنٹی مارین نے میری مدد کی تھی لیکن اس میں ان کی اپنی غرض بھی تھی۔ ایک حصے دار کم ہوتا تو ان کا اور ان کی بیٹی کا حصہ خود بہ خود بڑھ جاتا۔“

جیکب نے ایک اور سرد آہ بھری۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری بچی۔“

”اس لیے یہاں آنے کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ میری گم شدگی کا معما برقرار رہے۔ آپ کا یہ آدمی مجھے اس طرح لایا ہے کہ کسی کو میری آمد کا پتا نہیں ہے۔“

جیکب مائر نے سر ہلایا۔ ”ایسا ہی ہوگا میری بچی... جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔“

☆☆☆

لیلیٰ اس کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں ایک بوڑھی لیکن صحت مند عورت بیٹھی تھی۔ اس نے گود میں ایک گڑیا لے رکھی تھی اور اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ لیلیٰ آہستہ قدموں سے اس کے پاس آئی۔ وہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ بوڑھی عورت نے اس کی موجودگی محسوس کر لی تھی لیکن اس کی طرف دیکھا نہیں۔ لیلیٰ نے کچھ دیر بعد کہا۔

”ماما! میں لیلیٰ ہوں، آپ کی بیٹی لیلیٰ...“

بوڑھی عورت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”لیلیٰ۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔ ”تم لیلیٰ ہو؟“

”ہاں ماما! میں لیلیٰ ہوں۔“ لیلیٰ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں میری بچی؟"
"میں یہیں تھی ماما لیکن آپ سے نہیں مل سکتی تھی۔"
بوڑھی عورت نے سر ہلایا۔ "اب تم ٹھیک ہو؟"
"جی ماما۔"
"تم نے شادی کی ہے؟ تمہارے بچے ہیں؟"
"نہیں ماما۔"
"کیوں؟"
اس بار لیلیٰ ہچکچائی۔ "ہاں ماما! ایک آدمی ہے تو لیکن میں نہیں جانتی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔"
"تم اس سے محبت کرتی ہو؟"
"پتا نہیں ماما! شاید کرتی ہوں... یا شاید نہیں۔"
ماں نے مشورہ دیا۔ "اگر وہ اچھا آدمی ہے تو اسے اپنا لو۔ اچھا آدمی مشکل سے اور قسمت سے ملتا ہے۔"
لیلیٰ نے سر ہلایا پھر بولی۔ "ماما! میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ اگر میں آپ کو اپنے پاس بلواؤں تو کیا آپ آئیں گی؟"
بوڑھی عورت نے محبت سے اسے دیکھا۔ "نہیں میری بچی... میں یہاں خوش ہوں۔ اب میں عام زندگی نہیں گزار سکتی۔ میرے لیے زیادہ خوشی کی بات یہ ہوگی کہ تم کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لیے آتی رہو۔"
لیلیٰ نے سر ہلایا اور اٹھ گئی۔ "میں آپ سے ملنے آتی رہوں گی ماما۔"
"خدا حافظ میری بچی۔" بوڑھی عورت نے کہا اور اپنے آنسو چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ لیلیٰ اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی باہر آئی۔ استقبالیہ... لاؤنج میں خالد اس کا منتظر تھا۔ وہ اس کے ساتھ آیا تھا بلکہ وہ مستقل اس کے ساتھ ہی تھا۔ دو دن پہلے عدالت نے لیلیٰ کو دماغی لحاظ سے صحت یاب قرار دیتے ہوئے اس کی دولت اور جائداد پر تصرف دے دیا تھا۔ جیکب مائر کے وکیل شہاب علی نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ ماجد مائیکل عدالت کے حکم کے سامنے بے بس تھا اور فی الحال وہ حساب دے رہا تھا۔
ہوٹل واپس جاتے ہوئے خالد نے پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گی؟"
"میں قبرص جا رہی ہوں۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔ "اور تم کیا کرو گے؟"
خالد نے شانے اچکائے۔ "میں اپنے ملک جاؤں گا۔"
"میں نے سنا ہے کہ وہاں کے حالات بہتر نہیں ہیں۔" لیلیٰ بولی۔ "تم میرے ساتھ چلو، قبرص بہت خوب صورت ملک ہے۔"
"ہر ملک خوب صورت ہوتا ہے۔" خالد نے کہا۔ "اگر اس کے رہنے والے اسے خوب صورت رکھیں۔ میرے ملک کو اس وقت لوگوں کی ضرورت ہے۔ میں وہاں جا کر حالات ٹھیک کرنے میں اپنا حصہ لینا چاہتا ہوں۔"
لیلیٰ نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تمہیں وہاں سے کوئی آفر ہوئی ہے؟"
خالد نے سر ہلایا۔ "ہاں، ایک چینل نے جاب آفر کی ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ میں آفر قبول کر لوں۔ میں انفرادی طور بھی کام کر سکتا ہوں۔"
"لیکن تم تو کتاب لکھنا چاہتے تھے اور اب تمہارے پاس ایک ملین ڈالرز بھی ہیں۔"
"ہاں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ کتاب سے بھی زیادہ اہم اپنے ملک کے لیے کام کرنا ہے۔ دیکھو، اچھے حالات میں تو سب ہی اپنے ملک جا کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ وہاں خراب حالات میں جا کر کام کریں اور حالات ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ انفرادی کوششیں ہی اجتماعی تبدیلی لاتی ہیں۔"
لیلیٰ ہچکچائی پھر اس نے پوچھ لیا۔ "تمہارے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش ہوگی؟"
خالد نے گاڑی سڑک کے کنارے روک لی۔ اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ "لیلیٰ! اس سے پہلے میری زندگی میں عورت والا خانہ خالی تھا لیکن اب میں عورت کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں تم آتی ہو... مگر تم مجھ سے پندرہ سال چھوٹی ہو۔"
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
"لیکن ابھی میں نے ایک مشکل فیصلہ کیا ہے، وطن واپس جانے کا اور میں فی الحال تمہیں اس مشکل میں شامل نہیں کر سکتا۔ کیا تم دو سال انتظار کر سکتی ہو؟"
"میں... میں ساری عمر انتظار کر سکتی ہوں۔"
"میں ساری عمر کی بات نہیں کرتا۔ اس دوران میں تم بھی خود کو اسٹیبلش کر لو گی۔"
لیلیٰ نے سر ہلایا۔ "میں یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی۔"
خالد مسکرانے لگا۔ "تب ہم دو سال بعد دوبارہ ملیں گے اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔"
"تم مجھ سے رابطہ رکھو گے نا؟"
"وہ تو ہمیشہ رہے گا۔" خالد نے یقین سے کہا تو لیلیٰ نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔



مغرب کی تندی و تیزی سے ایک سبک رواں تحریر

مختار آزاد

زندگی کی گھماگھمی ہر شخص کے حصے میں نہیں آتی... وقت گزرتا چلا جاتا ہے... اور اس کے گزرنے کا احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب اچانک کسی بچھڑے ہوئے دوست سے ملاقات ہو جائے... ایک طویل عرصے بعد ہونے والی ملاقات کا شاخسانہ... جس نے بہت سی ان کہی حکایتیں اور ادھورے قصے طشت از بام کر دیے۔

# سِرِّ عشق

"کہانیاں ادھوری جو نہ ہو سکیں گی پوری
انہیں میں بھی کیوں سناؤں انہیں تم بھی کیوں سناؤ"

**ایک ہی سے میں جکڑ جانے والی زندگیوں کے آغاز و اختتام کا پُرالم ماجرا**

"تو پھر ٹیو پر کا کیا بنا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ ہم دونوں بیٹھے فی الحال اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

"اُسے تو میں نے قتل کر دیا تھا۔" کوئس نے بڑے سکون سے کہا۔ اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ کوئی اور یہ بات کہتا تو شاید میں چونک اٹھتا مگر یہ بات کوئس کہہ رہا تھا جو میرے نزدیک اپنے فن کی طرح اپنی شخصیت میں بھی ایسا نہیں تھا کہ اس کی کسی بات پر توجہ دی جائے۔ یہ میرا یقین

تھا مگر کچھ لوگ ایسے تھے جو اس کی ذات اور فن کو اہمیت دیتے تھے مگر میرا شمار اُن میں نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ٹیو پر کو قتل کیا، میں نے خاموش رہ کر اُسے یقین دلا دیا کہ میں نے اس کی بکواس کو سچ مان لیا ہے۔

کوٹس سے راہ و رسم کو نہ جانے کتنے سال گزر چکے تھے، یہ بات تو اب مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہی۔ ہم لڑکپن میں ملے تھے۔ پہلی بار کب اور کہاں ملے تھے؟ یہ تو مجھے یاد نہیں... پر کیوں ملے تھے؟ اس بات کو اب میں تقدیر کا ستم سمجھتا ہوں۔

یہ ہمارے ہائی اسکول کا زمانہ تھا۔ ہماری ملاقات وہیں ہوئی تھی اور پھر تقدیر ہمیں اب تک کی زندگی میں بار بار ایک دوسرے سے ملنے کا موقع دیتی رہی... لیکن جب بھی اس سے ملاقات ہوئی، اس کی یاد دل میں پھانس کی طرح چبھتی رہی۔ ہم دونوں بوڑھے ہو چکے تھے لیکن اب بھی میں اسے کسی اسکول میں زیرِ تعلیم لڑکے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ میرے لیے وہ ایسا لڑکا تھا جس کی بکواس سننے کو دل نہیں کرتا تھا مگر اس وقت مجبوری تھی۔ میں اس کی بکواس سننے پر مجبور تھا۔ آخر اس کی دعوت پر ہی یہاں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایسی شرماہٹ چھائی رہتی تھی جس میں جوش بھی نظر آتا تھا۔ یہ ویسی ہی کیفیت ہے جیسے کوئی کمینگی کی حد کو پہنچا شرارتی بچہ اپنے ساتھی کی ٹافی چھین کر کہے کہ یہ اب میری ہے۔ واپس لے سکتے ہو تو ذرا لے کر دکھاؤ۔ خوف، شرماہٹ، پُراسراریت، کینہ پروری اور منفی جوش... ہر وقت اُس کے چہرے پر اسی قسم کے تاثرات طاری رہتے تھے۔ جب اس نے میرے سامنے نہایت سادہ لفظوں میں ٹیو پر کے قتل کا اعتراف کیا، تب بھی اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔ مجھے نہ تو قاتل سے اُنسیت تھی اور نہ ہی مقتول سے کوئی جذباتی تعلق۔ یہ اور بات ہے کہ کوٹس کے بعد میرے لیے وہ بھی تقدیر کا ایک اور ستم تھا۔ ہائی اسکول کے زمانے کا سینئر ساتھی... جس کے نام سے وابستہ میری کوئی بھی یاد ہرگز خوش گوار نہیں تھی۔

اُس وقت ہم دونوں سینٹرل لندن میں واقع درمیانے درجے کے لائل اسٹن ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے اور کرسی پر جھولتے ہوئے ڈیل وچ شہر کے ہائی اسکول میں کئی دہائی پہلے گزارے ہوئے لڑکپن کے وقت کو یاد کر رہے تھے۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا باتیں کرنے کے لیے کوئی اور خاص موضوع نہیں تھا۔ ویسے بھی میں کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔ یہ ملاقات کی ابتدا تھی اور بوڑھوں کی ملاقات میں تمہید اسی طرح کی ہوتی ہے۔

یہ 1959ء کے موسمِ سرما کے ابتدائی دنوں کی ایک افسردہ شام تھی۔ باہر تاریکی اور ٹھنڈ تھی مگر کمرے میں آتش دان روشن ہونے کے باعث خوش گوار حدت پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی زرد روشنی سے مل کر آتش دان کی سرخ روشنی کمرے کو نارنجی رنگ میں نہلا رہی تھی۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول نے شاید ہم دونوں پر بھی افسردگی طاری کر دی تھی۔ ہم دوسروں کی طرح مستقبل کے بجائے صرف ماضی کی باتیں کر رہے تھے۔ زیادہ تر گفتگو کوٹس کر رہا تھا۔ میں صرف اس کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویسے اس نے اب تک جو باتیں کیں، وہ سب مجھے غیر متعلقہ اور بے ربط ہی لگ رہی تھیں۔

کوٹس آتش دان کے زیادہ قریب بیٹھا تھا۔ وہ مسلسل کرسی پر جھول رہا تھا۔ اس کے انداز سے طمانیت اور سکون ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس اور دوسرے میں سینڈوچ تھا۔ وہ وقفے وقفے سے سینڈوچ کا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر چباتا، گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ بھرتا اور پھر کرسی پر آہستہ آہستہ جھولنے لگتا۔ ہم دونوں کے درمیان رکھی میز پر اعلیٰ درجے کی شراب کی لگ بھگ نیم خالی بوتل اور سینڈوچ کی کم از کم پوری بھری پلیٹ رکھی تھی۔

”ذرا یاد کرو، ٹیو پر نے کس طرح ہماری تلاش میں کامیابی حاصل کی اور پھر پیچھا کرتے کرتے اس نے ہماری گردن پر ہاتھ ڈالا تھا۔“ میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کوٹس سے کہا۔

میری بات سن کر وہ فوری طور پر کچھ نہ بولا۔

یہ بھی لڑکپن کی بات ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے وہ بات اچھی طرح یاد ہوگی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہم نے ٹیو پر کے کمرے کے تالے کے سوراخ میں گوند بھر دی تھی جس کی وجہ سے وارڈن نے تالا تڑوا دیا اور اس کا جرمانہ ٹیو پر کو بھرنا پڑا مگر وہ بہت چالاک تھا۔ اس نے پتا چلا لیا کہ یہ ہم دونوں کی کارستانی تھی۔ اسے پیٹنا ہمارے لیے مشکل تھا، اس لیے اس کی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لیے یہ حرکت کی تھی مگر وہ اب ہمیں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ یہ بات ہم دونوں اچھی طرح جان چکے تھے۔ ہم دونوں کئی روز تک ٹیو پر سے بچتے رہے لیکن آخر ایک دن اس نے ہمیں پکڑ ہی لیا اور پھر سب سے زیادہ مار مجھے پڑی۔ کوٹس نے میرے سامنے اعترافِ جرم کر لیا اور کارروائی کا سارا الزام میرے سر تھوپ دیا۔ اس کے بعد جب تک میری ناک سے خون نہ بہا، ٹیو پر مجھے بیدردی سے مارتا رہا۔ البتہ دو چار تھپڑوں سے تواضع کے بعد کوٹس کی جان بخشی ہو گئی تھی۔ میں نے یہ بات جان بوجھ کر اسے... یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہی تھی کہ لڑکپن کی کمینگی اب بھی اس کی شخصیت کا مضبوط حصہ ہے مگر وہ اس بارے میں کچھ کہنے کے بجائے بالکل خاموش تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری اس بات میں پوشیدہ مقصد کو سمجھا ہے یا نہیں۔ اگر وہ سمجھ لیتا بھی تو اس کمینہ خصلت کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

اس وقت بھی حسبِ عادت اس نے براؤن کوٹ، سفید قمیص، میرون ٹائی، سویٹر اور خاکی پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بال منتشر تھے۔ اس کے برابر میں رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کی روشنی سے دیوار پر کوٹس کا ابھرنے والا ہیولہ نہایت ڈرامائی منظر پیش کر رہا تھا۔

”ویسے تو ہم سب ہی ناکام ہوئے ہیں۔“ اس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہا ہوں، اسی لیے اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کی وجہ سے تین دہائیوں تک ہمارے درمیان تنازعہ رہا اور صرف تین سال پہلے اس کا آخری مرحلہ ختم ہوا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تمہارے خیال میں ٹیو پر کی موت کے ساتھ...“

”نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میرا مطلب ہے اُس کی قدرتی موت جس کی وجہ سے ہم دونوں ٹیو پر سے بچتے تھے اور آپس میں بھی ایک دوسرے کے خلاف بغض رکھتے تھے مگر پھر بھی ہم تینوں ناکام ہی رہے۔“

”اوہ، تو یہ کہنا چاہ رہے تھے تم۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

میں اپنی کرسی پر سکون سے بیٹھا بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہا تھا۔ میرے سر کے سارے بال سفید تھے اور یہ سب پچھلی گرمیوں میں ہی ہوئے تھے، تاہم میرے اکثر ہم عمر دوست گنجے تھے۔ وہ سب مجھے دیکھ کر کہتے تھے... ”ڈینگ! خوش قسمت ہو کہ اب تک سر کے بال سلامت ہیں۔“ ویسے میں خوش قسمت تھا بھی۔ پُرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا۔ پریشانی کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ زندگی مزے سے کٹ رہی تھی۔ بس ایک خلش تھی اور شاید عمر کے اس آخری حصے میں وہ خلش دور ہونے والی تھی۔

”تم اسے بہت پیار کرتے تھے نا ڈینگ۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کوٹس نے بڑا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”اب یہ مت سمجھنا کہ میں نے نوٹس نہیں کیا ہوگا۔ وہ تمہاری چھوٹی سی کتاب کا انتساب...“ وہ کہتے کہتے رکا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ”تم نے بڑی چابک دستی سے انتساب لکھا تھا مگر میں جانتا ہوں، وہ کس کے لیے اور کس کے نام تھا۔“ اُس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ تائیدی جواب کا منتظر تھا مگر میں خاموش رہا۔ مایوس ہو کر اس نے پلیٹ سے ایک اور سینڈوچ اٹھایا اور کھانے لگا۔

میرے اور کوٹس کے درمیان کوئی خاص جذباتی تعلق نہیں تھا۔ اسکول سے لے کر عملی زندگی تک، ہم دونوں کا ساتھ ضرور رہا مگر دلوں کا لگاؤ قائم نہ ہو سکا۔ ہم اب تک ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی قدر ضرور مشترک تھی۔ کوٹس ایسے خاندان سے آیا تھا جس کی زرعی زمینیں تھیں اور میرا تعلق اُس گھرانے سے تھا جن کے پاس ایک بڑا سا گھر تھا۔ میں ڈیل وچ آتا تو کپڑے بدل کر آتا تھا اور وہ پوری الماری کے کپڑوں میں لپٹ کر وہاں پہنچتا تھا۔ اُسے مصوری کا شوق تھا، وہ عملی زندگی میں آرٹسٹ بنا۔ مجھے آرٹ سے شغف تھا اور لکھنے کا بہت شوق۔ میں بڑا ہو کر چین اسموکر اور ڈیلی ٹائمز اخبار میں آرٹ کا نقاد بن گیا۔ اُس کی تصویریں بکتی تھیں اور میرے تنقیدی مضامین پڑھے جاتے تھے مگر ان چھوٹی موٹی مماثلت کے ساتھ ہمارے درمیان ٹیو پر بھی تھا۔ پہلے ہم صرف دو رقیب تھے، ایک دوسرے کو برداشت کر لیتے تھے مگر ٹیو پر طاقت ور تھا۔ اسے طاقت کے نشے میں... کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ سو اس کے ہاتھوں پٹنا بھی ہم دونوں کی ایک اور قدرِ مشترک تھی۔

اُس کا اصل نام ٹیو پر تھامسن تھا مگر سب اسے ٹیو پر کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ہم سے بڑا تھا اور ایک کلاس سینئر بھی۔ ہائی اسکول کے ابتدائی دنوں میں اُس نے ہماری زندگی کو مصیبت بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہاسٹل کے کچن کی دیوار پر آویزاں کیلنڈر کے مطابق وہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی تھی لیکن جس ماحول میں ہم وہاں رہ رہے تھے، وہ اُس سے بہت پہلے کا لگتا تھا۔ ٹیو پر ہم نو آموزوں کے لیے مسلسل عذاب تھا۔ ویسے تو ہر جونیئر طالب علم اس کا تختۂ مشق تھا مگر ہم دونوں کی بات مختلف تھی۔ ہماری نظر میں وہ اور اُس کے خیال میں ہم اُس کے رقیب تھے۔

ہم دونوں کا کسی بھی لحاظ سے اس سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی کرنے والا لڑکا تھا اور ہم دونوں مار پیٹ

سے دور بھاگتے تھے۔ وہ طویل قامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اُس کے مقابلے میں کوٹس اور میں چھوٹے قد اور کمزور ہاتھ پاؤں والے تھے۔ وہ توہائی اسکول کے ابتدائی ایام تھے، بھرپور جوانی میں بھی ہم دونوں کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے تھوڑا کم ہی تھا۔ اُس وقت ٹیوپر ہمیں اپنے قد کے باعث جن نظر آتا تھا۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، وہ 1905ء کا زمانہ تھا۔ تب میں اور کوٹس کم عمر تھے۔ ہم دونوں نظر کا چشمہ لگاتے تھے اور رگبی کو تو چھوڑیے کسی بھی کھیل میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ٹیوپر رگبی کا ماہر تھا۔ وہ ہمارے چشموں سے بھی بہت چڑتا تھا۔ جہاں ہمیں دیکھتا، مذاق اڑانے لگتا۔ وہ ہر وقت ہم پر تاؤ کھاتا رہتا تھا۔

میرا گھر پلٹز میں تھا۔ حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ گھر آتے جاتے جتنی مار میں نے ٹیوپر سے کھائی اور جتنے زخم اس نے مجھے دیے، اتنے تو جنگ کے دوران گولہ بارود سے بھی اسے نہیں لگے ہوں گے۔ عملی زندگی میں وہ برطانوی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ ویسے وہ جس مزاج کا لڑکا تھا، فوج کی ملازمت ہی اُسے راس آسکتی تھی۔

”سنا تھا کہ وہ جنگ بھی لڑا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کون ؟“ لحہ بھر کے لیے کوٹس نے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تم ٹیوپر کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں... میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”پہلی یا دوسری جنگ میں؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں نے سنا تھا کہ اس نے دونوں عالمی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر اس نے ایسا کیا تو پھر ٹھیک کیا تھا۔“ کوٹس نے لحہ بھر کے بعد کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے وہ لڑائی بھڑائی کے لیے ہی پیدا ہوا تھا۔“

”تم نے اسے مارا کیسے؟“ میں نے کوٹس سے پوچھا۔

”میں نے اس کی گردن پر وار کیا تھا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے بتایا۔

”کیا اُس کی گردن پر میز ہی دے ماری تھی؟“ میرے انداز سے تجسس نمایاں تھا۔

”میں نے اسے پکڑ کر جھکایا اور پھر گردن پر وار کیا۔“ کوٹس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ گردن پر مہلک ہتھیار کا وار کارگر ثابت ہوگا اور ہوا بھی ایسا ہی۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”اگر پہلا وار کارگر نہ ہوتا تو پھر میں تمھیں ٹیوپر کے قتل کا قصہ سنانے کے لیے زندہ نہ بچتا۔“

میں تصور کر سکتا ہوں کہ کوٹس کے لیے یہ احساس کتنا فرحت بخش ہوگا کہ ٹیوپر مارا جا چکا ہے۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اسے لے کر کہیں دور گئے ہو گے جہاں سب سے چھپ کر اسے مار سکو۔“ میں نے کوٹس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“ وہ میری بات سن کر چونکا اور پھر حیرت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ”تمھارا اندازہ تو بالکل درست ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ اس نے ٹیوپر یہ وار کیا ہوگا اور پھر بھاگ نکلا ہوگا۔ جس طرح وہ بتا رہا تھا، اُس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ ٹیوپر کا قصہ پاک کرنا اس کے لیے کوئی خاص مشکل کام ثابت نہیں ہوا ہوگا۔

”تمھارا قیافہ بہت ٹھیک نکلا ہے۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”البتہ میری سوانح میں اس کتابی کیڑے کا کوئی ذکر نہیں ہوگا اور نہ ہی ملکۂ سلامت کی لطف اندوزی کے واقعات ہوں گے۔“

”تمھارا مطلب ہر میجسٹی سے ہے؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

میری بات سن کر وہ کچھ دیر تک مجھے خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”معاف کرنا، میں بھول گیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد تھی مگر پھر بھی ہمارے لیے تو وہ ہر میجسٹی ہی تھی نا۔“

یہ وہی حسینہ تھی جس کے بقول وہ بادشاہ کی ناجائز اولاد تھی۔ اسی کے عشق میں کوٹس، میں اور ٹیوپر بیک وقت مبتلا تھے۔ ہم تینوں سمجھتے تھے کہ وہ صرف ہم سے پیار کرتی ہے۔ یہ راز تو اسکول اور کالج کو خیرباد کہنے کے بعد کھلا کہ وہ دراصل ہم تینوں سے اپنا دل بہلا رہی تھی۔

”ہمارا چھ سال تک ساتھ رہا تھا۔“ میں نے غیر محسوس طور پر ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”وہ اس کی زندگی کے ابتدائی ایام تھے۔“ اس نے لقمہ دیا۔

”کیا تمھاری یادداشت جواب دے رہی ہے؟“ میرے لہجے سے تشویش نمایاں تھی۔ ”وہ اچھی خاصی سمجھ دار تھی۔“

”مجھے چیزوں میں تبدیلی پسند نہیں۔“ اس نے میری بات سن کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میرے لیے وہ نہایت معصوم تھی، بالکل کلی کی طرح۔ اپنی موت تک وہ میرے لیے





نہایت خوب صورت گلاب کی ننھی سی اَدھ کھلی کلی ہی رہی ہے۔“

”تم بوڑھے ہو رہے ہو۔“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اچھا، اب ذہن پر زیادہ زور ڈالنا چھوڑ دو۔“ وہ بدستور سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میرا اشارہ اسی طرف تھا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”میں کہاں بوڑھا ہو رہا ہوں ؟“ اس کے لہجے میں استفسار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، حقیقت میں یہی اس کے بڑھاپے کا اعتراف ہے۔

کچھ دیر تک ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے کرسی پر جھولتے رہے۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک اور سینڈوچ اٹھایا۔ ”سنا ہے کہ اسی کی مداخلت کے باعث حکومت نے پھانسی کی سزا ختم کی تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔ اس کے پیچھے بھی اُس کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ ویسے بھی اگر وہ ناجائز تھی تو کیا ہوا، تھی تو بادشاہ کی بیٹی نا۔“ یہ کہتے ہوئے میں میز کی طرف جھکا، بوتل اٹھائی اور خالی گلاس کو آدھا بھر لیا۔

”تم کیوں نہیں کھا رہے ہو؟“ کوٹس نے پوچھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”یہ میں نے خاص طور پر تمھارے لیے خریدے تھے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سینڈوچز کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے یاد ہے کہ تمھیں تولوکی کے سینڈوچ بہت پسند تھے۔“

”تھے نہیں، اب بھی پسند ہیں مگر اس وقت بھوک نہیں ہے۔ میں نے ساڑھے چھ بجے ڈنر کیا تھا۔“

دو بوڑھے کمرے میں ایک دوسرے کے قریب تنہا بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے مگر اس کے باوجود تنہا کمرے میں بیٹھے دوستوں کی طرح گپ شپ کر رہے تھے۔ اگر اس وقت ایک دوسرے کے خلاف ہماری نفرت کو جاننے والا کوئی مل جاتا تو یہ ضرور سوچتا کہ سخت نفرت کرنے کے باوجود ہم دونوں یہاں، اس کمرے میں کیوں ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ بظاہر تو لگ رہا تھا کہ ہم وقت گزاری کے لیے ہلکی پھلکی گپ شپ کر رہے ہیں مگر یہ سچ نہیں تھا۔ ہم گپ شپ کر رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ ایک دوسرے سے آنکھیں ملانے سے بھی کترا رہے تھے۔ ساتھ بیٹھنے کے باوجود ہم دل سے ایک دوسرے کے قریب نہیں تھے۔ پچھلے دس سال بعد ہم پہلی بار آج ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس کی ہر سرگرمی سے واقف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے بارے میں اس کا بھی یہی خیال ہوگا۔ ہم دونوں کے درمیان پچھلے تیس، پینتیس سالوں سے جس طرح کے مراسم رہے تھے، اس کے پیش نظر اس وقت ہمارا ملنا بہت تکلیف دہ تھا۔

ہماری یہ ملاقات اتفاقی تھی۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دس برس کے بعد ہم ایک بار پھر ملیں گے۔ اتفاق نہ ہوتا تو شاید ہم نہیں ملتے۔ سہ پہر کا وقت تھا، جب ہم گولڈن اسکوائر پر ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ گولڈن اسکوائر کے قریب ایک مینشن کے فلیٹ میں میری چھوٹی بہن رہتی ہے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اُس سے ملنے کے لیے جاتا تھا۔ اُس وقت سہ پہر کے چار بجنے والے تھے، جب میں بہن کے فلیٹ سے نکلا۔ میں گولڈن اسکوائر سے پکاڈلی سرکس اور پھر وہاں سے ہوتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانا چاہ رہا تھا کہ ٹیوب پکڑ کر گھر لوٹ سکوں مگر جیسے ہی گولڈن اسکوائر سے تھوڑا آگے بڑھا، مجھے کوٹس مل گیا۔ اس وقت وہ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا میری مخالف سمت سے آرہا تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کنی کترا کر نکل جاؤں مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اب یہ آداب کے خلاف تھا کہ میں اس سے دعا سلام کیے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ ہم دو معزز لوگوں کی طرح ملے۔ رسمی کلمات کے دوران میں اس نے خود ہی بتایا کہ وہ اُس وقت سنک اسٹریٹ پر واقع کلب جا رہا ہے، جہاں کچھ دیر ٹھہر کر اسے ایک نمائش میں شرکت کے لیے وکٹوریہ گیلری جانا تھا۔

کوٹس کے مطابق وہ رومانی موضوعات پر بنائی گئی پینٹنگز کی نمائش میں شرکت کے لیے ہی بیکس ہل سے لندن سٹی پہنچا تھا۔ بظاہر وہ مجھے دیکھ کر خوش ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ لائل اسٹون ہوٹل میں اس نے ایک رات کے لیے کمرا بک کروایا ہے۔ اس نے مجھے اپنا کمرا نمبر بتایا اور دعوت دی کہ آج رات اس سے ملنے ہوٹل پہنچوں۔ میں نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ رات نو بجے ملیں گے۔ میں نے اسے پیشکش کی تھی کہ اس کی پسندیدہ بوتل لے کر آؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کون سی وائن پسند کرتا ہے۔ میری پیشکش سن کر وہ مسکرا دیا۔

رات کے نو بجنے والے تھے، جب میں اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ کوریڈور میں سناٹا تھا۔ پہلی ہی دستک پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ ”مجھے امید تھی کہ آج کی یہ شام بہت اچھی گزرے گی۔“ اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

''اندر آجاؤ۔''

''شاید۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور اندر آ کر دروازہ لاک کر دیا۔

یہاں آ کر پتا چلا کہ کوٹس نے میری ضیافت کے لیے پسندیدہ لوکی کے سینڈوچ کا اہتمام کر رکھا ہے۔ میں نے خاکی لفافے میں لپٹی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ ''آج کی شام کے نام۔''

مجھے یہاں آئے ہوئے دس پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ دلوں میں سخت نفرت کے باوجود ہم دو مہذب بوڑھوں کی طرح بیٹھے شائستہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

''تم ماڈرن آرٹ کو کتنا پسند کرتے ہو؟'' کوٹس نے باتوں باتوں میں پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی پسند کرتا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''میرا تو خیال یہ ہے کہ تم ماڈرن آرٹ کے نام پر اس گند بلا کو زیادہ پسند کرنے لگے ہو؟'' اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

''میں ماڈرن آرٹ کو ناپسند نہیں کرتا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ماچس جلنے سے چند سیکنڈ کے لیے بند کمرے میں عجیب سی مہک پھیل گئی۔

''مجھے تمہاری پسند سے اتفاق نہیں۔'' اس نے شائستہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''یہ کس قسم کا آرٹ ہے۔'' اس کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ ''میگزین کی کٹ آؤٹ میں تیار کی گئی تصویریں، لنچ باکس پر مختلف قسم کے ڈیزائن بنا لینا، چنگھاڑتے رنگوں میں نقش و نگاری جن کی چمک ناگوار محسوس ہوتی ہے... ہونہہ۔'' اس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''مگر یہ سب بہت مقبول ہے، یہی پاپولر آرٹ ہے۔'' میں نے اس کی بات سن کر دلیل دی۔

اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور طنزیہ ہنسی ہنسا۔ ''پاپولر آرٹ اور یہ... تم بے وقوف نقادوں نے کب سے تنقید چھوڑ کر قصیدے پڑھنا شروع کر دیے ہیں۔''

''میں نہیں، یہ لارنس ایلوے کا کہنا ہے۔'' مجھے یقین تھا کہ کوٹس اس کے بارے میں نہیں جانتا ہوگا۔

''اب یہ کون ہے؟'' اس نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا کوئی نیا پلا ہے۔''

میں نے یہ سن کر ہاں میں سر ہلا دیا۔ ''دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ اب میدان میں بہت سارے نئے پلے آ گئے ہیں۔'' میں نے بھی اسی کے انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

''شاید... میں بھی خود کو بدل لیتا مگر ایک مشکل ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''بڑھاپے میں خود کو بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی بات سن کر کچھ نہیں کہا۔ بوتل اٹھائی اور اپنے گلاس میں تھوڑی سی وائن انڈیلنے لگا۔

''خود کو بدلنا بہت مشکل کام ہے۔'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''اب تو بیسویں صدی کا آخر آنے والا ہے مگر کیا کروں، میں نے اپنا بہت سا وقت ماضی میں گزارا ہے۔ اب نئے دور سے خود کو کس طرح ہم آہنگ کروں۔ سر کے بال سفید ہو کر جھڑنے لگے ہیں۔ یادداشت بھی کمزور ہو رہی ہے۔ کمزوری اور بیماری ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اب اس عمر میں نئے دوڑتے پلّوں کے کہے پر کس طرح چل سکتا ہوں۔ بھونکنے دو جو بھونک رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ ''میں نے جنگِ عظیم میں مصوری شروع کی تھی...''

''پہلی یا دوسری؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''دونوں۔'' وہ مسکرایا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔ ''تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی ناراضی نظر آئی۔

اُن جنگوں نے مجھ سے میرا سب کچھ لے لیا تھا۔ کچھ نہیں چھوڑا تھا میرے پاس۔ میرا پورا خاندان جنگ کی تباہ کاری کی نذر ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس تباہی و بربادی کے کھیل میں میرے پاس بچا، وہ صرف میری چھوٹی بہن تھی۔ وہی بہن جس کے گھر سے لوٹتے ہوئے راستے میں کوٹس مجھ سے ملا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جنگ نے کوٹس کا کیا کچھ چھینا تھا تاہم ایک بات مجھے معلوم تھی۔ ہم دونوں نے ہی شادی نہیں کی تھی۔ اولاد اور گھر کے جھمیلوں سے آزاد ہم دونوں اب عمر کے آخری حصے میں تھے۔ بالکل تنہا اور شاید سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔

''اجنبی لڑکے۔'' کوٹس نے اچانک لاطینی زبان میں کہا اور پھر میری آسانی کے لیے اس کا ترجمہ بھی کر دیا۔ لاطینی لب و لہجہ اور اس زبان پر کوٹس کی اچھی خاصی دسترس تھی۔ اس کے مقابلے میں میری اس زبان سے بس واجبی سی ہی شناسائی تھی۔ اسکول میں لاطینی زبان و ادب ہمارے نصاب کا حصہ تھا۔ میں نقل کر کے ہی پاس ہوتا تھا مگر اس کو نقل کی کبھی





ضرورت نہیں پڑی۔ کوٹس کی عادت تھی کہ اکثر بیٹھے بٹھائے کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ کہنے کے بعد وہ خوامخواہ ہنسا اور پھر جھک کر بوتل اٹھائی اور اپنا گلاس بھرنے لگا۔

''تمہیں یاد ہے، وہ ہائی اسکول کے امتحان میں لاطینی زبان و ادب کا پرچہ؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''وہی موقع تھا نا جب ہم دونوں دوست بنے تھے۔''

''کب؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''ڈیل وچ میں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

''پر وہاں...'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہم کہاں تھے اُس وقت؟'' میں نے وضاحت چاہی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی پرانی عادت ہے کہ اکثر بے ربط باتیں کرتا ہے اس لیے میں کچھ سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس حوالے سے تذکرہ کر رہا ہے۔

''راستے میں۔'' اس نے سینڈوچ کا ٹکڑا دانتوں سے کاٹتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''دوستوں کے ساتھ ملے تھے چلتے چلتے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہیں وہ اسکول کا ترانہ یاد ہے جو ہم اسمبلی میں پڑھتے تھے؟''

''اوہ...'' اب میں سمجھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ ''ہاں، وہ یاد ہے مجھے۔'' وہ ترانہ دراصل لاطینی زبان کی ایک نظم تھی جو اس طرح شروع ہوتی تھی... اے اجنبی لڑکے۔ میں نے اس ترانے کے چند اشعار اسے سنا دیے۔

''بہت اچھے بھئی۔ تمہاری یادداشت تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔'' اس نے اشعار سن کر میری طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔

''تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟'' میں نے کوٹس سے پوچھا۔ ''اتنا تو مجھے یقین ہے کہ بچپن کی باتیں یاد کرنے کے لیے تو ہرگز نہیں بلایا ہوگا۔'' میں نے گفتگو کا رخ متعین کرنے کے لیے کہا۔ مجھے تشویش تھی کہ آخر کوٹس نے مجھے ملنے کی دعوت کیوں دی تھی؟ وہ مجھ سے مل کر کیا کہنا چاہتا تھا؟ میں جب سے یہاں آیا تھا، تب سے اس نے کوئی ایک بھی ایسی بات نہیں کی جس سے اس ملاقات کی غرض پتا چل سکتی۔ وہ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا۔ اسی لیے میں نے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے اس سے سیدھے سادے انداز میں پوچھ

میری بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے گلاس میز پر رکھا اور ہاتھ سے ہوا جھلنے لگا۔ ''یہاں اتنی گرمی کیوں ہو رہی ہے؟''

''صرف تمہیں لگ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ بھی اس لیے کہ تم آتش دان کے بہت قریب بیٹھے ہو... سمجھے بوڑھے آدمی۔'' یہ کہہ کر میں مسکرانے لگا۔

میری بات سن کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں دو اور کرسیاں بھی تھیں جو آتش دان سے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں سمجھا کہ اب وہ اٹھ کر کسی دوسری کرسی پر بیٹھے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے ہاتھ سے پنکھا جھلنا بند کر دیا۔ اب اس کے چہرے پر کچھ اطمینان نظر آ رہا تھا۔

''مسٹر ڈیننگ...'' اس نے چند لمحوں تک مجھے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''اس سے پہلے کہ ہم دونوں اس دنیا سے اٹھ جائیں، میں چاہتا ہوں کہ تمہارے متعلق، تمہارے منہ پر کچھ سچ سچ باتیں کہہ دوں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ البتہ اس کی نگاہیں بدستور مجھ پر گڑی رہیں۔

میں بالکل خاموش تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ وقت آ رہا ہے جس کے لیے اُس نے مجھے یہاں بلایا تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔

''میری بات سن کر تمہارے چہرے پر جو تاثرات آئے ہیں، وہ میری توقع کے عین مطابق ہیں۔'' اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

میں جانتا تھا کہ یہ ایک کھیل ہے۔ میرے دل میں بھی اُس سے متعلق کچھ باتیں دفن تھیں۔ فی الحال میں اس سے وہ باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ سننا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھڑکی۔ ''کہو... تم میرے متعلق، میرے منہ پر کیا کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' میرا لہجہ سرد اور گمبھیر تھا۔

کوٹس نے فوری طور پر کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے خالی گلاس میز پر رکھا۔ رومال سے ہاتھ صاف کیے اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''گزرے سالوں میں بطور مستند اور معروف آرٹسٹ، میں نے دنیا میں اپنا نام اور مقام بنا لیا ہے۔'' یہ کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہ رہا ہے، اس کی تمہید باندھ رہا ہے۔

''دنیائے آرٹ میں میرا کافی اہم مقام ہے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کوٹس نے دوبارہ بات شروع کی۔

"میری پینٹنگز مہنگے داموں بکتی ہیں۔ نقاد میرے کام کی تعریف کرتے ہیں اور دنیا بھر کی آرٹ گیلریوں میں میری پینٹنگز بھاری قیمت پاتی ہیں۔ اکثر و بیشتر میری پینٹنگز کی نمائشیں ہوتی رہتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور اپنا گلاس بھرنے لگا۔

وہ مجھے نہایت سنجیدگی سے یہ باور کروانے کی کوشش کررہا تھا کہ دنیائے آرٹ میں اس کا کتنا بڑا مقام ہے۔ ویسے میرے لیے اس تمہید کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں اس کے فن کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ وہ خود کو جتنا بڑا آرٹسٹ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا، وہ اس سے کہیں کم درجے کا آرٹسٹ اور اس سے بھی بہت زیادہ نچلے درجے کا انسان تھا۔ یہ باتیں مجھے اچھی طرح معلوم تھیں۔ اس کی تمہید سے میری رائے بدلنے والی نہیں تھی۔ وہ لفظوں سے کھیلنا چاہ رہا تھا مگر کم از کم میری حد تک وہ اس کھیل میں نہیں جیت پاتا۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر اس کی شخصیت اور فن کے بارے میں ٹھوس رائے رکھتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ اتنی لمبی چوڑی تمہید کیوں باندھ رہا ہے۔ جو کہنا ہے، وہ بات سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتا۔
"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" کافی دیر تک جب وہ خاموش رہا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور اُکتا کر پوچھ بیٹھا۔

"میری فنی زندگی میں جب بھی کوئی اہم موڑ آتا ہے، تم میرے سامنے آکر کسی رکاوٹ کی طرح کھڑے ہوجاتے ہو۔" اس نے میری طرف دیکھ کر شکوہ بھرے انداز میں کہا۔ "بطور نقاد تم میرے کام میں سو طرح کے کیڑے نکالتے ہو۔ برائیاں تلاش کرنے کی ہزار کوشش کرتے ہو... کیوں؟" یہ کہہ کر وہ میری طرف تھوڑا سا جھکا۔ "تم دنیائے آرٹ کے تنہا نقاد نہیں ہو، دوسرے بھی ہیں مگر وہ سب میرے بارے میں ایسا کچھ نہیں کہتے اور نہ ہی لکھتے ہیں، جیسا کہ تم کرتے ہو میرے ساتھ..." یہ کہہ کر اس نے لمبا سا گھونٹ بھرا اور بڑبڑایا۔ "تمہارا رویہ واضح طور پر امتیازی ہی نہیں، حاسدانہ ہوتا ہے۔ تم مجھ سے دشمنی کی حد تک حسد کرتے ہو اور تمہارے مضمون اس بات کا ثبوت ہیں۔"

"تم بڑی حد تک غلط سوچ رہے ہو۔" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایک نقاد جو کہتا ہے اور لکھتا ہے وہ سو فیصد ایماندارانہ رائے ہوتی ہے۔ کم از کم میں تو اپنے بارے میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میری تنقید صرف سچ پر مبنی ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ یہی تنقید کا بنیادی اصول ہے۔" میں نے کوئنس کے اعتراضات کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی۔

"رائے دیتے وقت تم سچائی کو سامنے رکھتے ہو یا اس میں تمہارا ذاتی عناد، پُرخاش یا دوستی وغیرہ کا بھی کچھ عمل دخل ہوتا ہے؟" اس نے میری وضاحت سے اختلاف کیا اور کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"تنقید اصول پر مبنی ہوتی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "اُس میں میری ذاتی رائے یا نجی معاملات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اُس نے مسکراتے ہوئے میری بات سنی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم نے ہر جگہ میرے فن پر سخت جارحانہ تنقید کی ہے۔" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ "مجھ پر اور میرے کام پر تم سے زیادہ سخت تنقید کبھی کسی نے نہیں کی مگر تم نے..." وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میرے کام کے بارے میں تمہارے تنقیدی مضامین نہایت سخت ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر فرش پر نظریں جما لیں اور کچھ لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "معاف کرنا دوست! تمہارے وہ تنقیدی مضامین تنقید کے بجائے ذاتی نفرت کی عکاسی کرتے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "میں نے بڑی محنت اور طویل عرصے میں اپنا یہ مقام بنایا ہے لیکن تمہاری نفرت انگیز تنقید نے میرے کام اور میری ذات، دونوں پر سوالیہ نشان لگا دیے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور گلاس منہ سے لگا لیا۔ اس وقت وہ شدید جذباتی نظر آرہا تھا۔

اس کی باتیں اور انداز مشتعل کرنے والا تھا مگر میں خاموش بیٹھا خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"یہ بیسویں صدی ہے۔" کافی دیر بعد اس نے خاموشی توڑی اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں بدلتے وقت کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ تم اٹھارویں صدی کے نقاد کی طرح مجھ پر مسلسل کیچڑ اچھال رہے ہو۔ یاد رکھو، اگر یہ اٹھارویں صدی ہوتی تو میں بھی اُس زمانے کے آرٹسٹوں کی طرح اپنے گھوڑے کے چابک سے مار مار کر تمہاری کھال ادھیڑ دیتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں کرسکتا۔" اس نے یہ کہہ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ "مجھے اتنا اندازہ ضرور ہے کہ وقت اب بہت آگے نکل گیا ہے مگر ایک تم ہو کہ..." اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور طنزیہ ہنسی ہنسنے لگا۔ "تمہیں تو ذرا بھی خیال نہیں کہ وقت کتنا بدل چکا





ہے۔ زمانہ بہت آگے نکل آیا ہے مگر تم اٹھارویں صدی کے دقیانوسی نقادوں کے گھسے پٹے انداز میں مجھے تنقید کے نام پر اپنی نفرت کا نشانہ بنائے جارہے ہو۔ مجھے ناکام اور ناکارہ آرٹسٹ قرار دینے پر تُلے ہوئے ہو... آخر تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟"

میں نے کوئنس کو گھورا۔ اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ شاید غصے سے۔ "یہ تم رائل اکیڈمی کے حوالے سے کہہ رہے ہو۔ کہو یہی بات ہے کیا؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ حال ہی میں، میں نے رائل اکیڈمی کے تحقیقی جریدے میں شائع شدہ اپنے ایک تنقیدی مضمون میں کوئنس کی اب تک کی فنی زندگی کے کام پر ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا۔ مجھے لگا کہ شاید وہ اسی حوالے سے شکوہ کررہا ہے۔ اسی لیے میں نے اُس سے وضاحت چاہی۔

کوئنس نے میری بات خاموشی سے سنی مگر نہ میری طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ وہ دیوار پر دیکھ رہا تھا جس پر پڑنے والی ہماری پرچھائیاں خاصا خوفناک منظر پیش کررہی تھیں۔

"تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، ان سب کی اصل وجہ میں ہوں؟" کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنی بات شروع کی۔ "تم نے رائل اکیڈمی کے رکن کی حیثیت سے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ تمہارا کام اکیڈمی کے اعلیٰ معیار کے مطابق نہیں ہے۔" اس بار میرا لہجہ کچھ نرم تھا۔

"خدا کے لیے اب یہ تذکرہ بند کردو۔" اس نے تڑپ کر کہا۔ "کئی لوگ یہ بات تسلیم کرچکے ہیں کہ میرے فن کا معیار کیا ہے۔ ان میں سے کئی تمہارے قد سے بہت بلند نقاد ہیں۔ یہ بات میں نہیں کہتا، دنیا کہتی ہے۔"

"تم درست کہہ رہے ہو، تمہارے فن کو کئی مستند لوگ تسلیم کرچکے ہیں مگر میں اُن میں سے نہیں ہوں۔ میں فن کو جانتا ہوں، بہت اچھی طرح۔" میں نے کاٹ دار لہجے میں جواب دیا۔ "اگر اپنے نام کے ساتھ رکن رائل اکیڈمی کا ٹھپا نہ لگاتے تو اب تک جو مقام تم نے حاصل کیا، کبھی اس تک پہنچ نہیں پاتے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "اچھی طرح جانتا ہوں تمہیں یہ رکنیت کس طرح ملی تھی۔ سب کچھ تم اچھی طرح جانتے ہو مگر اس کے باوجود تم الزام میرے سر دھر رہے ہو... رو پرٹس کوئنس، رائل اکیڈمی یافتہ آرٹسٹ۔" میں نے اس پر طنز کا بھرپور وار کیا۔ میری بات سن کر اس نے غصے سے سر کو جھٹکا۔ "مجھے جب بھی کوئی اعزاز ملا، تم نے اپنے اخباری مضمون میں مجھ پر، میرے کام پر شدید اعتراضات اٹھائے۔" اس نے بھی غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ اس کا چہرہ اب بھی تمتمارہا تھا۔ "تمہارے تنقیدی مضامین پڑھ کر میں تو کیا، کوئی اجنبی شخص ہو تو وہ یہی کہے گا کہ تم مجھے برباد کرنا چاہتے ہو۔"

"میں نے اب تک جو کچھ لکھا، وہ لوگوں کے لیے لکھا ہے۔" میں نے دیوار پر بننے والی اس کی پرچھائیں پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ "تم پینٹنگ کے نام پر، کینوس پر مٹی پوت کر چلے آؤ تو میں کیا لکھوں گا؟ تمہارا شاہکار دیکھ کر ایک آرٹ کا شوقین کیا سمجھے گا؟" میں نے کہنا شروع کیا۔ "وہ سمجھنا چاہے گا، جاننا چاہے گا، اسے اپنے سوالوں کے تسلی بخش جوابات ملیں گے تبھی وہ مطمئن ہوگا۔ یہ کام صرف میں کرسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور کوئنس کی طرف دیکھا۔ "اور میں یہی کام کرتا ہوں اپنے مضمون میں۔"

آتش دان میں بھڑکنے والے سرخ شعلوں کے باعث کوئنس کا چہرہ سرخ انگاروں کے مانند دہک رہا تھا۔ شاید تپش زیادہ تھی یا پھر وہ شدید غصے میں تھا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میری باتیں سن سن کر اس وقت وہ دل ہی دل میں مجھے کتنی گالیاں دے رہا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ بظاہر وہ اپنی سنجیدگی کا بھرم رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں خاموش تھا اور وہ بھی چپ چاپ آتش دان میں جلتی لکڑیوں کو تکے جارہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے میری طرف سر گھمایا اور معصوم نظروں سے مجھے گھورا مگر کچھ بولا نہیں۔ شاید وہ یہ سوچ رہا ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہی کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ اس کے برعکس سوچ رہا ہو۔ میں اپنے بارے میں اس کا جواب سننا چاہتا تھا مگر وہ بدستور خاموش تھا۔

"گزشتہ کئی سالوں کے دوران میں میرے خلاف بہت سی افواہیں گردش کرتی رہی ہیں۔" میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اب میں واقعی اس سے وہ باتیں کہنے جارہا تھا جو اُس سے میری شدید نفرت کی وجوہات کی طویل فہرست میں شامل تھیں۔ "مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔" یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ نہایت تلخ ہوگیا۔ "ان افواہوں اور الزامات کی وجہ سے مجھے دو دفعہ جیل جانا پڑا۔ میری نوکری، عزت اور پیشہ ورانہ ساکھ... سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا۔ مجھے کئی بار اسکاٹ لینڈ یولیس کے سامنے تفتیش کے لیے پیش ہونا پڑا۔ کوئنس! تم ان سب باتوں کو جھٹلا نہیں سکتے۔" یہ کہہ کر میں رکا

اور اس کی طرف گھورا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے انگلی اس کی طرف اٹھائی اور کہا۔ ”مسٹر کوٹس! میں اچھی طرح جانتا ہوں، میرے خلاف یا میرے ساتھ جو کچھ اب تک ہوا ہے، اس کے پیچھے تم تھے۔“

میری بات سن کر وہ کچھ نہیں بولا بلکہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ”ایک ایماندار آرٹسٹ ایسا کچھ کرسکتا ہے۔“ میرے الزامات کے بعد اس کے جواب کو اقرار یا انکار ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ گول مول بات کررہا تھا۔

”تمہاری پھیلائی ہوئی افواہوں نے میری ذات، کردار اور پیشہ ورانہ ساکھ پر جو داغ لگائے ہیں، وہ اتنے پکے ہیں کہ میں لاکھ رگڑ رگڑ کر انہیں صاف کرنے کی کوشش کروں مگر کر نہیں سکتا۔“

اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میری بات سن کر اسے صدمہ ہوا ہے۔ ”یہ محبت ہے میرے دوست۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”محبت میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جو کہنا چاہتے ہیں اور جس کے بارے میں کہنا چاہتے ہیں، اونچی آواز میں اُس کا نام لینے کی ہمت نہیں ہوتی، اسی لیے سرگوشیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر کہنے لگا۔ ”اب تو میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں ذیل وچ میں ہی قتل کردینا چاہیے تھا۔ وہی اچھا فیصلہ ہوتا۔“

”افسوس... کہ تم ایسا نہ کرسکے۔“ میں نے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

میری بات سن کر وہ کچھ نہ بولا اور گلاس میز پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر ہوا کرنے لگا۔ ”اس کمرے میں اتنی گھٹن کیوں ہورہی ہے؟ مجھے عجیب سی مہک محسوس ہورہی ہے یہاں پر۔“ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ذرا گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کچھ نہیں ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور سگریٹ سلگایا۔ ”شاید اس کا دھواں محسوس ہورہا ہے تمہیں۔“

”نہیں... یہ سگریٹ کے دھوئیں جیسی گھٹن نہیں ہے۔“ اس نے فوراً میری بات رد کردی۔ وہ بدستور چہرے پر ہوا جھلنے کی کوشش کررہا تھا۔ ”میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے تائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

”تم ہو بڑے ذہین۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”نہ تو کمرے میں آکسیجن کم ہے اور نہ ہی گھٹن...“

”تو پھر کیا ہے؟“ اس نے قطع کلامی کی۔

”نہایت خاموشی اور سکون سے تمہیں قتل کررہا ہوں مسٹر کوٹس۔“ میں نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا اور سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی۔

یہ سن کر اس کا چہرہ اور سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مسکراہٹ یک لخت غائب ہوگئی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر مجھے گھورا۔ اس کے چہرے کے عضلات سخت پڑ رہے تھے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا دیے۔ اس کے سامنے میز پر رکھی بوتل میں اب دو چار گھونٹ ہی بچے تھے۔ اس کا گلاس بھی خالی تھا۔ آتش دان کی سرخ روشنی میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہورہی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور وائن کی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میں...“

میں نے منہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ ہاں میں سر ہلا دیا۔

”مگر یہ تو تم نے بھی پی ہے۔“ اس نے اٹکتے ہوئے بے یقین لہجے میں کہا۔ ہوسکتا ہے کہ میری بات کو اس نے مذاق سمجھا ہو، تبھی وہ یہ کہہ رہا تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔ میں نے بھی اسی بوتل سے وائن پی تھی۔ اسی لیے شاید وہ سمجھ رہا ہو کہ میں اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”کیا بکواس کرتے ہو؟“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ”میں نے تمہیں خود اس بوتل سے گلاس میں وائن لیتے دیکھا ہے۔“

”میں نے صرف ایک بار گلاس بھرا اور اس سے صرف ایک گھونٹ پیا تھا۔“ یہ کہہ کر میں مسکرایا۔ ”ویسے ایک گھونٹ مہلک تو نہیں مگر پھر بھی...“

”پھر بھی... کیا؟“ اس نے تڑپ کر میری بات کاٹی۔

”یہاں آنے سے پہلے میں نے وہ دوا پی لی تھی جس کے بعد اگر ایک گلاس بھر کر بھی پی لیتا تو یہ زہر مجھ پر بالکل اثر نہیں کرسکتا تھا۔“

یہ سنتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور میز پر سے گلاس اٹھا کر میرے منہ کی طرف دے مارا مگر میں ہوشیار ہوچکا تھا۔ جھکائی دے کر اس کے وار سے بچ گیا۔ کانچ کا گلاس دیوار پر لگا اور ایک چھناکے کی آواز آئی اور وہ ریزہ ریزہ ہوکر فرش پر بکھر گیا۔

”تم نے کیا ملایا تھا اس بوتل میں؟“ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر نڈھال ہوکر کرسی پر ڈھے گیا۔





اس کے چہرے پر پسینا بہہ رہا تھا۔

”بہت خاص زہر ہے یہ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ زہر کچھ خاص قسم کے ایسے قدرتی پودوں اور زہریلی جڑی بوٹیوں سے کشید کیا جاتا ہے کہ سیدھے سادے پوسٹ مارٹم سے تو اس کا پتا ہی نہیں چل سکتا۔ البتہ بہت ہی جدید انداز میں تحقیق کی جائے تو شاید پتا چل جائے۔“ یہ کہہ کر میں ارا سا اس کی طرف جھکا۔ ”ویسے تمہاری بہت عمر ہوچکی ہے، اس لیے کوئی تمہارا خصوصی پوسٹ مارٹم کیوں کرے گا؟ ویسے بھی اس زہر کے استعمال سے تمہاری موت کی وجہ میرے سوا کوئی اور نہیں جان سکے گا۔ اگر پوسٹ مارٹم رپورٹ بہت ماہرانہ طور پر تیار کی گئی ہو، تب بھی تمہاری موت کی وجہ صرف دل کا دورہ ہی قرار دی جاسکتی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

کوٹس کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کا چہرہ پسینا پسینا ہورہا تھا۔ سانسیں پھول رہی تھیں اور خوف یا شاید دم گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ”تمہیں یقین ہے کہ جو زہر تم نے مجھے پلایا ہے، وہ اثر بھی کرے گا؟“ کافی دیر بعد اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”سو فیصد یقین ہے، یہ میری تحقیق ہے۔ زہر پینے کے بعد سب سے پہلے اعصاب شل ہوتے ہیں اور پھر پورا جسم بے جان پڑنے لگتا ہے۔ کیوں... تمہارے اعصاب جواب دے رہے ہیں نا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اس زہر کی ایک خوبی یہ ہے کہ جب تک تمہارا دل بند نہیں ہوجاتا، تب تک تم باتیں کرسکتے ہو اور تمہارا دماغ بھی کام کرتا رہے گا۔“ یہ کہہ کر میں رکا، کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اب تمہارے پاس بہت زیادہ وقت باقی نہیں بچا ہے۔“

”کیا...“ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہی جو تم سن چکے ہو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بڑی محنت سے میں نے اس زہر کی ان خوبیوں کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔“

”تم ہمیشہ سے کتابی کیڑے رہے ہو۔“ اس نے بدقت تمام میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم نے اس زہر پر بھی بہت کچھ پڑھا ہوگا۔“ کوٹس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا نہ سکا۔

”میں پچھلے پانچ سالوں سے اس کام کی تیاری کررہا تھا۔“ میں نے کوٹس کی طرف دیکھا۔ جس انداز سے وہ فرش پر پاؤں پھیلائے کرسی پر نیم دراز تھا، اُسے دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ اس کے اعصاب آہستہ آہستہ مفلوج ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک اس کے دل کی دھڑکنیں پوری طرح بند نہیں ہوجاتیں، تب تک اُس کا دماغ کام کرتا رہے گا۔ ”میں یہ کام یہاں، لندن میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”تو تم مجھے کہاں قتل کرنا چاہتے تھے؟“ اس نے بڑی مشکل سے پوری جسمانی قوت لگاتے ہوئے کہا۔

”وہاں، جو تمہاری دنیا ہے مگر کس طرح... یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”میں صرف یہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں تنہا ہوں اور ہمارے بیچ وہ بوتل ہو جو میری لائی ہوئی ہو۔ اس کی وائن تمہارے گلاس سے، تمہارے منہ کے راستے معدے میں اُترے اور بس!“

”وہ تو تم نے کرلیا۔“ اس نے بڑے کرب سے جواب دیا۔

”موقع تو تم نے مجھے دیا۔“

”ٹھیک کہتے ہو، یہ تقدیر بہت ظالم چیز ہے۔“ کوٹس نے کہا۔

”تم نے مجھے نہیں، اپنی موت کو دعوت دی تھی۔“ میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کوئی نہیں جانتا کہ ہم دونوں اس شام یہاں، اس کمرے میں تنہا تھے۔“

”مگر یہ ہوٹل...“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”بے فکر رہو۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”میں ہوٹل کے پچھلے والے دروازے سے اندر داخل ہوا اور عقبی سیڑھیاں چڑھ کر تمہارے کمرے میں پہنچا ہوں۔ مجھے ہوٹل میں آتے اور تمہارے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ ویسے میں نے خود بھی کوشش کی تھی کہ مجھے یہاں کوئی نہ دیکھے۔ اب کام ختم کرکے اسی راستے سے، سب کی نظروں سے بچتا ہوا میں واپس چلا جاؤں گا مگر جانے سے پہلے یہاں کی ہر چیز پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات اچھی طرح صاف کرکے ہی جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں رکا اور اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ”اتنی بات تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کوئی بہت بڑا بے وقوف تو ہرگز نہیں ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں بے بسی نظر آرہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لیا۔ کمرے میں آتش دان کی سرخ اور لیمپ کی زرد روشنی نے مل کر ماحول پر جو نارنجی رنگ بکھیر رکھا تھا، اس میں سگریٹ کے دھوئیں کا مرغولہ عجیب سا نظر آرہا تھا۔

''کل صبح...'' یہ کہہ کر میں نے گردن موڑی اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس وحرکت پڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی گردن مڑی ہوئی تھی اور وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ''ہوٹل کا اسٹاف کل صبح تمہاری لاش دریافت کرے گا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس آجائے گی اور پھر ریڈیو پر تمہاری موت کی خبر نشر ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ ''کل دوپہر تک تمہارا پوسٹ مارٹم مکمل ہوچکا ہوگا۔ موت کی وجہ ہوگی دل کا دورہ۔ اُس وقت میں اپنے گھر میں اہتمام سے لنچ کر رہا ہوں گا۔ اس کے بعد ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھا کر تمہاری موت پر تعزیتی مضمون لکھنے بیٹھ جاؤں گا۔''

''کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تم اب تک خون خوار بلی کی طرح یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ جاؤ، بھاگ جاؤ یہاں سے۔'' اس نے بڑی دقت سے مسکرا کر کہا۔ ''میں تو مر ہی رہا ہوں۔''

''واقعی...'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے جسم سے آخری سانس نکلنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد چلا جاؤں گا۔''

''مجھے بڑا افسوس ہے...''

''کس بات پر؟'' یہ سنتے ہی میں چونک گیا۔

''تم نے میری موت کے بعد جن مصروفیات کا پروگرام بنایا ہے، اُس پر عمل نہیں کرسکو گے۔'' اس نے خباثت بھری مسکراہٹ سے کہا۔

''تمہارے خیال میں ایسا کیوں نہیں کرسکوں گا مرتے ہوئے انسان؟''

''تم نے مجھے مارنے کے لیے پانچ سال تک منصوبہ بندی کی تھی مگر میں تمہیں قتل کرنے کے لیے دس سال تک منصوبہ بناتا رہا۔'' وہ اپنے تمام حواس مجتمع کرکے بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر میں ہنس دیا۔

''ہنسو مت...'' اس نے آہستہ آواز میں مجھے ڈانٹا۔

''چلو نہیں ہنستا۔ مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے چپ ہوجاتا ہوں۔'' میں نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ اسے تڑپتا، مرتا دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہو رہی تھی۔

''تم مجھے لندن سے باہر قتل کرنا چاہتے تھے مگر میں تمہیں لندن میں ہی مارنا چاہتا تھا۔ بس منصوبے میں ذرا سی چوک ہوگئی۔''

''اوہ... تو تم بھی مجھے...'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

یہ سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بس ذرا سی غلطی ہوئی ہے ہم دونوں کے منصوبے میں...''

''وہ کیا؟'' میں یہ سن کر ایک بار پھر چونک گیا۔

''ہم دونوں نے ایک ساتھ منصوبے پر عمل شروع کردیا۔'' مجھے چونکتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

''تم مجھے کس طرح قتل کرنا چاہتے تھے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے سن کر پریشان ہونے کی باری اب میری تھی۔

''تمہیں پھندے پر لٹکا کر۔'' اس نے انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ تمہاری خواہش پوری نہ ہوسکی۔''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پھندے پر لٹکتے تو لوگ اسے قاتل کی شرمندگی اور خودکشی سمجھتے مگر اب...''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

''تم یہاں سے تو بھاگ جاؤ گے مگر اسکاٹ لینڈ یارڈ سے نہیں بچ سکو گے چوہے۔'' اس نے پوری طاقت لگا کر ہنسنا چاہا مگر ہنس نہ سکا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''یہ کمرا میرے نہیں، تمہارے نام پر بک ہوا ہے۔''

''کیا؟'' حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''بکواس مت کرو... چپ کرکے سنو۔ مجھ میں تمہاری طرح بکواس کرنے کی طاقت نہیں ہے اب۔''

''بکو، کیا بکنا ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ اس کی باتیں سن کر میرے دماغ میں تشویش سے دھماکے ہو رہے تھے۔

''تم سمجھتے ہو کہ ہم اتفاق سے ملے تھے؟''

''ہاں...'' میں نے قطع کلامی کی۔

''ہرگز نہیں، میں پچھلے تین ہفتوں سے تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔''

یہ سنتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا مگر میں خاموش رہا۔ میری حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن سے لہو کی بوند تک نہ نکلے۔ میرا حلق خشک ہونے لگا۔

''سن کر مزہ آرہا ہے نا ڈینگ؟''

''آگے کہو۔''

''میں یہاں کسی نمائش میں شرکت کرنے نہیں آیا تھا۔





میں نے جو کچھ سہ پہر تم سے کہا، وہ سب جھوٹ تھا۔ میں تمہیں قتل کرنے کے لیے لندن آیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور اپنی منتشر سانسیں درست کرنے لگا۔ اس کی سانس تیزی سے پھول رہی تھی۔

''میں نے آج شام یہ کمرا تمہارے نام پر بک کرایا تھا۔'' کچھ توقف کے بعد کوٹس نے کہنا شروع کیا۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے حواس ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ''تمہارے دستخط کی نقل کرنا مجھے آتی ہے۔ ہوٹل رجسٹر پر تمہارے نام کے آگے تمہارے دستخط ہیں۔ یہاں آتے ہوئے میں نے تمہاری طرح مصنوعی وگ لگائی، تمہاری طرح کا ہیٹ پہنا اور تمہارا پسندیدہ پرفیوم بھی لگایا تھا۔ تمہارے جیسا اوور کوٹ بھی پہنا تھا میں نے۔'' وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے سن کر تو میں اب اپنے حواس کھونے والا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ جو حلیہ میں نے بنایا تھا، اسے دیکھ کر تم بھی یقین کرلیتے کہ میں ہی ڈینگ ہوں۔ آخر کالج کے زمانے کا اداکار ہوں۔ حلیہ بدلنا جانتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تربتر ہو رہی تھی۔ اس کے انکشافات سن کر تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اب مجھے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

''مگر...''

''چپ رہو، اب بولنے کی باری میری ہے۔'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔ ''میں، اس جگہ تمہیں لٹکانے والا تھا۔'' اس نے چھت پر لگے پنکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر تو تم بھی پکڑے جاسکتے تھے۔''

''ہرگز نہیں...'' اس نے دھیرے سے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں نے بھی تمہاری طرح اپنا منصوبہ بنایا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے گھر میں ہونا تھا مگر افسوس کہ ہم دونوں نے اپنا اپنا کام ایک ساتھ شروع کردیا۔ بس یہی گڑبڑ ہوئی ہے ورنہ...'' وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''اٹھو۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''اپنے دائیں ہاتھ پر بیڈروم کا دروازہ کھول کر دیکھ لو، تمہارے خلاف قتل کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے وہاں۔''

یہ سنتے ہی میں اٹھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا، وہ کہنے لگا۔

''فرش پر دیکھنا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' جیسے ہی میں نے بیڈ روم کا دروازہ کھولا، سامنے فرش پر ایک بوڑھے شخص کی خون میں تربتر لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ فرش پر ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ مقتول کی گردن میں چوڑے پھل کا چاقو اندر تک دھنسا ہوا تھا۔ میں لاش کے پاس دوزانو ہوکر بیٹھ گیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ چہرہ بری طرح خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں پہچان گیا۔ یہ ٹیوپر ہی ہوسکتا تھا۔ خود کوٹس نے کچھ دیر پہلے ہی بتایا تھا کہ اس نے ٹیوپر کو قتل کردیا ہے مگر کب اور کہاں... یہ نہ تو میں نے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا تھا۔ میں تیزی سے کمرے سے نکلا اور کوٹس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

''وہ...'' میں نے کمرے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''ٹیوپر ہے، میرا بدترین دشمن۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہیں بتایا تو تھا نا کہ میں نے اسے قتل کردیا ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''یہ تم نے کیسے کیا؟'' یہ کہتے ہوئے میں کرسی کی طرف بڑھا اور کٹے ہوئے درخت کی طرح اس پر ڈھے گیا۔ اس وقت جو میری حالت تھی وہ مرتے ہوئے کوٹس کے لیے یقیناً اطمینان کا باعث بن رہی ہوگی۔

''میں نے تمہیں نو بجے بلایا تھا اور ٹیوپر کو آٹھ بجے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ میں پورے دھیان سے اس کا انکشاف سن رہا تھا۔ ''وہ آیا، ڈرنک لی اور پھر ہاتھ روم چلا گیا۔ جب وہ باتھ روم سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے عقب سے اس کی گردن میں چاقو گھونپ دیا۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ میرا لہجہ روہانسا ہوچکا تھا۔

''سب جانتے ہیں کہ وہ کالج میں تم سے سینئر تھا۔'' کوٹس نے پھولی سانسوں میں کہنا شروع کیا۔ ''وہ تم سے اور تم اس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ کئی بار تمہیں بُری طرح پیٹ چکا تھا۔ ایک دوبار اس نے تمہاری ہڈیاں بھی توڑ دی تھیں۔''

''وہ میرا دشمن تھا مگر تم نے اسے کیوں مارا؟''

''تاکہ پولیس کو جب اس کی لاش ملے تو وہ جان جائے کہ اسے قتل کرنے کے بعد تم نے شرمندگی سے بچنے کے لیے خودکشی کرلی۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ''اب بھی پولیس کو اس کمرے سے دو لاشیں ہی ملیں گی، ایک میری اور دوسری ٹیوپر کی۔ افسوس کہ تم یہاں

تنویر ریاض

سفرِ درد کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو... اس کی اذیت... چھبن اور یادیں کئی عشروں تک پیچھا نہیں چھوڑتیں... محبت کے خارزاروں پر گامزن ایک ایسی ہی عورت کا قصۂ دل... جس کے راستے میں دور تک کوئی پڑاؤ... کوئی سنگِ میل نہ تھا...

**بیک وقت غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے نبرد آزما محبت کرنے والوں کی دل گداز کہانی**

میں ہیکسن ہوٹل سے نکل کر اپنے دفتر کی طرف جارہا تھا کہ میں نے فیڈرا کو گھوڑے پر سوار قصبے میں داخل ہوتے دیکھا۔ گھوڑے کی کمر پر ایک مرد کی لاش تھی جس پر سرخ کمبل پڑا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور گھوڑے کی باگیں پکڑیں۔ فیڈرا کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں ننگے اور دھول میں اٹے ہوئے تھے جبکہ دونوں ہاتھ چھالوں سے بھرے ہوئے تھے۔

بازی لے گئے۔ اب تم جیل میں موت کا انتظار کرو گے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور پھر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ وہ میری نظروں کے سامنے مر رہا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میری اپنی جان نکل رہی ہے۔ میں نے گردن موڑ کر کوٹس کی طرف دیکھا۔ اس کی سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ بے جان ہو کر فرش کی طرف لٹک رہے تھے۔ گردن ڈھلک چکی تھی۔ آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ وہ مر رہا تھا مگر مجھے جیتے جی مار گیا تھا۔ مجھے پھنسانے کے لیے اس نے ٹیوپر کو قتل کیا۔ میں نے اسے زہر دے دیا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ خود اپنا انجام کیا کرنا ہے... جیل، بدنامی یا...

یہ سوچتے ہی میرا ذہن لمحہ بھر کے لیے ماضی میں بھٹک گیا۔

میں، ٹیوپر اور کوٹس ہائی اسکول سے کالج تک ساتھ پڑھے تھے۔ جب ہم کالج پہنچے تو وہاں ایک شہزادے کی ناجائز بیٹی بھی پڑھنے کے لیے آئی تھی۔ وہ بہت حسین و جمیل، نازک اندام اور رکھ رکھاؤ والی حسینہ تھی۔ ہم تینوں اُس کے عشق میں بری طرح گرفتار ہو چکے تھے۔ وہ بھی ہم سے بہت قربت سے ملتی تھی جس سے ہم تینوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ ہم میں سے صرف ایک سے پیار کرتی ہے اور ہم تینوں کے نزدیک وہ خوش قسمت نوجوان صرف وہی تھا، باقی دو اُس کے رقیب۔ وہ ہم تینوں کی پہلی پہلی محبت تھی۔ تین عاشق اور ایک محبوبہ... اس چکر میں ہم تینوں ایک دوسرے کے بدترین دشمن بن گئے۔

ہم دونوں تو ذرا بزدل عاشق تھے مگر ٹیوپر ایسا نہیں تھا۔ وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ صرف اُسی سے پیار کرتی ہے۔ اس کے خیال میں ہم شہزادی کو تنگ کر رہے تھے۔ اس نے کئی بار ہمیں تاکید کی کہ اُس سے دور رہیں مگر ہمارا خیال اس کے برعکس تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں نے ہی ٹیوپر سے یہ بات نہیں کی کہ وہ ہمارے پیار کے درمیان دیوار ہے۔ یہ کہنے کی ہمت نہ مجھ میں تھی اور نہ ہی کوٹس میں۔

اس چکر میں ٹیوپر نے کئی بار ہم دونوں کو بہت مارا تھا مگر عشق کا بھوت سر سے نہیں اترا۔ کالج کا زمانہ ختم ہوا تو وہ محبوبہ ہم تینوں کو ٹھینگا دکھا کر اپنی راہ لگ گئی۔ میں اور کوٹس اُسے 'ہر مجسٹی' کہتے تھے۔ وہ چلی گئی مگر ہم تینوں کے دل میں یہ زہر بھر گئی کہ اگر تم نہ ہوتے تو وہ کسی ایک کو ضرور مل جاتی۔ ٹیوپر کا خیال تھا کہ وہ صرف ہم دونوں کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکلی ہے۔ ہم دونوں بھی اپنی اپنی جگہ یہی سوچتے تھے۔ ویسے میرا خیال تھا کہ ٹیوپر اور کوٹس نہ ہوتے تو وہ میری بن جاتی۔ شاید یہ اس کی محبت کا ہی اثر تھا کہ ہم تینوں نے ہی شادی نہیں کی تھی۔ میں نے آرٹ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اپنی ایک دو کتابوں کے پیش لفظ میں... 'ہر مجسٹی' کا اشاروں، کنایوں میں تذکرہ بھی کیا تھا۔ ایک کتاب کا انتساب بھی استعاروں کی زبان میں، میں نے اس کے نام لکھا تھا۔ میرے دل پر اب بھی اُس کا راج تھا مگر کیا کیجیے... وہ عشق ہم تینوں کا لاحاصلِ زندگی تھا مگر جو حاصل ہوا وہ رقابت اور اب موت تھی۔ دو عاشق انجام کو پہنچ چکے تھے اور تیسرا میں تھا۔ مجھے اب اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور کوٹس کی طرف دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور گردن ڈھلک چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔

میں نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اب تک کے تمام واقعات کو تفصیل سے لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کے بعد انہیں پڑھنے لگا۔ ہر بات جذبات سے بیان کی گئی تھی۔ دراصل یہ میرا اعترافی بیان تھا جس کے آخر میں، میں نے لکھا تھا:

اعترافی بیان۔
دستخط: مائیکل ڈیننگ۔
وقت: رات کے دس بج کر پینتالیس منٹ۔
تاریخ: جمعہ اٹھارہ ستمبر، 1959ء لندن۔

بیان کی نوک پلک درست کر کے میں نے لکھے ہوئے صفحات پھاڑ کر نوٹ بک سے علیحدہ کیے اور تہ کر کے کوٹ کی اوپری جیب میں رکھ لیے۔

میں نے بیڈ روم میں رکھی رسّی تلاش کر لی تھی۔ میں کرسی پر کھڑا ہو کر چھت کے پنکھے سے رسّی باندھنے لگا۔

"مبارک ہو کوٹس... تمہارا منصوبہ پورا ہو گیا۔"

کمرے میں میری آواز گونجی۔ اگلے لمحے کرسی نیچے گری۔

دوست نما دو بدترین رقیبوں کے ایک دوسرے کے خلاف بنائے گئے منصوبے ایک ساتھ پورے ہو چکے تھے۔

"فیڈرا! کیا ہوا؟" میں اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

اس نے اپنی پلکیں یوں جھپکائیں جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ اس کے الجھے بے ترتیب بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ ان میں کئی دنوں سے کنگھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آرہی تھی جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ایبل فرنچ جیسے شخص کے ساتھ ویرانے میں واقع ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہ کر کسی بھی عورت کی جوانی برباد ہوسکتی تھی۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے بلند آواز میں کہا۔ "کیا تم میری بات سُن رہی ہو؟"

"مارشل! یہ ایبل ہے اور وہ مر چکا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ضبط کے باوجود اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ "میں اس کی لاش کو دفنانے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ زندگی میں تو اسے یہاں رہنا نصیب نہ ہوا لیکن مرنے کے بعد اس کی یہ حسرت ضرور پوری ہونی چاہیے۔"

"اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

"کل وہ گھوڑے پر سوار ہوکر کسی کام سے باہر گیا تھا۔ لگتا ہے کہ کسی جگہ گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور ایبل اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس کا پاؤں رکاب میں الجھ گیا اور وہ گھوڑے کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔"

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "یہ تمہیں کہاں ملا؟"

"کلیٹن اسے ڈھونڈنے گیا تھا۔ اسی نے اس کی لاش دریافت کی۔" کلیٹن اس کا سوتیلا بیٹا تھا۔

"اس وقت کلیٹن کہاں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"وہ گھر پر ہے۔ اسے اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کی کوئی فکر نہیں۔ سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑ رہا ہے۔"

"فیڈرا! تم گھوڑے سے نیچے آجاؤ۔ میں تمہیں ڈاکٹر ایڈورڈ کے پاس لے چلتا ہوں۔ تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

"مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں مارشل! میں جلد از جلد ایبل کو دفنانا چاہتی ہوں۔"

میں نے اس کا بازو پکڑا اور نرمی سے کہا۔ "فیڈرا! نیچے آجاؤ۔ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔"

وہ گھوڑے سے اُترنے لگی تو میں نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور بولا۔ "تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟ ان پر یہ چھالے کیسے ہیں؟"

"مجھے یاد نہیں۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔

میں اسے لے کر آگے بڑھا تو وہ میرے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "ایبل!"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میرے آدمی اسے دیکھ لیں گے۔"

ڈاکٹر ایڈورڈ کا کلینک میرے دفتر سے دو دروازے چھوڑ کر بالائی منزل پر واقع تھا۔ میں فیڈرا کو سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا اور ڈاکٹر کے دروازے پر دستک دی۔

ڈاکٹر ایڈورڈ ایک منحنی سا شخص تھا جس کی گول گول آنکھیں چشمے کے شیشوں کے پیچھے سے چمکتی رہتی تھیں۔ وہ مریض کی طرف یوں لپکتا جیسے شکاری اپنے شکار کی جانب جھپٹتا ہے۔

"مارشل! کیا بات ہے۔ تم اتنی صبح میرا دروازہ توڑنے کے لیے کیوں چلے آئے؟" پھر اس کی نظر فیڈرا پر گئی جو دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا اور اس پر آنسوؤں کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر اس کی حالت دیکھ کر چونک گیا اور بولا۔

"مارشل! اسے اندر لے آؤ۔"

میں نے فیڈرا کو ڈاکٹر ایڈورڈ کے کلینک میں چھوڑا اور خود اپنے دفتر چلا آیا جہاں میگرا فرش کی صفائی کر رہی تھی اور جیک میرے لیے کافی بنا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بولا۔

"صبح بخیر مارشل، کافی تیار ہے۔"

میگرا نے اپنی جھاڑو ایک طرف رکھ دی اور بولی۔ "ہیلو جان!"

میری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ فکرمند لہجے میں بولی۔ "کیا بات ہے جان! خیریت تو ہے؟"

"اس قصبے میں کوئی دن سکون سے نہیں گزرتا۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر پہلے فیڈرا یہاں آئی ہے۔ اس کا شوہر گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگیا ہے۔ جیک تم اس کی لاش کو ڈاکٹر ایڈورڈ کے پاس پوسٹ مارٹم کے لیے لے جاؤ۔ فیڈرا بھی وہیں ہے۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کررہا ہے۔"

یہ سن کر جیک اور میگرا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ یہاں





کے لوگ فیڈرا کا نام سن کر اسی طرح خاموش ہوجاتے تھے۔

"بہتر ہوگا کہ تم یہ کام ابھی کرلو۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

اس نے کافی کی پیالی میز پر رکھی اور جی جناب کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں اسے کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ کوئی ناخوشگوار فریضہ انجام دینے جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

"جان!" میگرا آہستہ سے بولی۔

"ہاں۔"

"اس میں تمہاری تو کوئی غلطی نہیں ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کا پیار اُمڈ آیا تھا۔ میں بھی اس سے محبت کرتا تھا لیکن ہمارے درمیان اس موضوع پر کھل کر بات نہیں ہوتی تھی اور ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں کون ہوں اور اس قصبے میں کیوں آیا تھا یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب دو افراد آپس میں محبت کرنے لگیں تو انہیں زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

میں اس بارے میں وضاحت نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہر بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے اور مجھے اس کی بھی پروا نہیں کہ اس کا تعلق میکسیکو کے کسی قبیلے سے تھا جبکہ میں خود گوری چمڑی والا خالص امریکن تھا۔

"اب لوگ یہی کہیں گے کہ فیڈرا اسی انجام کی مستحق تھی۔" مجھے اپنی آواز خود ہی اجنبی لگی جیسے میں نہیں کوئی اور بول رہا ہے۔

"جان!" میگرا کی آواز میں ہلکی سی سرزنش تھی جیسے اسے میری یہ بات اچھی نہ لگی ہو۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مجھے اس پر یقین ہے لیکن یہاں کے لوگ اسی طرح سوچیں گے۔"

میگرا میرے قریب کھسک آئی اور نرم لہجے میں بولی۔ "تم لوگوں کے سوچنے کی پروا کیوں کرتے ہو؟"

میں نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کیا اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت برا ہوگا۔ لوگ فیڈرا کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ خواہ وہ اپنے شوہر کو دفنانے کے لیے ہی کیوں نہ آئی ہو۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ کلیٹن بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ سب کچھ بالکل واضح ہے۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہو..."

''فیڈرا اور کلینٹن جو کرتے ہیں، وہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔'' میگرا نے کہا۔ ''ایبل نے ان حالات میں جینا سیکھ لیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔''

''ہاں، یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی جانب جاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں کے لوگ اس انداز سے نہیں سوچتے۔''

☆☆☆

میں ڈاکٹر ایڈورڈ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں جیک مل گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بولا۔ ''میں نے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دیا ہے اور ایبل کی لاش غلے کے گودام میں رکھ دی ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے اس کی لاش کو اندر لے جاتے دیکھ لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی ہیں۔''

''لوگ جو مرضی کہتے رہیں، ہمیں اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے۔ میگرا کا خیال رکھنا۔ وہ اپنے گھر تک بحفاظت پہنچ جائے۔''

وہ روزانہ صبح سویرے تین میل کا فاصلہ طے کر کے آتی تاکہ ہمارے دفتر کی صفائی کرے اور کافی بنائے۔ اکثر ہم صبح کا ناشتا بھی ساتھ ہی کیا کرتے لیکن آج اس کا موقع نہیں ملا۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس کے گھر کے آس پاس رہوں؟''

''نہیں، تم اسے چھوڑ کر واپس آجانا۔ مجھے شام سے پہلے تمہاری ضرورت پڑے گی۔''

اس نے ڈاکٹر ایڈورڈ کے کلینک کی بند کھڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہاں، مجھے اس کا اندازہ ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔''

''اپنا خیال رکھنا۔''

اس کے جانے کے بعد میں بھی ڈاکٹر کے کلینک کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ اس کا معائنہ کا کمرا پیچھے کی جانب تھا لیکن اس وقت وہ اپنی میز پر بیٹھا ایک بڑے سے سیاہ جلد والے رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔

''ہیلو جان!'' اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ تم اس کی حالت کے بارے میں جاننا چاہ رہے ہو گے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔''

''اس کی حالت بہت خراب ہے۔'' وہ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ''وہ بری طرح زخمی ہے۔ اس کا جسم ہی نہیں بلکہ دماغ کو بھی ایذا پہنچائی گئی ہے میرا خیال ہے کہ تم اس کی وجہ جانتے ہو گے۔ بیشتر لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہے۔''

''تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو ڈاکٹر؟'' میں نے مضطرب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اسے درد دور کرنے والی دوائیں دی ہیں اور زخموں پر مرہم لگا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے نیند آجائے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس کے دماغ پر سوچوں کی یلغار ہے۔ شاید ایبل فرنچ کے بچھڑ جانے کے بعد اس کی یہ کیفیت ہوئی ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں ڈاکٹر۔''

''اس نے مجھے بتایا کہ ایبل کی موت کس طرح واقع ہوئی۔'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے بولنے دیا اور اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔''

''لیکن مجھے اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہوگی۔''

''میں تمہیں نہیں روک سکتا لیکن بہتر ہے کہ تھوڑا سا انتظار کرلو۔''

''کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟'' میں ڈاکٹر کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ وہ ویسے ہی زخم خوردہ ہے۔ ایبل فرنچ نے اس کی زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' وہ اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''ڈاکٹر! کیا اس نے بتایا کہ اس کے ہاتھوں پر چھالے کیسے پڑے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ برتن دھونے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی کہ پتیلی الٹ گئی اور کھولتے پانی کے چھینٹے اس کے ہاتھوں پر گرے۔''

''تمہیں اس پر یقین ہے؟''

''میں تمہیں وہی بتا رہا ہوں جو اس نے کہا۔'' اس کے پیشہ ورانہ انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ فی الحال اس کے نزدیک اس زندگی کی اہمیت تھی جسے وہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک قانون پسند شہری تھا لیکن قانون سے زیادہ اس کے لیے اپنے مریض کی زندگی اہم تھی۔

''سنو ڈاکٹر! میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ ایبل فرنچ کی لاش غلہ گودام میں پڑی ہوئی ہے۔ کیا تم اسے ایک نظر دیکھنا چاہو گے؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ میں اسے ابھی دیکھے لیتا ہوں۔ بشرطیکہ تم فیڈرا کے پاس ٹھہرو۔ اسے اکیلا نہیں رہنا چاہیے جان! ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے واپس آنے تک یہیں رکوں گا۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

ڈاکٹر ایڈورڈ کے جانے کے بعد میں درمیان کا پردہ ہٹا کر معائنے کے کمرے میں آ گیا۔ فیڈرا بستر پر لیٹی ہوئی تھی اس کے سنہری بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں سے آنے والی ہوا سے پردہ آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر نحیف سی آواز میں کہا۔

''ہیلو مارشل!''

''فیڈرا! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب ہو گا۔ مجھے پوچھ گچھ کے مرحلے سے گزرنا ہو گا لیکن مجھے اس کی لاش کو لے کر تدفین کے لیے یہاں آنا ہی تھا۔ کیونکہ وہ بھی یہی چاہتا تھا گوکہ اس نے کبھی اس قصبے کو پسند نہیں کیا اور اسی لیے ہم پہاڑوں میں رہتے تھے لیکن اسے اس جگہ سے بھی نفرت تھی بلکہ وہ تو مجھ سے اور کلینٹن سے بھی نفرت کرتا تھا۔''

''فیڈرا! یہ اتنا آسان معاملہ نہیں۔ تم کافی مشکل میں پھنس گئی ہو۔''

''میں جن مشکلات سے گزر کر آئی ہوں، ان کے مقابلے میں یہ مشکل کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا اور بولی۔ ''معاف کرنا۔ میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جاتی ہوں۔''

میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ صاف کیا اور منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''وہ مجھے مارتا تھا۔ مارشل وہ پانچ سال تک مارتا رہا۔ اس کی وجہ سے میرا حمل بھی ضائع ہو گیا۔'' اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں جیسے آنسوؤں کے ساتھ تکلیف دہ یادوں کو بھی روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''لیکن اب وہ مر چکا ہے۔ اب وہ مجھے نہیں مار سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔''

''فیڈرا! کیا تم نے ایبل کو مارا ہے؟''

''نہیں بلکہ وہ مر گیا اور میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے۔''

## محبت کی خاطر

### سائن بورڈ

''برائے مہربانی یہاں تمباکو نوشی سے مکمل پرہیز کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس شہر میں آپ کی جان بالکل بے وقعت ہے لیکن یاد رکھیے کہ پیٹرول بہت مہنگا ہے۔''

کراچی کے ایک پیٹرول پمپ پر آویزاں سائن بورڈ۔

عبدالقدیر، کراچی

### عاشق

''آپ کا کتا بالکل شیر جیسا لگتا ہے... کیا کھلاتے ہیں آپ اس کو؟''

''بھائی یہ کمینہ شیر ہی ہے... جب سے عشق و محبت کے چکر میں گرفتار ہوا ہے، اس کی صورت کتے جیسی ہو گئی ہے!''

فہد رضا، سیالکوٹ

### وفا شعاری

جوں ہی فون کی گھنٹی بجی تو شوہر نے جلدی سے بیوی کو ہدایت دی۔ ''میرا فون ہو تو کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔''

بیوی نے فون اٹھایا، دوسری طرف کی بات سنی پھر بولی۔ ''دراصل وہ گھر پر ہیں۔''

بات وہیں ختم ہو گئی۔ شوہر غصے سے بولا۔ ''میں نے تم کو منع کرنے کے لیے کہا تھا پھر تم نے کیوں بتایا کہ میں گھر پر ہوں؟''

''فون تمہارے لیے نہیں، میرے لیے تھا۔''

مسعود رضا، راولپنڈی

### پاگل پن

''میرے مرنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟'' بیوی نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جان! ایسی باتیں نہ کرو... ایسا ہوا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''میرے بعد دوسری شادی تو نہیں کریں گے نا؟''

شوہر سوچ میں پڑ گیا پھر دھیرے سے بولا۔ ''پاگل تو پاگل ہی ہوتا ہے... کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

علی نعیم، اسلام آباد

"لیکن قانون اس طرح مطمئن نہیں ہوگا۔ میں اس کے قتل کے امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ تم نے اس کے مرنے کی جو کہانی سنائی ہے، وہ کافی برمحل ہے۔ تم اتنی تفصیل سے یہ کہانی بیان نہیں کرسکتی تھیں اگر خود وہاں موجود نہ ہوتیں۔"

"اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔"

"تم غلطی پر ہو فیڈرا! مجھے بتاؤ وہ کس طرح مرا تھا؟"

لیکن وہ جو کچھ پہلے بتا چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس بستر پر لیٹی کھڑکی کے پردے کو ہوا سے ہلتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں نے بھی مزید پوچھ گچھ کا ارادہ ترک کر دیا اور ڈاکٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر اپنی سیاہ جلد والا رجسٹر کھلا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ میں نے فیڈرا فرنچ کے بارے میں پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں اس نے اس کے جسم پر پڑنے والے چھالوں کی تفصیل کے علاوہ اس کی بائیں کلائی میں پرانے فریکچر کی بھی نشاندہی کی تھی جو پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ حمل ضائع ہونے کے بعد وہ بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے اس کے جسم اور ذہن کو سکون پہنچانے کے لیے کچھ دوائیں تجویز کی تھیں اور چھالوں پر لگانے کے لیے مرہم بھی لکھا تھا اور مریضہ کو مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر اندر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری زبان سے نکلا۔ "تم جلدی واپس آ گئے؟"

"فیڈرا کیسی ہے؟" ڈاکٹر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ آرام کر رہی ہے۔ میں اس سے کچھ بھی معلوم نہ کرسکا۔" میں نے اسے کمرے میں چکر لگاتے دیکھ کر کہا۔ "تم بتاؤ۔ لاش کا معائنہ کرنے کے بعد تمہاری کیا رائے ہے؟"

وہ دواؤں کی الماری میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔ "وہی جس کی تم توقع کرسکتے ہو۔ اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو گیا ہے اور جگہ جگہ سے کھال لٹک رہی ہے۔"

میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور میں نے جلدی سے کہا۔ "جیسے اسے کسی نے دھکا دیا ہو اور وہ ابلتے ہوئے پانی کے برتن میں جا گرا ہو۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ مجھے اس کے سر کی پشت پر ایک گومڑ نظر آیا ہے جیسے کسی نے اس پر پیچھے سے ضرب لگائی ہو اور جب وہ بے ہوش ہو یا چوٹ لگنے سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا ہو تو اس کا چہرہ پانی میں ڈبو دیا گیا۔ کسی کو مارنے کا یہ بہت ہی واہیات طریقہ ہے۔"

"کیا تمہارے خیال میں قتل کرنے کا کوئی اچھا طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ڈاکٹر جھینپتے ہوئے بولا۔

کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں اور اس کی وجہ سے وہاں گرمی اور حبس کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر! کیا تم سمجھتے ہو کہ فیڈرا نے ایبل کو مارا ہوگا۔"

ڈاکٹر ایڈورڈ نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ "جو کچھ اس پر گزر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے حیرت ہے کہ اس نے پانچ سال تک کس طرح برداشت کیا۔"

"لیکن ایبل بھاری بھرکم آدمی تھا اور فیڈرا اس سے زیادہ طاقتور نہیں تھی کہ......"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب کسی کو اتنا دبایا جائے تو اس میں اتنی طاقت آ ہی جاتی ہے کہ وہ قتل کرسکے تم قتل کو اتنا نہیں سمجھتے۔ تم اسے صرف قانون کی آنکھ سے دیکھتے ہو جبکہ میری نظر میں یہ کسی دباؤ کا ردعمل ہوتا ہے جب یہ دباؤ حد سے بڑھ جائے تو پھر کوئی بھی شخص قتل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فیڈرا جیسی ٹوٹی ہوئی لڑکی بھی یہ ہمت کرسکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر! تمہاری مدد کا بہت بہت شکریہ۔" میں جانے کے لیے مڑا۔

"تم کیا کرنے جا رہے ہو جان؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ میں فرنچ کے گھر جا کر کلیٹن سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں، وہ کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد میں فیڈرا کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلوں گا۔"

"کلیٹن سے پوچھ گچھ کیے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کرو۔" ڈاکٹر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو ڈاکٹر، میں اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار ہوں۔"

☆☆☆

میں سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ چار آدمیوں کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک بولا۔

"مارشل! ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے ان لوگوں کے قریب آنے کا انتظار کیا۔ اتنا تو

اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ وہ کیا بات کرنے والے ہیں۔ میں نے ایک کھمبے کا سہارا لیا اور تھوڑا سا جھک کر ایک ہاتھ سے کوٹ کے نیچے چھپے ہوئے ریوالور کا دستہ تھام لیا۔ کوکہ وہ لوگ مسلح نہیں تھے لیکن کسی ہنگامی صورتِ حال میں مجھے اپنے دفاع کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

وہ چاروں میرے قریب آکر رک گئے۔ ان میں سے ایک کوارٹرموں، کا مالک آگسٹ واکر تھا جبکہ بقیہ تین کے نام کلے، سیلٹری اور گیری تھے۔ وہ چاروں ہی خاصے مقبول کاروباری لوگ تھے یا کم از کم اس وقت تک میں ان کے بارے میں یہی سمجھتا تھا۔

''صبح بخیر دوستو۔'' میں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''امید ہے کہ آج کا دن اچھا گزرے گا۔''

''صبح بخیر۔'' واکر نے ان کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں کہ ان سب نے اسے متفقہ طور پر اپنا ترجمان چنا تھا یا اس نے ازخود ہی یہ فرض سنبھال لیا۔ ''مارشل! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فیڈرا، ڈاکٹر ایڈورڈ کے کلینک میں موجود ہے۔''

''ہاں۔''

''ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس قصبے سے فوراً چلی جائے۔ یہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ میں اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس کا سر کسی دیوار سے ٹکرا دوں لیکن ایسے لوگوں کے منہ لگنا میرے منصب کے خلاف تھا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

''تم سب لوگ میری بات غور سے سنو۔ وہ عورت بیمار ہے اور ڈاکٹر ایڈورڈ اس کا علاج کر رہا ہے۔ میں اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا۔''

''اس جیسی عورت اس قصبے کے ماحول کو خراب کرسکتی ہے۔''

''مسٹر واکر! تم اپنی گزراوقات کے لیے کیا کرتے ہو؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کوارٹرموں کا مالک ہوں لیکن تمہارے سوال کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا۔ گیری بول پڑا۔ ''مارشل! ہم خاندانی لوگ ہیں اور ایسی لڑکی کا اس قصبے میں وجود برداشت نہیں کرسکتے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہاں کا ماحول خراب ہوگا بلکہ ہمارے بچوں پر بھی اس کا بُرا اثر پڑے گا۔ وہ جو کچھ کر چکی ہے۔ اس کے بعد تو یہ بالکل بھی ممکن نہیں رہا۔ میں ایبل فرنچ کے قتل کی بات نہیں کر رہا۔''

''مسٹر گیری! ابھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ ایبل کو قتل کیا گیا ہے یا وہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔''

''رہنے دو مارشل! ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہیں۔'' سیلٹری نے کہا۔

''لیکن بے وقوفوں جیسی باتیں ضرور کر رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی وہ گرفتار نہیں ہوئی ہے۔''

''تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟'' کلے نے کہا۔ وہ ہیکسن ہوٹل کا مالک تھا اور میں اسے اپنے قریبی دوستوں میں شمار کرتا تھا۔ ''ہم شادی شدہ اور بچوں والے ہیں۔ ایسی عورت کا ہمارے خاندان کے درمیان رہنا ٹھیک نہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' واکر بول پڑا۔ ''تم جیسا آدمی شاید یہ بات نہ سمجھ سکے۔ حالانکہ یہ بہت سیدھی سی بات ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو مسٹر واکر؟''

اس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''سب جانتے ہیں کہ تم اکثر راتوں کو چھپ چھپ کر کس سے ملنے جاتے ہو۔'' اس کا اشارہ میگرا کی طرف تھا۔

دوسرے لوگ اس جسارت پر ششدر رہ گئے۔ ان میں سے ایک دو نے شرمندگی کے مارے نگاہیں نیچی کرلیں۔

''تمہاری زبان سے ایسی بات دوبارہ نہ سنوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔'' وہ چیلنج کرنے کے انداز میں بولا۔ ''تم دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہو لیکن مجھے نہیں۔ میں واشنگٹن والوں سے تمہاری تحریری شکایت کردوں گا۔''

''تمہارے پاس کہنے کے لیے کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی شکایت کرو گے کہ میں نے تمہاری دکان سے دو ہفتے پہلے کچھ سامان ادھار لیا تھا جس کی ادائیگی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔''

''میں تم جیسے سرکاری ملازم کے ہاتھوں ذلیل ہونا پسند نہیں کروں گا۔ ہم تمہاری رعایا نہیں بلکہ تم ہمارے ملازم ہو۔ ہم ہیکسن کے شہری ہیں اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں۔''

''یہ تمہاری بھول ہے مسٹر واکر! میں امریکی حکومت کا ملازم ہوں اور ایک سرکاری افسر ہونے کی حیثیت سے کسی کو سرکاری کاموں میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ





عورت اس وقت زیرِ علاج ہے اور ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ چاہے تم اسے پسند کرو یا نہیں۔''

یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ بقیہ لوگ کچھ فاصلے پر تھے۔ میں واکر کو ایک جانب لے گیا اور بولا۔ ''ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔'' میں نے اپنے سینے پر لگے تمغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ وردی تمہاری زہرافشانی سننے کے لیے نہیں پہنی ہے۔ تم میرے بارے میں جو چاہو کہو لیکن آئندہ میگرا کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''یونہی سمجھ لو۔''

''تم حد سے زیادہ بڑھتے جا رہے ہو۔ اب مجھے تمہاری تحریری شکایت کرنا ہی ہوگی۔ میں اپنے ہی قصبے میں قانون کے محافظوں کی دھمکیاں برداشت نہیں کرسکتا۔''

''میرے راستے سے ہٹ جاؤ واکر! مجھ بہت کام کرنے ہیں۔'' میرے کہنے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ ''تم نے سنا نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر فوراً ہی لہجہ بدلتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے مارشل! تمہارا وقت بھی آنے والا ہے۔'' پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''دوستو! ہمیں چلنا چاہیے۔ ہم غلطی پر تھے۔ ہمیں اس شخص سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

وہ سب مڑے اور اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب روانہ ہوگئے۔ میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جانتا تھا کہ وہ برے لوگ نہیں البتہ فیڈرا کے سابقہ ریکارڈ کی وجہ سے خوف زدہ تھے۔ میں دفتر کی جانب جا رہا تھا کہ اچانک ہی ایک گلی سے جیک برآمد ہوا اور کہنے لگا۔

''میں نے سب کچھ سن لیا ہے مسٹر مارشل! اسی لیے میں نے سوچا کہ مجھے یہاں چھپ کر انتظار کرنا چاہیے تاکہ ضرورت پڑنے پر تمہاری مدد کرسکوں۔''

''تم نے اچھا کیا جیک۔'' میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ واکر کی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس نے میگرا کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میگرا موت سے کتنا قریب ہوگئی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر میں ڈر گیا تھا۔ اس کی زندگی باقی تھی جو وہ بچ گئی۔ اگر میں اس کی مدد کو نہ آتا تو شاید وہ اس دنیا سے چل بسی ہوتی۔

جیک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے بڑی جلدی ہتھیار ڈال دیے۔ ورنہ ان کے تیور دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا معرکہ ہونے والا ہے۔''

''وہ لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا تھی۔ میں نے بھی انہیں اس کا پورا موقع دیا تاکہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے۔'' اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ خیال آیا اور میں پوچھ بیٹھا۔ ''کیا تم نے میگرا کو بحفاظت اس کے گھر تک پہنچا دیا تھا؟''

''ہاں، بلکہ مسٹر جانسن بھی اپنے کیبن کے باہر ہی کام کر رہے تھے۔''

ہم باتیں کرتے کرتے دفتر میں داخل ہوئے۔ میں نے الماری سے اپنی رائفل نکالی اور بولا۔ ''میں فرنچ کے گھر جا رہا ہوں تم میری غیر موجودگی میں ڈاکٹر کے کلینک کے آس پاس ہی رہنا۔ ویسے تو مجھے امید نہیں کہ وہ لوگ دوبارہ آئیں گے لیکن پھر بھی ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

"ٹھیک ہے۔ میں ان پر نظر رکھوں گا۔" جیک سعادت مندی سے بولا۔

میں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ میرا رخ مغرب کی جانب تھا۔ فریج کے گھر تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا تھا۔ یہ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں رہنے پر فخر محسوس کیا جا سکے۔ وہ ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن تھا جس کے ساتھ ہی مویشیوں کا باڑا اور ایک شیڈ بنا ہوا تھا جہاں فیڈرا اپنے گھوڑے کو باندھتی ہوگی۔ اس کے سوا مجھے وہاں کوئی اور جانور نظر نہیں آیا۔

میں جانتا تھا کہ ایبل کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں تھا اور شکار سے ہونے والی آمدنی اتنی قلیل تھی جس میں بمشکل اس کا گزارہ ہوتا ہوگا۔ اس کا اندازہ مجھے وہاں کی خستہ حالی سے بھی ہو گیا۔ وہ جگہ کسی بھی اعتبار سے رہنے کے قابل نہیں تھی۔

میں گھوڑے سے اتر کر ایک چھوٹی چٹان کی ہموار سطح پر کھڑا ہو گیا۔ وہ جگہ کافی بلندی پر واقع تھی اور وہاں سے ہیکسن کی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا تو جھرجھری سی آ گئی۔ میری نظروں کے سامنے کئی ایسے مناظر گھوم گئے جن کا تصور ہی روح فرسا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایبل کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جب وہ اس چٹان پر کھڑے ہو کر اپنے قصبے کی روشنیوں کو دیکھتا ہوگا پھر میرے کانوں میں فیڈرا کی چیخیں گونجنے لگیں۔ جب ایبل اسے مارتا ہوگا تو اس کے حلق سے ایسی ہی آوازیں نکلتی ہوں گی۔ مجھے لگا کہ ان پہاڑوں میں اس کی چیخوں کی گونج اب بھی محفوظ ہے جو وقفے وقفے سے مجھے سنائی دے رہی ہے۔

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کیبن کی جانب چل دیا۔ صحن کے وسط میں پانی سے بھرا ہوا لوہے کا ایک بڑا سا برتن رکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے پڑے ہوئے کوئلے بجھ چکے تھے۔ زمین پر جگہ جگہ کپڑے بکھرے ہوئے تھے جیسے کوئی انہیں وہاں پھینک کر بھول گیا ہو۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور وہاں کوئی ایسا برآمدہ یا پورچ نہیں تھا جہاں بیٹھ کر وادی کا نظارہ کیا جا سکے۔ دراصل وہ گھر نہیں بلکہ چھپنے کے لیے عارضی ٹھکانا تھا جہاں زندگی کی کوئی سہولت موجود نہیں تھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں۔ میں ایک جگہ کھڑے ہو کر اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک مجھے بارود کی بو محسوس ہوئی۔ میں اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا پھر ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں تمہیں اسی وقت گولی مار سکتا ہوں۔"

مجھ پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر کلیٹن مجھے مارنا چاہتا تو وہ ایسا کر چکا ہوتا۔ وہ ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے وہاں ایک بینچ، لکڑی کی الماری اور کچھ برتن رکھے ہوئے نظر آئے۔ کیبن کی چھت نیچی تھی اور مجھے اپنے سر کو اس کے بیم سے بچانا تھا۔

"بیٹھ جاؤ مارشل! تم دروازے پر کھڑے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے۔"

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"فیڈرا، پاپا کو ہیکسن لے گئی ہے۔ کیا تم نے اسے نہیں دیکھا؟" یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان دونوں کے جانے کے بعد اس کا مستقبل کیا ہوگا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کل صبح اس کی تدفین ہوگی۔"

"بہتر ہوتا کہ اس کی لاش کو جلا کر ہڈیاں پاگل کتوں کے آگے ڈال دی جائیں۔"

مجھے اس کی دیوانگی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ تاہم میں نے اپنے لہجے کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "کلیٹن! بندوق رکھ دو۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا پھانسی پر چڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ البتہ میں ان دونوں کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم فیڈرا کو چاہتے ہو۔ لوگ تو یہی کہتے ہیں۔"

"میں اب بھی اسے چاہتا ہوں۔" وہ اپنی کرسی کھسکاتے ہوئے بولا۔ "وہ بہت خوب صورت تھی۔ جب پاپا اسے لے کر یہاں آئے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد ہم لوگ کافی تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے مجھے فیڈرا کے آنے کی بہت خوشی ہوئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جگہ عورتوں کے رہنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ خاص طور پر فیڈرا جیسی خوب صورت اور جوان لڑکی یہاں نہیں رہ سکتی بلکہ سچ پوچھو تو مرد بھی یہاں بمشکل رہ پاتے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھیں جیسے وہ اپنے آپ کو ان پہاڑوں میں قیدی محسوس کر رہی ہو۔ "جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا، میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جب کوئی اس طرح پھنس جائے تو وہ وہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈتا ہے۔ ہم





دونوں ہی اس انتظار میں تھے کہ پاپا کہیں جائیں تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ پاپا کو کچھ شک ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی فیڈرا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اس علاقے سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"کیا تمہارے پاس روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی موم بتی یا لیمپ وغیرہ۔" میں نے اندھیرے سے گھبراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، پاپا کا خیال تھا کہ مردوں کو قدرتی روشنی میں گزارہ کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی وہ آتش دان میں آگ روشن کرتے تو وہ بائبل لے کر بیٹھ جاتی۔ ایسے میں وہ اور زیادہ حسین لگتی۔ آتش دان سے نکلتی روشنی سے اس کا چہرہ منور ہو جاتا اور بال چمکنے لگتے۔ وہ بہت اچھی تھی۔"

"اگر صورتِ حال اتنی ہی خراب تھی تو تم یہاں سے چلے کیوں نہیں گئے؟"

"فیڈرا یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ پاپا کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ خواہ وہ اس کے ساتھ کتنا ہی برا سلوک کیوں نہ کرتے.... اس کے باوجود کہ وہ اور میں...."

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور بات بدلتے ہوئے بولا۔

"یہاں تک کہ بچہ ضائع ہونے کے بعد بھی وہ یہی سمجھتی رہی کہ اس نے اپنی زندگی پاپا کے لیے وقف کر دی ہے۔ ایک طرح سے وہ ٹھیک ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا خاندان ٹیکساس میں فاقہ کشی کی زندگی گزار رہا تھا جب پاپا نے اس سے شادی کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہم اسے لینے کے لیے ہیکسن گئے تھے۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی اور اس کے پاس ایک ہینڈ بیگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم نے ہیکسن ہوٹل میں کھانا کھایا اور اسے لے کر ان پہاڑوں میں آ گئے اور اس کے بعد کبھی یہاں سے نہیں گئے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے پاس مزید کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا کلیٹن۔"

"میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"ایبل کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی موت کسی حادثے کے نتیجے میں واقع نہیں ہوئی بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اور ہمیں شبہ ہے کہ اس قتل میں فیڈرا کے ساتھ تم بھی ملوث ہو لہٰذا تم پر اس الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔"

اس نے غصے سے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا۔ "وہ اسے مارتا تھا اور فیڈرا خاموشی سے اس کی مار سہتی رہتی.... میں کبھی نہیں سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔ اسے کیا مجبوری تھی کہ وہ یہاں رہ کر اس کا ہر ظلم برداشت کر رہی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے اس کی وجہ جاننا چاہی تو بولی کہ وہ ٹیکساس واپس جانا نہیں چاہتی اور اس کے بجائے انہی پہاڑوں میں مرنے کو ترجیح دے گی۔ ٹیکساس میں اس پر جو بیت رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں روزانہ مار کھانا کچھ زیادہ برا نہیں۔ وہاں تو اسے کھانے کو بھی نہیں ملتا تھا اور کئی مرتبہ اسے پتے کھا کر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ انتہائی جذباتی آواز میں بولا۔ "مارشل! تمہیں یقین ہے کہ ڈاکٹر ایڈورڈ اس کی مناسب دیکھ بھال اور علاج کر رہا ہے؟"

"ہاں، اس کا اچھی طرح علاج ہو رہا ہے۔"

"میں نے اسے منع کیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ ابلتے ہوئے پانی میں نہ ڈالے لیکن اس نے کہا کہ وہ مجھے بچانے کے لیے ایسا کر رہی ہے تاکہ جائے واردات سے میری غیر موجودگی ظاہر کی جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس وقت کچھ پاگل ہو گیا تھا۔ پاپا کلہاڑی کے دستے سے اسے مارنے کے لیے آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے انہیں پکڑ کر ابلتے ہوئے پانی میں دھکا دے دیا اور ان کے کندھوں پر لکڑی رکھ کر اس وقت تک چہرہ پانی میں ڈبوئے رکھا جب تک ان کی جان نہ نکل گئی۔ ان کی موت کا یقین کرنے کے بعد میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا تھا اس پرندے کی طرح جسے کھلی فضا میں پرواز کرنے کا موقع مل گیا ہو۔ جب واپس آیا تو فیڈرا جا چکی تھی۔ اس نے گھوڑا نکالا اور اس پر پاپا کی لاش رکھ کر ہیکسن چلی گئی۔"

"کس نے گھوڑے کے اوپر تمہارے باپ کو لادا تھا.... کیونکہ وہ جلے ہوئے ہاتھوں سے یہ سب نہیں کر سکتی تھی؟"

"میرا خیال ہے کہ شاید یہ کام میں نے ہی کیا ہوگا۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔"

"میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا کلیٹن! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"میں کسی قیمت پر بھی نہیں جاؤں گا۔ اگر تم نے زبردستی کی تو تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا۔"

"کلیٹن! میری بات سنو۔ یہاں اندھیرا ہے اور تم مجھے نہیں دیکھ سکتے جبکہ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ اگر تم نے مجھ پر گولی چلانے کی حماقت کی تو میں بھی تم پر جوابی

حملہ کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا اور تمہاری موت کا فیڈرا کو بہت صدمہ ہوگا۔ کیا تم اسے یہ دکھ دینا چاہتے ہو۔"

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ مجھے لگا جیسے وہ رو رہا ہے۔ میں نے اس کی جذباتی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ پہلے ہی بہت دکھ نہیں جھیل چکی۔"

اس کا پستول دھم سے میز پر آن گرا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ جدید ساخت کا کولٹ برانڈ پستول تھا۔ اگر اس کے ٹریگر پر ہلکا سا دباؤ پڑتا تو میری موت واقع ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کا چیمبر خالی کر کے گولیاں میز پر پھیلا دیں اور پستول کو اپنی کمر میں اڑستے ہوئے بولا۔

"کلیٹن! اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ باہر اچھی خاصی روشنی تھی۔ ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے اور پہاڑیوں کے عقب سے چاند اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔

کلیٹن میرے گھوڑے کے آگے سے گزرتے ہوئے بولا۔ "فیڈرا سے کہہ دینا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"رک جاؤ کلیٹن! رک جاؤ۔" میں زور سے چلایا۔

میں نے اپنا پستول نکال لیا مگر گولی چلانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ چٹان کے آخری سرے پر کھڑا ہوا تھا جس کے آگے گہری کھائی تھی۔ چاند کی روشنی اس کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ تذبذب میں مبتلا ہے جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھایا اور اس کا وجود میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ میں احتیاط سے چلتا ہوا کنارے تک آیا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا لیکن وہاں گہرے اندھیرے اور سناٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کلیٹن کی لاش کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رات کی تاریکی اور گہری کھائی نے اسے نگل لیا تھا۔

میں نے اپنے گھوڑے کی باگ سنبھالی اور اسے لے کر پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔

☆☆☆

"کیا وہ واقعی مر چکا ہے؟" فیڈرا نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

صبح ہو چکی تھی اور میں رات بھر کے سفر کے بعد صحیح حالت میں واپس آنے میں کامیاب رہا تھا۔ ورنہ اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اس ناہموار راستے پر اندھیرے میں چلتے ہوئے میری یا گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ میں بری طرح تھک چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے اور اس دوران مجھے ایک منٹ کے لیے بھی آرام نصیب نہیں ہوا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔ میں نے اسے زندہ سلامت لانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ جانتی ہوں کہ اس نے سب کچھ قبول لیا ہوگا۔ وہ اسی طرح کا لڑکا تھا۔" اس نے تھکی ہوئی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ "اس نے ہمیشہ مجھے بچانے کی کوشش کی۔"

وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی اور لیمپ کی زرد روشنی میں اس کے جلے ہوئے ہاتھ بہت بدنما لگ رہے تھے۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے فیڈرا۔"

"میں تیار ہوں۔"

ہم دونوں باہر والے کمرے میں آئے۔ جہاں جیک اور ڈاکٹر ایڈورڈ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم پریشان ہو، فیڈرا۔" میں اس سے کہہ رہا تھا۔ "میں مقدمے کے دوران میں تمہاری طرف سے بولوں گا اور تمہیں اس مشکل سے نکالنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"جانتی ہوں کہ تم میرا خیال رکھو گے۔ میں تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔"

میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس کے چہرے کی جانب نہ دیکھ سکا ورنہ مجھے اس کی آنکھوں میں لکھی ہوئی تحریر صاف نظر آجاتی اور میں جان جاتا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس مرحلے پر مجھ سے چوک ہو گئی۔ میں یہ الزام قبول کرتا ہوں اور اپنے آپ کو اس کا ذمے دار سمجھتا ہوں۔

ہم باتیں کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ ہم وہاں تک پہنچتے، فیڈرا نے جھپٹ کر جیک کے ہولسٹر سے پستول نکال لیا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ جیک نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔"

"اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے جیک! اس نے ایک غیر معمولی حرکت کی ہے۔"

یہ کہہ میں اس کے تعاقب میں سیڑھیوں کی طرف

بھاگا۔ مجھے حیرت سے زیادہ اس بے وقوف لڑکی پر غصہ آرہا تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس طرح نہیں بچ سکتی۔ جب میں نیچے پہنچا تو وہ پلازا تک جانے والا نصف راستہ طے کر چکی تھی۔

''فیڈرا!'' میں پوری قوت سے چیخا۔

میری آواز سن کر وہ رک گئی۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ابھی اس میں کچھ عقل باقی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے پستول کا رخ میری جانب کرلیا اور طنزیہ انداز میں بولی۔

''جانتی ہوں کہ تم میرا خیال رکھو گے مارشل۔''

میرے قدم وہیں رک گئے اور منہ خشک ہونے لگا۔ میں بمشکل اتنا کہہ سکا۔ ''ایسا مت کرو فیڈرا۔''

''مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں۔''

''فیڈرا! پستول پھینک دو۔ اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

وہ مسکرائی۔ ''کوئی مرد میرے لیے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو تم کرو گے۔''

''فیڈرا! میری بات سنو۔ پستول نیچے رکھ دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں گواہی دوں گا کہ تمہارے شوہر کا قاتل کلیٹن ہے۔ وہ مرنے سے پہلے اس کا اعتراف کرچکا ہے۔''

اس نے پستول کا لیور کھینچا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔

''تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا۔ ایک عورت پر گولی چلانا ہوگی۔ اگر کوئی مرد یہ کام کرسکتا ہے تو وہ تم ہو اور یہ بات ہم دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''نہیں، فیڈرا نہیں۔'' میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں اپنا پستول نکال چکا تھا۔

''میری مدد کرو۔'' وہ چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے فائر کردیا۔ نشانہ چوک گیا اور گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ لیکن میں نے اپنے اعصاب قابو میں رکھے۔ اپنی جان بچانے اور اسے مزید فائر کرنے سے روکنے کے لیے جوابی اقدام ضروری تھا کیونکہ وہ مرنے مارنے پر آمادہ تھی جبکہ میں اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

میری پہلی گولی اس کے سینے کے وسط میں لگی جبکہ دوسری اس سے دائیں جانب تین انچ کے فاصلے پر رہی۔ وہ گھٹنوں کے بل گری اور اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔ میں تیزی سے اس کی جانب لپکا اور اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

''فیڈرا!''

اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولی۔ ''کلیٹن۔'' میں نے اس کا زخمی ہاتھ تھام لیا۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''کلیٹن! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کلیٹن کے پاس جاچکی تھی۔ میں زور سے چلایا۔ ''فیڈرا!''

اس چیخنے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ میری آواز سننے سے قاصر تھی۔ میں کافی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا اس کے مردہ جسم کو یکھتا رہا پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹا۔ جانتا تھا کہ بہت سے لوگ سڑک پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ مجھے یاد نہیں وہ کون تھا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا اور بولا۔

''مارشل! ہم غلطی پر تھے۔ اسے سمجھ نہ سکے۔ میں نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا۔ مجھے اس پر افسوس ہے۔''

میرا جی چاہا کہ اس شخص کا منہ نوچ لوں۔ یہی لوگ فیڈرا کے قاتل تھے۔ انہی کی وجہ سے وہ قصبہ چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پانچ سال تک پہاڑوں میں اپنے شوہر کے ظلم و تشدد برداشت کرتی رہی۔ ان کی نفرت کی انتہا یہ تھی کہ وہ اس کے شوہر کی قصبے میں تدفین کے لیے بھی تیار نہ تھے اور جب وہ اس دنیا میں نہ رہی تو اس کی لاش پر کھڑے مگرمچھ کی طرح آنسو بہا رہے تھے۔

میں اپنے دفتر میں چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو فیڈرا کی موت کے ذمے دار تھے۔ اگر میں تفتیش کے لیے کلیٹن کے پاس نہ جاتا اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش نہ کرتا تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔ مجھے فیڈرا کے بیان پر اعتبار کر کے ایبل کی موت کو حادثاتی سمجھ لینا چاہیے تھا لیکن قصور میرا بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد میرے لیے لازم ہوگیا تھا کہ ایبل کے قاتل کا کھوج لگاؤں البتہ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ فیڈرا اور کلیٹن میں سے کس نے اسے دھکا دیا تھا۔ وہ آخر وقت تک ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔

اس شام انہی چار آدمیوں نے فیڈرا کو ایبل کے پہلو میں دفن کردیا جو نہیں چاہتے تھے کہ ایبل کی تدفین اس قصبے میں ہو۔ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا جسے بدلنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے فیڈرا بہت یاد آتی ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کی قبر پر جاسکوں۔

◆



ربیکا اندھیرے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے وہ آواز پھر سنائی دی تھی۔

وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سے کھسکتی ہوئی باہر آکے کھڑی ہوگئی اور پوری توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگی۔

گیری کی متوازن دھیمی...... سانسیں ظاہر کررہی تھیں کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ اس نے وہ آواز نہیں سنی تھی۔

ربیکا نے ٹینٹ کے اوپری حصے پر سے نگاہیں اٹھا کر

# شکار

سلیم انور

غیر معمولی حالات میں غیر معمولی ذہانت کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے... شکار پر گئے ہوئے میاں بیوی کی مشترکہ مہم جوئی... شکار اور شکاری کے تصادم نے اچانک پانسا پلٹ دیا...

چونکا دینے والے انجام سے بھرپور ایک سنسنی خیز کتھا

آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر بے شمار ستارے جگمگا رہے تھے لیکن چاند کی روشنی بے حد مدھم تھی۔ کیمپ سائٹ کے پاس انہوں نے جو الاؤ روشن کیا تھا، اس کی آگ بھی اب دھیمی پڑ رہی تھی۔ اس کی ہلکی روشنی میں ان کے خیمے کے آس پاس کی چیزوں میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

تب ربیکا کو درختوں کی قطار کے پاس کوئی شے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ایک سیاہ پھیلا ہوا سا سایہ تھا جو روشنی کے حلقے سے دور ڈگمگاتے ہوئے چل رہا تھا۔

ربیکا نے اپنا سانس روک لیا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس ہیولے کا بہتر طور پر جائزہ لینے کے ارادے سے ربیکا نے نیم باز آنکھوں سے درختوں کی سمت دیکھنا شروع کیا۔

اتنے میں گیری کی آواز گونجی۔ ”یہ تم آدھی رات کو کیا کر رہی ہو؟“

ربیکا کے حلق سے بے ساختہ ایک کان پھاڑ دینے والی چیخ نکل گئی اور وہ سایہ ربیکا کی چیخ بلند ہوتے ہی تیزی سے گہری تاریکی غائب ہو گیا۔

ربیکا خیمے کے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

گیری نے اپنی ایک کہنی کا سہارا لیتے ہوئے سر اٹھایا اور بولا۔ ”کیا ہوا؟“

”میں نے کچھ دیکھا ہے۔ وہ کوئی لمبی چوڑی چیز تھی۔“

”کوئی ہرن تھا؟“

”نہیں، اس سے بڑا ہیولہ تھا۔“

”کوئی ریچھ؟“

”نہیں، میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی ریچھ ہی ہو گا۔“ یہ کہہ کر ربیکا نے ایک اچٹتی نگاہ تاروں بھرے آسمان پر ڈالی... وہ دوبارہ گویا ہوئی تو اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”کیا تمہارے خیال میں وہ واپس آئے گا؟“

گیری نے آگے جھکتے ہوئے اپنے پتلے ہاتھوں سے ربیکا کی کلائی تھام لی اور اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ”بے بی!... میں یہاں گھر سے اتنی دور تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“

ربیکا گیری کے پُرعزم لہجے کے جواب میں تیزی کے ساتھ اس کے سلیپنگ بیگ میں کھسک گئی اور خود کو اس کے دبلے پتلے گرم جسم کے ساتھ چمٹا لیا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ اس منحنی جسم کے ساتھ گیری کسی ریچھ کا کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن اس نے اپنے اس خیال کو زبان نہیں دی۔

”مجھ پر اعتبار کرو۔“ گیری نے اسے بھینچتے ہوئے دلاسا دیا۔ ”میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“

ربیکا نے ایک آہ بھری اور بولی۔ ”اوکے۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں نے تمہیں اس بات کی اجازت کیوں دی کہ تم مجھے اس ویران اور دور دراز بیابان میں لے آئے۔ میں خوامخواہ تمہاری باتوں میں آگئی۔ اب خوف کے باعث میں نے ہار مان لی ہے۔“

گیری یہ سن کر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا اور حیرت سے منہ پھاڑ کر ربیکا کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”یہاں آنے کا آئیڈیا تمہارا ہی تھا۔“

”ہاں... نہ جانے میں نے کیا سوچ کر یہ آئیڈیا دیا تھا۔ لعنت ہو مجھ پر۔“ وہ بڑبڑائی۔

”اچھا اب سونے کی کوشش کرو۔ ہمارے سامنے شکار کا ایک بڑا دن پڑا ہے۔“ گیری نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ربیکا کا اعتماد بحال ہو گیا۔

وہ خیمے سے نکل کر باہر آگئی۔ صبح کی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ ربیکا نے الاؤ میں مزید سوکھی ہوئی لکڑیاں ڈال دیں۔ جب آگ بھڑکنے لگی تو انڈے پھینٹ کر آگ پر تلنے لگی۔ اس دوران میں گیری شکار کا لباس تبدیل کرنے خیمے میں چلا گیا۔

”ان کپڑوں میں سے فضلے کی سی بو آرہی ہے۔“ گیری نے خیمے کے اندر سے چیختے ہوئے کہا۔ ”کیا میرے پچھلے مچھلی کے شکار پر سے آنے کے بعد تم نے ان کپڑوں کو دھویا نہیں تھا؟“

ربیکا الاؤ کے مزید قریب ہو گئی اور اس نے اپنے جسم کو مزید تپش پہنچاتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا پھر بولی۔ ”یقیناً میں نے تمہارا لباس دھویا تھا۔ یہ بو گل کے شکار کے باعث کپڑوں میں بس گئی ہو گی۔“

گیری ڈگمگاتے قدموں سے باہر آیا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی جینز اور اوور سائز فشنگ جیکٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”مجھ میں سے ایک بڑی ٹراؤٹ مچھلی کی سی بو آرہی ہے۔“

ربیکا نے کیمپ فائر کی تیز حدت سے اپنے چہرے کو بچاتے ہوئے گیری کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”تب تو تمہیں مچھلی کا شکار بلکہ ٹراؤٹ مچھلی کا شکار کرنے میں زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ تمہاری بو سے مچھلیاں دھوکا کھا جائیں گی۔“

گیری نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے زمین پر ٹھوکر





ماری اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں ربیکا نے ناشتا تیار کیا۔ وہ دونوں ناشتا کرنے لگے۔

ناشتے کے دوران میں انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ربیکا نے برتن سمیٹ لیے۔ گیری شکار کا سامان اکٹھا کرنے لگا۔

پھر وہ دونوں فشنگ ہول کی جانب پیدل روانہ ہو گئے جو ان کے خیمے سے ایک لمبی مسافت کے فاصلے پر تھا۔

لگ بھگ ایک میل چلنے کے بعد گیری رک گیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کسی چیز کو دیکھنے لگا۔ ربیکا بھی رک گئی۔

”ادھر دیکھو۔“ گیری نے ربیکا کو مخاطب کیا۔

ربیکا نے اپنی نظریں ادھر جما دیں جدھر گیری اپنی انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔

وہ نرم ریت پر ایک بڑے سے پنجے کا نشان تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ ربیکا نے پوچھا۔

گیری نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ”رات تم نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہ درست تھا۔ یہ ریچھ کے پنجے کا نشان ہے۔“

ربیکا اِدھر اُدھر سر گھمانے لگی۔ خوف اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ”کیا ہم خطرے میں ہیں؟“

”نہیں، شاید یہ کوئی سیاہ ریچھ ہے اور عام طور پر سیاہ ریچھ حملہ نہیں کرتا...“

”اس صورت میں اگر اس کے بچے نہ ہوں۔“ ربیکا نے جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بے بی۔ میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ...“

”میں جانتی ہوں۔ تم مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دو گے۔“ ربیکا نے اسی کا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

گیری یہ سن کر مسکرا دیا۔ ”یہ حوصلہ ہونا چاہیے۔“

پھر وہ دونوں چلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں دو درخت آپس میں مل کر پانی کے اوپر ایک بڑے سے ”وی“ کا نشان بنا رہے تھے۔

”آؤ، یہیں شکار کرتے ہیں۔“ ربیکا نے مشورہ دیا۔

گیری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی اور شکار کا سامان سیٹ کرنے لگا۔ ربیکا پانی کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھ گئی اور گیری کو کانٹے میں چارا لگاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

گیری نے مچھلی کے شکار کی ایک جنسی ربیکا کو تھما دی اور پانی کے کٹاؤ دار حصے پر آگے کو جھکے ہوئے درختوں کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی ڈور وہاں ڈال دو۔"

ربیکا نے گیری کی ہدایت کے مطابق اس مقام پر پہنچ کر اپنی ڈور پانی میں پھینک دی اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ گیری اس سے دائیں جانب بیس گز کے فاصلے پر چلا گیا اور اس نے وہاں پانی میں اپنی ڈور پھینک دی۔

گیری نے پلٹ کر ربیکا کی جانب دیکھا اور مسکرانے لگا۔ ربیکا نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے سر ہلا دیا۔

وہ دونوں اپنی اپنی ڈور سنبھالے بیٹھے رہے۔ گیری کی تمام توجہ اپنی ڈور کی جانب رہی۔ جبکہ ربیکا بار بار پلٹ کر اپنے عقب میں گھنے جنگل کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس دوران جب بھی کسی درخت کی شاخ ٹوٹنے کی آواز آتی تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔

گیری یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب شاخ کے ٹوٹنے کی آواز پر ربیکا ڈر کے مارے اچھل سی گئی تو گیری نے وہیں سے ہانک لگائی۔ "لعنت ہو! تم اتنی جلدی گھبرا جاتی ہو۔" ساتھ ہی اس نے اپنی ڈور میں پھنسی ہوئی ایک مچھلی پانی سے باہر کھینچ لی۔ اس نے مچھلی کو کانٹے میں سے نکال کر اپنی بالٹی میں ڈال دیا اور بولا۔ "اس کے ساتھ میری شکار کی ہوئی مچھلیوں کی تعداد چھ ہو گئی۔ اور تم نے ابھی تک ایک مچھلی بھی نہیں پکڑی۔"

"میں کیا کروں؟" ربیکا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تم مزید کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ تمہیں کس چیز کا ڈر ہے؟"

"میں مرنا نہیں چاہتی۔"

گیری نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "مطمئن رہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے ربیکا کو دلاسا دیا۔

"کیا تم ریچھ کو بھول رہے ہو؟" ربیکا نے اسے ریت پر پنجے کا نشان یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"سنو! اس علاقے میں صرف سیاہ ریچھ پائے جاتے ہیں اور وہ انسانوں پر شاذونادر ہی حملہ کرتے ہیں۔" گیری نے بتایا۔

"ویل، اگر وہ ادھر آ گیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟" ربیکا اپنے خوف کو زبان پر لے آئی۔

"اگر تم کسی ریچھ کو دیکھ لو تو بس ساکت ہو جانا اور اپنی جگہ سے کوئی حرکت مت کرنا۔ اگر کسی وجہ سے وہ تم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو تم بے حس و حرکت زمین پر لیٹ جانا اور یہ ظاہر کرنا جیسے کہ تم مردہ ہو۔ وہ تمہیں سونگھنے کے بعد آگے بڑھ جائے گا۔"

"کیا یہ بات بھاری گہرے بالوں والے ریچھ کے لیے مشہور نہیں ہے؟" ربیکا نے کہا۔

"یہ بات تمام قسم کے ریچھوں کے لیے مشہور ہے۔ میری بات پر اعتبار کرو اور مجھ پر بھی۔" گیری نے کہا۔

اتنے میں گیری کی بنسی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ مڑنے لگا۔ گیری نے اپنی ڈور کھینچنا شروع کر دی۔ اس کے کانٹے میں ایک اور مچھلی آن پھنسی تھی۔

ربیکا نے ایک اچٹتی نگاہ سورج کی طرف ڈالی اور پھر اپنی دستی گھڑی میں دیکھا۔

دوپہر ہونے کو تھی۔

ابھی اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسے اپنے دائیں جانب اور گیری کے عقب میں ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ یہ آواز جھاڑیوں کی جانب سے آئی تھی۔

ربیکا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

گیری بھی دھاڑ کی آواز پر گھوم گیا تھا۔ اس نے جو مچھلی کانٹے سے علیحدہ کی تھی وہ اب بھی اس کے ایک ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے اپنی بنسی پکڑی ہوئی تھی۔

ربیکا خوف و دہشت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

گیری کے مقابل ایک دیوہیکل سیاہ ریچھ تھا۔

پھر وہ بڑا سا ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے جبڑوں سے تڑاتوں کی سی آوازیں نکالتے ہوئے گیری کو گھور رہا تھا۔

ربیکا آہستہ آہستہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی اور اپنی مچھلی کے شکار کی ڈور زمین پر گرا دی۔ اس کے قدم زمین پر جم سے گئے تھے۔

اتنے میں ریچھ نے اپنے چاروں ہاتھ پیر زمین پر گرا دیے اور گیری کی جانب لپکا۔

گیری زمین پر لیٹ گیا اور ساکت ہو گیا۔ مچھلی اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر پھڑ پھڑانے لگی۔ بنسی بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔

جب ریچھ گیری کے پاس پہنچا تو اس نے بے حس و حرکت گیری کو سونگھنے کے بجائے اپنے بڑے سے پنجے سے گیری کے جسم پر ایک وار کیا اور پھر اس کے چہرے کو اپنے نکیلے دانتوں میں دبا لیا۔

گیری کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی کمزور سی چیخ بلند ہوئی۔ پھر اس کی گردن کے ایک گہرے زخم سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔

وہ اپنے بچاؤ کے لیے اندھوں کی طرح ریچھ پر اپنے



[ہاتھ پیر] مارنے لگا۔ لیکن خوف اور ناتوانی کے باعث اس کی [بچاؤ] کی ہر کوشش رائگاں جا رہی تھی۔ اتنے میں ریچھ نے [گیری] کے بائیں شانے پر اپنے دانت گاڑ دیے اور بے تابانہ [انداز] میں اپنے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ جب اس نے اپنا [سر] اٹھایا تو گیری کے شانے سے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس [کے] دانتوں میں دبا ہوا تھا۔

ربیکا یہ منظر دیکھ کر دہری ہو گئی اور اسے ابکائیاں آنے لگیں۔ وہ چٹان پر بیٹھتی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ریچھ کی نظریں اب اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ریچھ کی تھوتھنی سے خون ٹپک رہا تھا۔ پھر وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

ربیکا دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی۔

ریچھ نے اس پر حملہ کرنے کے ارادے سے اپنے چاروں ہاتھ پیر زمین پر لگا دیے۔

اچانک ایک فائر ہوا اور اس کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔

ریچھ ہلکے سے ڈگمگایا لیکن پھر دوبارہ ربیکا کی جانب لپکا۔ ایک اور فائر ہوا اور ریچھ منہ کے بل دھیرے دھیرے زمین پر گرتا چلا گیا۔

اس دوران میں وہ ربیکا کے خاصے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

ربیکا کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

ریچھ نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن تیسری گولی اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی اور وہ زمین پر گر کر اپنی آخری سانسیں لینے لگا۔

چند لمحوں بعد ربیکا کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں ممنونیت کے احساس سے نم ہو رہی تھیں۔

سامنے بل واٹسن کھڑا تھا... دراز قامت اور کسرتی جسم کا مالک بل واٹسن! اس نے اپنی رائفل اپنے شانے پر لٹکائی اور آہستہ آہستہ ربیکا کی جانب بڑھنے لگا۔

جب وہ نزدیک پہنچا تو ربیکا دوڑ کر اس کے کھلے ......بازوؤں میں سما کر اس کے سینے سے چمٹ گئی۔

بل واٹسن نے اسے مضبوطی سے بھینچ لیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" ربیکا نے پوچھا۔ اس کی آواز بل کے سینے میں دب سی گئی۔

"مجھے اندازہ تھا۔"

ربیکا نے اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکلتے ہوئے اپنی آنکھیں بل واٹسن کی گہری سیاہ آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "نہیں، واقعی؟"

"گزشتہ چھ ماہ کے دوران میں یہ ریچھ دو آدمیوں کو ہلاک کرنے کے علاوہ نصف درجن کو زخمی بھی کر چکا ہے۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتا کہ یہ دوپہر کے وقت ادھر آئے گا؟" ربیکا نے جاننا چاہا۔

"یہ اس کا معمول تھا۔" بل واٹسن نے بتایا۔ "میں اس وقت سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم مچھلی کے شکار کے ارادے سے ادھر آنے کا پروگرام بنا رہی ہو۔"

"تم غیر معمولی طور پر ذہین ہو۔"

"تھینک یو میڈم!"

ربیکا نے پلٹ کر گیری کی ادھڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا تو اس پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ "ایسا گھناؤنا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔

بل واٹسن نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگا۔

ربیکا ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کیسے پتا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ نہیں کرے گا؟"

اس سوال پر بل واٹسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ "تم نے وہ لباس نہیں پہنا ہوا تھا جو مچھلی کے جوس میں ڈبویا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میں درختوں کے پیچھے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر ریچھ تمہاری جانب رخ بھی کرتا تو میں اسے اسی وقت وہیں ڈھیر کر دیتا۔ گیری کا لباس مچھلی کے جوس میں ڈبویا ہوا تھا۔ ریچھ مچھلی کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ اس بو کی بنا پر ریچھ کی پوری توجہ گیری پر مبذول ہو گئی تھی۔"

ربیکا ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ "اب ہم کیا کریں؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے پلان پر ڈٹے رہیں گے۔ ہم فاریسٹ رینجرز کو فون کر کے اس حادثے کی اطلاع دیں گے پھر تم بیمے کی رقم وصول کر لینا اور..."

"میں اس شخص کی محبت میں مبتلا ہو جاؤں گی جس نے نہ صرف میرے شوہر کے قاتل کو جان سے مار دیا بلکہ میری زندگی بھی بچائی تھی۔"

بل واٹسن نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "اور اس کے بعد ہم دونوں ہمیشہ کے لیے خوشیوں سے بھرپور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کریں گے۔"

# للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرا ... خاص جو للکار سنتے ...

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے۔ جس نے
عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے۔ کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے...... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے.... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و
شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر... ایک للکار ہے۔

طاہر جاوید مغل

ستائیسویں قسط

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صنوبرا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صنوبرا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں ڈرگاں اور تل پانی۔ بعد ازاں مجھے ڈرگاں میں پگوڈا پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صنوبرا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن

ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعدازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں ساتھیوں سے الگ ہوکر اور ہاروندا جنکی تک جا پہنچا۔ مجھے اور جنکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جنکی کی حالت خراب تھی۔ جنکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑلیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے۔ میرا آپریشن ہوگیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم منورا کے پاس پہنچ گئے۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہوگیا۔ پھر میں نے جارج گورا کو سابر کا چیلنج کرڈالا۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کردیا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں بوتلوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رتنا دیوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام میں ایک جرمن جیپ دی۔ پھر سابر مقابلے والا دن آگیا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کردیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کروادیا گیا۔ عمران نے راہزنی کی واردات کا ڈراما کرکے انعام میں ملنے والی جیپ غائب کردی پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوگئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں نے لپک کر کسی کو گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ گھوڑا گاڑی ایک احاطے میں رک گئی۔ یہ گاؤں کا شفاخانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کرکے یرغمالیوں کو مارنا شروع کردیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیرلیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر لی وان بھی یرغمالیوں میں شامل تھا اور آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہمیں کھیت میں بصرت نامی نوجوان ملا جو ہمیں اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ پھر عمران نے بصرت کے ہاتھ انگریز افسر کو ملاقات کا پیغام بھیجا اور ہماری اس سے ملاقات ہوئی۔ عمران نے اسے اپنی باتوں سے قائل کرلیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ انگریز افسر راضی ہوگیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلادی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کرکے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب بھی مارا گیا۔ سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ زرگاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ یہاں بغاوت ہوگئی تھی اور زوروں کی لڑائی ہورہی تھی۔ پھر انور خاں بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ بصرت بھی جھوٹے الزام میں قید تھا۔ ہمیں جیل سے قاسمیہ چوک لے جایا گیا۔ ہمیں سولی چڑھایا جانا تھا۔ اچانک طلال فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم بھی حرکت میں آگئے۔ خیارڈ اور اسٹیل مارے گئے۔ ہم وہاں سے نکل کر پرانے قلعے میں آگئے۔ ستیش اور مالا بھی قلعے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں گیتا کھی بھی آگئی۔ اس نے عمران کو کوئی خاص جانکاری دی۔ ہم پر حکم کے فوجیوں کی طرف سے حملہ ہوگیا۔ اسی دوران میں قلعے کے برآمدے سے گیتا کھی کی تشدد زدہ لاش ملی۔ یہ کوئی اندرونی سازش تھی۔ ہم لوگ شفاخانے گئے تو وہاں زخمیوں کے بیچ رنجیت پانڈے موجود تھا۔ اس نے ہمیں گن پوائنٹ پر لے لیا۔ اس نے مزاحمت کرنے والے زغیبل اور چوہان کو بھی گولی ماردی اور ہمیں انور خاں کے کمرے میں لے آیا۔ اس سازش میں عبدالرحیم اس کا دست راست تھا۔ اس نے انور خاں کے گلے میں کڑا ڈال دیا جو کہ بم ڈیوائس تھی۔ وہ ہم سے قلعے کا دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ تاہم ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کردیا۔ پھر وہاں موجود قیدی انگریزوں سے ڈیوائس کا کوڈ لگا کر اسے بند کیا گیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ حکم کو گرفتار کرلیا گیا اور اینڈرسن مارا گیا۔ بصرت اس لڑائی میں زخمی ہوکر اسپتال میں داخل تھا۔ مالا نے عمران کو بتایا کہ اس کی دادی ساس تین عورتوں کی بلی دے کر ایک خطرناک رسم ادا کرنا چاہتی ہے تاہم عمران اور ہم موقع پر پہنچ گئے اور یہ خطرناک کام ہونے سے رک گیا لیکن اس دوران بڑی ماتا سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہوگئی۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور طویل سفر کے بعد ہم الٰہ آباد پہنچ گئے مگر وہاں مجھے اور عمران کو ڈی ایس پی سجاد نے گرفتار کرلیا اور ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے گیا۔ ہم پر تشدد بھی کیا گیا۔ عمران کچھ سال پہلے یہاں آیا تھا اور اس نے منوج نامی شخص کو گولیاں چلا کر زخمی کردیا تھا جو بعدازاں ہلاک ہوگیا تھا۔ عمران وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ اسی سلسلے میں ہمیں پکڑا گیا تھا۔ سجاد کی بیوی عمران کو جانتی تھی اور اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ عمران کی گمشدگی کے حوالے سے ایک انگریزی اخبار میں اشتہار دیکھ کر سجاد تحقیق میں لگ گیا اور ہمیں اجنبی لوگوں کے حوالے کردیا گیا۔ ہمارا سفر ایک بند کنٹینر میں شروع ہوا۔ پانچویں روز یہ سفر ختم ہوا۔ ہمیں لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ ہماری جان صاحب سے ملاقات ہوئی، ان کی زبانی ہمیں یہاں لانے کا مقصد ایک گیم شو میں عمران کی لک کو آزمانا تھا جو ایک انگریز کے کہنے پر کیا جارہا تھا۔ اس گیم میں حصہ لینے والے سے سوال کیے جاتے اور گیم کھیلنے والا نوجوان سوال سمجھ میں نہ آنے کی صورت میں فون لائن کے ذریعے عمران سے مشورہ کرسکتا تھا۔ اس کا انعام ایک قیمتی جہاز کی صورت میں تھا جس کی مالیت ایک ارب بیس کروڑ تھی۔ تاہم عمران نے دو سوالوں کے جواب کے بعد ایک جواب غلط دیا ہے جس کے باعث گیم سے باہر ہونا پڑا۔ بعدازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ یہ انتہائی رقت انگیز منظر تھا۔ پھر وہاں اچانک میڈم منورا اور دیگر لوگ پہنچ گئے۔ ان کی زبانی پتا چلا کہ وہ عاصمہ کی مدد سے پاکستان پہنچے تھے۔ پھر ہمیں ایک پیر صاحب نے بلایا، وہ ہماری مدد چاہتے تھے۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ہم پر فائر ہوا۔ ہم نے ایف ایکس میں موجود شخص کا تعاقب کیا۔ اس کی کار ایک الیکٹرک پول سے ٹکرا گئی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔





**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

بازار کے پیچھے ایک قدرے سنسان گلی میں ہم نے اسے جالیا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس شخص کے کوٹ کا کالر پیچھے سے پکڑا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرادیا۔ حیرت تھی کہ اب تک اس نے رائفل استعمال نہیں کی تھی۔ اس بات کا پتا بعد میں چلا کہ اس کی رائفل میں بس دو ہی گولیاں تھیں جو وہ ہم پر چلا چکا تھا۔

میں نے دو تین زوردار ہاتھ اس کے چہرے پر رسید کیے۔ وہ اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے لے جانے کی کوشش کررہا تھا۔ عمران نے تاڑلیا کہ قمیص کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ موجود ہے۔ اس نے اس کی کلائی جکڑ کر اتنی زور سے مروڑی کہ وہ چلا اٹھا۔ عمران نے اس کی قمیص کے نیچے ہاتھ چلایا اور چمڑے کی بیلٹ میں لگا ہوا ایک تیز دھار چاقو نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

کئی لوگ تیزی سے ہمارے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسے ہے؟ ایسے بہت سے سوال فضا میں ارتعاش پیدا کررہے تھے۔

عمران نے مبہم سا جواب دیا۔ ”یہ پولیس کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیں۔ اس نے گولی چلائی ہے۔ قاتلانہ حملہ کیا ہے۔“

عمران کے بارعب انداز نے لوگوں کو شک میں ڈال دیا کہ ہم شاید پولیس کے سادہ پوش یا کسی خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں۔

عمران کے اشارے پر میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی اسکول وین کو روکا۔ عمران نے وین ڈرائیور سے کہا۔ ”اس بندے کو تھانے لے جانا ہے۔“ اور ڈرائیور کے جواب دینے سے پہلے ہی حملہ آور کی گردن پر دوہتڑ مار کر اسے وین میں پھینک دیا۔ اس کے منہ سے اب باقاعدہ خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی بائیں کلائی کو دائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ رائفل اور چاقو دونوں چیزیں اس سے چھینی جاچکی تھیں۔

اس نے اضطراری طور پر وین سے نکلنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک اور زوردار گھونسے نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ ”چپکا بیٹھا رہ۔ نہیں تو اس سڑک کو ہی تھانے کا ڈرائنگ روم بنادوں گا۔ مار مار کر ہڈیوں کا چورا کردوں گا۔“ عمران ہنکارا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”تابی! تم موٹر سائیکل پر پیچھے پیچھے آؤ۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

عمران نے بھگوڑے حملہ آور کے چیک دار کوٹ کا خون آلود کالر پکڑا اور اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے واپس دوڑ لگائی۔ کھمبے سے ٹکرا جانے والی ایف ایکس گاڑی میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ کئی افراد اردگرد جمع ہوچکے تھے۔ ہماری چرخہ موٹر سائیکل بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سیدھی کی تو لوگ میرے گرد جمع ہوگئے۔ ایک ٹریفک سارجنٹ بھی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ایکسیڈنٹ کے بعد میں بغیر کچھ کہے سنے موٹر سائیکل لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن پھر سارجنٹ کا چہرہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی۔ یہ وہی نواز احمد نامی نوجوان تھا جس سے راوی روڈ پر چند گھنٹے پہلے بھی دوستانہ ملاقات ہوچکی تھی۔ میرے سر پر ابھی تک ہیلمٹ موجود تھا لیکن چرخہ موٹر سائیکل کو نواز نے فوراً پہچان لیا۔

اسی دوران میں وہ اسکول وین بھی موقع پر پہنچ گئی جس میں عمران نے زخمی حملہ آور کو بٹھا رکھا تھا۔ سارجنٹ نواز نے عمران کو پہچان کر کہا۔ ”یہ کیا ہوا ہے عمران بھائی؟“

”لمبا لفڑا ہوگیا ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اس نے پیچھے اچھرہ موڑ کے قریب گولی چلائی ہے ہم پر... بلکہ دو گولیاں... تھانے لے جارہے ہیں اسے۔“

سارجنٹ نواز نے ہمارے اردگرد لوگوں کی بھیڑ ہٹا کر ہمارے لیے راستہ بنایا اور ہم آگے پیچھے مزنگ چونگی کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ سب کچھ عجلت میں ہوا۔ یہ خطرہ موجود تھا کہ ابھی کوئی پولیس موبائل یہاں پہنچ جائے گی اور نیا بکھیڑا شروع ہوجائے گا۔ مجھے ہرگز نہیں لگتا تھا کہ عمران اس زخمی شخص کو تھانے لے کر جائے گا۔ اسکول وین درمیانی رفتار سے چل رہی تھی، میں اس کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ اونٹ کی طرح اس موٹر سائیکل کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں تھی۔ میں نے عمران کے سامنے دو تین بار اس موٹر سائیکل کو شاہجہانی جوٹھ کا نام دیا تھا لیکن اب، جب میں اس پر سواری کررہا تھا، یہ نام بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں لگا۔ اس پر سواری کرتے ہوئے سیدھی سڑک پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ پتا نہیں عمران اسے موت کے کنوئیں میں کیسے چلا لیتا تھا۔ موٹر سائیکل پر کنٹرول رکھنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن تیزی سے سوچ بھی رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا، بالکل آناً فاناً اور ڈرامائی تھا۔ ہم تو پیر شوکت احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لیے آئے تھے اور احمد تھانوی صاحب ہمیں کافی مناسب

شخص لگتے تھے۔ عمران کی چار دیواری سے رخصت ہونے کے فوراً بعد ہی ہم پر دو ''قاتل فائر'' کیے گئے تھے۔

قریباً دو کلومیٹر آگے جا کر عمران نے اسکول وین جین مندر کے قریب ایک بغلی سڑک پر رکوالی۔ عمران کے اشارے پر میں بھی موٹر سائیکل سے اتر کر وین میں چلا گیا۔ عمران نے حملہ آور کے سر کے بال بیدردی سے مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ حملہ آور کے چوڑے تھوبڑے پر دو تین تازہ نیل بھی نظر آرہے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے راستے میں بھی عمران سے زور آزمائی کی کوشش کی ہے۔ بہرحال، اب وہ مزید مار کھالے کے بعد بالکل شانت نظر آتا تھا۔

عمران نے مجھ سے پوچھا۔ ''کہاں لے جانا ہے اسے؟ میرے خیال میں گھر تو لے جا نہیں سکتے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گھر میں فرح اور عاطف تھے اور فرح تو پچھلے چند دن سے مسلسل دہائی دے رہی تھی کہ ہم کسی خطرناک کام میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ اگر ہم اس زخمی مچھندر کو رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں لے جاتے تو فرح اور عاطف کو بہت شاک لگتا۔

''تمہارے راوی روڈ والے گھر میں جا سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں پورے محلے کو پتا چل جائے گا۔''

''تو پھر؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''جیلانی بھی لاہور میں نہیں ہے... ہاں، ایک کام ہو سکتا ہے۔'' اس کے چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی۔

''کیا ہو سکتا ہے؟''

''چلو بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر وین والے سے کہا کہ وہ گاڑی چلائے۔ وین والا اب کچھ ہراساں بھی نظر آرہا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ ہم اس شخص کو تھانے لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے عمران سے معذرت کی ہو کہ وہ یہ ''خدمت'' انجام نہیں دے سکتا لیکن وہ عمران ہی کیا جو ایسی کسی معذرت کو خاطر میں لائے۔

میں وین سے اُترا اور ایک بار پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے عمران اور حملہ آور کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اسکول وین ایک رہائشی کالونی میں رکی۔ یہاں زیادہ تر گھر پانچ اور چھ سات مرلے کے تھے۔ ایک دو منزلہ گھر کے سامنے جا کر عمران نے وین رکوادی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وین کے رکتے ہی گھر کا مین گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک دبلا پتلا نوجوان لڑکا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اس گھر کے مکینوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ دبلے پتلے نوجوان نے وین کو گیراج میں جانے کے لیے راستہ دیا اور پھر مین گیٹ بند کر دیا۔ عمران نے سو سو کے چھ سات نوٹ وین ڈرائیور کو دیے اور حملہ آور کو گردن سے دبوچے دبوچے نیچے اتر آیا۔ اب عمران کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل گیراج میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ موٹر سائیکل کے رکتے ہی جیسے ایک طوفان تھم گیا تھا۔

وین کا ڈرائیور اپنی وین سمیت یوں بھاگا جیسے تھوڑی دیر بھی یہاں رکا تو یہ مکان اپنی وزنی چھتوں سمیت اس کے اوپر آن گرے گا۔ یقیناً عمران نے راستے میں اس کی کافی برین واشنگ کی تھی اور اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں کسی طرح کی مخبری کرتا۔

ہم نے اندر جا کر حملہ آور کو ایک اسٹور نما تاریک کمرے میں بند کر دیا اور یہی وقت تھا جب ایک طرف سے عمران کی سرکس کی ساتھی شاہین تیزی سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی نمی تھی۔ شاید وہ آگے بڑھ کر عمران کے گلے ہی لگ جاتی مگر نوجوان لڑکے کی وجہ سے نہیں لگی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ شاہین کا چھوٹا بھائی ظفر تھا۔

''مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا کہ تم اس طرح اچانک آگئے ہو۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''اور اکیلا نہیں ہوں۔ کسی کو ساتھ بھی لایا ہوں۔'' عمران نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے ہیلمٹ اتارا۔ ''اوہ گاڈ! تابش بھائی آپ؟'' وہ پکاری اور بھاگ کر میرے گلے لگ گئی۔

عمران نے برا سا منہ بنایا۔ ظفر اندر جا چکا تھا۔ عمران، شاہین کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولا۔ ''اگر گلے لگنے کے لیے چار سال باہر رہنا ضروری ہے تو میں ڈھائی تین سال اور گزار آتا ہوں۔''

شاہین کے ملیح چہرے پر شفق کا رنگ بکھر گیا۔ وہ کبھی حیرت سے عمران کو اور کبھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پچھلے ساڑھے تین چار سال میں، میں جسمانی طور پر کافی تبدیل ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں شاہین کو حیران کر رہی تھیں۔ ''آپ بہت بدل گئے ہو تابش بھائی۔ میں نے پہلے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو پہلے ایک لڑکا تھا، وہ مرد بن کر واپس آیا ہے۔ آپ کہاں تھے اب تک؟ پتا ہے ہم نے کتنا یاد کیا ہے آپ کو؟ پتا ہے کتنا پریشان ہوئے ہیں؟ میں نے بہت دعائیں کی تھیں آپ کے لیے۔''

''اچھا بھئی، میں تو چلتا ہوں۔ یہاں میرا کیا کام؟'' عمران جلے بھنے انداز میں بولا۔

''تمہارے لیے بھی کی تھیں۔'' شاہین جلدی سے بولی۔ ''تمہارے لیے بھی سب بہت پریشان رہے ہیں۔ میں تقریباً روزانہ جان انکل کو فون کرتی تھی۔ تمہیں کیا پتا...'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''لو بھئی رونے دھونے کا پروگرام شروع ہونے لگا ہے۔ اچھا یار! نہیں جاتا، بالکل نہیں جاتا۔ اگلے پندرہ بیس سال تک یہیں رہوں گا بلکہ یہیں اس گیراج میں کھڑا رہوں گا۔ ہلوں گا بھی نہیں۔'' عمران نے کہا اور شاہین کے آنسوؤں کو مدھم مسکراہٹ کے بریک لگ گئے۔

اسی دوران میں ظفر واپس آگیا۔ اس نے کہا۔ ''عمران بھائی! آپ کب آئے؟ آپ نے تو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ فون پر آپ کی آواز ہے۔''

عمران بولا۔ ''اس طرح نہیں کہتے کہ یقین نہیں آرہا تھا۔ کہتے ہیں کہ مجھے تو وشواس ہی نا ہیں ہو وت تھا کہ میں فون پر آپ کی آواج سنت ہوں... جب حیرانی والے فقرے میں یقین کے بجائے وشواس کا شبد استعمال کیا جائے تو فقرے میں بڑی شکتی آجاوت ہے۔''

وہ دونوں مسکرانے لگے۔ شاہین بولی۔ ''چلو، اس سے کم از کم اتنا پتا تو چلا کہ تم انڈیا سے ہی آرہے ہو لیکن...'' پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کا دھیان یقیناً اس بندے کی طرف چلا گیا تھا جسے ہم پکڑ کر یہاں لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس بھی ہوا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، اندر آجائیں۔''

ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاہین اور ظفر کے سوا اس چھوٹے سے گھر میں اور کوئی نہیں۔ اب اسٹور روم کے مقفل دروازے پر دستک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یقیناً زخمی شخص بے چین ہو رہا تھا... عمران نے شاہین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اس بندے سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔ اس دوران میں تم کچھ پکا دکا سکتی ہو۔ زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ دو تین ڈشیں کافی رہیں گی۔ میٹھے کے طور پر آئس کریم منگوا لینا۔ پھل وِل تو ہوتا ہی ہے تمہارے فریج میں۔''

شاہین بولی۔ ''ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ زیادہ بڑا گھر نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری پوچھ گچھ کے دوران میں محلے والوں کو شک ہو جائے۔ ایک بار پہلے بھی تمہاری مہربانی کی وجہ سے مجھے ایک اچھے مالک مکان سے محروم ہونا پڑا تھا۔''

''گھبراؤ مت۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ بس تم کچن میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لو۔ زور کس پر ہوا؟ کچن پر۔''

شاہین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں گھر کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے۔ میں اور عمران اسٹور روم کی طرف بڑھے۔ عمران نے اپنا پستول ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسٹور روم کے اندر اب ہمارے ''حوالاتی'' نے چلانا شروع کر دیا تھا۔ ''دروازہ کھولو۔ میں مر رہا ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' اس کی آواز میں کرب کی شدت صاف محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال، اس کی آواز گھر کے برآمدے تک بمشکل ہی پہنچ رہی تھی۔

ہم اسٹور روم میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی کلائی دوسرے ہاتھ سے تھامے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ اس کا رنگ زرد نظر آرہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کلائی میں کوئی فریکچر وغیرہ ہو چکا ہے۔ عمران نے جاتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کی۔ ''اوئے! تم تو کہتے ہو، میں مر رہا ہوں۔ کیا اس طرح کھڑے کھڑے کوئی مرتا ہے؟ مرنے کے لیے لیٹنا پڑتا ہے۔ کھینچ کھینچ کر سانس لینی ہوتی ہے۔ آنکھیں اوپر اٹھانا پڑتی ہیں۔ اس طرح سے۔'' عمران نے باقاعدہ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھا کر دکھائیں۔

''میری کلائی ٹوٹ گئی ہے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔'' وہ کراہا۔

''اپنی کلائی کی تمہیں بڑی فکر ہے۔ اگر ہمارے سر میں گولی لگتی تو ہمیں درد نہیں ہونا تھا؟ سر میں گولی لگے تو چلا چلا کر گلا بیٹھ جاتا ہے اور یہ گلا اس کا نہیں بیٹھتا جسے گولی لگی ہو بلکہ اس کے گھر والوں کا بیٹھتا ہے... ذرا دکھاؤ اپنی کلائی۔'' عمران نے کہا۔

اس نے اپنی کلائی عمران کی طرف بڑھائی۔ اس نے ذرا دبا کر دیکھا۔ زخمی ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ یہاں اسے الٹا لٹکانے کے لیے چھت پر کوئی کنڈا وغیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ اپنی اس کلائی کی وجہ سے ہی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔''

اس شخص کا رنگ کچھ مزید زرد ہو گیا۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا۔ اس کی شکل وصورت گواہ تھی کہ وہ متعدد بار جیل جا چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شکرے کی سی سفاک چمک تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی قتل جیسی وارداتیں کر چکا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود کو بُری طرح گھرا

ہوا محسوس کر رہا تھا۔ عمران نے مجھے بتایا کہ اسکول وین میں اس نے خود کو چھڑانے اور چلتی گاڑی سے کودنے کی ایک زوردار کوشش کی تھی مگر عمران کے سامنے اس کا بس نہیں چلا۔ عمران نے وین میں ہی بُری طرح اس کی دھنائی کردی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس شخص نے ہمیں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اس کا نام رشید عرف چھیدا ہے۔ وہ ہسٹری شیٹر ہے اور پیسے لے کر کام کرتا ہے۔ اس کام کے لیے اسے بہاولپور کے کسی بندے نے ایک واقف کار کے ذریعے ایک لاکھ کی رقم بجھوائی تھی۔ باقی دو لاکھ روپیا اسے کام ہونے کے بعد ملنا تھا۔ کام ہمیں قتل کرنا ہرگز نہیں تھا... بلکہ ڈرانا یا زخمی کرنا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اس خبیث کی شکل ہی بتا رہی تھی کہ وہ بک رہا ہے۔ اس کی باتوں میں سچ اتنا ہی ہے، جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس بندے کی شکل مجھے کچھ شناسا سی لگ رہی تھی۔ پھر ایک اور چیز سامنے آئی اور اس نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔

اسکول وین میں عمران کے ساتھ زوردار کھینچا تانی کے دوران میں چھیدے کے کوٹ کی ایک آستین کہنی تک ادھڑ گئی تھی۔ یہ آستین ذرا سی اوپر ہوئی تو مجھے چھیدے کے بازو پر کٹ کا ایک لمبا نشان نظر آیا۔ یہ تیز دھار آلے کا ایک قوس نما پرانا زخم تھا، ٹانکے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ماضی میں یہاں سے گولی وغیرہ نکالنے کے لیے کوئی آپریشن کیا گیا ہو۔ بہرحال، یہ سب کچھ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی۔ چار سال پہلے کے مناظر میری نگاہوں کے سامنے شعلوں کی طرح پھیل گئے۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہ بندہ ان سفاک غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے ماں جی کو درد کے سمندر میں غرق کر کے مجھ سے فرح اور عاطف کا پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ فلیش بیک میں وہ سین... وہ خونی سین آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔

ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے کندھوں کو بے رحمی سے جھنجوڑا جا رہا تھا۔ وہ چلّا رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ پھر ان کے ایک کندھے میں برینا پسٹل کی گولی اتار دی گئی تھی۔ جن افراد نے ماں جی کو دبوچا ہوا تھا، ان میں یہ زخمی بازو والا بندہ بھی شامل تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے زخم کا یہ نیم گول نشان ایک انمٹ ثبوت بن کر چمکنے لگا۔

میں نے ایک بار پھر دھیان سے چھیدے کی صورت دیکھی۔ اس کی صورت نے میرے اخذ کیے ہوئے نتیجے کو تقویت دی۔ میرے اندر تہلکہ سا مچ گیا۔ ایک سرخ چادر سی تھی جو میری نگاہوں کے سامنے تن گئی۔ میں دیوانگی کے عالم میں چھیدے پر جا پڑا۔ "حرامزادے... کتے... قاتل!" میرے منہ سے بے ساختہ پتا نہیں کیا کچھ نکل رہا تھا۔

اگلے ایک منٹ میں، میں نے چھیدے کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ اچھل اچھل کر دیواروں سے ٹکرایا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کلائی سمیت خوفناک انداز میں جھولنے لگا۔ یہ وہی کلائی تھی جس میں کچھ دیر پہلے عمران کے مروڑنے کی وجہ سے فریکچر ہوا تھا۔ عمران خود بھی ہکا بکا تھا۔ وہ چھیدے کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بس کر تابی... یہ مر جائے گا... چھوڑ دے۔"

لیکن میرے سر پر خون سوار تھا۔ پچھلے چار سال سے جو آگ سینے میں دہک رہی تھی، وہ شعلوں میں بدل گئی تھی اور اس کی ساری تپش رشید عرف چھیدے کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ میں نے چھیدے والا چاقو پکڑا تو عمران میرے سامنے دیوار بن گیا۔ "کیا کرتے ہو تابی... اس کو مار دیں گے تو سراج تک کیسے پہنچیں گے؟ کیا دیوانہ پن ہے؟ پیچھے ہٹو..." اس نے مجھے دھکیلا۔

"نہیں عمران... میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔" میں دہاڑا۔ اپنی آواز خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

عمران نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ "کیا کرتے ہو تابی! شاہین کیا سوچے گی؟ آواز باہر تک جا رہی ہے۔ ذرا تحمل کرو۔"

چھیدا کسی پھٹے پرانے خون آلود کپڑے کی طرح اسٹور روم کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کی شکل میرے دماغ میں شعلے بھڑکا رہی تھی۔ میں نے اس کے منحوس سراپا کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو سرسراہٹ جگانے لگے۔ عمران مجھے اپنے کلاوے میں لے کر اسٹور سے باہر نکل آیا اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

شاہین اور ظفر ساتھ والے کمرے میں کھڑے تھے اور ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً اسٹور روم میں جو تہلکہ مچا تھا، اس کی آوازیں پورے گھر میں گونجی تھیں۔ کھلا ہوا چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ شاہین اور ظفر کا ہراس دیکھتے ہوئے میں نے یہ چاقو جیکٹ میں رکھ لیا۔

عمران نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کتے کو پہچان لیا ہے۔ یہ ان غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے شیرے وغیرہ



کے ساتھ مل کر ماں جی کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

"تم نے شروع میں تو نہیں پہچانا تھا؟" عمران نے پوچھا۔

"مجھے تھوڑا بہت شک تو پہلے سے ہو رہا تھا مگر اب اس کا زخمی بازو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے۔ یہ سراج اور شیرے کا ساتھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سراج اور شیرا ابھی ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے تو ایک اور خطرہ محسوس ہو رہا ہے..." میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شاہین سے کہا کہ وہ میرے لیے پانی لائے۔ وہ چلی گئی تو میں نے عمران سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ہمارا پیچھا کیا گیا ہو اور چھیدے کے ساتھی یہاں آس پاس موجود ہوں۔"

"نہیں، اس بارے میں فکر نہ کرو۔" عمران نے جواب دیا۔ "میں وین والے کو کافی گھما پھرا کر لایا ہوں۔ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا۔"

"عمران! یہ بندہ سراج کا پتا ٹھکانا بتا سکتا ہے۔ اور ہمیں جلدی کرنی چاہیے، یہ نہ ہو کہ وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔"

"تم غم نہ کرو۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولے گا اور سب کچھ فرفر بتائے گا۔"

عمران دو چار منٹ مزید میرے پاس بیٹھا اور پھر چھیدے سے پوچھ گچھ کے لیے اسٹور روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے شاہین کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ گھر کے سارے دروازے بند رکھے اور کیسٹ پلیئر پر اونچی آواز میں کوئی میوزک وغیرہ لگا دے۔

عمران اسٹور روم میں گیا اور پندرہ بیس سیکنڈ بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ "کیا ہوا؟" شاہین نے پوچھا۔

"مر گیا۔" عمران نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

"اس نے گلے پر بلیڈ پھیرا ہے۔ بازو کی نسیں بھی کاٹی ہیں۔ سارا فرش خونم خون ہو رہا ہے۔"

"اوہ گاڈ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہم تیزی سے اسٹور روم میں آئے۔ عمران نے شاہین کو آنے سے منع کر دیا تھا... اسٹور روم کا منظر واقعی دہلا دینے والا تھا۔ چھیدا ٹھنڈے فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کی گردن اور ٹوٹی ہوئی کلائی میں سے بڑی تیزی کے ساتھ خون کا اخراج ہوا تھا اور اب اس کی آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔ عمران نے اسے ایک بار پھر ہلا جلا کر دیکھا۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

"ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس کا خودکشی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ واقعی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے تمہاری والدہ پر بہیمانہ تشدد کیا اور یقیناً یہ ہمیں سراج اور شیرے کا اتا پتا بھی بتا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ہم اس کی کھال اتار کر بھی اس کی زبان کھلوا لیں گے۔ اس نے مرنا آسان سمجھا۔"

ہم نے اسے گھسیٹ کر خشک فرش پر کیا اور اس کے اوپر ایک چادر ڈال دی۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے؟" میں نے پریشان لہجے میں عمران سے پوچھا۔

"لاش غائب کرنا پڑے گی اور کیا؟"

"لیکن کیسے؟"

"سوچ لیتے ہیں، زیادہ پریشان صورت نہ بناؤ۔" عمران نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

دروازے کو مقفل کر کے ہم باہر آ گئے۔ شاہین اور ظفر کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ عمران نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ اس کے رویے سے شاہین اور ظفر کو بھی کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ "اس بندے کی موت پر زیادہ سوگوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک قاتل کی موت ہے۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے اس کی لاش سے نمٹنے کے لیے... لہٰذا ہم پہلا کام پہلے کریں گے۔ بھوک میں دماغ بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس لیے پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔"

میرے کانوں میں چھیدے کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے شروع میں خود کو کرائے کا غنڈا ظاہر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس نے کسی کے کہنے پر ہمیں صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے فائر کیے تھے۔ لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ نہایت خطرناک شخص اور سراج کے قریبی کارندوں میں سے تھا۔ یقیناً آج اس نے ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ہی ہمارے راستے میں گھات لگائی تھی... لیکن اب وہ خود موت کے اندھیرے میں اتر چکا تھا۔ عمران کو پورا یقین تھا کہ چھیدا، پیر تھانوی صاحب کی کوٹھی سے ہمارے پیچھے نہیں لگا ہے۔ عمران کے خیال کے مطابق ہمیں راستے میں کہیں دیکھا گیا تھا اور ہمارا پیچھا شروع کیا گیا تھا۔ بعدازاں یہ اندازہ درست نکلا۔ یہ بھی پتا چلا کہ ہمارے پہچانے جانے

میں عمران کی بجوبہ موٹر سائیکل نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ گھر کے اسٹور روم میں ایک خون آلود لاش پڑی ہو تو اطمینان سے کھانا کیسے کھایا جاسکتا ہے۔ عمران کے اصرار کے باوجود ہم نے کھانے کا پروگرام کینسل کیا۔ میں نے علیحدگی میں جا کر عمران کو سمجھایا کہ ہمیں لاش سمیت جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

''بہت خوب۔ کتنی دلیری والی بات کی ہے تم نے۔ اور شاہین کو یہاں خطرے میں چھوڑ جانا چاہیے۔''

''خطرہ کیسا؟''

''تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ ممکن ہے یہ گھر سراج اور اس کے ہرکاروں کی نظر میں آچکا ہو۔'' عمران نے کہا۔

''اور تم نے میرے اس خیال کو بالکل رد کر دیا تھا۔''

''لیکن اندیشہ تو بہرحال اندیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر ہم اس اسکول دین والے کی طرف سے بھی پوری طرح غافل نہیں ہو سکتے۔ اس کی نیت میں کوئی فتور آ گیا تو پھر؟''

''تو کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔ ''شاہین اور ظفر کو یہاں سے لے جانا ہے؟''

''میرے خیال میں اب یہی مناسب رہے گا۔'' عمران بولا۔

اگلے پانچ منٹ میں عمران نے شاہین اور ظفر کے لیے یہ نادر شاہی حکم جاری کر دیا کہ وہ ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑیں گے اور ان کے ساتھ جائیں گے۔

''لیکن کتنی دیر کے لیے؟'' شاہین نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کے نہایت چکیلے بلوری رخسار قدرے دھندلے نظر آرہے تھے۔

''بس دو چار دن کے لیے۔'' عمران نے کہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ شاہین اور ظفر کو مستقل طور پر یہاں سے لے جا رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں لے لیں اور گھر کو تالا لگا دیں۔ موجودہ صورتِ حال میں شاہین کا حوصلہ قابلِ ذکر تھا۔

ایک طرح سے ہم دونوں شاہین اور ظفر کے لیے بلائے ناگہانی ثابت ہوئے تھے۔ وہ اچھے بھلے سکون سے بیٹھے تھے۔ اب نہ صرف ان کے گھر میں ایک خونچکاں لاش پڑی تھی بلکہ انہیں فوراً گھر بھی چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ شاہین کے چہرے پر زیادہ تردد نہیں تھا۔ وہ عمران کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اسے جیسے عمران پر بھروسا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا بھروسا اور اعتماد آسانی سے پروان نہیں چڑھتا لیکن جب ایک بار پروان چڑھ جائے تو بڑا پائیدار ہوتا ہے۔

عمران نے جیلانی کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور واپس آچکا ہے۔ وہ پچیس تیس منٹ میں ایک ٹویوٹا کار لے کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ گاڑی کو گھر کے گیراج میں کھڑا کیا گیا۔ چھیدے کی لاش ایک بڑے پولیتھین میں لپیٹ کر ڈگی میں رکھی گئی۔ گھر کو تالے لگانے کے بعد جیلانی اور ظفر... ظفر کی موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے جبکہ میں، شاہین اور عمران ٹویوٹا کار پر روانہ ہوئے۔ عمران کا شیطانی چرخہ وہیں کھڑا رہنے دیا گیا۔ جیلانی موٹر سائیکل پر ہم سے قریباً دو فرلانگ آگے تھا۔ اس نے اپنا موبائل مستقل آن کر رکھا تھا۔ دوسری طرف عمران کا موبائل بھی آن تھا۔ راستے میں کوئی بھی خطرناک پولیس ناکا دکھائی دینے کی صورت میں جیلانی نے ہمیں اطلاع دینا تھی اور ہمیں اس کی ہدایت کے مطابق راستہ تبدیل کرنا تھا۔

یہ شام سات بجے کا وقت تھا۔ پھر بھی لاش کو ڈگی میں رکھ کر شہر کی بھری پُری سڑکوں سے گزرنا ایک پُرخطر کام تھا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ شاید چھیدے مرحوم کے ساتھیوں میں سے کوئی ہمارا پیچھا کرے۔ بہرحال، یہ اندیشہ تو غلط ہی ثابت ہوا۔ تناؤ کی کیفیت کو ختم کرنے کے لیے عمران نے حسبِ عادت ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔ اس گفتگو کا آغاز شاہین کے ایک سوال ہی سے ہوا۔ شاہین نے رشید عرف چھیدے کے بارے میں عمران سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اور کیسے ہمارے پیچھے لگا...؟

عمران نے کہا۔ ''اگر میں جھوٹ بولوں گا تو میرے دل پر بوجھ پڑے گا۔ اگر سچ بولوں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''نہیں ہوتی ناراض، بتاؤ تم۔''

وہ معصوم صورت بنا کر بولا۔ ''تم تو جانتی ہی ہو کہ ریما جی ایک عرصے سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اب نرگس جی کے بعد یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی ہے۔''

''نرگس کون؟'' شاہین نے برا سا منہ بنایا۔

''وہی یار، اسٹیج دھماکوں... میرا مطلب ہے ڈراموں والی۔ میں نے تو صرف اس لیے اسے تھوڑی سی لفٹ کرائی تھی کہ شاید اس طرح ریما جی سے پیچھا چھوٹ جائے۔ ریما کا دل کھٹا ہو جائے اور شاید اس طرح میرا بھی ہو جائے۔ لیکن وہ کیا مولانا سر سید احمد خاں کا پنجابی شعر ہے، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ ریما کا دل تو پھر بھی کھٹا نہیں ہوا، الٹا نرگس کا دل بھی میٹھا ہو گیا۔ ایک دوست نے مجھے بتایا تھا کہ ریما نے شوٹنگ کے دوران میں کئی لوگوں کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔ وہ جہاں بھی گیا میرے پاس آیا... اک یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی۔ تو اب معاملہ یوں ہے کہ ریما اور نرگس میں میرے حوالے سے ٹھنی ہوئی ہے... بات کافی آگے نکل چکی ہے...''

''ہاں، مجھے بھی لگتا ہے کہ کافی آگے نکل چکی ہے۔ تمہیں اب کہیں داخل کرانا پڑے گا۔'' شاہین نے رواں لہجے میں کہا۔

عمران نے سنی ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے، یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب نرگس کی سوچ یہ ہو گئی ہے کہ اگر میں اس کا نہیں بن سکتا تو کسی کا بھی نہ بنوں۔ یہ رشید عرف چھیدا یقیناً اسی کا بندہ تھا...''

عمران کی گفتگو کو بریک لگ گئے۔ موبائل پر جیلانی نے اطلاع دی کہ آگے ایک ناکا ہے لہٰذا ہم سیدھا چوبرجی آنے کے بجائے سمن آباد کے اندر سے ہو کر نکل جائیں۔

ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم رائے ونڈ روڈ کی اس شاندار کوٹھی میں موجود تھے جہاں فرح اور عاطف ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ فرح نے آج لان میں باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ ہم رات گئے تک باہر بیٹھیں گے اور گپ شپ کریں گے۔ لیکن یہاں ڈگی میں لاش موجود تھی اور ہم کسی طرح کی تفریح کے موڈ میں نہیں تھے۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے گہرے اندھیرے میں بدل چکے تھے۔ کوٹھی کے باغیچے کے پاس فرح اور عاطف باربی کیو کی طویل انگیٹھی میں کوئلے وغیرہ رکھ رہے تھے۔ ایک ملازم کرسیاں وغیرہ ترتیب دے رہا تھا۔ میڈم صفورا ان انتظامات کی نگرانی کر رہی تھی۔ صفیہ بالو کو گود میں لیے ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ ان لوگوں کا موڈ کچھ اور تھا جبکہ ہمارا کچھ اور۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''ان کو سنبھالو۔ یہ پروگرام ایک دو روز بعد کا رکھ لیا جائے۔''

''لیکن یہ لوگ کیسے مانیں گے؟ یہ تو کل سے انتظامات میں لگے ہوئے ہیں۔ جان محمد صاحب کو بھی بلایا ہے انہوں نے۔''

اس نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ ''ایسا کرو... ان سے کہو کہ شاہین کی نانی فوت ہو گئی ہے۔ وہ بہت پیار کرتی تھی اس سے۔ سوگ کی حالت میں یہاں آئی ہے۔''

''لیکن جب وہ پوچھیں گے تو؟''

''ان سے کہو، کوئی نہ پوچھے۔ اس بارے میں کوئی ذکر ہی نہ کرے۔ وہ سخت ڈپریشن میں ہے اس وقت۔''

''لیکن...''

''یارا جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' عمران نے جلدی سے کہا۔

ہم نے پورے گروپ کے سامنے شاہین کی نانی کو فوت کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ سخت ڈپریشن میں ہے، کوئی اس سے اس بارے میں بات نہ کرے۔

بادلِ ناخواستہ کھلی فضا میں ''روسٹ ڈنر'' کا پروگرام کینسل ہو گیا اور اس پروگرام کو اِن ڈور عام ڈنر میں بدل دیا گیا۔ کوٹھی کا لان اور عقبی لان خالی ہو گئے۔ ہمارے لیے ممکن ہو گیا کہ ہم چھیدے کی لاش سے نجات حاصل کر سکیں۔ عمران اور جیلانی ٹویوٹا کار کو دھکا لگا کر عقبی باغیچے کی طرف لے گئے۔ یہاں کھاد تیار کرنے کے لیے پہلے ہی ایک گڑھا سا بنایا گیا تھا۔ اس گڑھے کو مزید گہرا کیا گیا اور پھر چھیدے کی لاش کو اچھی طرح پولیتھین کی شیٹ میں لپیٹ کر دبا دیا گیا۔

میں رات دیر تک جاگتا رہا اور صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ ہمیں یہاں لاہور پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اور سیٹھ سراج کی طرف سے ہم پر پہلا وار ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی شک ہوتا تھا کہ شاید سراج اور شیرا وغیرہ پاکستان میں ہی ہیں۔ میں باقی سب کچھ بھول بھال کر جلد از جلد شیرے اور سراج کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے لیے اب اور صبر ممکن نہیں رہا۔ اگلے روز میں نے عمران سے اس بارے میں تفصیلی بات کی۔ وہ تو ہر وقت ایکشن اور خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی رہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، جو تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔ ہم باہر نکلتے ہیں۔ سراج اور اس کے گماشتوں کو تلاش کرتے ہیں۔ ہم ان کو ڈھونڈ لیں گے یا وہ ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔''

اگلے روز ہم نے وہی کیا جو ہمارے ذہن میں تھا۔ ہم دونوں جیلانی کی موٹر سائیکل پر نکلے اور شہر میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ ہم دونوں ہیلمٹ کے بغیر تھے۔ میری جیب میں ٹی ٹی پسٹل تھا اور وہی یادگار رام پوری خنجر تھا جس سے میں نے جارج کورا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ خنجر نما چاقو الٰہ آباد کے پارک ویو ہوٹل میں ہمارے سامان کے اندر موجود تھا۔ جب ڈی ایس پی سجاد نے ہمیں گرفتار کیا اور

ہمارے ساتھی ہوٹل سے فرار ہوئے تو وہ دیگر سامان کے ساتھ یہ خنجر بھی ساتھ لے گئے۔ بعدازاں میڈم صغورا اسے سسٹم کی نظر سے بچا کر یہاں لانے میں کامیاب رہی۔ میری طرح عمران بھی مسلح تھا۔ اس کی جیکٹ میں بارہ گولی والا ماؤزر موجود تھا۔

ہم شام تک شہر کے مختلف علاقوں میں چکراتے رہے۔ خاص طور سے ان جگہوں کے آس پاس بھی گھومے جہاں سیٹھ سراج کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا... یا اس کے ہرکاروں سے مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ شام تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم اس جگہ بھی گئے جہاں کل ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس فائرنگ کے حوالے سے بھی کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ بس ایک دکان دار نے بتایا کہ یہاں کل دو تین گولیاں چلی تھیں... اور دو موٹر سائیکل سوار بڑی تیزی سے بڑے چوک کی طرف گئے تھے۔ اس نے ہمیں بس اسٹاپ کی دیوار پر ایک گولی کا نشان بھی دکھایا۔

بعدازاں ہم ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچے۔ کھمبے سے ٹکرانے والی ایف ایکس کو وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا۔ یقیناً اب وہ کسی قریبی تھانے میں کھڑی اپنی مزید بربادی کا انتظار کررہی تھی۔ پچانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ ایف ایکس کی نمبر پلیٹ جعلی ہوگی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم بڑی احتیاط سے اپنے تعاقب کا دھیان رکھتے ہوئے رائے ونڈ روڈ پر واپس آگئے۔

شاہین غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی یہ بات عمران کی سمجھ میں آگئی کہ نانی کی وفات والا جھوٹ کھل چکا ہے۔ بہرحال، کسی نے اس بارے میں بات نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہین نے عمران کی بات کا بھرم رکھا ہے اور نانی کی وفات والی بات کو جھٹلایا نہیں۔ کھانے کے بعد جب تنہائی ملی تو شاہین سیدھی ہمارے کمرے میں آئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ عمران پر برس پڑی۔ ”تم نے یہ غلط بات کیوں کی؟ تم ہمیشہ ”ہرٹ“ کرتے ہو۔“

عمران نے مسکین سی صورت بنائی۔ ”بس مجبوری تھی یار! فوری طور پر کوئی بہانہ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”اس لیے نانی ماں کو مذاق بنادیا۔“ شاہین نے بات اُچکی۔

وہ بولا۔ ”شاہین! دیکھو، ہر بات میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ اسی بہانے تم نے بلکہ ہم سب نے تمہاری نانی ماں کو یاد کرلیا۔ ورنہ آج کل بزرگوں کو کون یاد کرتا ہے... تم سچ بتاؤ، کبھی تمہیں نانی یاد آئی ہے؟ میری وجہ سے ہی آئی ہے نا...؟“

”تم بہت بُرے ہو عمران... آتے ساتھ ہی دل دکھانا شروع کردیا ہے۔“ اس نے آنچل سے آنسو پونچھے۔

”اچھا چلو معاف کردو یار! جب تم کہوگی تمہاری نانی ماں سے ملنے چلیں گے۔ کہاں رہتی ہیں وہ؟“

”جہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ وہ فوت ہوچکی ہیں۔ ایک سال پہلے۔“

”زبردست... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر تو مسئلہ ہی ختم ہوگیا۔“ وہ چہکا۔ ”ہم... میرا مطلب ہے، اگر وہ فوت ہوچکی ہیں تو پھر تو ہم نے کوئی جھوٹ ہی نہیں بولا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے لیٹ خبر دی ہے اور لیٹ خبر آج کل کون سا چینل نہیں دیتا... بلکہ ہمارا ”فساد پلس“ تو اس میں نمبر ون ہے۔ وشواس کرو، صرف چار دن پہلے ہم نے اندرا گاندھی کے قتل کی خبر نشر کی ہے اور سب کو ہکا بکا کردیا ہے۔ بڑے بڑے چینلوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائی ہیں۔“

”یعنی چینلوں کے دانت ہوتے ہیں۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے، چینل دانتوں کے بغیر ہی ہر قسم کا گوشت ہڈی سمیت چبا جاتے ہیں...“

”لگتا ہے کہ تمہیں کوئی خاص تکلیف پہنچی ہے کسی چینل سے؟“ میں نے کہا۔

”مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہمارا چینل کسی دوڑ میں شامل ہی نہیں ہے۔ یہاں تو جلد سے جلد خبر دینے کی دوڑ ہے جبکہ ہم لیٹ سے لیٹ خبر دینے کے چیمپئن بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا ایک اپنا راستہ ہے، اپنا ٹارگٹ ہے۔ دیکھنا عنقریب ہمارے چینل سے اس طرح کی بریکنگ نیوز نشر ہوں گی... ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ اتحادی فوجوں نے جرمنی کے دارالحکومت برلن پر اپنا قبضہ مکمل کرلیا ہے۔ ہٹلر جو اپنے زمین دوز بنکر میں تھا، لاپتا ہے۔ ہمارے خصوصی نامہ نگار نے اپنے خاص ذرائع سے اطلاع دی ہے کہ ہٹلر زندہ یا پھر مر گیا ہے۔ ہمارے نامہ نگار نے دو دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس آخری معرکے میں ہٹلر مرجائے گا یا پھر زندہ رہے گا...“

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز ہماری آوارہ خرامی پھر شروع ہوئی۔ میں اور عمران لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتے رہے۔ اندرون شہر گئے، خاص اڈوں پر جاکر بھی اپنی صورت دکھائی۔ شہر میں عمران کو جگہ جگہ اپنے شناسا ملے۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ مشکل میں پھنسے ہوئے لوگوں کا مددگار، ضرورت مندوں کا خیال رکھنے والا۔ چاہنے والے اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہتے تھے۔ وہ نگاہوں کے راستے دل میں اترتا تھا، ہر محفل کی جان بن جاتا تھا۔ ایک قحبہ خانے میں ایک سابق پولیس انسپکٹر سے عمران کی تلخ کلامی ہوئی تو عمران کی حمایت میں بولنے والے کئی افراد سامنے آگئے اور اس سابق انسپکٹر کی بولتی بند کردی... شام کے وقت ہم سیٹھ سراج کے اس پلازا میں بھی گئے جو وہ اب فروخت کرچکا تھا۔ پلازا میں بھی کسی مطلوبہ شخص سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوسکی۔

اس روز بھی ہم ناکام واپس آئے۔ مجھ پر عجیب سی مایوسی طاری ہورہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ تک پہنچنے کا موقع میں نے اپنے ہاتھوں گنوایا ہے۔ چھیدے کو پہچاننے کے بعد میں خود پر ضبط نہ رکھ سکا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے خودکشی کرلی۔ اب ہم ایک بار پھر مکمل اندھیرے میں تھے۔ اپنی کیفیت کے زیرِاثر میں چھت پر چلا گیا۔ یہاں عاطف نے ہلکی پھلکی ورزش کے لیے چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا۔ ایک سینڈ بیگ بھی یہاں جھول رہا تھا۔ میں سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ یہاں تک کہ سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں نہا گیا اور ہاتھوں کی پشت سے خون رسنے لگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو عمران اور عاطف کھڑے تھے۔ عمران نے تو مجھے پہلے بھی ایسے دیوانے پن سے مشق کرتے دیکھا تھا مگر عاطف کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ششدر دکھائی دیا۔ میری آنکھوں کی نمی بھی اسے حیران کررہی تھی۔

عمران نے اشارے سے عاطف کو واپس بھیج دیا اور دھیمے قدموں سے میرے پاس آیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تمہارا دکھ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جگر... لیکن ذرا انتظار... بس تھوڑا سا صبر۔ ہم ماں جی کی روح کو اب زیادہ دیر تڑپنے نہیں دیں گے۔“

اس کے لفظوں نے میرے اندر ایک حوصلہ سا بھر دیا۔ وہ جب بھی بولتا تھا، اسی طرح زخموں پر مرہم رکھ دیتا تھا۔

اگلے روز چاچے نذیرے کی شادی تھی۔ میں اور عمران حسب وعدہ وہاں پہنچے۔ عمران کی موجودگی نے اس انوکھی شادی کی رونق دوبالا کردی۔ عمران نے باقاعدہ گانا گایا اور ڈانس کرنے والے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ڈانس بھی کیا۔ عمران کا دوست ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی خصوصی اہمیت دی جارہی تھی۔ حاضرین میں فربہ اندام نوجوان جمیل بھی موجود تھا... یہ وہی بندہ تھا جس نے چند روز پہلے ہمیں اپنے پیر شوکت احمد تھانوی سے ملایا تھا اور پیر تھانوی نے ہم سے کچھ الجھی سلجھی باتیں کی تھیں۔ میں نے جمیل سے اس کے پیر کا حال احوال دریافت کیا اور پوچھا کہ وہ ہم سے دوبارہ کب ملاقات کررہے ہیں؟

جمیل اس کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکا۔ اس نے بس یہ کہا کہ پیر صاحب کے پاس آپ کے موبائل نمبرز موجود ہیں۔ انہیں جیسے ہی ضرورت پڑے گی، وہ آپ کو کال کریں گے۔

چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی انوکھی شادی کی کوریج کے لیے تین چار اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ دو ٹی وی کیمرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چاچا نذیرا روایتی دیہاتی لباس تہ بند اور کرتے میں تھا۔ سر پر رنگ دار پگڑی تھی۔ اس نے خود کو خوب چمکایا ہوا تھا۔

ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔ ”چاچا جی! اس شادی پر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟“

بہرے چاچے نے کہا۔ ”پیسا؟ شادی پر میرا پیسا تو نہیں لگ رہا۔ یہ میرے سجن بیلی ہیں جو لگا رہے ہیں۔“

نمائندے نے نذیرے کے کان کے پاس جاکر ذرا زور سے کہا۔ ”میں کہہ رہا ہوں کہ بچپن کی محبت کو پاکر آپ نے کیسا محسوس کیا ہے؟“

”جوس تو نہیں پیا ہے۔ پتر، جوس تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میں نے سویرے گری بادام والا دودھ پیا تھا۔ اب تم سب کے ساتھ میٹھے دا حلوہ کھایا ہے...“ سب ہنسنے لگے۔

عمران نے کہا۔ ”چاچے! تم بڑے خوش قسمت ہو، شوہر کو سنائی نہ دے تو وہ بڑا ہی چنگا رہتا ہے۔“

”پنگا؟ نہیں عمران پتر! میرا تو کسی سے پنگا نہیں رہتا۔ اور کلثوم کے ساتھ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“

محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

شام کے وقت چاچے نذیرے کی شادی سے فارغ ہوکر میں اور عمران ایک بار پھر لاہور کی سڑکوں کی پیمائش کرنے لگے۔ یہ ہفتے کا روز تھا۔ ہر طرف ویک اینڈ کی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ہم اس ہوٹل کے پاس سے گزرے جہاں کبھی ثروت اور میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ ہم ذرا چائے پینے کے لیے رک گئے۔ یہاں کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ یہی

جگہ بھی جہاں سیٹھ سراج کے بیٹے واجی نے اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھے اور ثروت کو زچ کیا تھا۔ ہم پر فقرے کسے تھے اور اپنی ہیوی موٹر بائیکس ہماری گاڑی کے پیچھے پارک کر کے ہمارا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد ہم بھی اس جگہ نہیں آئے۔ آج قریباً چار سال بعد میں ان در و دیوار کو دیکھ رہا تھا اور.... سینے میں دھواں بھر رہا تھا۔

"چلو عمران چلیں۔" چائے ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو ایک دبلے پتلے ویٹر مقبول نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ پرانے چہروں میں سے بس یہی ایک چہرہ مجھے یہاں نظر آیا تھا۔ "آپ بہت عرصے بعد یہاں آئے ہیں صاحب جی؟" وہ بتیسی نکال کر بولا۔

"ہاں، میں یہاں نہیں تھا۔ باہر تھا ملک سے۔" میں نے مبہم جواب دیا۔

وہ ذرا جھجکا پھر بولا۔ "مجھے یاد ہے جی، آپ جب بھی آتے تھے.... وہاں اس کونے والی میز پر بیٹھتے تھے۔ اس وقت کافی دبلے پتلے تھے آپ.... اور.... اور آپ کے ساتھ وہ بی بی بھی ہوتی تھیں۔ آپ کی منگیتر تھیں نا شاید؟"

"ہاں۔" میں نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔

"وہ کچھ مہینے پہلے بھی یہاں آئی تھیں۔ میں نے جس طرح آپ کو پہچانا، انہیں بھی فوراً پہچان لیا تھا۔"

ویٹر مقبول کے اس فقرے نے جیسے میرے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو زمین میں پیوست کر دیا۔ عمران بھی چونک گیا۔

"کک.... کب کی بات ہے یہ؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں، میرا خیال ہے، یہی اگست، ستمبر کے دن تھے۔ اور ایک بار نہیں، وہ تین چار بار آئی تھیں یہاں۔ اکیلی ہی ہوتی تھیں۔ پہلے سے کمزور لگتی تھیں اور کچھ گم صم بھی۔ وہ اسی کونے والی میز پر بیٹھتی تھیں۔" ویٹر مقبول نے ایک بار پھر ہال کے شمالی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے تعجب سے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ عمران کی اطلاع کے مطابق ثروت اور ناصر وغیرہ جرمنی میں تھے لیکن یہ ویٹر مقبول کچھ اور خبر دے رہا تھا۔ ویٹر مقبول کا یہ جملہ بھی میری دھڑکنوں کو زیر و زبر کر رہا تھا کہ ثروت یہاں آئی تھی اور فلاں میز پر بیٹھتی تھی۔

عمران نے ویٹر مقبول سے پوچھا۔ "کیا ہم کہیں اور بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں جی.... میری ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے۔ میں تو واپس جا رہا تھا۔ اگر آپ دو سیکنڈ پہلے کاؤنٹر کی طرف نہ آتے تو میں نے تو سیدھا نکل جانا تھا۔"

"کہاں بیٹھیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کہیں باہر چلتے ہیں جی.... یہاں آپ کے برابر بیٹھتے ہوئے شرم آئے گی۔"

بہتر یہی تھا کہ کہیں اور بیٹھا جائے۔ ہم ویٹر مقبول کے ساتھ باہر نکلے۔ اب آٹھ بجنے والے تھے۔ ان گنت نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ سڑک پر روشنی کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ ہم نے سڑک پار کی اور کچھ فاصلے پر ایک پارک میں جا بیٹھے۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے مقبول سے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ.... میرا مطلب ہے کہ وہ ثروت ہی تھی؟"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں جی.... میں آپ دونوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یوں تو ہمارے کیفے میں بہت سے جوڑے آتے ہیں لیکن آپ دونوں کی بات اور تھی۔ آپ کے میل ملاقات میں کوئی لوفر پن نہیں تھا۔ آپ دونوں کبھی کسی کیبن میں نہیں بیٹھے۔ اور بی بی جی کی تو شکل دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آپ دونوں اکثر گرین ٹی پیتے تھے اور مجھے یاد ہے جس حساب سے بل بنتا تھا، اسی حساب سے مجھے ٹپ بھی دیتے تھے.... ایک دفعہ آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ دونوں منگیتر ہیں۔ بی بی جی کا چہرہ اس بات پر بالکل گلابی ہوگیا تھا۔"

میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "تم بتا رہے ہو کہ چند مہینے پہلے وہ تین چار بار یہاں آئی.... تمہاری کوئی بات ہوئی ان سے؟"

"جی ہاں.... مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ کے ساتھ ان کی منگنی وغیرہ آگے نہیں چل سکی۔ ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی ہیں اور آج کل یہاں اکیلی کیوں آتی ہیں؟ انہوں نے بس گول مول سا جواب دیا۔ کہنے لگیں، میں پاکستان سے باہر تھی۔ یہاں کی چائے کی بہت یاد آتی تھی اس لیے آجاتی ہوں.... سوچتی ہوں شاید یہاں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آجائے لیکن لگتا ہے کہ تمہارے سوا سب کچھ بدل چکا ہے۔ مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے ان سے یہ سب کچھ پوچھا۔"

"کیوں؟"

"اس کے بعد وہ آئی ہی نہیں۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے، وہ عارضی طور پر لاہور میں تھیں یا یہاں رہ رہی تھیں؟"

"میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ان کے پاس اپنی سواری نہیں تھی جی۔ وہ پیدل ہی آتی تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں رکشا سے اترتے بھی دیکھا... ہاں، ایک بات یاد آئی۔ ایک دن میں نے انہیں انشورنس کمپنی والے دفتر کی سیڑھیاں اترتے بھی دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نوکری کی تلاش میں وہاں گئی ہیں لیکن اس کے بعد میں نے انہیں دوبارہ نہیں دیکھا۔"

انشورنس کمپنی کے دفتر والے ذکر نے مجھے چونکایا۔ یہ دفتر پاس ہی چوراہے میں تھا... ایک لحاظ سے یہ اس علاقے میں سب سے پرانا دفتر تھا۔ یہاں میرے کالج کی ایک ساتھی فائزہ کام کرتی تھی۔ فائزہ کسی حد تک ثروت کو بھی جانتی تھی۔ جب میں اور ثروت یہاں ویٹر مقبول والے کیفے میں ملنے آتے تھے تو کبھی کبھی یہاں فائزہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ثروت کو واقعی ملازمت کی تلاش ہو۔ وہ اس سلسلے میں فائزہ سے ملی ہو اور فائزہ اس کے بارے میں جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔

اگلے دن تک کا وقت میں نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ انشورنس کمپنی کے اس دفتر کے علاوہ میرے پاس فائزہ کا اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علی الصباح میں اور عمران موٹر سائیکل پر سوار انشورنس کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔ یہ جان کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ فائزہ ابھی تک اسی آفس میں کام کرتی ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن چکی ہے... جلد ہی میں اور عمران، فائزہ کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھے۔ فائزہ نے مجھے پہچان لیا اور بڑے تپاک سے ملی۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گئی تھی اور لڑکی کے بجائے خاتون نظر آتی تھی۔

وہ میری آمد پر بے حد حیران ہوئی۔ "تم اتنا عرصہ کہاں رہے تابش! مجھے تو لگتا تھا کہ تم سے اب کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میرے اندازے کے مطابق تم پاکستان میں تو ہرگز نہیں تھے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے فائزہ۔"

"میں نے تمہارے گھر بھی کئی بار فون کیے۔ پھر ایک بار خود وہاں گئی بھی لیکن پتا چلا کہ اس گھر میں اب کوئی اور رہتا ہے۔ فرح اور عاطف وغیرہ کا بھی کچھ کھوج نہیں ملا۔ بس ایک اڑتی اڑتی سی افسوس ناک خبر ملی کہ تمہاری والدہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہیں اور اس کے بعد سے تم بھی لاپتا ہو۔"

فائزہ نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے ہمارے لیے چائے منگوائی اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اسے والدہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں مختصراً بتایا اور فرح عاطف کی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔

"ثروت کہاں ہے آج کل؟" فائزہ نے چائے کا دوسرا دور شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو فائزہ! مجھے پتا چلا ہے کہ ثروت تمہارے پاس نوکری کے لیے آئی تھی اور تم نے اسے نوکری دلوا بھی دی تھی۔ وہ یہیں پر کام کرتی رہی ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

فائزہ گہری نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ "تمہیں یہ کس نے بتایا؟"

"اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ "غلط نہیں کہہ رہے ہو تو درست بھی نہیں کہہ رہے۔ شاید تم قیافے سے بات کر رہے ہو۔"

"چلو تم خود بتا دو۔ میں نے کتنا درست کہا ہے اور کتنا غلط۔"

"چلو، کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔" فائزہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

ہم دفتر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سڑک پار کر کے اسی جانے پہچانے کیفے میں آ بیٹھے جو کبھی میری اور ثروت کی ملاقاتوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کیفے کی فضا میں پہنچتے ہی میرے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ آج ویٹر مقبول آن ڈیوٹی نہیں تھا۔ ہم نے کولڈ کافی کا آرڈر دیا... اور ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عمران نے اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا۔ بہر حال، فائزہ سمجھ چکی تھی کہ عمران کی حیثیت میرے نہایت قریبی دوست کی ہے اور وہ عمران کے سامنے ہر طرح کی بات کر سکتی ہے۔

میں بے چینی سے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گمبیر آواز میں





بولی۔ "تمہاری یہ بات درست ہے تابش کہ سات آٹھ مہینے پہلے ثروت یہاں نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں ملی۔ شاید اسے پتا ہی نہیں تھا کہ میں ابھی تک یہاں کام کر رہی ہوں۔ وہ ایک خانہ پری والا انٹرویو دے کر مایوس واپس جا رہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ میں اسے پکڑ کر دفتر کے کیفے ٹیریا میں لے گئی۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ بس مجھ سے جلد از جلد پیچھا چھڑا کر چلی جانا چاہتی تھی۔

"میں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے اور میرا یہی تجسس اسے مجھ سے دور جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا کہ اگر میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے تو پھر میں اس سے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھوں۔ میں نے کہا کہ میں خود سے کچھ نہیں پوچھوں گی، اگر وہ اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہے تو اور بات ہے۔

"اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو ماہ پہلے جرمنی سے پاکستان آئی ہے۔ یہاں ایک پرانی سہیلی کے پاس ماڈل ٹاؤن میں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ شادی شدہ سہیلی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں لیکن اب وہ مزید اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ اسے نوکری کے ساتھ ساتھ ایک ٹھکانے کی تلاش بھی ہے۔

"میں نے کہا کہ ثروت یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا اور میرا ٹکراؤ ہو گیا۔ میرا گھر تمہارے لیے بہترین ٹھکانا ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا بچہ کوئی نہیں ہے۔ ساس کے ساتھ رہتی ہوں۔ شوہر ملازمت کے سلسلے میں آج کل دبئی مقیم ہیں۔ ہمارا وقت بڑا اچھا گزرے گا۔ باقی رہی نوکری کی بات تو تم پڑھی لکھی ہو۔ اب جرمنی کی ڈگری بھی ہے تمہارے پاس۔ تھوڑی سی کوشش سے تمہیں کہیں بھی باوقار نوکری مل سکتی ہے۔ لیکن اگر تم میرے ساتھ انشورنس کمپنی کے دفتر میں کام کرو تو مجھے اچھا لگے گا۔ یوں میں نے ثروت کے لیے اپنے دفتر میں ہی بڑی مناسب جاب کا انتظام کر دیا۔ میں نے اپنے شوہر سے بھی اجازت لے لی اور وہ میرے ساتھ ہی میرے گھر میں رہنے لگی۔ وہ کوئی تین ماہ میرے ساتھ رہی اور ہم دونوں کا وقت اتنا اچھا گزرا کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن الجھن بس ایک ہی تھی۔ اس نے میری زبان کو تالا لگا دیا تھا۔ میں اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ جو تھوڑا بہت مجھے معلوم ہوا، وہ بس یہی تھا کہ تمہارے ساتھ اس کی منگنی برقرار نہیں رہ سکی تھی اور وہ ڈھائی تین سال جرمنی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے واپس آئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "فائزہ! تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس نے شادی کی ہے یا نہیں؟"

"میں سچ کہتی ہوں تابش! مجھے اس بارے میں بڑا تجسس تھا لیکن یہ سوال ان نازک ترین سوالوں میں سے تھا جنہیں وہ کسی صورت سننا پسند نہ کرتی۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنا وعدہ توڑا تو اسے ایک دم کھو دوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ صبح اٹھوں تو وہ میرے گھر میں موجود ہی نہ ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ ایک بہت بھاری بوجھ سینے پر لیے پھر رہی ہے۔ اس بوجھ اور دکھ سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے وہ گاہے بگاہے، ہنستی بھی تھی، باتیں بھی کرتی تھی، رات گئے تک دفتر کے کام میں بھی لگی رہتی تھی لیکن اس سب کے دوران میں بھی اس کا دھیان جیسے کہیں اٹکا رہتا تھا۔"

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا کبھی اس نے آپ سے تابش کے بارے میں کوئی سوال کیا؟"

"نہیں... براہِ راست تو نہیں لیکن ایک بار اتنا ضرور پوچھا کہ کیا میری ملاقات کبھی فرح اور عاطف سے نہیں ہوئی؟ میں نے بتایا کہ نہیں۔ ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں نے اسے تجویز دی کہ لاہور میں اس کے دو چار رشتے دار موجود ہیں، وہ ان سے ملے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فرح اور عاطف کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔ اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملنا چاہتی ہے اور نہ ماضی سے کسی طرح کا رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔"

ہم باتیں کر رہے تھے۔ کیفے کی کھڑکیوں سے باہر ایک ابر آلود دوپہر گرد و پیش کو نیم روشن کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "فائزہ! تم نے کہا ہے کہ وہ دو تین مہینے تمہارے ساتھ رہی... پھر کہاں گئی؟"

فائزہ نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولی۔ "ایک دن میں فیلڈ ورک کے لیے دفتر سے باہر تھی۔ شام کے وقت واپس آئی تو پتا چلا کہ ثروت جلدی چھٹی کر کے چلی گئی ہے۔ اس کے ساتھی آفیسر نے بتایا کہ لمبے قد کا ایک شخص وہاں آیا تھا۔ اس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر ثروت سے آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کوئی تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ شاید وہ شخص ثروت کو کسی بات پر دھمکا بھی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لیگل سائز لفافہ تھا جسے وہ بار بار ثروت کے سامنے کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ثروت چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں سمجھ رہی تھی

کہ جب میں گھر جاؤں گی تو وہ وہاں موجود ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں بے چینی سے اس کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا موبائل بند جارہا تھا۔ وہ ساری رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اگلے روز بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ شام کے وقت بس اس کا مختصر ٹیکسٹ میسج میرے موبائل پر آیا۔ وہ میسج ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے...“

فائزہ نے اپنے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون نکالا اور تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک میسج دکھایا۔ اس ٹیکسٹ میسج پر تقریباً پانچ مہینے پہلے کی ڈیٹ تھی۔ میسج کچھ یوں تھا۔

”فائزہ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں بتائے بغیر چلی آئی ہوں۔ میری کچھ ذاتی مصروفیات ہیں جن کی وجہ سے میں آ نہیں سکتی۔ بہرحال، میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آفس بھی نہیں آؤں گی۔ میرا استعفا آفس میں مل جائے گا۔“

فائزہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ثروت کے اس نمبر پر رابطے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نمبر کے علاوہ میرے پاس اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ آخر میں تھک ہار کر بیٹھ گئی۔“

عمران نے فائزہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”اس بندے کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے جو ثروت سے ملنے آیا تھا؟“

”میں نے کہا ہے نا کہ ثروت نے مجھے اپنے بارے میں بالکل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس اس کے رہنے کی پہلی شرط ہی یہ تھی کہ میں کچھ پوچھوں گی نہیں۔ جہاں تک اس بندے کا تعلق ہے... ہوسکتا ہے... وہ اس کا شوہر ہو لیکن اگر وہ شادی شدہ نہیں تھی تو پھر وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً میرا دھیان ثروت کی اس شادی شدہ سہیلی کی طرف بھی جاتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آنے کے بعد ٹھہری تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس سہیلی کا شوہر یا دیور وغیرہ ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنی اس سہیلی کا گھر چھوڑنے پر ”بہ وجوہ“ مجبور ہوئی تھی۔“

عمران نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ سہیلی کے شوہر یا گھر کے کسی اور مرد کا رویہ ثروت سے ٹھیک نہ ہو؟“

”بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں عمران صاحب! ہماری سوسائٹی میں خوب صورت اکیلی لڑکی کے لیے زیادہ تر مرد تو شکاری ہی ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کا ریشو کم ہے۔“

عمران نے سگریٹ کے روشن سرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس بندے کا پتا چلنا چاہیے جو آخری بار ثروت سے ملا تھا۔“

”یا پھر ثروت کی اس سہیلی سے کچھ پتا چل سکتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آکر ٹھہری تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی کھوج کھرا نہیں۔“ میں نے کہا۔

عمران نے پوچھا۔ ”دفتر میں جاب حاصل کرتے وقت ثروت نے جو کوائف لکھوائے، ان سے کوئی مدد نہیں ملتی؟“ فائزہ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

”اور وہ سامان جو وہ تمہارے پاس چھوڑ گئی تھی؟ ہو سکتا ہے اس سے کوئی کھوج ملے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے تو وہ کئی بار دیکھا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو تم بھی دیکھ لو۔“ فائزہ نے کہا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی موسم کافی ابرآلود ہوگیا تھا۔ دوپہر میں ہی لگ رہا تھا کہ شام ہوگئی ہے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش شروع ہوجائے گی۔ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو... کون؟ جی جی تھانوی صاحب۔ میں بول رہا ہوں... ابھی؟... لیکن...“

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا... پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو میں حاضر ہوجاتا ہوں... اوکے۔“

فون بند کر کے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”پیر احمد تھانوی صاحب کی کال تھی۔ زور دے رہے ہیں کہ میں ابھی آجاؤں۔ مریض کی حالت خراب ہے۔“

”تو پھر؟“ میں نے پوچھا۔

فائزہ بولی۔ ”میرے خیال میں آپ کو کوئی ضروری کام ہے، آپ چلیں۔ میں بھی دفتر کا تھوڑا سا کام نمٹا لوں۔ آج رات کا کھانا آپ میرے گھر کھائیں۔ تفصیل سے بات چیت بھی ہوگی۔ ابھی آپ کو بہت کچھ بتانا ہے اور آپ سے پوچھنا بھی ہے۔“

فائزہ نے اپنے گھر کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر مجھے دیا۔ فائزہ سے رخصت ہوکر ہم جیلانی کی موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور شاہ جمال کے علاقے کی طرف روانہ ہوگئے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ راستے میں ہی زوردار بارش شروع ہوگئی۔ یہ اچھا خاصا طوفانِ بادوباراں تھا، ہم کہیں رکنے کے بجائے چلتے رہے۔ ساون میں تو سب ہی بارش میں نہانا چاہتے ہیں... اس جاتی سردیوں کی بارش میں نہانے کے لیے ہمت کی ضرورت تھی اور یہ ہمت ہم دونوں میں موجود تھی۔ عمران کی جیکٹ مکمل واٹر پروف تھی۔ اس کی پاکٹ میں موجود ماؤزر اور ایمونیشن کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

تھانوی صاحب نے چند دن پہلے ہمارے اندر جو تجسس جگایا تھا، وہ اب عروج پر پہنچ چکا تھا۔ پیر صاحب فرماتے تھے کہ ایک مریض کے علاج میں عمران ان کی خاطر خواہ مدد کر سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک مریض کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور نہ ان کے علاج کے بارے میں۔

ہم جس وقت شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے، بارش پورا زور پکڑ چکی تھی۔ ہمارے استقبال کے لیے فربہ اندام جمیل اور ایک باریش ادھیڑ عمر مرید پہلے سے برآمدے میں موجود تھے۔

جمیل نے کہا۔ ”اوہو عمران بھائی! آپ تو بھیگتے ہوئے آئے ہیں۔ آپ بتا دیتے، پیر صاحب آپ کے لیے گاڑی بھجوا دیتے۔“

عمران بولا۔ ”کسی ایک کو تو بھیگنا ہی پڑتا۔ ہم نہ بھیگتے تو گاڑی بھیگ جاتی بلکہ چیکو وچیکو ہوجاتی۔ پھر سروس کرانے پر کافی پیسے لگ جاتے۔ ہمارا کیا ہے، تھوڑے سے پانی سے نہالیں گے۔ اور پانی کی بچت بہت ضروری ہے۔ امریکا نے کہا ہے کہ اگلی ساری لڑائیاں پانی کی وجہ سے ہوں گی... جیسے پچھلی ساری لڑائیاں امریکا کی وجہ سے ہوئی ہیں...“

عمران جب ایک بار زبان کو حرکت دے دیتا تھا تو پھر وہ جلدی رکتی نہیں تھی۔ لیکن یہاں بولنے کا زیادہ موقع نہیں تھا کیونکہ ہم جلد ہی ..... تھانوی صاحب کے قرب وجوار میں پہنچ گئے۔ تھانوی صاحب نے اپنے کمرے میں ہمارا استقبال کیا، تپاک سے ملے۔ اس بات پر معذرت بھی کی کہ ہمیں بھیگتے ہوئے یہاں آنا پڑا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھے۔ کندھوں پر ایک سنہری شال تھی۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا اور ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کا منظر تعجب خیز تھا۔ ایک پلنگ پر ایک نہایت کمزور شخص لیٹا نظر آیا۔ اس کی عمر یہی کوئی چھبیس ستائیس سال دکھائی دیتی تھی۔ اس نے تھوڑی تک لحاف اوڑھ رکھا تھا۔ تاہم اس لحاف کے اوپر ایک سفید چادر بھی تھی۔ اس نے اپنا سر وغیرہ بھی ایک سفید کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لحاف کا ایک کنارہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ اس شخص کے سینے پر کوئی زخم سا ہے جس پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اس جواں سال شخص کی گدلی آنکھوں میں خوف وہراس جم کر رہ گیا تھا۔ رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر عورت مدقوق شخص کے سرہانے بیٹھی تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔ اندازہ ہوا کہ یہ مریض کی ماں ہے۔ ماں بیٹا نے جن نظروں



سے عمران کو دیکھا، مجھے فوراً یقین ہوگیا کہ وہ اسے پہلے سے جانتے ہیں۔ دوسری طرف عمران کے چہرے پر بھی شناسائی کے آثار نظر آئے۔

عمران کو دیکھ کر ادھیڑ عمر عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

احمد تھانوی صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کر کے مدقوق شخص سے کہا۔ ”نیاز محمد! اسے پہچان رہے ہو نا تم؟ یہ عمران ہے... جسے تم عمو کہتے ہو۔“

مدقوق شخص نے اپنے سوکھے سڑے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مزید ڈرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ تھانوی صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔ ”بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لایا ہوں اسے۔ اگر اب بھی تمہارے دماغ کا فتور نہ نکلا تو یہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔“

میرے دماغ میں ہلچل ہوئی۔ عمران کی روداد میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ نیاز اسی چودھری زادے کا نام تھا جس پر سے آفت ٹالنے کے لیے برسوں پہلے عمران کا انتخاب کیا گیا تھا۔ چودھری سجاول اور اس کی بیوی نے اپنے لاڈلے بیٹے کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لیے عمران کو قربانی کا بکرا بنایا اور اسے شہنشاہ کے مزار پر خدمت کے لیے بھیج دیا تھا۔

میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ وہی نیاز تھا۔ خوف اور بیماری نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا تھا... یوں لگتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور وہ یہیں اس پلنگ پر پڑا پڑا آخری ہچکیاں لینی شروع کردے گا۔ باہر طوفانِ بادوباراں اپنے زور پر تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل دہاڑ رہے تھے۔

تھانوی صاحب نے عمران کو اشارہ کیا اور ہم پیر صاحب کے ساتھ باہر آگئے۔ دوسرے کمرے میں آکر پیر صاحب نے مجھے اور عمران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ بولے۔ ”عمران بیٹا! انسان جو کچھ بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ اس میں دیر ہوسکتی ہے، اس کی شکل بدل سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔ نیاز کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ وہم کا دنیا میں کوئی علاج نہیں... اور یہ وہم نیاز اور اس کے گھر والوں کو جکڑ چکا ہے۔ یہ وہی وہم ہے جس کی وجہ سے تم پر مصیبتیں آئیں اور تمہیں اپنا گھربار چھوڑنا پڑا۔“

”آپ کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ عمران نے ہنکارا بھرا۔

تھانوی صاحب نے اپنی سفید براق داڑھی میں

انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں یہ بات کیسے ان لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی کچھ خاص لوگوں کا پیچھا کرتی ہے... اور انہیں مارے بغیر نہیں چھوڑتی۔ کئی برس پہلے جب اس وہم نے ان لوگوں کو جکڑا تو انہوں نے اپنی دانست میں اپنی بلا تمہارے گلے ڈالنے کی کوشش کی... اب ایک بندے کی وجہ سے یہ وہم پھر ان لوگوں کی طرف واپس آ گیا ہے کہ آسمانی بجلی نیازے کو کھا جائے گی۔ اب یہ بندہ رات دن جان کنی کے عذاب میں پڑا ہوا ہے۔ تم نے ابھی اسے دیکھا ہی ہے، کیا حال ہو رہا ہے اس کا۔ راتوں کو اٹھ کر چلانے لگتا ہے۔ اونچی آواز میں روتا ہے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے نیچے چھپتا ہے۔ نیم دیوانوں کی سی حالت ہو چکی ہے۔“

عمران پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”لیکن یہ لوگ تو ساری مصیبت میرے سر... ڈال کر ”فارغ“ ہو چکے تھے۔“

”میں نے بتایا ہے نا کہ ایک بندے کی وجہ سے یہ وہم پھر ان کی طرف لوٹ آیا ہے... یا یوں کہہ لو کہ اس بندے کی خود غرضی اور طمع نیاز کو موت کے منہ میں لے آئی ہے۔ تم اس بندے کو جانتے ہو اور پہچان بھی لو گے۔“ احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دراز کھولی اور ایک کتاب میں رکھی ہوئی تصویر نکال کر عمران کو دکھائی۔ عمران کے چہرے پر نفرت کا رنگ لہرا گیا۔ حالانکہ یہ رنگ کم کم ہی اس کے چہرے پر آتا تھا۔ میں نے بھی تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ گول چہرے والا ایک شخص تھا۔ بال لمبے تھے۔ اس نے سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ ایک رخسار اور کنپٹی پر گہرا زخم تھا جیسے کسی جانور کے پنجے کا کھرونچا ہو۔ اس کھرونچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کی یہ آنکھ بھی سلامت نہیں ہے۔ میرا ذہن فوراً صادق شاہ کی طرف چلا گیا۔ وہی شیطان صفت عامل جو عمران کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ ”نوجوان مردوں کی شکاری ماجھاں“ کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جسے عمران نے بڑی خوب صورتی سے اپنے انتقام کی تپش سے آگاہ کیا تھا۔ عمران نے مشتعل بنگال ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے میں چھوڑ دیا تھا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ شیر اور صادق شاہ کی اس طوفانی ملاقات میں پیر صادق شاہ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ دونوں ہنسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ”خادم“ نے مخدوم کا ایک کندھا بھی چبا ڈالا تھا۔

تھانوی صاحب کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”نیاز اور اس کی ماں کے ذہن میں یہ بات اسی صادق شاہ نے ڈالی ہے کہ عمو چونکہ اب تک بجلی والی آفت سے بچا ہوا ہے، اس لیے اب یہ آفت عمو کے ساتھ ساتھ نیازے پر بھی آ گئی ہے۔ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی پہلے آسمانی بجلی کے نشانے پر آئے گا، مارا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ چودھرائن اور اس کے اکلوتے بیٹے سے موٹی رقمیں بٹورنے کے لیے کیا تھا۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیاب بھی رہا ہے۔ سنا ہے کہ نقد رقم کے ساتھ ساتھ وہ اب تک کافی اراضی بھی ماں بیٹے سے ہتھیا چکا ہے۔“

عمران نے اپنی تھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھوا اور پرسوچ انداز میں بولا۔ ”مجھے پتا تھا، ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہے۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ وہم کا کوئی علاج نہیں اور وہمی شخص کو کسی نئے وہم میں مبتلا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔“

تھانوی صاحب نے کہا۔ ”دو تین ماہ پہلے یہ لوگ پیر صادق شاہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ کسی نے ان کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی۔ چودھرائن کو نماز، روزے کی طرف راغب کیا۔ وظیفے بتائے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ نیاز محمد پچھلے قریباً ڈھائی مہینے سے میرے پاس ہی رہ رہا ہے۔ دو تین روز کے لیے گاؤں جاتا بھی ہے تو فوراً پلٹ آتا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ میرے پاس زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہاں بھی وہ مکمل سکون میں نہیں ہے۔ اس کی ذہنی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ میں مختلف طریقوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ اسے نارمل زندگی کی طرف لا سکوں۔ آج میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی ہے تو اسی سلسلے میں دی ہے۔“

”جی، میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ عمران نے کہا۔

”یہ سب کچھ تمہیں عجیب تو لگے گا عمران... لیکن عجیب بیماریوں کے علاج بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں عمران کہ آج تم اس برسوں پرانے خیال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو جو تمہارے آبائی گاؤں کے لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے... اور یہ بس تمہارے گاؤں کی بات نہیں ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ علاقے کے بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آسمانی بجلی تمہاری دشمن ہے اور تم اس سے چھپتے پھرتے ہو۔ نیاز اور اس کی چودھرائن ماں کا خیال بھی یہی ہے۔ آج تم نیاز اور اس کی ماں کے سامنے اس خیال کو غلط ثابت کر دو۔“





”میں بالکل تیار ہوں جی... مجھے خوشی ہو گی اگر میرے اس چھوٹے سے کام سے ان لوگوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔“

”میں جانتا ہوں عمران... تم بڑے دل کے مالک ہو۔ اپنے دشمنوں سے بھی اچھا کر سکتے ہو۔“ احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سچ پوچھیں جی تو میں نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا رکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ جاہلیت اور دقیانوسیت نظر آئے گی، اس کے خلاف اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق کوشش کروں گا۔ اور اس کام میں میرا یہ بھائی اور دوست تابش بھی میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہے۔“

تھانوی صاحب نے گہری نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولے۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں ہمارے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ بہرحال، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔“

تھانوی صاحب ہمیں وہیں چھوڑ کر پھر نیازے اور اس کی ماں کے پاس چلے گئے... بارش اسی تسلسل سے جاری تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ تین چار منٹ بعد... تھانوی صاحب واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ لبادہ تھا... انہوں نے یہ لبادہ عمران کے بھیگے ہوئے کپڑوں کے اوپر سے ہی اسے پہنا دیا۔ پھر وہ عمران کو لے کر باہر صحن میں آ گئے۔ یہاں فائبر کی ایک کرسی پڑی تھی..... تھانوی صاحب کی ہدایت کے مطابق عمران جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران کو کمپنی فراہم کرنے کے لیے فربہ اندام جمیل بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دونوں باتیں کرنے لگے اور بارش میں بھیگنے لگے... میں اور تھانوی صاحب اس کمرے میں آئے جہاں نیاز اور اس کی ماں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کمرے کی گرل دار کھڑکی میں سے صحن کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ بستر پر بیٹھے نیازے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی ہیں۔ چودھرائن بھی سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ تھانوی صاحب کچھ دیر تک ان دونوں کے پاس کھڑے رہے پھر نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ”نیازا! مجھے پتا نہیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تمہارے دماغ کا خناس دور ہو گا یا نہیں... لیکن جو حقیقت ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ یہ اس چمکتی بجلی اور برستی بارش میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہے۔ اور میں تمہیں دعوے سے کہتا ہوں۔ یہ بندہ کبھی بھی ان چیزوں سے چھپا نہیں بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہ اسی طوفان میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔“

”لیکن... یہ...“ نیاز ہکلا کر رہ گیا۔

”تم چاہو تو جب تک یہ بارش برس رہی ہے... عمران یہاں کھڑا رہے گا۔ اور صرف آج کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر تم آئندہ بھی چاہو تو یہ تمہیں اس تجربے سے گزر کر دکھا سکتا ہے۔ اپنے اندر کے بے جا خوف اور واہموں کو دور کرو نیازے... جس طرح عمران عمو کے سر پر کوئی آفت نہیں، تمہارے سر پر بھی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک زہریلا وسوسہ ہے...“

بجلی چمکی۔ ساتھ ہی ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ در و دیوار لرز گئے۔ نیازا بے ساختہ چلا اٹھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنے کلاوے میں لے لیا، اسے پچکارنے لگی۔ ”کچھ نہیں پتر... کچھ نہیں ہوا۔ پیر جی ہمارے پاس ہیں۔ ان کے ہوتے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”میرے ہونے نہ ہونے کی بات نہیں چودھرائن۔ اصل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک دھواں ہے، دھند ہے، وسوسہ ہے۔ وہ دیکھو، حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ کالا چولا پہنے وہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور جب تک تم چاہو گے بیٹھا رہے گا۔“

نیازے نے ڈری ڈری نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ عمران اور جمیل باہر موجود تھے۔ نیازے کا سارا جسم کانپنے لگا... چودھرائن نے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ خود بھی کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ عمران اب اندر آ چکا تھا۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دوسرے پہن لیے تھے... یہ تھانوی صاحب کے کسی مرید کی شلوار قمیص اور جرسی تھی۔ ایک ہال کمرے میں... تھانوی صاحب کے کئی مریض اور معتقدین موجود تھے۔ وہ بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ سات بج چکے تھے۔ ہال میں موجود افراد میں سے بھی دو چار لوگوں نے عمران کے بارش میں بھیگنے کا منظر دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید اسے کسی روحانی عمل سے تعبیر کیا ہو۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے عمران سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ آج نہیں بلکہ پھر کسی اور دن اسے زحمت دیں گے۔ یقیناً انہیں کسی ابر آلود دن کا انتظار تھا... اور یہ انتظار آج ختم ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد فربہ اندام چودھرائن اندر داخل ہوئی۔

اس کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے تھے۔ لباس دیہاتی طرز کا لیکن قیمتی تھا۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہورہی تھیں۔ کمرے میں صرف میں، عمران اور جمیل موجود تھے۔ چودھرائن ہم دونوں کی پروا کیے بغیر زمین پر بیٹھ گئی اور عمران کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عمران نے جلدی سے چودھرائن کو اپنے پاؤں پر سے اٹھایا اور کوشش کر کے صوفے پر بٹھایا۔

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”عمو پُتر... خدا کے واسطے ہمیں ماف کردو۔ ہم نے تمہیں بڑے دکھ دیے ہیں۔ ہم کو اپنی کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ میرا پتر جھلا ہو گیا ہے۔ وہ کسی کام جوگا نہیں رہا۔ دن رات کمرے میں بند رہتا ہے۔ کھڑکیاں دروازے بھی نہیں کھولتا۔ اس کا جینا حرام ہو گیا ہے پُتر... تو ہمیں ماف کردے۔ شاید اسی طرح اس کی مشکل آسان ہو۔“

عمران خاموش کھڑا تھا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ وہ فوراً چودھرائن کی اشک شوئی کرے گا اور نیازے کو معاف کرنے کی بات کرے گا۔ عمران کے چہرے سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اندرونی کرب کے اثرات اس کے چہرے پر بھی تھے۔

چودھرائن نے اپنی گرم شال کے پلو سے اپنا تربتر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں مانتی ہوں عمو پتر! ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں... پہلے تمہاری ماں کو تم سے دور کیا پھر تمہاری منگ بھی تم سے چھڑا دی۔ یہ ظلم شاید پہلے ظلم سے بھی بڑا تھا... اس دکھ نے تمہیں بالکل اجاڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے سارے قصور مانتی ہوں پُتر! تیرے سسرال والے تیرے بارے میں سن گن لینے کے لیے ہمارے پاس ہی آئے تھے۔ ہماری حویلی میں آئے تھے۔ اللہ بخشے نیازے کے پیو نے انہیں ڈرا دیا۔ ان سے کہا کہ عمو پر سایہ ہے۔ عاملوں نے کہا ہے کہ بجلی اس کی ویری ہے۔ وہ چھپ چھپا کر رہتا ہے۔ ہماری ان باتوں نے تمہیں اجاڑ دیا پُتر... وہ کڑی بھی مر گئی... اس کی قبر بن گئی۔ اس سارے ظلم میں ہم حصے دار ہیں پتر... ہم حصے دار ہیں۔ خدا کے واسطے ہمیں ماف کردو۔ میرے نیازے کی جان بچالو...“

وہ ایک بار پھر عمران کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں تھام لیے۔ عمران نے اسے دوبارہ اٹھایا۔

وہ روتی رہی، بلکتی رہی۔ اپنے ایک ایک گناہ کا اعتراف کرتی رہی۔ اس نے یہ مانا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے عمران کو مشکلوں کی آگ میں پھینک دیا... اور آج اس کا پھل یہ ملا ہے کہ اس کا بیٹا موت کے منہ میں ہے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ اس کے بیٹے کو سینے کی کوئی بیماری ہے۔

اسی دوران میں..... تھانوی صاحب بھی اندر آگئے۔ انہیں دیکھ کر چودھرائن ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ دہائی دینے لگی۔ ”پیرجی... آپ سفارش کریں۔ آپ عمو سے کہیں ہمیں ماف کردے۔“

پیر صاحب نے چودھرائن کو ڈانٹا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاؤں سے اٹھ جائے۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر۔ تھانوی صاحب نے نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے تسلی دی کہ عمران ان کے ساتھ وہ نہیں کرے گا جو انہوں نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ وہ انہیں معاف کردے گا اور اس کی معافی انشاء اللہ نیازے کو ٹھیک ہونے میں بھی بہت مدد دے گی۔

چودھرائن سسکیاں لیتی رہی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ میں سوچنے لگا، انسان جب طاقت اور اختیار کے نشے میں سرشار ہوتا ہے تو فرعون اور شداد جیسے جابروں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے لیکن جب حالات کی چکی میں پستا ہے تو ذرے سے حقیر نظر آتا ہے۔

کچھ دیر بعد احمد تھانوی صاحب کے کہنے پر چودھرائن نے بتانا شروع کیا کہ پیر صادق شاہ نے کس طرح نیاز کو اور باقی گھر والوں کو اپنی باتوں میں جکڑا... کیسے ان کے دلوں میں ایک جان لیوا خوف کی بنیاد رکھی اور پھر کس کس طرح اس خوف کو بڑھاوا دیا۔ یہاں تک کہ چودھرائن اپنے بیٹے اور اس کے بچوں کی خاطر صادق شاہ کے شکنجے میں جکڑتی چلی گئی۔ چودھرائن کے پاس زیورات کی شکل میں ڈھائی تین کلو سے کم سونا نہیں تھا۔ نیازے کے علاج کے سلسلے میں وہ اپنا قریباً آدھا زیور وقتاً فوقتاً صادق شاہ کو دے چکی تھی... اس کے علاوہ کچھ اراضی بھی تھی...

عمران نے چودھرائن کی ساری گفتگو سنی۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ ”چاچی! میری ماں کے بارے میں کوئی خیر خبر نہیں تمہارے پاس؟“

چودھرائن نے نفی میں سر ہلایا اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ”پیر صاحب کی دعا سے اب میں پنج وقت کی نماز پڑھنے لگی ہوں۔ میں ہر نماز کے بعد رب سے دعا کرتی ہوں کہ ہمیں بھین شریفاں کا کوئی پتا چلے۔ ہم اس کے پاؤں میں





گر کر معافی مانگیں۔ پتا نہیں یہ دعا کب قبول ہوگی۔“

عمران نے کہا۔ ”چاچی! تو پچھلے چند مہینے سے جس طرح اپنے پتر کے لیے تڑپ رہی ہے، میری ماں پچھلے دس سال سے اسی طرح تڑپ رہی ہوگی۔ کیا کبھی تم نے سوچا ہے اس بارے میں کہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟“

وہ ایک بار پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

بارش تھم گئی تھی..... تھانوی صاحب کے عقیدت مند اب جانا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر قطار میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کچھ گاڑیاں اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ موٹر سائیکلوں وغیرہ پر آئے ہوئے لوگ بھی نکل رہے تھے۔ ایک چادر پوش لڑکی رکشے والے کو ہاتھ کے اشارے سے روک رہی تھی۔ رکشا رک گیا۔ جب وہ اندر بیٹھنے کے لیے ذرا سا گھومی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا... اور اپنی جگہ سے بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ چہرہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہ قد کاٹھ، یہ حلیہ... یہ ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی... جو ثروت اور بھائی ناصر کے ساتھ ہی جرمنی چلی گئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ چند سیکنڈ کے لیے مجھے پوری کی پوری دکھائی دی پھر رکشے میں اوجھل ہو گئی۔ میں تڑپ کر کھڑکی تک پہنچا۔ ایک بارِش مرید مراد دھکا لگنے سے دور جا گرا تھا۔ میں کھڑکی سے منہ نکال کر دیوانہ وار چلایا... ”رکو... رک جاؤ۔“

تب تک رکشا سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو چکا تھا۔

”عمران آؤ۔“ میں بلند آواز سے بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے باہر گیراج میں آئے۔ عمران جان چکا تھا کہ میں نے کسی کو دیکھا ہے اور اب اس کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے لپک کر موٹر سائیکل سنبھالی۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ تین چار کِکس سے پہلے اسٹارٹ نہیں ہو سکی۔ ہمارا انداز دیکھ کر اردگرد کے سارے لوگ ٹھٹکے ہوئے تھے۔ جونہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی، ہم طوفانی انداز میں احمد تھانوی صاحب کی کوٹھی سے نکلے۔

”کدھر؟“ عمران نے پوچھا۔

”رکشے کے پیچھے۔ ابھی دائیں طرف مڑا ہے۔ نیلے رنگ کا ہے۔“

”سارے رکشے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ نمبر دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“

عمران نے سڑک پر پھسلن کی پروا کیے بغیر خطرناک رفتار سے موٹر سائیکل کو دائیں طرف موڑا۔ رکشا قریباً سو میٹر سڑک کے موڑ پر اوجھل ہوتا دکھائی دیا۔ عمران ایکسلریٹر کو گھماتا چلا گیا۔ جب ہم موڑ پر پہنچے تو رکشا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ قریباً دو سو میٹر آگے جا کر ہم ٹھٹکے گئے۔ یہ ایک چوراہا تھا۔ تین اطراف میں خم دار سڑکیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عمران نے اندازے سے ایک سڑک پر موٹر سائیکل ڈال دی۔

ہم قریباً پانچ منٹ تک اِدھر اُدھر چکراتے مگر مطلوبہ رکشے کا کھوج نہیں ملا۔ آخر ہم رک گئے۔ اس دس منٹ کی بھاگ دوڑ کے دوران میں میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنی کنپٹیوں میں محسوس کیا تھا۔ ”کون تھا رکشے میں؟“ عمران نے ہانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا عمران... لیکن نوّے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ رکشے میں ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بیٹھ کر گئی ہے۔“

”یار! تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ آج کل تمہارے ذہن میں رات دن یہی باتیں گردش کر رہی ہیں۔ ایسی کیفیت میں اس طرح کے ”نظری دھوکے“ ہوتے ہیں۔“

”لیکن یہ ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے عمران! ہمارے پاس ثبوت ہے کہ چار پانچ مہینے پہلے تک ثروت یہاں پاکستان میں موجود تھی اور عین ممکن ہے کہ اب بھی ہو۔ اگر ثروت یہاں ہو سکتی ہے تو نصرت بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ناصر بھائی بھی ہوں...“

”تم نے کب دیکھا ثروت کی بہن کو؟“

”جب وہ رکشے میں بیٹھ رہی تھی۔ وہاں مرکری اسٹریٹ لائٹ ہے۔ مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں واپس تھانوی صاحب کے پاس چلنا چاہیے۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتے ہیں۔“

ہم واپس شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے..... تھانوی صاحب کے بیشتر عقیدت مند اور مریض رخصت ہو چکے تھے۔ تھانوی صاحب کے دو مرید اور عمران کا مخلص دار جمیل پریشان سے گیراج میں کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھا تو وہ لپک کر ہمارے پاس آئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم یوں آناً فاناً کس کے پیچھے گئے تھے۔

ہم نے ان لوگوں کو تو کچھ نہیں بتایا تاہم تھانوی صاحب کے سامنے ساری بات کھول دی۔ تھانوی صاحب نے سب کچھ توجہ سے سنا۔ آخر میں بولے۔ ”میں نے آج تقریباً پچیس تیس مریضوں کو دیکھا ہے۔ ان میں آٹھ اس

عورتیں بھی تھیں۔ اکثر بی بیاں اپنا نام بتا دیتی ہیں لیکن ان میں نصرت کا نام تو میرے سامنے نہیں آیا۔ لڑکی کا لباس کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک میں نے دیکھا ہے، اس نے گلابی رنگ کی کڑھائی دار شال لے رکھی تھی۔ سویٹر شاید سفید تھا۔"

۔۔۔ تھانوی صاحب نے اپنے مرید خاص فرید کو آواز دی۔ "فرید! اندر آؤ۔"

درمیانی عمر کا ایک باریش شخص دست بستہ اندر داخل ہوا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔۔۔ تھانوی صاحب نے پوچھا۔ "آج نصرت نام کی ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے گلابی شال اور سفید سویٹر پہن رکھا تھا شاید۔"

فرید نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی حضرت! گلابی شال والی ایک بی بی، عورتوں والے حصے میں بیٹھی ہوئی تو تھی لیکن میرا خیال ہے کہ آج اس کی باری نہیں آئی۔ جو آخری ٹوکن نمبر میں نے آپ کے پاس بھیجا، وہ تیس تھا۔ اس کے بعد بھی دس بارہ ٹوکن اور تھے لیکن پھر آپ کے مہمان آ گئے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

فرید الٹے پاؤں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھانوی صاحب نے کہا۔ "اگر آج اس کی باری نہیں آئی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کل آئے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہاں اس سے تم دونوں کی ملاقات ضرور ہوگی۔"

اگلے اٹھارہ گھنٹے میں نے اور کسی حد تک عمران نے بھی بے حد بے چینی میں گزارے۔ یہ احساس بے حد سنسنی خیز اور صبر آزما تھا کہ ثروت جرمنی میں نہیں بلکہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ جس کے لیے میں پل پل تڑپا تھا جس کو میں کبھی بھی بھولا نہیں تھا۔ نہ اپنی خود فراموشی کے اندھیروں میں، نہ نل پانی کے ہنگاموں میں، نہ زرگاں کی قتل گاہوں میں۔۔۔ جوں جوں صبح ہوئی تھی، جوں جوں دن ڈھلا تھا، جوں جوں رات نے آنچل پھیلایا تھا، میں نے اسے یاد کیا تھا۔ اس سے ملنے کی آرزو کی تھی۔۔۔ اس رات میں بالو کو دیر تک گود میں اٹھائے کوٹھی کے پائیں باغ میں گھومتا رہا۔ اس کے نرم گال چومتا رہا۔ یہ بالو جیسے میرے لیے ماضی اور مستقبل کا سنگم تھا۔ بالو کے ایک طرف سلطانہ کی یادیں تھیں اور دوسری طرف ثروت کی۔

میڈم صفورا اپنی لال کوٹھیوں میں واپس جا چکی تھی۔ اقبال بھی جا چکا تھا۔ تاہم نوری اور صفیہ یہیں پر تھیں۔ شاہین کا بھائی ظفر اپنے ہاسٹل چلا گیا تھا۔ شاہین بھی جانا چاہتی تھی مگر عمران نے اسے جانے نہیں دیا۔ میری توقع کے عین مطابق عمران نے کرائے کا وہ گھر خالی کر دیا تھا جہاں شاہین اور ظفر احمد ہماری آمد سے پہلے رہ رہے تھے۔ جیلانی کے ذریعے شاہین اور ظفر کا سارا سامان بھی یہیں پر منگوا لیا گیا تھا۔ اب یہاں دن میں کئی بار عمران اور شاہین کی نوک جھونک دیکھنے کو ملتی تھی۔

اگلے روز میں اور عمران دوپہر ایک بجے ہی پیر احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ چودھرائن اور اس کے بیٹے نیازے سے بھی مختصر ملاقات ہوئی۔ چودھرائن ہم دونوں کے سامنے اور خاص طور سے عمران کے سامنے بچھ بچھ جا رہی تھی۔ کل والے واقعات کے بعد نیازے کی حالت کچھ بہتر لگتی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا دو تین تکیوں کے سہارے بیٹھا گندم کا دلیا کھا رہا تھا۔ اس نے عمران سے نظر نہیں ملائی۔۔۔ ہم جب تک وہاں رہے، وہ کچھ بولا اور نہ ہی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی چھاتی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کئی ایلوپیتھک دوائیں قریبی میز پر پڑی تھیں۔

دوسرے کمرے میں آ کر میں نے عمران سے پوچھا۔ "یار! اس نیازے کی بیماری ہے کیا؟ کل تم نے کینسر کی بات کی تھی۔ چھاتی کا کینسر وغیرہ تو پھیپھڑوں میں ہوتا ہے نا۔ اس نے چھاتی کے اوپر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "یہ چھاتی کے اندر کا نہیں پستان کا کینسر ہے۔۔۔ یہ بریسٹ کینسر عام طور پر عورتوں میں ہوتا ہے لیکن شاذ و نادر کوئی ایسا کیس بھی ہوتا ہے جس میں مریض "مرد" ہوتا ہے۔ یہ نیازا بھی اسی تکلیف کا شکار ہوا ہے۔ پیر صادق شاہ کے چکروں میں رہتا تو شاید اب تک عدم آباد کی تیاری شروع کر دیتا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ یہاں احمد تھانوی صاحب کے پاس آ گیا۔ انہوں نے روحانی علاج کے ساتھ ساتھ اس کا ڈاکٹری علاج بھی شروع کرایا۔ اب اس حوالے سے یہ کافی بہتر ہے۔"

احمد تھانوی صاحب ظہر اور مغرب کے درمیانی وقت میں اپنے عقیدت مندوں اور مریضوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ انہیں وظائف بتاتے۔۔۔ نماز، روزے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے پاس حکمت کے حوالے سے کچھ مجرب نسخے بھی تھے جو وہ اپنے خاص مریضوں کو استعمال کراتے تھے۔ تاہم اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا کہ فلاں مریض کو مناسب ڈاکٹری علاج کی ضرورت ہے تو وہ فوراً اسے کسی ڈاکٹر کی طرف "ریفر" کر دیتے تھے۔





مریض اور عقیدت مند آنے شروع ہو گئے تھے۔ ہم بہت بے قراری سے منتظر رہے لیکن جس کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ مغرب ہو گئی اور لوگ واپس جانا شروع ہو گئے۔ مایوسی کا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ جس کے بغیر جیسے تیسے چار برس گزار دیے تھے، اب اس کے بغیر گھڑیاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اگلے روز بھی یہی ہوا۔ میں اور عمران بارہ بجے ہی احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ پروگرام یہی تھا کہ اگر وہ آ گئی اور وہ نصرت ہی ہوئی تو ہم اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ ہاں، احمد تھانوی صاحب رسمی انداز میں اس کا پتا ٹھکانا پوچھ لیں گے۔ جب وہ یہاں سے واپس جائے گی تو ہم اس کا پیچھا کریں گے۔ لیکن یہ سب تو تب ہوتا جب وہ آتی۔ اور اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

وہ رات بھی عالم بے قراری میں گزری۔ رات کے کھانے کے بعد میں اکیلا ہی باغیچے میں ٹہلتا رہا اور ثروت کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان گنت سوالات ذہن میں کلبلاتے تھے۔ کیا وہ ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہوگی؟ کیا اس نے شادی کر لی ہوگی؟ کیا اس کے دل میں اب بھی میری چاہت ہوگی؟ میں بالو کے بارے میں اسے کیا بتاؤں گا؟ سلطانہ کا ذکر کس طرح کروں گا؟

مجھے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو فرح تھی۔ اس نے بالو کو اٹھایا ہوا تھا۔ بالو مجھے دیکھ کر ہمکنے لگا۔ میں نے اسے پیار کیا اور اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ فرح میرے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگی۔ "بھائی جان! آپ پریشان ہیں۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور فرح کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "تو ہمیشہ کی طرح وہمی ہے۔ کسی نہ کسی مسئلے کی کھوج میں رہتی ہے۔"

"نہیں بھائی جان۔۔۔ میرا دل کہتا ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ کل عاطف بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اسے ڈر ہے کہ شاید آپ نے سیٹھ سراج سے الجھنا شروع کر دیا ہے۔ کیا واقعی ایسی بات ہے؟"

"نہیں فرح! تم دور دراز کے اندیشوں کو دل میں جگہ دے رہی ہو۔ سیٹھ سراج کا تو ابھی کوئی کھوج کھرا ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہ وہ خبیث پاکستان میں ہے بھی یا نہیں۔"

"عاطف کہہ رہا تھا کہ عمران بھائی، شاہین باجی کو اس لیے یہاں لے کر آئے ہیں کہ انہیں سیٹھ سراج کی طرف سے کوئی خطرہ تھا۔ اب وہ بھی میری اور عاطف کی طرح اس چار دیواری میں رہنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فرحی! مجھے لگتا ہے تیرے اندر کسی اسی نوے سالہ بڑھیا کی روح گھس گئی ہے جو تجھے ہر وقت فکروں میں جلا رکھتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ "بھائی جان! میرا دل چاہتا ہے کہ ہم سب پھر سے پہلے کی طرح ہو جائیں۔ ہماری کسی سے دشمنی ہو اور نہ زیادہ دوستی ہو۔ کہیں کسی انجان جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر ہو۔۔۔ جہاں ہم سکون سے رہیں۔ عاطف اپنی پڑھائی مکمل کرے۔۔۔ آپ کہیں سروس کریں اور۔۔۔ اور۔۔۔"

"۔۔۔ تمہاری شادی ہو جائے۔" میں نے اس کی بات اچکی۔

"نہیں بھائی جان۔" وہ ٹھٹکی۔ "آپ شادی کریں۔ ہمارے گھر میں رونق آئے۔ ہماری اداسیاں دور ہوں۔"

وہ رات کی رانی کے ایک پودے کے پاس کھڑی ہو گئی اور اس کے پھولوں پر نزاکت سے انگلیاں چلانے لگی میں اس معصوم، بے خبر لڑکی کو کیسے بتاتا کہ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ وہ جس خوشبو دار زندگی کے سپنے دیکھ رہی ہے، وہ کچھ سانپ صفت لوگوں کی وجہ سے زہریلی ہو چکی ہے۔ اور یہ ایسا زہر ہے جس کا تریاق آسانی سے ملنے والا نہیں۔ وہ بے خبر کیا جانتی تھی کہ وہ اب بھی جس جگہ کھڑی پھولوں کو سہلا رہی ہے، وہاں چند دن پہلے ہم نے ایک لاش دبائی ہے۔ وہ چھیدے کے مدفن کے عین اوپر کھڑی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کا سر چوم کر کہا۔ "فرحی! وہی ہوگا جو تم اور عاطف چاہتے ہو۔۔۔ لیکن اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔"

اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میں نے شاہین کو دیکھا۔ اس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور وہ مرے مرے قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ فرح نے بھی اسے دیکھ لیا۔ میں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ آج پھر عمران سے اس کی لڑائی ہوئی ہے۔"

اتنے میں عمران بھی نظر آ گیا۔ وہ شاہین کے پیچھے گیا۔ وہی کھلنڈرا سا جانا پہچانا انداز تھا، اس کا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کالی سی چیز تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی چری تھیلا وغیرہ ہے۔ اس نے شاہین کو آواز دی۔ پھر اس کے قریب پہنچ کر یہ کالی سی

شے اس کے سامنے پھینک دی۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ ایک کالی بلی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے گزر کر درختوں میں اوجھل ہوگئی۔

ہم عمران اور شاہین کے پاس پہنچے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو، یہ بالکل اچھا شگون نہیں ہے۔ کالی بلی تمہارے سامنے سے گزر گئی ہے۔ اب تو تمہیں بالکل بھی نہیں جانا چاہیے۔ اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہو گیا ہے تو صبح میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گا۔"

وہ تنک کر بولی۔ "اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔"

"لیکن بلی؟"

میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ "بلی تم نے خود چھوڑی ہے عمران! اور جان بوجھ کر شاہین کے سامنے پھینکی ہے۔ کم از کم اس بھونڈی دلیل کے ذریعے تو تم شاہین کو نہیں روک سکتے۔"

وہ بولا۔ "لیکن یار! یہ بھی تو دیکھو کہ بلی کسی اور طرف بھی بھاگ سکتی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے ہو کر نکلی ہے۔ اسی کو شگون کہتے ہیں۔"

"اسے بے ہودگی کہتے ہیں اور مجھ سے یہ بے ہودگیاں اور برداشت نہیں ہوتیں۔" شاہین نے کہا۔ وہ واقعی آزردہ تھی۔

"اب کیا کیا ہے اس نے؟" میں نے شاہین سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی اور چھوٹی سی ناک سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

عمران بولا۔ "یار! بات بس اتنی سی ہے، میں نے کہہ دیا کہ شادی کے لیے لڑکیوں کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اب اسے شادی کر لینی چاہیے بلکہ میں نے اس کام کو مزید آسان بھی کر دیا ہے۔ ایک بڑا اچھا "لڑکندہ" ڈھونڈا ہے اس کے لیے۔"

"لڑکندہ کیا ہوتا ہے؟" فرح نے پوچھا۔

"لڑکے اور بندے کی جمع ہے یہ۔ یعنی درمیانی عمر کا مرد۔ اچھا بھلا اسمارٹ ہے۔ ایک چینل میں اینکری بھی کرتا ہے۔ اوپر نیچے کی اچھی کمائی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ بھلکڑ ہے۔ اتنا بھلکڑ کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ کئی دفعہ تو ٹاک شو کے دوران میں بریک لیتا ہے اور پھر واپس آنا ہی بھول جاتا ہے۔ قریب ہی اس کا گھر ہے... گھر چلا جاتا ہے۔ پون گھنٹا اشتہار چلتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک اسے یاد آتا ہے کہ واپس بھی آنا تھا۔ تب تک ٹائم ختم ہو چکا ہوتا ہے... اسکرین پر آ کر وہی گھسا پٹا فقرہ بولتا ہے۔ ناظرین! وقت کم تھا اور موضوع بہت وسیع تھا... بہت ہی زیادہ وسیع تھا... ہم نے اسے زیادہ چھیڑا ہی نہیں۔ اب آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ خدا حافظ۔ اب سوچو تائی! ایسا بھلکڑ شوہر کہیں مل سکتا ہے؟"

"تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بھلکڑ شوہر بیوی کے لیے بہت بڑی نعمت خداوندی ہوتا ہے۔ اللہ کے بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ جیب میں کتنے پیسے تھے۔ کتنے نکلے اور کتنے رہ گئے۔ جمعرات کو ہونے والی بے عزتی جمعے کو بھول جاتا ہے۔ بیوی جو کہتی ہے مان لیتا ہے۔ جدھر چلاتی ہے چل پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ لڑکندہ بڑا آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ٹاک شو میں ایک تاریخی جملہ بول گیا۔ کہنے لگا... آج کل ٹی وی ڈراموں میں اتنی عورتیں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کر "سوچتی" ہوں کیا دنیا میں بس عورتیں ہی رہ گئی ہیں... اندازہ لگاؤ۔ عورتوں کے بارے میں بات کرتے کرتے اپنی جنس بھی بھول گیا۔"

میں نے کہا۔ "اگر اتنا بھلکڑ ہے تو کچھ اور بھی نہ بھول رہا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں بچے وچے نہ ہوں اس کے۔"

"یار! تم ہر بات کا منفی پہلو لیتے ہو۔ تم ضرور کسی بڑے چینل کو جوائن کرو گے۔"

"چلو، جو بھی ہے لیکن تم دانستہ کالی بلی شاہین کے سامنے سے گزار کر اسے روک نہیں سکتے۔ اس کے لیے تمہیں معافی مانگنی پڑے گی۔"

"معافی تو میں ہرگز نہیں مانگوں گا۔" وہ اکڑ کر بولا۔ "ہاں، کہو تو ہاتھ وغیرہ جوڑ دیتا ہوں۔" آخری الفاظ اس نے مسکین لہجے میں کہے۔

پھر واقعی اس نے بڑی دل جمعی کے ساتھ شاہین سے معافی تلافی کی۔ یہاں تک کہ وہ بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔

فرح نے کہا۔ "بھائی جان! باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہیں کہ اب شاہین باجی کے سامنے سے کبھی کالی بلی نہیں گزاریں گے۔"

اس نے جھٹ شاہین کے کانوں کو ہاتھ لگائے اور فقرہ دہرایا۔

شاہین اپنے کان چھڑاتے ہوئے بولی۔ "اور اپنی نظر بھی ٹیسٹ کرواؤ جناب عمران صاحب! یہ شگون جو تم بتا رہے ہو کالی بلی کے لیے بنا ہوا ہے۔ کالے بلے کے لیے نہیں۔ جو آپ نے میرے سامنے سے زبردستی گزارا، وہ کالا بلا تھا۔"





"ہائیں، بلا تھا؟ نہیں نہیں یار۔"

اسی دوران میں وہ "کالی بلی" پھر سے چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر نکل آئی۔ ہم نے دھیان سے دیکھا، وہ واقعی بلا تھا۔ عمران نے کانوں کو ہاتھ لگا کر میری طرف دیکھا۔ "دیکھو جگر! تم میری پرستاروں ریما اور نرگس کو یونہی بدنام کرتے ہو۔ آج کل تو ہر لڑکی طوفان ہے۔ اتنی تیز نظریں ہیں ان لڑکیوں کی کہ ایک سیکنڈ میں زنانہ، مردانہ صفتوں کا پوسٹ مارٹم کر لیتی ہیں۔"

شاہین شولڈر بیگ پکڑ کر اس پر جھپٹی۔ وہ چھلاوے کی طرح برآمدے کی طرف نکل گیا۔

... اگلے روز ہم پھر بارہ بجے کے قریب پیر احمد تھانوی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج عمران نے ایک مہران کار کا بندوبست بھی کیا تھا۔ "کار پر جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یار! کار پر تم جاؤ گے۔ میں موٹر سائیکل پر رہوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اگر وہ لڑکی آ جاتی ہے تو ہم دونوں اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر کوئی ایک اسے مس بھی کر دے تو دوسرا تو پیچھے لگا رہے۔"

"لیکن ہو سکتا ہے کہ احمد تھانوی صاحب ہی اس سے سارا پتا ٹھکانا پوچھ لیں۔"

"دیکھو، جس فقرے میں "ہو سکتا ہے" آئے، اس پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔"

اس دن ہم علیحدہ علیحدہ سواری پر احمد تھانوی صاحب کے گھر پہنچے اور اس روز ہم کامیاب بھی رہے۔ تین بجے کے قریب ایک رکشا کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے رکا اور اس میں سے اسی دن والی چادر پوش لڑکی اتری۔ اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے پلو میں چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نصرت ہی تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ پہلے سے ذرا بھر چکا تھا۔ بہرحال، میں اسے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دوڑ کر نصرت کے پاس پہنچوں۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑوں اور پوچھوں کہ بتاؤ ثروت کہاں ہے؟

لیکن میں جانتا تھا، مجھے صبر کرنا ہے۔ نصرت سے براہ راست بات کرنے سے پہلے ہم جتنا بھی جان سکتے، وہ ہمارے لیے بہتر تھا۔

پانچ بجے کے لگ بھگ نصرت کی ملاقات احمد تھانوی صاحب کے ساتھ ہوئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ واپس چل دی۔ حسب سابق اس نے ایک رکشے کا انتخاب کیا تھا۔ رکشا روانہ ہوا تو ہم دونوں مناسب فاصلے سے اس کے تعاقب میں تھے۔ عمران موٹر سائیکل پر آگے تھا، میں کار میں تھوڑا سا پیچھے تھا۔

رکشا مختلف سڑکوں سے گزر کر گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں آیا اور پھر ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گیا۔ نصرت اتری اور کرایہ ادا کر کے اندر چلی گئی۔ ہم تھوڑا آگے جا کر سروس روڈ پر کھڑے ہو گئے۔

عمران موٹر سائیکل چھوڑ کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ "نیم پلیٹ پڑھی ہے تم نے؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں کسی جمشید ناگی کے نام کی تھی۔"

"یہ ناگی صاحب کون ہو سکتے ہیں؟"

"اللہ جانے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مالک مکان کا نام ہو۔"

میرے ذہن میں مختلف سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ یہ ناگی صاحب کون ہیں؟ کیا یہاں ثروت سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ کیا بھائی ناصر سے یہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟

ہمیں وہاں کھڑے قریباً پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک سوزوکی سوئفٹ کوٹھی میں سے نکلی۔ سوزوکی کار کو جو ادھیڑ عمر شخص چلا رہا تھا، وہ شکل و صورت سے ڈرائیور ہی لگتا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک اکیلی خاتون بیٹھی تھی۔ ہمیں فقط اس کے ہلکے براؤن لباس کی جھلک دکھائی دی۔ جب گاڑی ٹرن لے کر ہماری طرف آئی اور ہمارے پاس سے گزری تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پچھلی نشست پر خاتون نہیں، ایک جواں سال لڑکی بیٹھی تھی... اور وہ کوئی اور نہیں ثروت تھی۔ وہ سو فیصد ثروت تھی۔ میری نظریں اس کے بارے میں دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ اخبار کی اوٹ میں کر رکھا تھا، ویسے بھی ثروت نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

جونہی سفید سوزوکی کار آگے نکلی، میں نے اخبار نیچے رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور پیچھے روانہ ہو گیا۔ "اوئے میری موٹر سائیکل۔" عمران پکارا۔

"بھاڑ میں جائے موٹر سائیکل۔" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

"کون تھی؟"

"ثروت۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف کیا اور عمران کو سوئفٹ کار کے پیچھے ڈال دیا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں

میں دھڑک رہا تھا۔ قریباً دس منٹ میں ہم گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ میں آگئے۔ گاڑی ایک شاپنگ مال کے عین سامنے پارک ہوئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر عقبی دروازہ کھولا اور ثروت باہر نکل کر شاپنگ مال میں داخل ہوگئی... وہ ہمیشہ کی طرح بالکل سادہ لباس میں تھی۔ چہرہ بھی میک اپ سے خالی تھا لیکن اس کی اندرونی خوب صورتی اور کشش اس کے چہرے پر روشنی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ یہ میرے جانے پہچانے خدوخال تھے۔ یہ میری جانی پہچانی چال ڈھال تھی۔

''بھئی واہ! ان کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔'' عمران نے بے تکلفی سے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں یہیں بیٹھتا ہوں۔ تم جاؤ محترمہ کے پیچھے۔'' عمران نے کہا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکلا اور ثروت کے پیچھے چل دیا۔ پچھلے تین چار برسوں نے مجھے بہت بدلا تھا۔ میں اب کوئی کمزور شخص نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے عمران کے ساتھ اور پھر زرگاں میں ہونے والی مار دھاڑ نے میری پوری کیمسٹری ہی تبدیل کر دی تھی۔ پھر بھی آج یوں ثروت کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اور اب اس کے پیچھے آتے ہوئے مجھے اپنے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔

ثروت فرسٹ فلور پر پہنچی اور گارمنٹس وغیرہ دیکھنے لگی۔ اس دوران میں اس نے ایک چھوٹی سی موبائل کال بھی سنی۔ میں اس سے اپنا فاصلہ کم کرتا گیا اور بالکل قریب پہنچ گیا۔ ایک کاؤنٹر سے واپس مڑتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تو میں اس کے سامنے تھا۔ چند لمحے کے لیے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خالی پن کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر دنیا جہان کی حیرت اور سنسنی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ چند لحظے کے لیے یوں لگا جیسے وہ ایک دم اجنبیوں کی طرح گھومے گی اور دوسری طرف نکل جائے گی۔ لیکن میں اتنا پاس تھا اور وہ اس قدر وضاحت سے مجھے دیکھ چکی تھی کہ نظریں چرا لینا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چار پانچ سیکنڈ کے اندر اس کے خوبرو چہرے پر کئی رنگ آئے... آخری رنگ آنسوؤں کا تھا۔ یہ آنسو اس کی جھیل آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

''ہیلو ثروت!'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ میری آواز میں صدیوں کا کرب سمٹ آیا تھا۔

''ہیلو۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سر جھکا لیا۔ دو چمکیلے قطرے اس کے سیاہ شولڈر بیگ پر گرے۔

''کیسی ہو ثروت؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے عجیب آواز میں کہا۔

''اپنی نظروں پر بھروسا نہیں ہو رہا... کیا میں واقعی تمہیں دیکھ رہا ہوں؟'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بس جھکی پلکوں اور لرزاں جسم کے ساتھ کھڑی رہی۔

''ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈال کر کال منقطع کر دی۔

''ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے متوحش نظروں سے اردگرد دیکھا اور بولی۔ ''نہیں، میرے ساتھ کوئی ہے۔''

''تو پھر کب؟''

''یہ بہت مشکل ہے۔'' اس کی آواز میں کرب سمٹ آیا۔

''کیا... تم... بات بھی نہیں کرو گی؟'' میری آواز ٹوٹنے لگی۔

وہ چند سیکنڈ تک جیسے فیصلے کی سولی پر لٹکتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔ میں آپ کو کال کر کے بتاؤں گی۔''

میں نے اسے نمبر دیا جو اس نے لرزاں انگلیوں سے اپنے موبائل میں ایڈ کر لیا...

''کیا تم اپنا نمبر نہیں دو گی؟''

''نہیں، میں خود کال کروں گی۔''

''کتنا انتظار کرنا ہوگا؟'' میری آواز بھرا گئی۔

''ایک دو دن تک۔'' اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ سینے میں دھڑکن کی گونج تھی۔ کچھ دیر کے لیے مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں ایک ٹین ایجر ہوں اور پہلی بار کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

دو تین روز انتہائی بے چینی میں گزرے۔ میری نگاہ ہر وقت اپنے سیل فون پر رہتی تھی۔ کوئی ایس ایم ایس آتا، کوئی فون کال آتی تو میں بے طرح چونک جاتا۔ پھر مایوسی ایک سرد لہر بن کر رگ و پے میں اتر جاتی۔ بہت سے اندیشے ذہن





میں سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں وہ پھر پہلے کی طرح اچانک اوجھل تو نہیں ہو جائے گی؟ تیسرے روز مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید میں نے ثروت کی بات پر بھروسا کر کے غلطی کی ہے۔ وہ کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کرے گی... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آناً فاناً اپنے گارڈن ٹاؤن والے ٹھکانے سے بھی غائب ہو جائے۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ثروت کی کال آگئی۔ یہ کسی پی سی او کا نمبر تھا۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے اس کی جاں فزا آواز سنائی دی۔ ''ہیلو تابش! میں ثروت بول رہی ہوں۔''

''بہت انتظار کروایا تم نے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ میری بات اور میرے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''رائے ونڈ روڈ پر۔''

''اقبال ٹاؤن میں سپر کافی شاپ پر آسکتے ہیں؟''

''آسکتا ہوں۔ کب تک پہنچوں؟''

''اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ آپ ٹھیک ڈھائی بجے پہنچ جائیں۔''

جونہی گفتگو ختم ہوئی، میں نے عمران کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ پروگرام بنا کہ عمران میرے ساتھ جائے گا لیکن ثروت کے سامنے نہیں آئے گا۔ بس میرے آس پاس موجود رہے گا۔ ہم پندرہ منٹ بعد ہی روانہ ہوگئے۔ عمران موٹر سائیکل پر تھا جبکہ میں گاڑی میں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کر رہی تھیں اور اس سے کئی گنا رفتار کے ساتھ میرا دل حرکت کر رہا تھا۔ پردۂ غیب سے جو کچھ ظہور میں آنے والا تھا، وہ میرے لیے بے حد اہم تھا۔ اسی پر میری آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ جو کچھ بھی تھا، دل سے ایک گواہی بار بار آرہی تھی۔ وہ اب بھی مجھے پیار کرتی ہے۔ جس طرح میں نے اس کی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے، اس کے دل میں بھی میری یادیں موجود ہیں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں خوب صورت کافی شاپ کے نیم گرم ہال میں موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ عمران کافی شاپ سے باہر اوپن ایئر میں ایک کونے میں بیٹھا سہ پہر کے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بے رحم ہوتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے بھی تھا لیکن آج یہ بے رحمی شدید تھی۔ ثروت نے ڈھائی بجے پہنچنے کا کہا تھا مگر وہ تین بجے آسکی۔ حسبِ سابق اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آرہی

تھیں... بلکہ آنکھوں پر بھی براؤن شیڈ کے سن گلاسز تھے۔ وہی خوش قامتی، وہی ہلکورا لیتی ہوئی دل نواز چال، وہی ایک جاں فزا خوشبو قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، وہ سیدھی میری میز پر چلی آئی۔ میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ وہ اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ ہم کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر ان گنت شکوے شکایتوں کا بوجھ تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا ثروت؟''

''ہوں...'' اس نے کہا پھر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے ہولے سے بولی۔ ''ہم، تم کتنے بدل گئے ہیں تابش۔''

''لیکن جو کچھ دلوں میں تھا وہ تو نہیں بدلا نا۔ درمیان میں چار سال کا طویل وقفہ ہے لیکن مجھے یہی لگ رہا ہے کہ سلسلہ وہیں سے جڑا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہے۔ میں امی اور فرح کو لے کر تمہارے گھر آیا ہوں۔ تمہاری ناراضی دور کرنے کے لیے۔ تمہاری ڈھارس بندھانے کے لیے۔ تمہاری بنی ہوئی چائے پینے کے لیے اور تم سے بہت سی باتیں کرنے کے لیے... ہاں، لگتا ہے کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ تم مجھے اچانک چھوڑ کر گئی ہو، نہ امی ہم سے جدا ہوئی ہیں، نہ ہم سب تتر بتر ہوئے ہیں... وہ بے رحم چار سال بھی ابھی ہمارے درمیان نہیں آئے جنہوں نے مجھے بار بار مارا اور زندہ کیا۔''

وہ پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد دل گرفتہ آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں رہے اتنا عرصہ؟''

''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں لیکن پہلے تم نے پوچھا ہے اس لیے بتا دیتا ہوں۔ تفصیلی جواب تو بہت لمبا ہے ثروت... اور شاید ابھی تمہارے پاس اتنا وقت نہ ہو... مختصر یہ ہے کہ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ ایک ایسی جگہ تھا جہاں مجھے میری خبر بھی نہیں ملتی تھی۔ اتر پردیش کے دور دراز علاقے میں ایک خودمختار اسٹیٹ تھی۔ دنیا سے بالکل کٹی ہوئی جگہ تھی... اب ان سارے حالات کے بارے میں سوچتا ہوں تو جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا ہے لیکن... لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ اس سے پہلے تو یہ ہوا تھا نا ثروت کہ تم ایک دم، بغیر کچھ بتائے بغیر کوئی موقع دیے، مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم تمہارے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ تم اور نصرت، ناصر بھائی کے ساتھ پاکستان سے ہی چلے گئے ہو۔ میں حسرت سے تمہارے گھر کے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا ثروت۔

اور پھر آنے والے دنوں میں، میں نے اس بند دروازے کو اتنی بار دیکھا... اتنی بار دیکھا کہ وہ سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا ثروت کہ میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں، وہ بند دروازہ ہی نظر آتا ہے...“ میرا گلا رندھ گیا۔

”ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا تابش! ہر طرف سے انگلیاں اٹھائی جارہی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کو لگتا تھا کہ ناصر بھائی کو کچھ ہوجائے گا، ہم انہیں بھی کھو دیں گی... اور ویسے بھی ناصر بھائی نے ہمیں کچھ بتایا نہیں۔ انہوں نے ساری تیاری خاموشی سے کی تھی۔ انہوں نے آخر میں مجھے قسم دے دی کہ میں آپ کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اور میں سمجھتی ہوں تابش ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔“

”ثروت! کیا یہاں سے جانے کے بعد بھی تمہارے دل میں نہیں آیا کہ ایک بار مجھ سے رابطہ کرلو؟ صرف ایک بار مجھے حالات کو سنبھالنے کا موقع دے دو؟ پھانسی پانے والے مجرم کو بھی پھانسی سے پہلے پانی پلا دیتے ہیں، تم نے تو مجھے اپنی شکل تک نہ دکھائی۔ آواز تک نہ سنائی...“

”آپ میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے تھے تابش! کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا... اپنی اس بے بسی نے مجھے بہت رلایا۔ پر میں کچھ کرنہ سکی...“ وہ بول رہی تھی اور اپنے دودھیا ہاتھوں کی حنائی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ہاتھوں سے پیچھے اس کی کلائیوں میں کانچ کی خوش رنگ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں کی مدھم کھنک مجھے کچھ بھولے بسرے نغمے یاد دلا رہی تھی۔ وہ نغمے جو کبھی ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے تھے۔ جن کے بولوں میں ملن کی گھڑیوں کی چاپ تھی۔ انتظار کی میٹھی میٹھی کسک تھی... اور ساتھ ساتھ شہنائیوں کی گونج بھی سنائی دیا کرتی تھی۔ میں نے پلکیں اٹھا کر ثروت کی طرف دیکھا۔ اس میں بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ وہی سادگی، وہی ملاحت، آئینے جیسی وہی شفاف رنگت، جھیل آنکھوں پر گری ہوئی وہی لمبی پلکیں... ثروت کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اسکرین کو دیکھنے کے بعد کال ریسیو کی۔ ”جی... جی... نہیں، اس کی ضرورت نہیں... غلط کہتا ہے وہ۔ صدقے کے لیے کالا رنگ ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔“

اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ ”کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور پلکیں جھکالیں۔

”میرے شوہر۔“

یہ وہ الفاظ، وہ سماعت شکن دھماکوں کی طرح تھے۔ مجھے لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر شے تھم کر سکتے میں چلی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی۔ ایک یخ بستہ لہری کانوں کے راستے میرے جسم میں اتری اور مجھے سرتاپا برفاب کرگئی۔ میں بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ پلکیں جھکائے بیٹھی تھی۔

یہی وہ الفاظ تھے جو میں ثروت کے منہ سے سننا نہیں چاہتا تھا اور یہی وہ ”جواب“ تھا جس کا سوال پچھلے آدھ گھنٹے سے میری زبان پر تو تھا مگر ہونٹوں سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس سوال کی غیر معمولی سنگینی اسے میرے ہونٹوں تک آنے سے روک رہی تھی۔ بس یہ ڈر تھا کہ پتا نہیں اس سوال کا کیا جواب مل جائے گا۔ اور اب... یہ جواب بغیر میرے پوچھے ہی میرے سامنے آگیا تھا۔ اور یہ ایسا جواب تھا جس نے چند لمحوں میں میرے سینے کے اندر ایک وسیع و عریض قبرستان آباد کردیا۔ ہر قبر آرزوؤں اور امیدوں کا مدفن تھی۔

”مبارک ہو۔“ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”اور آپ؟“ اس نے نم ناک پلکیں اٹھائیں۔

میں نے گہری سانس لے کر بمشکل کہا۔ ”ثروت! شادی کا مطلب خوشی ہوتا ہے اور جہاں تک خوشی کی بات ہے، میں اس سے بہت دور ہوں۔“

اس کے موبائل سیٹ پر میسج ٹون ہوئی۔ اس نے اداسی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ”میرا خیال ہے، اب مجھے جانا چاہیے...“

”ہاں، اب چلنا ہی چاہیے۔“ میری آواز انجانے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

”مجھے معاف کردیجیے گا۔“ وہ عجیب سی آواز میں بولی۔

”ثروت! یہ نہیں پوچھو گی، میں اب تک کیسے جیا اور کہاں رہا؟“

اس کی جھیل آنکھوں پر ایک بار پھر گھنیری پلکوں کا سایہ ہوگیا۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”جہاں بہت کچھ ”ان کہا“ رہ گیا ہے، اس کو بھی رہنے دیں۔ میں جانتی ہوں، میں نے آپ کو ایک ایسا دکھ دیا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ اسی لیے تو آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ سے ایک التجا بھی ہے تابش! آپ نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ امید ہے اب بھی نہیں کریں گے۔“





”کہو۔“ میں بمشکل بول پایا۔

”ہم دوبارہ نہیں ملیں گے تابش! اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔“

”کچھ اور؟“ میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

”بس۔“

”اس سے تو بہتر تھا کہ شاپنگ مال میں تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی۔ اور اگر ہوئی تھی تو تم وہیں میرے لیے اجنبی بن جاتیں۔ اس طرح زخموں سے خون تو نہ رستا۔“ میرے لہجے کی شکستگی ناقابلِ بیان تھی۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔ لب تھرا کر رہ گئے۔ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ”اسی لیے تو اس ملاقات کو آخری ملاقات بنانا چاہتی ہوں۔ ہم دوبارہ بھی ملیں گے تو اسی طرح زخموں سے خون رسے گا۔“

ہم کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے... جیسے قبرستان میں آمنے سامنے دو قبریں جن کے کتبوں پر اجل کی بے رحمی سے متعلق شعر لکھے ہوں۔ آخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے ثروت! جیسے تمہاری مرضی۔ جہاں اتنی خواہشیں مری ہیں، شاید میری یہ خواہش بھی آہستہ آہستہ مر جائے کہ تمہارے بارے میں کچھ جان سکتا۔ اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے لینا۔ تمہارے لیے میرے رابطے کا نمبر ہمیشہ وہی رہے گا جو میں نے اس دن تمہیں دیا تھا۔“

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ جب جدائیاں طے ہوچکی ہوں تو یہ نمبر اور یہ پتے تعلق کا ذریعہ نہیں بن سکتے...

ہم کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ جیسے کسی جانکاہ موت پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

”مجھے اجازت ہے؟“ آخر اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہاں کہوں۔“

میرے ہاتھ دو بے جان پرندوں کی طرح میرے سامنے میز پر رکھے تھے۔ چند لمحے کے لیے لگا کہ وہ الوداعی انداز میں میرے ہاتھوں کو چھونا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے اپنی انگلیوں کو میری طرف بڑھانے کے بجائے اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھا دیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ ”خدا حافظ۔“ اس نے کہا۔

”خدا حافظ۔“ میں نے جواب دیا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ کافی شاپ میں موجود ہر شے سے خون رس رہا ہے... تازہ سرخ خون۔ یہ خون دیواروں سے بہہ رہا ہے اور چھت سے ٹپک رہا ہے۔ اس خون کے اندر چلتے چلتے ثروت میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں آخر تک دیکھتا رہا، اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایسے جانے والے مڑ کر نہیں دیکھتے... ہاں، وہ کہیں آگے جا کر بہت روتے ہیں۔ یہ رونے والی شام تھی... ٹوٹ کر رونے والی۔

مجھے بھی تنہائی چاہیے تھی۔

میں کافی شاپ سے باہر آیا۔ تب تک ثروت جا چکی تھی۔ میرے اور عمران کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم خاموشی سے کار میں بیٹھے اور واپس روانہ ہوگئے۔ کار عمران ڈرائیو کررہا تھا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ ”شادی ہوچکی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے بھی مختصر جواب دیا۔

”ناصر اور نصرت ساتھ ہی رہتے ہیں۔“

”پتا نہیں۔“

”دوبارہ ملے گی؟“

”نہیں۔“

گاڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ عمران جانتا تھا کہ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ زیادہ مخل نہیں ہوا۔ میری عجیب سی کیفیت تھی۔ کوئی بھاری بوجھ دل کو پیس رہا تھا۔ عاطف نے مجھ سے بات کرنا چاہی لیکن میں اسے نظرانداز کرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دروازے بند کرلیے اور تاریک کمرے میں گم صم لیٹ گیا۔ آنسو اپنے آپ ہی چہرے کو بھگونے لگے۔ ایک خاموش بارش کی طرح جو تواتر سے برستی ہے اور سب کچھ بھگوتی چلی جاتی ہے۔ کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی دوبارہ ختم ہوگئی تھی یہ کہانی۔ شاید ایسے ہی ہونا تھا۔ شاید یہی لکھا ہوا تھا۔ آس کا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو رہتی ہی انہونیوں کی تلاش میں ہے... اور انہونیاں تو بس کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں۔ معجزے عام ہوجائیں تو پھر وہ معجزے نہ رہیں۔ چار سال کا عرصہ کوئی کم تو نہیں ہوتا۔ میں چار سال اس سے دور رہا تھا... اسے میرا پتا تھا، نہ مجھے اس کا۔ پھر بھی میں نے یہ آس پالی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی ہوگی۔ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔ جب میں اسے ڈھونڈوں گا تو وہ مل جائے گی اور یوں ملے گی کہ میرے جسم اور روح کا حصہ بن جائے گی...

ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایسا نہیں ہونا تھا۔

... لیکن یادوں کے کانٹے... ہاں، یادوں کے کانٹے تو شاید اس کے دل میں بھی تھے۔ انارکلی کیفے کے ویٹر مقبول نے مجھے بتایا تھا۔ وہ کیفے میں آتی تھی۔ اس میز پر بیٹھتی تھی جہاں کبھی ہماری سرگوشیاں گونجا کرتی تھیں۔ شاید وہ ان سب جگہوں پر گئی ہو جہاں جہاں ہم ملتے تھے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دل سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں کیا ہے، کوئی نہیں جان سکتا۔

رات ایک بجے کے قریب عمران نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”کیا ہے عمران؟“ میں نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

”کھانا نہیں کھاؤ گے یار؟“

”نہیں، بالکل بھوک نہیں۔“

”اچھا باہر تو آجاؤ۔ سب پریشان ہو رہے ہیں۔“

”سر میں درد ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں یار۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ بیرا مزاج شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں ابھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔ وہ چلا گیا۔

دکھ ایک مہیب طوفان کی طرح تھا جو مجھے اٹھا اٹھا کر پٹختا رہا۔ روندتا اور مسلتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ رات کیسے گزری۔

اگلے روز میں نے ناشتے کے نام پر چند لقمے لیے اور خاموشی سے موٹر سائیکل پکڑ کر نکل گیا۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ بہ زبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں کرب کے شدید ریلے سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ فرح اور عاطف مجھ سے ان گنت سوال کریں گے۔ میرا دکھ ان کے دل و دماغ تک میں بھی سرایت کر جائے گا۔ عمران اس وقت سویا پڑا تھا۔ میں نے وہی موٹر سائیکل لی جو اس کے زیرِ استعمال تھی۔ سیاہ ونڈ اسکرین والا ہیلمٹ اپنی شناخت چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ سے باہر نکلتے ہوئے ہمیں بے حد محتاط رہنا پڑتا تھا۔ میری نگاہیں گاہے بگاہے عقب نما آئینے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جونہی میں گلشن اقبال کی طرف مڑا، چونک گیا۔ عقب میں ایک موٹر سائیکل سوار آرہا تھا۔ ایک دم ذہن میں وہ سنگین واقعہ گھوم گیا جب سیٹھ سراج کے ہرکارے چھیدے نے ہمیں فائرنگ کا نشانہ بنایا تھا اور پھر خود ایک اچانک موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میں گلشن اقبال جانے کے بجائے سیدھا نکل گیا۔ ایک دو سڑکوں پر موڑ کاٹے۔ نیلے رنگ کی موٹر سائیکل بدستور پیچھے تھی اور اب کافی نزدیک آگئی تھی۔ دفعتاً میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہو گئی۔ موٹر سائیکل پر عمران تھا۔ میں نے اسے لباس سے پہچانا۔ وہ میرے قریب آکر رک گیا اور ہیلمٹ اتار کر بولا۔ ”موٹر سائیکل چرانا جرم ہے۔ اس پر سزا ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے نیوز چینل کے نمائندے کی موٹر سائیکل چرا کر کوئی کیسے خیر منا سکتا ہے۔ ان کی تو اگلی پچھلی موٹر سائیکلیں نکل آتی ہیں۔ وہ ایسی موٹر سائیکلیں بھی برآمد کرا دیتا ہے جو اس نے ابھی چرائی بھی نہیں ہوتیں۔“

میں نے کوئی جواب دیا اور نہ ردِ عمل ظاہر کیا۔ میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے گلشن اقبال میں بیٹھنا چاہ رہے تھے۔“ اس نے کہا۔

”بیٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اکیلا۔“

”چلو تھوڑی دیر اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اکیلے بیٹھ جانا۔“

میں جانتا تھا کہ اس کو قائل کرنا ناممکن ہے۔ میں نے خاموشی سے موٹر سائیکل موڑی اور گلشن اقبال کی پارکنگ میں روک دی۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ سبزہ زاروں اور کوتاہ قامت درختوں پر خوش گوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی سی تمازت کو ہوا کی مدھم حرکت زائل کر رہی تھی۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ ہم مصنوعی جھیل کے کنارے ایک چوبی بینچ پر بیٹھ گئے۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر دھواں فضا میں چھوڑا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”تابش! میں تمہارے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ لیکن سب کچھ پا لینے کا نام ہی تو محبت نہیں ہے۔ محبت تو کسی سے دور رہ کر بھی کی جا سکتی ہے اور ساری عمر کی جا سکتی ہے۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ”وہ بے شک کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن وہ تمہارے دل میں زندہ رہے گی۔ تم اس کو سوچو گے اور اس کا تصور بہت سے روپ بدل کر تمہارے سامنے آئے گا۔ اس کی یادیں سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہیں گی۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”پچھتاوا یہی ہے عمران کہ میں جلدی نہ لوٹ سکا۔ پتا نہیں وہ کب تک میرا انتظار کرتی رہی۔ کیسی کیسی آسیں دل میں پالتی رہی...“

”لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تابی! ہم گئے وقت کو آواز تو نہیں دے سکتے نا۔ وہ کیا ایک بھلا سا شعر ہے۔ ہم سوالی پر یہ دروازہ سدا رہتا ہے بند... کب کسی کو گمشدہ لمحوں کی سوغاتیں ملیں... اب تو بس دل پر پتھر رکھنا ہے تابی...





آگ میں جلنا جھلسنا ہے... کڑھنا ہے... زندگی کے دن (گز)ارنے ہیں۔“ وہ باقاعدہ رونے لگا۔ آنسو اس کی ٹھوڑی (تک) بہہ آئے۔ ”بس تابی! عشق نام ہی جلنے کڑھنے اور کوئلہ ہونے کا ہے۔ اپنی ہی تپش سے پک پک کر مرونڈا ہو جانا... مرونڈا سمجھتے ہو نا تم؟“

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے روتے روتے ناک سے ”وون“ کی زوردار آواز نکالی اور ناک کا رقیق مادہ چٹکی میں لے کر میرے کرتے کے دامن سے صاف کر دیا۔

”کیا کرتے ہو؟“ میں نے سخت ناگواری سے کہا۔

”اوہ سوری... سوری۔“ اس نے میرا کرتہ پکڑ کر کھینچا اور پھر کھینچتا چلا گیا جیسے اسے جھیل کے پانی میں دھونا چاہتا ہو۔ میں نے رکنے کی بہت کوشش کی لیکن رک نہیں سکا۔ ہم دونوں دھڑام سے جھیل کے ٹھنڈے پانی میں گرے۔ ”عمران۔“ میں چلایا۔ بھنا کر میں نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

اس نے جواباً میری گردن پر جھانپڑ مارا اور میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔ ”اوئے کھوتے کے پتر! میرے ہوتے ہوئے بھلا تو بن سکتا ہے دیوداس۔ تیری تو ایسی کم تیسی۔“ اس نے میری گردن دبوچی۔

میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا اور خود کو چھڑا لیا۔ اس نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے پھر پانی میں گرا دیا۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ”اتنی جلدی پیچھا نہیں چھڑانے دوں گا اسے تجھ سے۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا یہ ہو سکتا ہے۔ پوری تحقیقات اور پوری تفتیش ہو گی۔ پورے حالات معلوم کرنے ہوں گے اس کے۔ اور اگر تو نے مجھی کوئی دلیپ کماری دکھائی نا تو دونوں کانوں میں سر کردوں گا تیرا۔ ایسا مکا ماروں گا کہ چاڑا کڑک ہو جائے گا۔“

”عمران! تو ہوش میں تو ہے؟“ میں دہاڑا۔

”ہوش میں ہوں اور تمہیں بھی ہوش میں لانا چاہتا ہوں۔ پانی سے نکل۔ میں تجھے کچھ بتاتا ہوں۔ کچھ معلوم ہوا ہے مجھے۔“ اس کی آواز میں چمک سی تھی۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے کوئی خاص اطلاع دینا چاہتا ہے۔ ہم باہر نکل آئے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ گارڈز بھی سیٹیاں بجاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ سخت نالاں تھے کہ ہم نے قواعد کو توڑتے ہوئے جھیل میں چھلانگ لگائی ہے اور اودھم مچایا ہے۔ عمران نے انہیں کسی نہ کسی طرح رام کر لیا اور مجھے لے کر بڑی جھیل کی دوسری جانب ایک خاموش اور تنہا گوشے میں آن بیٹھا۔ ہمارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ عمران نے اپنے سویٹر اور قمیص وغیرہ اتار کر نچوڑے اور سنہری دھوپ میں اپنے کسرتی جسم کے مسلز دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک جگہ دو ناکام عاشق بھی نہیں رہ سکتے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ میں ابھی تک اس کی بے ہودہ حرکت کی وجہ سے اپ سیٹ تھا۔

”یار! اس چھوٹے سے شہر لاہور میں کیا میں ایک ناکام عاشق کافی نہیں ہوں جو تم بھی پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نامعقول حرکت نہیں کرنے دوں گا۔ آخر دم تک کوشش کروں گا کہ تمہارا نام رانجھا، مہینوال، پنوں اور عمران وغیرہ کی فہرست میں نہ آسکے۔ اور اگر تم نے اس کوشش میں میرا ساتھ نہ دیا تو تمہارا حشر نشر کر ڈالوں گا۔“

”عمران! میں سچ کہتا ہوں۔ تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم... تم ثروت کے بارے میں کیا بات کر رہے تھے؟“

اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پیکٹ، لائٹر وغیرہ سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کل جب تم کمرے میں گھس کر بیٹھ گئے تھے تو میں بھی کمبل اوڑھ کر سو گیا تھا؟ نہیں جگر! جب تیرے دل پر چوٹ پڑتی ہے تو ساتھ ہی میرے دل پر بھی پڑتی ہے۔ میرا دشواس کرو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ تم تڑپ رہے ہو اور میں شانتی سے سو تا رہوں۔ اگر تم ایسا سوچتے ہو تو یہ میرے لیے بڑی نراشا کی بات ہووے گی۔“ اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کی۔

”تم نے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کچھ چھان بین کرائی ہے اور مجھے ایک دو باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں۔“

”کچھ بکو بھی۔“

”ان خاص باتوں سے پہلے یہ جان لو کہ ثروت کا شوہر وہی یوسف ہے جس سے جرمنی میں اس کی منگنی ہوئی تھی اور جس کے بارے میں ہم پہلے بھی جانتے ہیں۔ جو دو خاص باتیں پتا چلی ہیں، ان میں پہلی تو یہ ہے کہ ثروت اور یوسف کے درمیان کوئی خاص قسم کی ناچاقی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے ثروت، شوہر کا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی... اور دوسری بات یہ ہے کہ یوسف کے گھر میں انیس بیس برس کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے جس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ یوسف کی دوسری بیوی ہے۔“

”عمران! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ میں نے اسے

گہری نظروں سے دیکھا۔

"ایک سو دس فیصد سنجیدہ ہوں۔"

"یہ باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"جیلانی کے ذریعے۔ میں نے اسے اس کام پر لگایا تھا۔ اور تمہیں پتا ہی ہے، وہ ہرفن مولا بندہ ہے۔ اس نے بس دو تین گھنٹے کے اندر ایک ایسی عورت کا کھوج لگا لیا جو یوسف کے گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل تک وہ اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرے گی۔"

"تم ثروت اور اس کے شوہر کے درمیان کس طرح کی ناچاقی کی بات کر رہے ہو؟"

"ابھی وضاحت سے تو پتا نہیں چلا لیکن امید ہے کہ ایک دو دن میں چل جائے گا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا عمران! ہر کسی کے گھریلو معاملات ہوتے ہیں۔ اب ثروت کی زندگی میں دخل دینا..."

"واہ... واہ کیا بات کی ہے تم نے۔" عمران نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ ڈائیلاگ بہت سی فلموں میں بولا گیا ہے۔ چار پانچ فلموں میں تو دلیپ کمار صاحب نے ہی اس طرح کا ڈائیلاگ بولا ہے... نہیں، اب رادھا کا جیون اس کے پتی کے ساتھ ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا بھی پاپ ہے۔ میں اب اس کے جیون پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا... دور چلا جاؤں گا... بہت دور... بہت دور... ٹن ٹاٹن... اور اس کے ساتھ ہی انٹرویل ہو جاتا تھا۔ بہرحال، دلیپ صاحب بہت دور نہیں جاتے تھے کیونکہ پرانی فلموں میں "بہت بہت دور" جانے سے مطلب گاؤں سے پچاس ساٹھ میل دور بمبئی آنا ہوتا تھا..."

"عمران! تمہاری بکواس میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ آخر تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟"

"کچھ ثابت کرنا نہیں چاہ رہا۔ بس اتنی سی درخواست ہے کہ ہمیں رادھا کے بارے میں... ہم، میرا مطلب ہے ثروت کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل ہونی چاہئیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو... یا کوئی مشورہ درکار ہو۔ جیسا کہ اندازہ ہو رہا ہے، اس کے بھائی ناصر صاحب اس کے ساتھ نہیں ہیں... بس دونوں بہنیں ہیں یہاں۔ نصرت بھی پریشان ہے۔ احمد تھانوی سے اس کی جو ملاقات ہوئی تھی، اس کے بارے میں پتا ہے تمہیں؟"

"تم نے ہی بتایا تھا کہ نصرت نے پیر صاحب اپنی گھریلو پریشانیوں کا ذکر کیا تھا اور دعا وغیرہ کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے کسی اچھے رشتے کی خواہش رکھتی ہے۔"

"ہاں... لیکن کل احمد تھانوی صاحب نے کچھ اور بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس کی اہم پریشانی اس بڑی بہن کی وجہ سے ہے۔ اس کی شوہر کے ساتھ ناچاقی ہے۔ اسی وجہ سے وہ نو دس ماہ پہلے جرمنی سے اکیلی پاکستان آگئی تھی۔ بعد میں اس کا شوہر یوسف پاکستان آگیا۔ اب دونوں میاں بیوی میں کچھ سلوک ہے مگر حالات ابھی بھی ٹھیک نہیں ہیں..."

"نصرت نے یوسف کی دوسری شادی کا کوئی ذکر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس بارے میں نصرت نے تو کچھ نہیں بتایا لیکن کل حمیدن نے یہ کہا ہے کہ گھر میں انیس بیس سال کی ایک انگریز لڑکی ہے جو یوسف صاحب کی بیوی ہی ہے۔ حمیدن اس نوکرانی کا نام ہے۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آج شام حمیدن سے ملنے کا پروگرام ہے۔ جیلانی اسے چھ بجے کے قریب گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں لے کر آئے گا۔ ہم وہاں اس سے تفصیلی بات کرسکیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا عمران؟"

"ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی کوئی مدد کرسکیں۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے یار... تمہاری اپنی ہے۔ ٹھیک ہے، اس کی شادی اور جگہ ہوگئی ہے لیکن باقی سارے رشتے اسی ایک رشتے کی وجہ سے ختم تو نہیں ہوسکتے۔ یہ ایک خاصا سنجیدہ معاملہ ہے یار! دیکھو کہ وہ جرمنی سے تن تنہا پاکستان چلی آئی۔ یہاں پہلے کسی سہیلی کے گھر ٹھہری... پھر فائزہ کے پاس رہی اور اسی کے ساتھ دو تین مہینے سروس بھی کی۔ اب اس کا شوہر پھر اسے اپنے پاس لے گیا ہے... اب یہ اندازہ بھی ہو رہا ہے کہ کوئی ٹین ایجر جرمن لڑکی اس کی دوسری بیوی ہے۔"

ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اپنے کپڑے سکھاتے رہے۔ میں تو اتفاقاً اپنا موبائل لے کر ہی نہیں آیا تھا۔ عمران کا موبائل بھیگ گیا تھا۔ اس نے دھوپ میں رکھ ہوا تھا اور گاہے بگاہے موبائل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا تھا کہ وہ اسے داغ جدائی دینے کی کوشش نہ کرے۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ عمران نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور ہلا کر بولا۔ "پیر احمد تھانوی صاحب واقعی پہنچے ہوئے ہیں

دیکھو، اس بھیگے ہوئے سیٹ پر بھی ان کی کال آگئی۔ اب یہ بچ جائے گا۔"

اس نے کال اٹینڈ کی اور اسپیکر بھی آن کر دیا۔ تھانوی صاحب کی آواز آئی۔ "ہیلو، کیسے ہو عمران؟"

"آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکی نصرت یہاں پھر آئی تھی۔ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی کہ اچانک اسے واپس جانا پڑ گیا۔"

"وہ کیوں حضرت؟" عمران نے پوچھا۔

"فرید بتا رہا تھا کہ موبائل پر کوئی کال سنی تھی اس نے۔ پریشان ہوگئی اور ٹوکن واپس کر کے جلدی سے نکل گئی۔"

"کیا معاملہ ہوسکتا ہے جی؟" عمران نے پوچھا۔

"پتا نہیں لیکن یہ لڑکی کافی پریشان لگتی ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی ایسا رشتے دار مرد بھی اس کے آس پاس نہیں جو اس کی مدد کر سکے۔ اگر تم لوگ کچھ کر سکتے ہو اور مناسب طریقے سے کر سکتے ہو تو اس کے لیے کرو۔"

"بالکل ٹھیک ہے حضرت۔ ہم ابھی اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ تھوڑی سی پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ میں حاضر ہوں گا تو بتاؤں گا۔"

احمد تھانوی صاحب نے کہا۔ "اس روز ہم نے جو کوشش کی، وہ کافی کامیاب رہی ہے۔ نیازے کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔ کل رات بھی بارش ہوئی ہے لیکن اس میں پہلے کی طرح جو شدید بے چینی پیدا ہوتی تھی، وہ نہیں ہوئی۔ وہ تم سے دوبارہ ملنا بھی چاہ رہا ہے۔"

"آپ جب کہیں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا اور اگر اس کا وہم توڑنے کے لیے پھر بارش میں بھیگنا ضروری ہے تو میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔"

احمد تھانوی صاحب کے ساتھ عمران کی گفتگو دو تین منٹ مزید جاری رہی۔ فون بند کر کے اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ کیا نصرت کسی گھریلو مسئلے کی وجہ سے آناً فاناً واپس گئی ہوگی؟"

میں نے کہا۔ "اگر ملازمہ حمیدن سے تمہاری ملاقات کنفرم ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ بتا دے۔"

عمران نے اثبات میں سر ہلایا...

حمیدن سے ہماری ملاقات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوئی۔ گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں شام سے تھوڑی دیر پہلے حمیدن اپنی آٹھ نو سالہ بیٹی کے ساتھ آگئی۔ بیٹی بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے لگی۔ حمیدن ہمارے پاس آبیٹھی۔ حمیدن کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ جسم فربہ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ جیلانی بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ جیلانی نے بتایا تھا کہ حمیدن کو شیشے میں اتارنے کے لیے اسے صرف تین ہزار روپے خرچ کرنے پڑے ہیں۔ ان تین ہزار کے عوض وہ یوسف کے گھر کی ہر "معلوم بات" بتانے کو تیار ہوگئی ہے۔

حمیدن نے کہا۔ "یہ ثروت بی بی یوسف صاحب کی پہلی بیوی ہیں جی۔ ہم ان کو بڑی بی بی جی کہتے ہیں۔ گھر کے سارے ملازم بڑی بی بی کی عزت کرتے ہیں۔ چھوٹی بی بی اور طرح کی ہے۔ ایک تو اس کو اپنی بولی نہیں آتی، دوسرے وہ کبھی کبھی بہت غصہ بھی کرتی ہے۔"

"تم کب سے ملازم ہو اس گھر میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی چار مہینے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ باہر کے ملک سے آئے ہیں۔ ابھی کرائے کی کوٹھی میں رہ رہے ہیں لیکن ان کا اپنا بڑا شاندار مکان بھی بن رہا ہے جو ہربنس ٹاؤن میں ہے۔"

"یوسف صاحب کیسے بندے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم سے تو ٹھیک ہیں جی۔ بخششیں وغیرہ بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی بڑی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ سنا ہے کافی زیادہ تنخواہ ہے ان کی۔ شاید دس پندرہ لاکھ روپے۔"

"بڑی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟"

"بس ٹھیک ہے جی... جو چیز لاتے ہیں، دونوں بیوں کے لیے لاتے ہیں۔ دونوں کو ٹائم دیتے ہیں مگر پھر بھی قدرتی بات ہے، چھوٹی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک زیادہ ہے۔ وہ بھی ہر وقت ان کے ساتھ چمٹتی رہتی ہے۔"

"گھر میں اور کون کون ہے؟"

"بس جی، ہم تین چار نوکر ہیں۔ ایک بڑی بی بی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی ہے۔ ہاں، دو ڈھائی مہینے پہلے یوسف صاحب کے ابا جی "بڑے صاحب" بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ کافی پیسے والے ہیں۔ باہر کے ملک میں ان کی پراپرٹی شراپرٹی بھی ہے۔ جب تک وہ یہاں رہے، بڑی بی بی ثروت کے ساتھ یوسف صاحب کا سلوک بڑا اچھا رہا۔ وہ ایک دوسرے سے ہنستے بولتے تھے۔ یوسف صاحب بڑی بی بی کو لے کر شاپنگ شوپنگ کرنے بھی جاتے تھے۔ لگتا تھا کہ یوسف صاحب اپنے ابا جی سے ڈرتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "تم بتا رہی ہو کہ ابا جی کے ہوتے ہوئے یوسف صاحب کا سلوک بڑی بی بی سے اچھا رہا ہے۔ لیکن اب اس کا سلوک اچھا نہیں ہے؟"

وہ ذرا توقف کر کے بولی۔ "آہو جی۔ بڑے صاحب کے جانے کے بعد ان دونوں میں پھر زیادہ صلح صفائی نہیں رہی ہے۔ کبھی کبھی جھگڑا شکوا بھی ہو جاتا ہے دونوں میں۔ بلکہ... آج دوپہر کو بھی ہوا ہے۔"

میں چونک گیا۔ احمد تھانوی صاحب نے بتایا تھا کہ آج نصرت کو دوپہر کے وقت کوئی فون کال آئی تھی جس کے بعد وہ فوراً واپس چلی گئی تھی۔ کہیں یہ اسی جھگڑے کا شاخسانہ تو نہیں تھا۔

"آج کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ خرابی تو یوسف صاحب کی طرف سے ہی ہوتی ہے جی۔ بڑی بی بی تو کچھ بولتی ہی نہیں ہیں لیکن کبھی ان کو بھی تھوڑا بہت غصہ آجاتا ہے۔ آج دوپہر کو چھوٹی بی بی نے کوئی واہیات سی فلم ٹی وی پر لگائی ہوئی تھی۔ آواز بھی بڑی اونچی کر رکھی تھی۔ بڑی بی بی نے کہا، میں نے نماز پڑھنی ہے، آواز ذرا کم کر دو۔ اس بات پر چھوٹی بی بی جھگڑا کرنے لگی۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی چھت سے اتر کر آگئے۔ انہوں نے بھی بڑی بی بی کو ہی جھڑکا اور کہا کہ وہ برداشت کرنا سیکھے، وہ اپنا دل تنگ سے تنگ کرتی جارہی ہے۔ بڑی بی بی رونے لگیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک چھوٹا اٹیچی کیس لیا اور کہیں جانے کے لیے نکل پڑیں۔ یوسف صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے بی بی کو گیٹ پر روک لیا۔ وہاں پھر جھگڑا ہوا۔ بی بی جانا چاہتی تھیں اور یوسف صاحب انہیں روک رہے تھے۔ وہ بی بی کو کھینچ کر اندر لے گئے۔ بی بی کمرا بند کر کے روتی رہیں۔ نصرت بی بی بھی گھر میں نہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد آئیں اور انہوں نے بڑی بہن کو سنبھالا۔"

"اب کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس، ان میں جھگڑا ہوتا ہے اور پھر جلدی سے ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یوسف صاحب نے بی بی ثروت کو منا لیا ہے۔ آج سویرے وہ بی بی ثروت کے کمرے میں ہی ناشتا کر رہے تھے اور باتیں شاتیں بھی ہو رہی تھیں۔"

جیلانی نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے حمیدن... کہیں اپنے باپ کے ڈر کی وجہ سے تو یوسف، بی بی ثروت کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں ہے؟"

"آپ کی بات ٹھیک بھی ہو سکتی ہے جی۔" حمیدن نے سر ہلایا۔

"بی بی ثروت سے یوسف صاحب کے ابا جی کا رویہ کیسا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"بہت چنگا جی... بہت ہی چنگا۔ وہ انہیں بہو نہیں، بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ انگریز بی بی سے ان کو کچھ زیادہ پیار نہیں ہے۔ اس سے بس ضرورت کی بات ہی کرتے تھے۔"

صورتِ حال کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف نے ثروت سے شادی اپنے ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے کی جبکہ جرمن لڑکی سے اس کا کوئی معاشقہ وغیرہ تھا۔ حمیدن کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یوسف کا والد امیر کبیر اور صاحبِ جائداد ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ جائداد سے محروم ہونے کے ڈر سے یوسف، ثروت کو خود سے دور کرنا نہ چاہتا ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا تھا، اگر ایسی بات تھی تو پھر اس نے جرمن لڑکی سے شادی کیوں کی؟ اور اگر کی تھی تو پھر اسے منظرِ عام پر کیوں لایا؟ یا پھر ممکن تھا کہ یہ شادی خفیہ ہو اور خفیہ رہ نہ سکی ہو... یا جرمن بیوی نے ہی اسے مجبور کر دیا ہو کہ وہ اس شادی کا اعلان کرے...

جیلانی نے حمیدن سے پوچھا۔ "یوسف کی جرمن بیوی خوب صورت ہے؟"

"ہاں جی، خوب صورت تو بہت ہے۔ نیلی آنکھیں، گولڈن بال۔ لگتا ہے کہ شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ پر خوش شکل ہونا اور بات ہوتی ہے جی اور سوہنا ہونا اور بات۔ چھوٹی بی بی خوش شکل ہے، پر بڑی بی بی سوہنی ہے۔ اوپر سے بھی اور اندر سے بھی۔ ہمیں تو بڑی بی بی ہی چنگی لگتی ہے جی۔"

عمران نے جیلانی کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو بھئی! حمیدن نے شیکسپیئر اور شیلے کے پائے کی بات کی ہے۔ خوش شکل ہونا اور بات ہے، سوہنا ہونا اور بات۔"

جیلانی نے کہا۔ "حمیدن! تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے، یہ دو شادیاں کیسے اور کیوں ہوئیں؟"

وہ بولی۔ "میں تو جی موٹی عقل کی غریب نوکرانی ہوں۔ سارا دن کھوتے کی طرح کام کرنے والی پھر بھی مہینے کے آخر میں رونے والی۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑے لوگ ہی جانیں۔ پر میرا اندازہ ہے کہ بی بی ثروت بزرگوں کی مرضی سے آئی ہے اور چھوٹی بی بی کے ساتھ یوسف صاحب کا کوئی چکر شکر تھا۔ میرا مطلب ہے، کوئی پہلے کا معاملہ۔ سنا ہے کہ وہ اس دفتر میں کام کرتی تھی جہاں یوسف صاحب کرتے تھے۔ دونوں کی عمروں میں کافی فرق بھی لگتا ہے جی۔ پر جب

مت ماری جائے تو ایسے فرق شرق کون دیکھتا ہے۔"

حمیدن کے ساتھ ہماری گفتگو کوئی ایک گھنٹا رہی۔ یہاں تک کہ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور وہ واپسی کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔

جیلانی... حمیدن کی مٹھی کو تھوڑا سا مزید گرم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک دو دن میں کچھ مزید کارآمد باتیں بتائے گی۔

اس رات میں دیر تک اکیلا ہی چھت پر ٹہلتا رہا۔ موسم صاف تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ بالو گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا میرے بازوؤں میں تھا۔ وہ کبھی اپنے ننھے ہاتھ میرے منہ پر چلاتا، کبھی ناخنوں سے میری جلد کریدتا پھر ایک دم گردن گھما کر اوپر دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی نگاہ تاریک آسمان کی بے کراں وسعتوں میں دمکتے ستاروں پر جا ٹکتی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے ستاروں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ کیا اناری رخساروں اور جھیل آنکھوں والی سلطانہ بھی ان ستاروں میں کہیں موجود تھی؟ پتا نہیں کیوں لگا کہ وہ موجود ہے۔ ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی گم گشتہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ "...مہروج! تم ثروت نام کی اس لڑکی سے بہت پیار کرتے ہو۔ شاید اتنا پیار جتنا تم خود بھی نہیں جانتے۔ اسے ڈھونڈنا جرور... اس سے ملنا جرور۔ اور مجھے یقین (یقین) ہے مہروج! وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی تو اس سے کہنا..."

میں سلطانہ کی آواز سنتا رہا۔ میرے قدم چھت کے پتھریلے فرش پر اٹھتے رہے اور بالو میری بانہوں میں کھیلتا رہا... ہمکتا رہا۔

میں نے سوچا کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ثروت کے سلسلے میں اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے؟ کیا اب بھی کوئی ایسی انہونی ہو سکتی ہے جو میری اور اس کی راہوں کو ملا دے؟

بالو کے دودھ کا وقت ہو گیا تھا۔ صفیہ آئی اور اسے نیچے لے گئی۔ میں اوپر ہی رہا۔ سرد ہوا کی کاٹ میرے لیے بے معنی تھی۔ میں برداشت کے معاملے میں اتنا ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ شاید اس سے دس گنا سردی بھی جھیل سکتا تھا۔

عاطف نے چھت پر جو چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا، وہ آج کل میرے استعمال میں تھا... میں رات کے وقت دیر تک یہاں مصروف رہتا۔ اپنے آپ کو جسمانی مشقت کے حوالے کر کے مجھے عجیب سا سکون ملتا تھا۔ جب سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹتے، جب مساموں سے پسینا دھاروں کی صورت میں بہتا اور سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چلتی، میرے سامنے نیکی کا مسکراتا ہوا چہرہ آ جاتا۔ اس نے کہا تھا... تکالیف کا صلہ ملتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ قدرت اپنے اس اٹل اصول سے انحراف کر ہی نہیں سکتی۔

میں جان توڑ ورزش میں مصروف ہو گیا۔ ایک نئی دنیا میں چلا گیا... اپنے اردگرد موجود ان بدترین لوگوں کے سامنے آ گیا جن سے مجھے نبرد آزما ہونا تھا۔

اسی دوران میں عمران بھی اوپر چلا آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ وہ بولا۔ "ابھی احمد تھانوی صاحب کا فون آیا ہے۔ نصرت آج پھر ان کے پاس پہنچی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ آج اس نے تھانوی صاحب سے بہت اہم ڈسکشن کی ہے۔"

"کس حوالے سے؟" میں نے پوچھا۔

"خاوند سے علیحدگی اور طلاق کے موضوع پر۔"

"کیا مطلب؟ نصرت کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"اس نے یہ گفتگو اپنی بہن ثروت کے حوالے سے کی ہے۔ اس نے تھانوی صاحب سے اس بارے میں شرعی پوزیشن پوچھی ہے۔ بہت سے متعلقہ سوال کیے ہیں۔ تھانوی صاحب نے نصرت کو بتایا ہے کہ مذہب میں کسی بھی صورت میں زبردستی نہیں ہے۔ اگر ایک عورت سمجھتی ہے کہ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور شوہر کی اصلاح کا بھی کوئی امکان نہیں تو وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہے۔ اس کے لیے طلاق کا راستہ ہے۔ جو بے شک ناپسندیدہ ہے لیکن موجود ہے۔ میں نے کہا تھا نا تابش! ثروت کے ازدواجی معاملوں میں کافی گڑبڑ ہے۔"

"نصرت کیا کہتی ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ اس کی بڑی بہن اور اس کے شوہر میں بہت فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ معاملے ایسی جگہ پر ہیں جہاں اس کی بہن کو شوہر سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں۔ وہ اسے ایک گناہ کی طرح سمجھ رہی ہے۔ اس کی یہ سوچ اس کی زندگی تباہ کر دے گی۔ نصرت کا کہنا ہے کہ ثروت کے شوہر نے جعلی اجازت نامے کے ذریعے خفیہ شادی کی۔ اب وہ دوسری بیوی کو گھر لے آیا ہے۔ وہ پرلے درجے کا مفاد پرست ہے اور صرف اپنے باپ سے جائداد کا باقی حصہ حاصل کرنے کے لیے ثروت کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ثروت اس کے ہاتھ کھلونا بنی ہوئی ہے۔"

عمران کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ "تمہارا خیال ہے، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"جہاں تک میری چھٹی حس کہتی ہے جگر... اب موقع آ گیا ہے کہ ہم نصرت سے مل لیں۔"

"کہیں اس سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ... ثروت مجھ کو خدا حافظ کہہ کر جا چکی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے راستے میں نہ آؤں... اب ہم نصرت سے ملے تو وہ سمجھے گی کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔"

"بالکل اصلی ناکام عاشقوں والا رویہ ہے تمہارا۔ یہی کرتوت تھے جن کی وجہ سے عظیم اداکار دلیپ کمار کو ہر فلم میں ہیروئن سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہی گھسی پٹی سوچ، میں اس کے رستے میں نہیں آؤں گا... میں اس کی زندگی پر اپنا منحوس سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ میں اندر ہی اندر جل کر خاک ہو جاؤں گا، راکھ ہو جاؤں گا، مرونڈا بن جاؤں گا... بندۂ خدا... یہ نیا دور ہے۔ خود اذیتی والی حرکتیں چھوڑو۔ منطقی انداز میں سوچو، ہم اس کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کرنے نہیں جا رہے۔"

"اچھا کہو، کیا کرنا ہے؟"

"احمد تھانوی صاحب بتا رہے تھے کہ کل نصرت پھر آ رہی ہے۔ وہ جب تھانوی صاحب سے مل کر واپس جائے گی، ہم اس کے سامنے آئیں گے اور اس سے ملاقات کریں گے۔"

"لیکن..."

"لیکن کے آگے جھانپڑ ہے۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔" اس نے اپنی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر جمائی اور میرا منہ بند کر دیا۔

اگلے روز سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح ہم نے سوچا تھا۔ نصرت پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر اور ان سے وظیفہ جات وغیرہ لکھوا کر رکشا پر روانہ ہوئی تو ہم کار میں اس کے پیچھے تھے۔ وہ ابھی گارڈن ٹاؤن سے کافی دور تھی جب ہم نے کار رکشا کے پاس سے گزاری۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اتفاقاً میری نگاہ نصرت پر پڑ گئی ہے۔ نصرت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ ایک دو سیکنڈ کے لیے وہ مجھے پہچان نہیں سکی پھر ہکا بکا رہ گئی۔ کچھ دیر تک رکشا ہماری کار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر میں نے رکشا ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ اس نے رکشا سائڈ پر روک دیا۔ میں کار سے اتر کر نصرت کی طرف بڑھا۔ وہ بھی رکشا میں سے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ چہرے پر کئی رنگ یک جا ہو گئے تھے جن میں





پریشانی کا رنگ بھی شامل تھا۔ "تابش بھائی آپ...؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ اس کے انداز نے ثابت کیا کہ ثروت نے ابھی تک اسے میری اور اپنی حالیہ ملاقاتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہیں دیکھ کر اتنا ہی حیران ہو رہا ہوں جتنی تم۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ شاید اب کبھی..." اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

...قریباً پندرہ منٹ بعد ہماری کار ایک اسنیک بار کے سامنے رک رہی تھی... عمران کار میں ہی رہا جبکہ میں اور نصرت اتر کر اندر چلے گئے۔ نصرت حیران تھی کہ اس نے اپنا تین چوتھائی چہرہ چادر کے پلو میں چھپا رکھا تھا پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا... اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں سے اس کے پیچھے تھے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ میں اسے بہت بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی اور بول چال کے اعتبار سے بھی۔ ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈھیروں سوال جواب تھے لیکن نصرت کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے ہم اہم سوال و جواب کے دائرے میں ہی رہے۔ نصرت میری بہن فرح اور بھائی عاطف کے بارے میں جاننے کے لیے بہت بے چین تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ دونوں خیر خیریت سے ہیں۔ نصرت نے ہماری والدہ کی وفات پر جو نصرت کی خالہ بھی تھیں، گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے سپاٹ لہجے میں مجھے بتایا کہ ثروت باجی کی شادی ہو چکی ہے اور یہ وہیں ہوئی ہے جہاں ان کی منگنی طے تھی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کی ثروت باجی اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں۔ انہیں ایک اچھا شوہر ملا ہے... اس نے اس "اچھے شوہر" کی دوسری شادی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! میں جتنا عرصہ انڈیا میں رہا ہوں، کچھ لوگ بہت ہی شدت سے یاد آتے رہے ہیں۔ ان میں ناصر بھائی بھی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بہت سی دیگر باتیں چھپا رہی ہے، ناصر بھائی کے بارے میں بھی چھپانا چاہ رہی ہے۔ لیکن پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے ایک بار رونا شروع کیا تو روتی چلی گئی۔

"کیا ہوا نصرت! ناصر بھائی ٹھیک تو ہیں نا؟"

وہ ہچکیوں میں بولی۔ "وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تابش

بھائی۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔" میرے سینے میں جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹی اور بکھر گئی۔ کئی سیکنڈ تک میں کچھ بول نہیں سکا۔ وہ روشن چہرہ میری نگاہوں میں چمکا اور پوری طرح چمک کر ایک دم بجھ گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ "نصرت! کیا ہوا انہیں؟"

"ایکسیڈنٹ۔" وہ سسک کر بولی۔ "فرینکفرٹ سے ہمبرگ جاتے ہوئے ان کی کار کا حادثہ ہوگیا۔ ناصر بھائی کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔ ان کی منگیتر اور منگیتر کا بھائی بھی اس حادثے میں ختم ہوگئے۔ دو سال ہوگئے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس حادثے کے اثر سے نکل نہیں سکے۔"

ہم کتنی ہی دیر تک اس تکلیف دہ موضوع پر بات کرتے رہے پھر دھیرے دھیرے گفتگو میں دیگر موضوعات بھی شامل ہونے لگے۔ میں نے نصرت سے پوچھا۔ "جب یہ واقعہ ہوا، ثروت کی شادی ہو چکی تھی؟"

"جی تابش بھائی! صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ باجی نے تو اس کا اتنا غم لیا کہ بستر پر پڑ گئیں۔ ایک دفعہ تو ایسے لگنے لگا کہ ان کو بھی کچھ ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے دو تین مہینوں بعد کچھ سنبھل سکیں۔"

ناصر کے مرنے کی اطلاع نے ہمیں ایک دم سوگوار کر دیا تھا۔ کسی اور موضوع پر بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دوسری طرف یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ نصرت اگر اب چلی گئی تو پھر شاید جلد ہی اس سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اس کی باتوں اور اس کے انداز سے "گریز" صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ اس ملاقات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہے کہ اس ملاقات سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے سمجھا دیا کہ ثروت کی کچھ گھریلو مصروفیات ہیں۔ شاید ابھی اس کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ مجھ سے مل سکے۔ اس نے گارڈن ٹاؤن والے گھر کا ادھورا سا ایڈریس تو بتا دیا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی ثروت باجی اور یوسف بھائی کچھ دنوں کے لیے لاہور سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ "نصرت! کیا فرح اور عاطف وغیرہ سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا؟"

وہ بولی۔ "دل تو بہت کچھ چاہتا ہے تابش بھائی لیکن میں باجی اور یوسف بھائی کی اجازت کے بغیر تو کچھ نہیں کر سکتی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ثروت باجی ابھی کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتیں۔ پھوپی زینب، چچی کلثوم اور تایا شفیق سمیت کئی رشتے دار لاہور میں موجود ہیں لیکن ابھی تک کسی کو پتا نہیں کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ سے بھی... بس اتفاقاً ہی ملاقات ہوگئی ہے...."

اس نے یوں کہا جیسے اس "اَن چاہی" ملاقات نے اسے خوش تو کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ بہت پریشان بھی کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "ابھی تم کہاں سے آ رہی تھیں؟"

اس نے ایک اور غلط بیانی کرتے ہوئے کہا۔ "انارکلی گئی تھی، کچھ چیزیں لینے کے لیے۔"

میں کچھ دیر تک نصرت کی طرف دیکھتا رہا پھر طویل سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔ "نصرت! ناصر بھائی کی وفات کی اطلاع دے کر تم نے جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے بعد کوئی اور بات چھیڑنے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن کچھ باتیں کرنا ضروری بھی ہیں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نصرت! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک سچی لڑکی ہو لیکن اس وقت حالات کی مجبوری تمہارے سچ پر گہرا سایہ ڈال رہی ہے۔"

"مم... میں سمجھی نہیں تابش بھائی!"

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "نصرت! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چند دن پہلے میں ثروت سے مل چکا ہوں۔ شاید ثروت نے تمہیں یہ بات بتانی مناسب نہیں سمجھی۔"

"آ... آپ ملے ہیں؟" وہ ششدر رہ گئی۔

"ہاں نصرت! میں اس سے ملا ہوں اور میں نے اس کے بارے میں کافی کچھ جانا بھی ہے۔ اور جو کچھ میں نے جانا ہے، وہ اس سے بہت مختلف ہے جو تم بتا رہی ہو۔"

میز پر رکھے ہوئے نصرت کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہوگئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "آپ... کو... کیا پتا چلا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ثروت اپنے گھر میں بالکل بھی خوش نہیں ہے۔ یوسف کا کہیں معاشقہ تھا۔ اس نے خفیہ طور پر دوسری شادی کی اور پھر دوسری بیوی کو گھر بھی لے آیا۔ اس نے صرف اپنے امیر باپ کے خوف سے ثروت کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ان دونوں میں طلاق تک نوبت پہنچ چکی ہے لیکن ثروت اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ "آپ غلط نہیں کہہ رہے لیکن صحیح بھی نہیں کہہ رہے۔ شاید کسی نے آپ کو درست نہ بتایا۔ تھوڑی بہت بات تو ہے میاں بیوی میں... لیکن ایسی باتیں تو گھروں میں ہوا ہی کرتی ہیں..."





"کیا یوسف کی دوسری شادی والی بات بھی غلط ہے؟"

"ہاں... یہ شادی ہوئی تو ہے... لیکن میں سمجھتی ہوں تابش بھائی، یہ سب کچھ عارضی ہے۔ وقتی جذبات کا نتیجہ ہے۔ یوسف بھائی کی اصل اور خاندانی بیوی تو باجی ثروت ہی ہیں۔ مم... مجھے یقین ہے کہ یوسف بھائی بہت جلد گریس کو چھوڑ دیں گے۔"

میں نے نصرت کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نصرت! کچھ لوگوں کے چہرے شیشے کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولنا چاہیں بھی تو نہیں بول سکتے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔"

وہ روہانسی ہوگئی۔ غالباً وہ خوف زدہ تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی انکشاف کی وجہ سے ثروت کے مسائل میں اضافہ ہو اور وہ جو پہلے ہی دکھوں کے بھنور میں ہے، کچھ اور بھی بے حال ہو جائے۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں تابش بھائی! تھوڑی بہت رنجش ضرور ہے لیکن..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم ابھی انارکلی سے نہیں بلکہ شاہ جمال سے آ رہی ہو۔ وہاں کسی پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہاں ثروت کی شدید گھریلو پریشانیوں کے سلسلے میں ہی گئی ہوگی۔"

نصرت کا رنگ کچھ اور بھی زرد ہوگیا۔ وہ شپٹائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تابش بھائی! میں آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ آپ ثروت باجی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں... وہ پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نصرت! تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا تھا۔ "بہت دکھی" کو اس کے حال پر چھوڑنا کیا مناسب ہوگا؟ جہاں تک تمہارا مسئلہ ہے نصرت! وہ بھی میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈر رہی ہو کہ ثروت تمہیں مجھ سے ملنے اور صورتِ حال سے آگاہ کرنے پر موردِ الزام ٹھہرائے گی... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں نصرت! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس سارے معاملے میں کبھی تمہارا نام نہیں آئے گا۔ اور میں ایک بھائی کی حیثیت سے تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے ثروت کے مسئلوں میں کوئی چھوٹا سا بھی اضافہ ہو۔"

"لیکن تابش بھائی..."

"لیکن میری بہن! اگر تم کچھ نہ بھی بتاؤ گی تو صورتِ حال میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں اور باقی بھی مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

وہ آبدیدہ ہوگئی۔ "تابش بھائی! آپ کیوں خوامخواہ خود کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ آپ خود کو اس سارے معاملے سے الگ کیوں نہیں رکھتے؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ یہ جملہ بے دھیانی میں بول گئی تھی لیکن اس جملے میں چھپے ہوئے اندیشے مجھ تک پہنچے تھے۔ میں نے کہا۔ "نصرت! ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ دوسری طرف مشکلوں کی بات بھی کر رہی ہو۔ جب سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر ثروت کے بارے میں جاننے سے میں مشکل میں کیوں پڑوں گا...؟"

"آپ نہ پڑیں گے لیکن ان کے لیے تو مشکل ہو سکتی ہے نا۔ آپ کو اس معاشرے کا پتا ہی ہے۔ آپ سے زیادہ اور کون جانے گا کہ چار سال پہلے کیا ہوا تھا۔ باجی کچھ گھنٹوں کے لیے گھر سے باہر رہی تھیں اور خیریت سے واپس آ گئی تھیں لیکن ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنی باتیں بنی تھیں، اتنی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں کہ ہم زندہ درگور ہو گئے تھے۔ آپ کچھ کر سکے تھے، نہ ناصر بھائی، نہ کوئی اور... تھانے دار اشرف اور گورایا جیسے لوگوں نے سراج کے ساتھیوں والا کردار کیا تھا اور ہمیں بے بس کر کے رکھ دیا تھا... آپ کے سامنے ہی تو اباجی کی لاش اٹھی تھی تابش بھائی۔ ان کے جنازے کو آپ نے بھی کندھا دیا تھا... کس طرح ایک ہنستا بستا گھر اجڑا تھا تابش بھائی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس کی مار بڑی سخت ہے تابش بھائی۔ ہم اور طرح کے لوگ ہیں، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے..."

میری اور ثروت کی گفتگو جاری تھی جب اچانک میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ہال کے ایک گوشے میں گئی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ وہاں دھاری دار کوٹ والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص موجود تھا۔ اس کی پھولی ہوئی ناک اس کے چہرے پر خاصی نمایاں تھی۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص سیٹھ سراج اور شیرے کے ساتھیوں میں سے ہے۔ اور اگر وہ یہاں موجود تھا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے نصرت کا خیال ہی آیا۔ وہ میرے ساتھ یہاں موجود تھی اور کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھی۔

میں نے بائیں ہاتھ سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھایا اور بڑی

آہستگی سے اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا۔ ایک ہی ہاتھ سے میں نے اس کا میگزین علیحدہ کر کے اس میں گولیوں کی تعداد دیکھی اور پھر اسے دوبارہ اٹیچ کر کے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

نصرت کو شک پڑ گیا تھا کہ میں ٹیبل کے نیچے کچھ کر رہا ہوں۔ اس کی نظر کا زاویہ بدلا اور اس نے میری گود میں سیاہ رنگ کا پستول دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی چہرے پر زردی چھا گئی۔ ”آ... آپ کے پاس پستول ہے بھائی؟“

میں اسے کیا بتاتا کہ اب میرے ہاتھوں میں پھول، کتابیں، خوشبوئیں اور امن آشتی کی لکیریں نہیں ہیں۔ اب یہ ہاتھ بہت بدل چکے ہیں۔ اب ان ہاتھوں کے اثاثے کچھ اور طرح کے ہیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”نصرت! ایک ایسا بندہ یہاں موجود ہے جو کوئی غلط حرکت کر سکتا ہے۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تو تم...... پچھلے دروازے سے نکل کر چھوٹی سڑک پر چلی جانا۔ جو سواری بھی ملے، اس پر بیٹھ کر نکل جانا۔“

”لل... لیکن۔“

”اگر کوئی پیچھا کرے تو پولیس اسٹیشن سامنے ہی ہے۔ سو ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔“

نصرت کا پورا جسم لرزنے لگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ گوشے میں بیٹھا ہوا موٹی ناک والا الرٹ ہو گیا ہے۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے دیکھ کر چونکا ہوں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ وہ اپنی میز چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے والا ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ نصرت کو وہیں پر چھوڑ کر میں عام سے انداز میں اٹھا اور گوشے کی طرف بڑھا۔ وہ شخص تاڑ گیا کہ میں اس کی طرف آ رہا ہوں۔ یکایک اس نے اپنا ہاتھ اپنے دھاری دار کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پستول نکال لیا۔ یقیناً اس نے جو کرنا تھا، اس کا فیصلہ وہ پہلے سے کر چکا تھا۔ میں ابھی اس سے آٹھ دس قدم دور تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے بے دریغ مجھ پر فائر کیا۔ میں فائر کے دھماکے سے پہلے ہی جھک گیا تھا۔ گولی ایک میز پر رکھے ہوئے ایک خاتون کے سنہری شولڈر بیگ میں لگی۔ میں نے بیگ کو اچھل کر نصرت کے پاؤں میں گرتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا، میرے ہاتھ میں دبے پستول کی نال سے شعلہ نکلا۔ گولی حملہ آور کے کندھے میں کہیں لگی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا لیکن گرتے ساتھ ہی اٹھا اور ایک خالی میز کو الٹاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ پورے اسنیک بار میں کہرام مچ گیا تھا۔ میزیں الٹ رہی تھیں، برتن گر رہے تھے... لوگ بھاگ رہے تھے۔

میں پوری رفتار سے موٹی ناک والے شخص کے پیچھے لپکا۔ ابھی میں نے آٹھ دس قدم ہی اٹھائے تھے کہ میری بائیں جانب سے ایک پرچھائیں سی مجھ پر جھپٹی۔ یوں لگا جیسے رفتار سے بھاگتا ہوا کوئی ٹرک مجھ سے آن ٹکرایا ہے۔ میں ایک میز کے اوپر سے ہوتا ہوا اور ایک خاتون کو روندتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ شیشے کی ایک نہایت خوب صورت سائڈ ٹیبل میری ٹکر سے چکنا چور ہو گئی۔ دیوار کے ساتھ میرے سر کا بھی زوردار تصادم ہوا تھا۔ یہ میری غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے بے ہوش ہونے سے بچایا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں بھنا کر اٹھا، کرخت شکل و صورت والا ایک گرانڈیل شخص میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا لمبا چاقو تھا۔ بڑی بیدردی سے اس نے میرے پیٹ پر وار کیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر خود کو بمشکل بچایا پھر بھی چاقو کی نوک میری چرمی جیکٹ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے طوفانی مکا اس کے چوڑے جبڑے پر رسید کیا... وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اسے جبڑے پر میری دوسری ضرب سہنا پڑی۔ غالباً اسے ایسی زوردار ضربوں کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن کھو کر شیشے کے طویل کاؤنٹر سے ٹکرایا۔ تب دوبارہ اچھل کر میری طرف آیا۔ اس مرتبہ میں نیچے جھکا، مہلک چاقو میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ میرے اردگرد سے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں خواتین کی آوازیں نمایاں تھیں۔ میں نے گرانڈیل شخص کے پہلو پر زوردار لات رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ یقیناً اس کی ایک آدھ پسلی اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے گرے ہوئے پستول کے لیے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اس دوران میں میرے مدمقابل کو جو ایک سیکنڈ کا وقفہ ملا، اس میں اس نے بار کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کھلا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ اسے روکتا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ بار سے نکلتے ہی وہ یوں اوجھل ہوا جیسے زمین میں کہیں سما گیا ہو۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، وہ کہیں نہیں تھا... یوں لگا جیسے وہ کسی قریبی دکان میں گھسا ہے اور پھر دوسری طرف سے نکل گیا ہے۔

اسنیک بار کے ملازمین اور مالک بھی میرے اردگرد موجود تھے اور چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن حملہ آور اوجھل ہو چکا تھا۔ پھر مجھے نصرت کا خیال آیا... وہ کہاں تھی؟ میرا اندازہ تھا کہ وہ میری ہدایت کے مطابق بھاگی نہیں ہے بلکہ وہیں کہیں دبک گئی ہے۔ یہ اندازہ درست تھا۔ وہ بار ہی کے ایک گوشے سے نکلی اور روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس





کا سارا جسم لرز رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب مجھے عمران بھی نظر آیا۔ بار میں دو گولیاں چلی تھیں اور یقیناً یہ آوازیں پارکنگ میں عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ ”کیا ہوا تابی! تم ٹھیک تو ہو نا؟“ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا۔

”ہاں، ٹھیک ہوں... سیٹھ سراج کے بندے تھے۔“ میں نے مدھم آواز میں کہا۔

عمران کی نگاہ میری کٹی ہوئی جیکٹ پر پڑی اور اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ہمارے اردگرد ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہم واپس بار کے اندر آئے۔ میں نے سب سے پہلے اپنا پستول تلاش کیا اور جیب میں ڈالا۔ بار کے ہال میں کافی نقصان ہوا تھا۔ پتلون اور جرسی والی ایک جواں سال لڑکی ہنگامے کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی، اسے ہوش میں لایا جا رہا تھا۔

کون تھے یہ لوگ؟ کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے کیوں حملہ کیا؟ اس طرح کے بہت سے سوال مجھ سے پوچھے جا رہے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تابی! تم نصرت کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ یہاں کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

لیکن جب میں نصرت کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا تو اسنیک بار کے ”منیجر مالک“ نے مجھے روک لیا۔ ”جناب! آپ رکیں۔ میں نے پولیس کو بلایا ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”ان کو جانے دو۔ ان کے ساتھ خاتون ہے۔ ان کی جگہ میں ہوں یہاں۔“

مالک بولا۔ ”آپ بھی رک جائیں۔ پانچ دس منٹ کی بات ہے۔ وہ لوگ پہنچ ہی رہے ہوں گے۔“ مالک کو یقیناً زیادہ فکر توڑ پھوڑ سے ہونے والے اپنے نقصان کی تھی۔

عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ دونوں یہاں کھڑے رہیں... اور ابھی کسی طرف سے کوئی اور حرامزادہ ان پر گولی چلا دے... ان کو جانے دو۔ ان کے سارے معاملات کے لیے میں جو ہوں یہاں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم نکلو تابش! یہ لو گاڑی کی چابی۔“

عمران کے تحکمانہ لہجے میں بار کے مالک کو چپ کرا دیا۔ میں ذری سہمی نصرت کو لے کر پارکنگ میں آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے آ کر میں نے دیکھا کہ ایک پولیس موبائل جس میں ایک سست الوجود تھانے دار بھی بیٹھا تھا، اسنیک بار کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اس معاملے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسے مسئلوں کو عمران چٹکیوں میں حل کرتا ہے۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے۔

ہم گلبرگ مین مارکیٹ کی طرف نکل آئے اور پھر ایک اور ریستوران میں جا بیٹھے۔ اپنی کٹی ہوئی جیکٹ میں نے گاڑی میں ہی رہنے دی تھی۔ نصرت کے چہرے پر اب تک حیرت جمی ہوئی تھی۔ اسے جیسے میرے اس روپ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ روپ اس روپ سے یقیناً بہت مختلف تھا جو وہ بچپن سے لے کر چار سال پہلے تک دیکھتی رہی تھی۔ دبلا پتلا، کم گو اور دبو تابش بھائی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آج اس نے جس تابش کو دیکھا تھا، وہ نہ صرف مار دھاڑ کر سکتا تھا بلکہ آتشیں اسلحے کا استعمال بھی اس کے لیے معمولی بات تھی۔ نصرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ میں نے دو خطرناک غنڈوں سے ٹکر لی تھی بلکہ انہیں بھاگنے پر بھی مجبور کیا تھا۔ اس واقعے کی شدت نے اسے ابھی تک لرزہ براندام کر رکھا تھا۔

”آپ بہت بدل گئے ہیں تابش بھائی۔ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں کسی اور شخص سے مل رہی ہوں۔“ وہ کانپتی سی آواز میں بولی۔

”یہ تم تعریف کر رہی ہو یا ناپسندیدگی ظاہر کر رہی ہو؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تابش بھائی! مجھے لگتا ہے کہ آپ... بہت خطرناک قسم کا وقت گزار رہے ہیں۔ آپ کے آس پاس جو لوگ ہیں، وہ بھی خطرناک ہیں۔ یہ آپ کا دوست کون ہے جس نے ذمّے داری لے کر ہمیں وہاں سے نکالا ہے؟“

”یہ بھی ہے ایک۔ تم اسے جانو گی تو تمہاری یہ موجودہ حیرت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں نصرت جن کو دیکھ کر زندہ رہنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔“

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ نصرت میں وہ جھجک اور وہ خوف کی کیفیت کم ہو گئی ہے جو اس ملاقات کے شروع میں اس میں نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میری بدلی ہوئی شخصیت دیکھی تھی۔ عورت ایک کمزور صنف کا نام ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر سہارے، تحفظ اور مضبوطی کی طلب ہوتی ہے۔ اور یہ صفات اسے جہاں بھی نظر آتی ہیں، کشش کرتی ہیں۔

میں گفتگو کے ذریعے اسے ہفتوں تک قائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تو بھی شاید کامیاب نہ ہوتا لیکن بار میں پیش آنے والے اس ایک واقعے نے نصرت کو اس کے سخت خول کے اندر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے کے راستے پر گامزن ہو گئی تھی۔ وہ اب تفصیل سے جاننا چاہ رہی تھی کہ میں اتنا عرصہ کہاں اور کس حال میں رہا ہوں۔ کن کن مرحلوں سے گزرا ہوں۔ کن کن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے... اور کیا ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے دونوں گھرانوں کی زندگیوں کو تباہ کیا۔

میں اسے گزرے ماہ و سال کے سارے حالات تو نہیں بتا سکتا تھا تاہم چیدہ چیدہ واقعات سے اسے آگاہ کیا... نصرت نے اپنے موبائل فون سے گھر میں ثروت کو فون کر دیا اور اسے بتایا کہ اسکول کے دور کی ایک دوست اسے مل گئی ہے، اس لیے وہ کچھ دیر بعد آئے گی۔ میں نے ایک بار پھر ثروت اور اس کے گھریلو حالات والا موضوع چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ نصرت کی آنکھوں میں فوراً نمی جاگ گئی۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد گمبھیر آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ باجی کے گھریلو حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ یوسف بھائی نے اپنے مطلب کے لیے باجی کو ڈھلونا بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی حیثیت اس گھر میں بیوی کی ہے ہی نہیں۔ بیوی تو وہی گریس ہے۔ یوسف بھائی نے اس کا اسلامی نام حدیقہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ جب بندے کا دل نہ بدلے تو کچھ نہیں بدلتا۔ وہ صرف نام کی مسلمان ہے۔ اس نے یوسف بھائی پر پوری طرح قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ شاید بے دام کی غلامی اسی کو کہتے ہیں۔''

''کیا یہ گریس والا معاملہ ثروت سے شادی کے بعد شروع ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

نصرت نے آنسو پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں تابش بھائی! یہ چکر پہلے سے چل رہا تھا۔ یوسف بھائی فرینکفرٹ کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ یہ وہاں ان کی ماتحت تھی۔ وہیں سے یہ افیئر شروع ہوا۔ یوسف بھائی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے والد فاروقی صاحب کی وجہ سے ان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ جرمن لڑکی سے شادی کر کے وہ والد کی جائداد سے عاق ہو سکتے تھے۔ فاروقی صاحب اپنی جائداد کا تقریباً آدھا حصہ اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ آدھا حصہ بھی پندرہ سولہ لاکھ یورو سے کم کا نہیں تھا۔ یوسف بھائی نے باجی ثروت سے شادی کر لی اور کچھ ہی ہفتے بعد فاروقی صاحب نے پراپرٹی یوسف بھائی کے نام کر دی۔ پراپرٹی نام ہو گئی تو یوسف بھائی نے اپنا اصل کھیل کھیلا اور ایک فیک اجازت نامے کے ذریعے گریس سے میرج کر لی۔ نہ صرف میرج کر لی بلکہ اسے گھر بھی لے آئے۔ اس موقع پر باپ بیٹے میں تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے... لیکن آہستہ آہستہ یوسف بھائی نے فاروقی صاحب کو منا لیا... فاروقی صاحب نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ لاہور میں اپنا پرانا گھر ثروت باجی کے نام کریں گے۔ اس کے علاوہ یوسف بھائی دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے اور ثروت باجی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری بات سمجھ میں آ رہی ہے نصرت... کیونکہ ابھی فاروقی صاحب کی آدھی جائداد کا فیصلہ ہونا باقی ہے اس لیے یوسف اپنے باپ کی خواہش کے مطابق ثروت کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے تابش بھائی۔'' نصرت نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''یوسف بھائی گریس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس گھر میں باجی کے لیے کوئی جگہ نہیں اور نہ کبھی ہو گی۔ ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ یوسف بھائی سے خلع حاصل کر لیں... اور انہیں فوراً مل بھی سکتا ہے۔ لیکن... وہ اس کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتیں۔ وہاں ہر دکھ سہہ رہی ہیں لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو سمجھنے کے لیے بالکل تیار نہیں کہ وہ ایک غلط جگہ پر، غلط لوگوں کے درمیان، غلط حیثیت سے آ گئی ہیں۔''

نصرت کا چہرہ کرب کی آماجگاہ تھا۔ اپنی جواں سال من موہنی بہن کا دکھ اس کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔ پھر اپنایت کے انداز میں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی جان! میں آپ کو یوسف بھائی اور باجی کے بارے میں ایک اور خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں...''

میں تجسس سے نصرت کی طرف دیکھنے لگا۔ نصرت نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں



# ذہانت

بابر نعیم

ذہانت کا استعمال کسی بھی فن یا شعبے میں کیا جائے... تو اس کے نتائج نہایت دیرپا اور مؤثر صورت میں سامنے آتے ہیں... ایسے ہی لوگوں کے گرد گھومتی کہانی... جس کے کردار اپنے ہنر کے ساتھ ساتھ عقل و دانش میں یکتا تھے۔

**ایک ذہین شخص کی موت سے شروع ہونے والے واقعے کے چونکا دینے والے مضمرات**

سراغ رساں انسپکٹر رالف سنور نے اپنی گاڑی پارک کی اور بیرونی گیٹ کھول کر اس بڑی سی عمارت کی جانب بڑھنے لگا جو اوسلو کے نواح میں واقع تھی۔ پندرہ منٹ پہلے سراغ رساں انسپکٹر نارمن نے گھر پر فون کر کے اسے فوری طور پر یہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ مسئلہ صرف وہی حل کر سکتا ہے۔ یہ اتوار کی شام تھی اور رالف اس دن چھٹی پر تھا لیکن نارمن کے فون نے اس کا سارا موڈ خراب کر دیا۔ اسے زیادہ غصہ نارمن کی چاپلوسی پر آ رہا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر کہ یہ مسئلہ وہی حل کر سکتا ہے، رالف کو وہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

نارمن ایک بڑے ہال میں موجود تھا جس کی آرائش پر کچھ خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔ رالف نے بغور جائزہ لیا تو اسے وہاں کچھ قیمتی تصاویر، معمولی قسم کا فرنیچر، چند ٹرافیاں اور الماریوں میں سجے ہوئے ہتھیار نظر آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس گھر کے مکین شکار کا بھی شوق رکھتے ہیں۔

''کیا قصہ ہے؟'' رالف نے پوچھا۔

نارمن نے کندھے اچکائے اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''یہ معلوم کرنے کے لیے ہی تو تمہیں بلایا ہے۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے۔''

''میں حقائق جاننا چاہوں گا۔''

''یہ وہ جگہ ہے جہاں انٹیل کلب کے نو اراکین ایک میٹنگ کے سلسلے میں آج شام سات بجے جمع ہوئے تھے اور اس کی میزبانی مکان کا مالک راجر ایلی کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کلب کے اراکین عام لوگوں کے مقابلے میں دگنے ذہین ہوتے ہیں۔ بہرحال، یہ تمام اراکین اس میٹنگ کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے لیکن ان میں کلب کا نائب صدر پیٹر ڈیل موجود نہیں تھا جس نے ٹانگ میں تکلیف ہونے کی وجہ سے صبح ہی میٹنگ میں شرکت سے معذرت کرلی تھی۔ کلب کے آٹھ اراکین اب بھی لیونگ روم میں موجود ہیں اور ایک محافظ ان کی نگرانی پر مامور ہے جبکہ کلب کے صدر راجر نے تہ خانے میں واقع اپنی خلوت گاہ میں خود کو گولی مار کر خودکشی کرلی۔ آؤ وہیں چلتے ہیں۔''

رالف بے دلی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے اس طرح کے کلبس کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن اپنی مصروفیت کے سبب ان پر دھیان نہ دے سکا اور نہ ہی کبھی اس کی ضرورت پیش آئی۔

''دروازہ اندر سے بند تھا۔'' نارمن نے بتایا۔ ''ہمیں اسے کھولنے میں بڑی مشکل پیش آئی اور اس کے لیے ڈرل مشین سمیت مختلف اوزار استعمال کرنا پڑے۔''

دونوں سراغ رسانوں نے ہاتھوں پر ربر کے دستانے چڑھائے اور کمرے میں داخل ہوگئے۔ اسے بھی کسی لیونگ روم کی طرح سجایا گیا تھا اور وہاں دو پولیس والے پہلے سے ہی لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ راجر کی لاش کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ کلین شیو اور کھچڑی بالوں والا باوقار شخص تھا۔ اس نے عمدہ تراش کا سوٹ اور میچنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی جبکہ جوتوں کی چمک سے بھی اس کے اعلیٰ ذوق کا پتا چلتا تھا۔

''تمام علامات یہی ظاہر کر رہی ہیں کہ اس نے اپنے منہ میں پستول رکھ کر گولی چلائی ہے۔'' نارمن نے کہا۔

''یہ وہ پستول ہے جس سے راجر نے اپنے آپ کو ہلاک کیا۔'' نارمن نے ایک پلاسٹک کی تھیلی رالف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے معلوم کرلیا ہے کہ یہ پستول راجر کے نام پر ہی رجسٹرڈ ہے۔ تمام علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے خود کو کمرے میں بند کر کے خودکشی کی ہے... لیکن کیوں؟ وہ آج کی میٹنگ کا میزبان تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے پرتگیزی شراب کی بوتل لے کر ہال میں جانے والا تھا۔''

''کیا مہمانوں نے بھی یہی کہا ہے؟''

''ہاں، یہ اس کا معمول تھا۔ جب بھی یہاں کلب کی میٹنگ ہوتی تو وہ اپنے مہمانوں کی تواضع عمدہ قسم کی شراب سے کیا کرتا۔ اس کمرے سے متصل اس کا زمین دوز شراب خانہ ہے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ بوتل کھول کر پہلے خود چکھتا تاکہ اندازہ کرسکے کہ یہ شراب مہمانوں کے لیے موزوں ہے یا نہیں۔ موزوں ہونے کی صورت میں وہ بوتل لے کر سٹنگ روم میں جاتا اور گلاسوں میں بھر کر خود مہمانوں کو پیش کرتا۔ اس وقت بھی وہاں چاندی کی ایک ٹرے میں آٹھ خالی گلاس رکھے ہوئے ہیں جبکہ بالکل اسی طرح کا ایک گلاس اس کمرے میں بند بوتل کے ساتھ موجود ہے۔''

نارمن نے ایک بڑی سی میز کی طرف اشارہ کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ شراب چکھنے ہی والا تھا لیکن اس نے بوتل کھولنے کے بجائے میز کی نچلی دراز کھولی جہاں یہ پستول رکھا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں یوں ہوا کہ اسی خانے میں کارتوسوں کا ڈبا اور پستول صاف کرنے والا برش بھی رکھا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ راجر کو اپنے آپ کو گولی مارنے کی بہت جلدی تھی... مگر کیوں؟''

نارمن نے ٹھنڈی سانس لی اور سر کھجانے لگا۔ رالف نے نظریں اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کی نظریں کپ بورڈ پر گئیں جہاں مختلف سائز کے خوب صورت کرسٹل گلاس رکھے ہوئے تھے جبکہ اس کے نیچے کتابوں کی الماری میں چمڑے کی جلد والی کئی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی اور تعریفی نظروں سے اس کرسی کو دیکھنے لگا جس پر چمڑا چڑھا ہوا تھا۔ وہ کرسی واقعی فن کا نمونہ تھی۔ راجر اسی کرسی پر بیٹھ کر کتابوں اور شراب سے دل بہلاتا ہوگا۔ اس کی دراز میں حفاظت کے لیے بہترین قسم کا پستول بھی رکھا ہوا تھا جو اس کی موت کا سبب بن گیا۔ ان تمام واقعات اور علامات کو دیکھتے ہوئے یہ کیس رالف کے لیے بھی ناقابل فہم اور بے





معنی نظر آرہا تھا۔

''چلو، ایک نظر شراب خانے پر بھی ڈال لیں۔'' نارمن نے کہا۔

رالف اس کی تقلید میں اس سے متصل دوسرے کمرے میں چلا گیا جو رقبے کے لحاظ سے اس کا آدھا تھا اور اس میں لگی الماریاں اوپر سے نیچے تک شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھیں۔

''ان سب بوتلوں کو ان کی ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے ترتیب میں رکھا گیا ہے۔'' نارمن نے کہا۔

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرنے والا ہر کام نظم و ضبط سے کرنے کا عادی تھا۔''

''خلوت گاہ کے علاوہ یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟'' رالف نے پوچھا۔

''نہیں۔''

رالف چند منٹوں تک شراب خانے کا جائزہ لیتا رہا پھر خلوت گاہ کی جانب چل دیا۔ اس کمرے کی ترتیب و آرائش سے وہ بہت متاثر ہوا۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں کے موضوع اور تکنیک سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ ان کا تعلق انیسویں صدی سے ہے۔ اسی طرح بیشتر کتابیں بھی زمانہ قدیم سے متعلق تھیں۔ اس نے متوفی کی شخصیت سے ان چیزوں کا موازنہ کیا تو اسے یہ سب کچھ بے جوڑ سا لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راجر جیسا آدمی اپنے آپ کو اچانک کیوں گولی مار سکتا ہے؟ اس نے ایک بار پھر پوری احتیاط سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے وہاں ایک لوہے کی پیٹی نظر آئی جس میں پرانی کتابیں اور رسالے رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس نے الماری کی تمام درازیں دیکھ ڈالیں جن میں کئی کاغذات اور خطوط رکھے ہوئے تھے۔ لیکن ایسا کوئی کاغذ نظر نہیں آیا جس میں اس نے اپنی خودکشی کے بارے میں کچھ لکھا ہو۔ ایک کونے میں سنک لگا ہوا تھا۔ نیچے فرش پر ایک ٹوکری میں اسے پلاسٹک کی پیالی نظر آئی۔ اس نے وہ پیالی اٹھائی اور اسے سونگھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی نبض اچانک ہی تیز ہوگئی ہو۔

رالف نے نارمن کو اپنے پاس بلایا اور پیالی دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے سونگھو۔''

نارمن نے ایک بار نہیں بلکہ دو بار سونگھا۔ اس کی بھویں تن گئیں اور وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو کڑوے بادام جیسی مہک ہے۔ یہ...''

''زہر بھی ہوسکتا ہے۔'' رالف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔ ''اب ہم اس معمے کے حل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ راجر بوتل کھولنے سے پہلے کلی کرنے کی غرض سے یہاں آیا۔ اس نے اس پلاسٹک کی پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور منہ صاف کر کے اس کا گھونٹ نگل لیا۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ زہر نگل چکا ہے۔''

نارمن اس کی تھیوری کے بارے میں سوچتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سائنائڈ تو تحلیل ہوجانے والی مائع ہے جس کا نقطۂ ابال اناسی ڈگری فارن ہائٹ سے ذرا سا کم ہوتا ہے۔''

''تمہارا خیال درست ہے لیکن یہ پیالی دوسری پیالی کے نیچے رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے محلول کے بھاپ بن کر اڑ جانے کا عمل سست ہوگیا اور راجر کی نظر بھی اس پر نہیں گئی کیونکہ یہ ایک بے رنگ محلول ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر...؟''

''پھر اسے احساس ہوا کہ وہ زہر پی چکا ہے جس کی ساٹھ گرام مقدار بھی آدمی کو مارنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ کتنی ہولناک موت ہوتی ہے۔ اس زہر کی وجہ سے خلیات میں آکسیجن کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے اور سانس لینا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اگر مقدار زیادہ ہو تو چند سیکنڈ میں موت واقع ہوجاتی ہے لیکن راجر کی پیالی میں اتنا زیادہ زہر نہیں تھا۔ اس نے اذیت ناک موت سے بچنے کے لیے دراز کھول کر اپنا پستول نکالا اور منہ میں اس کی نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ اس طرح اسے قتل کرنے کی کامیاب کوشش ہمارے سامنے خودکشی کی شکل میں آگئی۔''

''اوہ میرے خدا۔'' نارمن حیرت سے بولا۔ ''میں نے پہلے کبھی اس طرح کا واقعہ نہیں سنا۔ لیکن پیالی میں زہر کس نے ڈالا؟''

''یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔''

نارمن نے سر ہلایا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''بظاہر یہ بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اسے ہمیں چیلنج سمجھ کر قبول کرنا ہوگا۔ تم پہلے ہی ان لوگوں سے بات کرچکے ہو۔ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''کچھ خاص نہیں۔ ان سب کا یہی کہنا ہے کہ انہوں نے تہ خانے سے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ اس وقت آٹھ بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔ وہ تیزی سے نیچے کی جانب بھاگے لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ تہ خانے کا دروازہ

اندر سے بند ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ سمجھ گئے کہ کوئی حادثہ رونما ہو چکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔“

”جب تم نے انہیں بتایا کہ راجر ایلی نے خود کو گولی ماری ہے تو ان کا ردِعمل کیا تھا؟“

”وہ سب حیران رہ گئے اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ ان میں سے زیادہ تر کے چہرے صدمے سے زرد پڑ گئے اور ان کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ البتہ کلب کی سیکریٹری رتھ اسکوگن بے اختیار رونے لگی۔ اس کا کہنا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ اس کا ایک خاص تعلق تھا۔“

”یہ ایک دلچسپ انکشاف ہے لیکن کیا تم نے نائب صدر پیٹر ڈیل سے بھی بات کی جو آج کی میٹنگ میں شریک نہیں تھا؟“

”نہیں، ویسے بھی وہ رتھ اسکوگن کا سابق دوست ہے۔ یہ بات رتھ نے خود بتائی تھی اور جیسا کہ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ یہ تعلق محض لفظی نہیں تھا۔“

”اوہ، میں سمجھ گیا... اور یہ محض اتفاق ہے کہ پیٹر ڈیل ٹانگ میں تکلیف ہونے کی وجہ سے اس میٹنگ میں شریک نہ ہو سکا۔ کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ یہ لوگ اپنی گزر اوقات کس طرح کرتے ہیں؟“

”ہاں، میں نے اس سلسلے میں تمام معلومات جمع کر لی ہیں۔“ یہ کہہ کر نارمن نے ایک کاغذ رالف کی طرف بڑھا دیا جس پر لکھی ہوئی تفصیل کے مطابق راجر ایلی، یونیورسٹی میں لائبریرین تھا۔ کلب کی سیکریٹری رتھ اسکوگن پیشے کے لحاظ سے اکاؤنٹنٹ تھی۔ بقیہ اراکین میں ایک ڈاکٹر، ایک اخباری فوٹوگرافر، ایک کاروں کا سیلز مین، ایک پراپرٹی ایجنٹ، ایک ہوٹل کا مالک، ایک پیٹرولیم انجینئر اور ایک پائلٹ شامل تھے جبکہ پیٹر ڈیل، ہائی اسکول میں سائنس ٹیچر تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں لیونگ روم میں جا کر ان لوگوں سے ملتا ہوں۔ اس دوران میں تم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کیا واقعی پیٹر ڈیل، ٹانگ کی تکلیف میں مبتلا ہے۔“

”امید ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا۔“ نارمن نے کہا۔ ”البتہ تم یہاں کے معاملات دیکھتے رہنا۔“

انٹیل کلب کے آٹھوں اراکین بہترین لباس زیب تن کیے سٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی نگرانی پر ایک باوردی سپاہی مامور تھا۔ وہ سب ہی اس صورتِ حال سے پریشان نظر آ رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ عام لوگوں جیسے تھے اور ان میں کسی قسم کے غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ سائڈ بورڈ پر چاندی کی ٹرے میں آٹھ خالی کرسٹل کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایسا ہی ایک گلاس وہ راجر کی میز پر بھی دیکھ چکا تھا۔

”میں سراغ رساں انسپکٹر رالف ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ تصدیق کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ راجر ایلی نے اپنے ذاتی پستول سے خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا ہے۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور جیسا کہ آپ لوگوں کے علم میں ہے کہ ہمیں کمرے تک پہنچنے میں خاصی مشکل پیش آئی۔“

کلب کے اراکین نے اس خبر کو بڑے تحمل سے سنا۔ اس دوران وہ سر ہلاتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔ پھر ایک سنہری بالوں والا فربہ اندام شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ”میرا نام اول برائن ہے اور میں اس کلب کے بورڈ کا ممبر ہوں۔ میں اپنے تمام اراکین کی جانب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ راجر ایلی جیسے پُرجوش شخص نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ کیا پولیس اس سلسلے میں کچھ جانتی ہے؟“

”نہیں۔“ رالف نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ میں یہاں موجود نہ ہوتا۔ سب سے پہلے میں کلب کی سیکریٹری سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔“

ایک سیاہ بالوں اور گندمی رنگت والی عورت اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں ہی کلب کی سیکریٹری ہوں۔ میرا نام رتھ اسکوگن ہے۔“

”کیا تم میرے ساتھ کھانے کے کمرے تک چل سکو گی؟“

وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ رالف نے کہا۔ ”تم نے انسپکٹر نارمن کو بتایا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ تمہارے تعلقات تھے۔ کیا یہ صحیح ہے؟“

”ہاں، ہمارے درمیان بے ضرر سا تعلق تھا۔ راجر اور میں گزشتہ ایک ماہ سے ساتھ تھے لیکن میں کبھی اس کے ساتھ نہیں رہی۔“

”اور اس سے پہلے تم کلب کے نائب صدر پیٹر ڈیل سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہی تھیں؟“

”یہ سچ ہے۔“ اس نے اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اس طرح کے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہیں یقین نہیں کہ راجر نے خودکشی کی ہے؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں کہ اس نے پستول کی نال اپنے منہ میں رکھی اور اس کا ٹریگر دبا دیا۔“

رتھ نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس کا پُرسکون انداز اور خود اعتمادی رالف کو بے چین کر دینے کے لیے کافی تھی۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہ ایک سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہے۔ اس نے اسی لیے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا کہ کسی قسم کی مداخلت کا اندیشہ نہ رہے۔ بہرحال، یہ ایک ہولناک المیہ ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”واقعی؟“ رالف اسے کریدتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم کسی مزید سوال کا جواب نہیں دو گی؟ اس سے تو میں شک میں مبتلا ہو جاؤں گا کیونکہ ابھی مجھے تم سے مزید سوالات کرنے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہارے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ تم نے کئی بڑے کیس حل کیے ہیں لیکن کتنے کیس ایسے ہیں جو تم حل نہیں کر سکے۔“

”کئی ایک ہیں۔“ اس نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ اعتراف کیا۔ ”لیکن یہ بتاؤ کہ انٹیل جیسے کلب کیوں موجود ہیں؟“

”کیونکہ ایک جیسا ذہن اور مفادات رکھنے والے لوگوں کو اکٹھا ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے کراٹے کلب، کشتی رانی کا کلب اور ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے والوں کا کلب وغیرہ وغیرہ۔“

”لیکن ان کا تو ایک واضح مقصد ہوتا ہے۔ تم لوگ کس لیے اکٹھے ہوتے ہو؟“

”لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے ہم آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکچر سنتے، شطرنج کھیلتے اور مختلف موضوعات پر سیمینار منعقد کرتے ہیں اور ان تمام سرگرمیوں کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ ہمیں آپس میں مل بیٹھنے کا موقع ملے۔“

”اس کلب کا رکن بننے کا کیا طریقہ ہے؟“

”ہمارے اراکین کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر کسی رکن کی موت واقع ہو جائے یا کسی اور وجہ سے اس کی جگہ خالی ہو تو بورڈ ایک نئے رکن کی منظوری دے گا اور قابلیت کے لحاظ سے اس کا ٹیسٹ لیا جائے گا۔ اگر وہ شخص مطلوبہ ٹیسٹ پاس کر لیتا ہے تو پھر اس کی ذہانت کا امتحان لیا جائے گا۔ یہ گویا ایک طرح سے احتیاطی تدابیر ہے۔ بعض اوقات لوگ قسمت یا اتفاق سے پہلا ٹیسٹ پاس کر لیتے ہیں اسی لیے ذہانت کا امتحان ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ویسے ابھی تک ہمارے سبھی اراکین مقررہ معیار سے زیادہ ذہین ثابت ہوئے ہیں۔“

”اور وہ مقررہ معیار کیا ہے؟“

”اسے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔“

رالف چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”آج رات کا کیا پروگرام تھا؟“

”پیٹر ڈیل کو ایک خاص موضوع پر تقریر کرنا تھی اور وہ موضوع تھا ”کیا منطقی سوچ ایک کیمیائی عمل ہے؟“... بہرحال وہ اس میٹنگ میں شریک نہ ہو سکا۔ کیا تم نے اسے راجر کی موت کے بارے میں مطلع کر دیا ہے؟“

”انسپکٹر نارمن اسے بتانے کے لیے گیا ہے۔“

”بے چارہ پیٹر، اس پر راجر کی موت کا بہت اثر ہو گا۔ وہ اس کا بہترین دوست تھا۔ دونوں ہی عمدہ شراب کے شوقین تھے۔“

”واقعی؟“

رالف نے اگلا سوال کرنے سے پہلے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ”ایک بات بتاؤ، کیا کبھی کلب نے اس قسم کی چھان بین میں دلچسپی لی ہے جسے جرم کی زبان میں ’بند کمرے کا معما‘ کہا جاتا ہے۔“

”نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”کیونکہ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب میں خلوت گاہ میں داخل ہوا اور میں نے راجر کو مردہ حالت میں پایا۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اس نے خود ہی کمرا بند کر کے خودکشی کر لی تھی۔“

”کیا تمہیں اس پر شک ہے؟“

”ہاں، میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں۔ کیا کلب کا کوئی رکن راجر کو قتل کر سکتا ہے؟ مثلاً پیٹر ڈیل... کیونکہ تم نے اسے چھوڑ کر راجر سے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ کیا یہ جذبہ رقابت قتل کا محرک نہیں بن سکتا؟“

رتھ کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ ”یہ محض ایک مفروضہ ہے اور تم اصل مقصد سے ہٹ رہے ہو۔ ہم دونوں نے باہمی رضامندی اور خوش اسلوبی سے اپنا تعلق ختم کیا تھا اور پیٹر کے دل میں کوئی رنجش نہیں تھی۔“

”اگر ایسا ہے تو ہم دوسرے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ راجر بہت دولت مند شخص تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور اس کا کوئی وارث بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے انٹیل کلب کے حق میں کوئی وصیت چھوڑی ہو گی اور تم اس کی سیکریٹری ہونے کے ناتے اس بارے میں

کچھ جانتی ہوگی۔"

رتھ اسکوگن کسی حد تک پُرسکون نظر آنے لگی۔ اس نے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ سجاتے ہوئے رالف کو دیکھا اور بولی۔ "تمہارا خیال درست ہے اور وصیت میں جو کچھ لکھا ہے، میں اس کی تصدیق کرسکتی ہوں۔ راجر کی موت کی صورت میں کلب کے تمام اراکین اس کے وارث ہوں گے اور جیسا کہ تم نے بھی اندازہ لگالیا ہوگا کہ اس کے اثاثوں کی مالیت خاصی زیادہ ہے۔"

"اوہ، میں سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلب کے بقیہ نو اراکین کے پاس اسے قتل کرنے کا مقصد موجود تھا۔"

یہ سن کر رتھ پریشان ہوگئی اور بولی۔ "یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟ ہم سب حالتِ غم میں ہیں اور تم ہم پر ہی شک کررہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ راجر نے خودکشی کی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے لیکن میرے پاس دوسرے پہلو پر یقین کرنے کی وجہ موجود ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔"

رتھ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا اب ہم جاسکتے ہیں؟"

"نہیں، تم سب لوگوں کو ابھی رکنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ راجر نے بیکری سے سینڈوچز منگوائے تھے جو کچن کے فریج میں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو ہم ہلکا سا ناشتا کرلیں۔"

"اگر تمہیں بہت زیادہ بھوک لگی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے بھی اب یہ سب کچھ تم لوگوں کا ہی ہے۔"

"نہیں جب تک ہم پر قتل کا شبہ کیا جاتا رہے گا، یہ وصیت موثر نہیں ہوگی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن خیرسگالی کے طور پر میں تمہیں اپنی بھوک مٹانے کی اجازت دیتا ہوں۔"

رالف نے اس کے جانے کے بعد کلب کے بقیہ سات اراکین سے بھی پوچھ گچھ کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ لوگ صدمے اور افسوس کی حالت میں تھے۔ دیکھنے میں وہ نرم مزاج اور خاموش طبیعت کے لگتے تھے اور یوں نظر آتا تھا کہ انہیں صورتِ حال کا پوری طرح ادراک نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور ان کی اجتماعی خاموشی کسی منصوبہ بندی کا حصہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اس کی قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ لگا رہے تھے اور ان کے خیال میں وہ پولیس کا ایک ایسا نمائندہ تھا جس کی حیثیت سوال کرنے والی مشین سے زیادہ نہیں تھی اور وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

وہاں سے راجر کی لاش ہٹائی جاچکی تھی اور متعلقہ اہلکار بھی واپس چلے گئے تھے۔ رالف نے ایک بار پھر خلوت خانے کا جائزہ لیا۔ وہاں موجود کاغذات اور خطوط پر نظر ڈالی لیکن ان میں اسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ اسی دوران انسپکٹر نارمن ایک سنسنی خیز کہانی کے ساتھ واپس آگیا۔

"میں نے اس کے گھر کے باہر باغ میں کھڑے ہوکر ایک فائر کیا تو پیٹر ڈیل چیختا ہوا باہر آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری ٹانگ میں کوئی تکلیف نہیں ہے ورنہ اس طرح دوڑتے ہوئے باہر نہ آتے۔"

"اوہ۔" رالف مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم نے ثابت کردیا کہ پولیس والوں کے پاس بھی دماغ ہوتا ہے۔"

"بالکل۔" نارمن پُرسکون ہوتے ہوئے بولا۔ "اور جب میں نے اسے بتایا کہ راجر نے اپنے آپ کو گولی مارلی ہے تو وہ صدمے سے بے حال ہوگیا۔"

"کہیں وہ ایکٹنگ تو نہیں کررہا تھا؟"

"بظاہر تو ایسا نہیں لگتا۔ اس نے اقرار کیا کہ راجر اس کے انتہائی قریبی دوستوں میں سے تھا۔ پھر میں اس کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا جہاں مجھے ایک عورت نظر آئی۔ ان دونوں کی ملاقات حال ہی میں ایک پارٹی میں ہوئی تھی اور اسی لیے پیٹر نے کلب کی میٹنگ میں آنے کے بجائے اس کے ساتھ وقت گزارنے کو ترجیح دی۔ ٹانگ کی تکلیف تو محض ایک بہانہ تھا۔"

"اس کے علاوہ اس سے کچھ معلوم ہوا؟"

"کیوں نہیں۔ یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور رالف کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ اس مکان کی چابیاں ہیں اور اسی میں راجر کے کمرے کی چابی بھی ہے۔ راجر نے ہی پیٹر ڈیل سے کہا تھا کہ وہ اپنے پاس چابیوں کا ایک فالتو سیٹ رکھے۔"

"شاید اس لیے کہ مرنے والا اکیلا رہتا تھا اور ایسے لوگ اپنے دوستوں یا قریبی رشتے داروں کے پاس احتیاط کے طور پر گھر کی چابیاں رکھوا دیتے ہیں تاکہ اگر ان کی اپنی چابیاں گم ہوجائیں تو پریشانی نہ ہو۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے پیٹر سے اور بھی بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم سائنس ٹیچر ہو اس لیے کیمسٹری کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہو گے۔ اس نے کہا کہ یہ اس کا پسندیدہ مضمون ہے اور اس نے اپنے تہ خانے میں ایک چھوٹی سی تجربہ گاہ بنا رکھی ہے۔ میں نے اسے دیکھنے کی خواہش کی اور وہ مجھے تجربہ گاہ میں لے گیا اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی کلاس کے لیے یہیں تجربات کرتا ہے۔ میں نے اس تجربہ گاہ کا بغور جائزہ لیا تو ایک شیلف میں سائنائڈ کی بوتل نظر آگئی۔ اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

رالف چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "سب سے پہلے تو مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"مجھے تو یہ بالکل سیدھا سادہ کیس لگ رہا ہے اور ان حقائق کی روشنی میں تو پیٹر ڈیل ہی مجرم نظر آرہا ہے۔ اس نے بڑی عقل مندی سے اپنے آپ کو اس میٹنگ سے الگ کیا اور یہ انتظام بھی کرلیا کہ وہ اپنے گھر پر کسی کے ساتھ تھا۔ وہ عورت اس کی گواہی دے گی۔ اس کے باوجود کہ وہ گھر پر اپنی موجودگی ثابت کرے گا، ہمارے پاس اسے گرفتار کرنے کے لیے کافی مواد موجود ہے۔"

"نہیں۔" رالف نے کہا۔ "اس سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مجرم ہے۔ اگر وہ بے قصور نہ ہوتا تو تمہیں بھی چابیوں کا گچھا نہ دیتا اور نہ ہی اپنی تجربہ گاہ دکھاتا جہاں سائنائڈ رکھا ہوا تھا۔"

"کیونکہ وہ اپنے آپ کو دیانت دار ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے بھی اس کی ایک چال سمجھ لو۔ بہر حال، اس کی دیانت داری مشکوک ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس نے ٹانگ کی تکلیف کا بہانہ کیوں کیا؟"

"جہاں محبت شامل ہوجائے تو سفید جھوٹ بھی برداشت کرلیا جاتا ہے۔ اگر اس نے میٹنگ میں شرکت سے معذرت کی تو اس کے پاس اس کا جواز موجود تھا۔"

"واقعی؟" انسپکٹر نارمن تعجب سے بولا۔ "شاید تمہارے پاس کوئی اور ثبوت ہے۔ ممکن ہے کہ تمہیں کلب کے اراکین سے کوئی خاص بات معلوم ہوگئی ہو۔"

"فی الوقت تو کچھ معلوم نہیں ہوسکا لیکن میں نے اس گفتگو کے نتیجے میں ایک نظریہ قائم کیا ہے، اس کے صحیح یا غلط ثابت ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا کام ختم ہوچکا۔ اب ان لوگوں کو بھی گھر بھیج دینا چاہیے۔"

نارمن نے اسے گھورا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن اس نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا پھر لحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ شاید مجھے تمہیں بلانے پر افسوس ہورہا ہے۔"

"شاید۔" رالف نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ "شاید نہ بھی ہو۔"



## کل اور آج

☆ ...کل لوگ نمک اور دال سے روٹی کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے لیکن آج بریانی اور مٹن کھا کر کہتے ہیں "مزہ نہیں آیا۔"

☆ ... کل پردہ عورت کی زینت تھا اور آج کھڑکیوں اور دروازوں کی زینت ہے۔

☆ ... کل کھڑے ہوکر کھانا بدتمیزی سمجھا جاتا تھا لیکن آج فیشن سمجھا جاتا ہے۔

☆ ... کل لوگوں میں پیار تھا لیکن آج ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔

☆ ... کل لوگ سنت کو فروغ دیتے تھے اور آج فیشن کو فروغ دیتے ہیں۔

دو دن بعد رالف، انسپکٹر نارمن کے دفتر پہنچا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ثابت ہوگیا ہے کہ راجر کو سائنائڈ کی مہلک مقدار دی گئی تھی۔ بظاہر وہ گولی لگنے سے مرا ہے اور یہ بات تم پہلے سے جانتے ہو۔ جو نئی بات معلوم ہوئی وہ یہ کہ وہ مہلک سرطان میں مبتلا تھا اور اس کی تصدیق اس کے ذاتی معالج نے بھی کردی ہے۔ پندرہ دن پہلے ہی اس نے راجر کو بتایا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ زندہ رہ سکے گا۔"

"اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟"

"یہی کہ راجر نے دو مرتبہ خودکشی کی۔ پہلے اس نے پیالی میں زہر ڈال کر اس میں تھوڑا سا پانی ملایا اور اسے پینے کے بعد خود کو گولی مارلی تاکہ تکلیف دہ موت سے نجات حاصل کرسکے۔"

"اس کے لیے زہر پینے کی کیا ضرورت تھی؟ آسان موت مرنے کے لیے پستول کی گولی ہی کافی تھی۔"

"نہیں، ایسی صورت میں یہ ایک معمانہ بنتا اور پولیس اسے سیدھا سادہ خودکشی سمجھتی۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس نے جان بوجھ کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کی؟"

"میں یہ لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے ہمیں چیلنج کیا اور ہمیں ایک بند کمرے کے بھید میں الجھا دیا۔ ایٹیل کلب کے کسی رکن کو اس بارے میں نہیں بتایا گیا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پیٹر ڈیل کے نہ آنے سے راجر کا کام اور بھی آسان ہوگیا کیونکہ ڈیل کے پاس اس مکان کی چابیاں تھیں اور راجر اس کی تجربہ گاہ کے بارے میں بھی جانتا

تھا۔ ان حقائق کی موجودگی میں ہم غلط راستے پر بھٹکتے رہتے اور پیٹر ڈیل مشتبہ قرار پاتا لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے قصور ٹھہرا۔"

"پھر اس کے پاس سائنائڈ کہاں سے آیا؟"

"یقیناً پیٹر ڈیل اس کا ذمے دار نہیں ہے۔ راجر نے خود ہی کہیں سے اس کا بندوبست کیا ہوگا اور اس طرح اس نے اپنے منصوبے پر عمل کیا جس کے بارے میں کلب کے کسی رکن کو علم نہیں تھا۔"

"عجیب شخص تھا۔" نارمن تعجب سے بولا۔ "ویسے تو میرا پہلے بھی ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آئندہ ایسے نام نہاد ذہین لوگوں سے دور رہنے ہی کی کوشش کروں گا۔"

اس شام رالف اپنے گھر میں بیٹھا کیس کی فائل پڑھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے رتھ اسکوگن بول رہی تھی۔ "میں نے اس کیس کو حل کرنے پر مبارک باد دینے کے لیے تمہیں فون کیا ہے۔"

"شکریہ۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اول برائن اس کلب کا نیا صدر ہوگا جبکہ پیٹر ڈیل، میں اور بورڈ کے اراکین اپنے اپنے عہدوں پر کام کرتے رہیں گے۔"

"مبارک ہو۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

"شکریہ۔ میں ایک بات اور بتانا چاہ رہی ہوں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ کلب کا ایک ممبر کم ہو گیا ہے اور قانون کے مطابق کلب کے ہمیشہ دس اراکین ہونے چاہئیں۔ فی الوقت ایک جگہ خالی ہے۔ گزشتہ برس راجر نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ پولیس فورس کے ایک ذہین نمائندے کی موجودگی سے ہمارا کلب مضبوط ہو جائے گا اور تمام اراکین اس پر متفق ہو گئے تھے۔ لہٰذا میں نے تمہارا نام تجویز کر دیا ہے اور اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے مطلوبہ ٹیسٹ دینا ہوں گے؟"

"نہیں، ہم سب اس پر متفق ہیں کہ تمہیں اپنی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے پہلا ٹیسٹ دینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ذہانت کا امتحان دینا ہوگا اور ہمیں امید ہے کہ تم اتنے نمبر حاصل کر لو گے جو ممبر شپ کے لیے ضروری ہیں۔"

"تم لوگوں نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے تمہارا شکریہ۔ لیکن میں تمہاری پیشکش کو مسترد کرتا ہوں۔"

"واقعی... کیا میں اس کی وجہ معلوم کر سکتی ہوں؟"

"میں ایمانداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا کلب فطرت کے ساتھ ایک فریب ہے۔ انسانی جذبات اور احساسات کو کچل کر مشینی اور منطقی انداز میں فیصلے کرنے والے دانشوروں کی کھیپ تیار کی جائے جنہیں زمینی حقائق سے کوئی سروکار نہ ہو۔"

"کیا واقعی تم اس پر یقین رکھتے ہو؟" رتھ کی آواز سے جوش و جذبہ غائب ہو گیا تھا اور اس کی جگہ ناراضی نے لے لی تھی۔

"ہاں، مس رتھ...! میں واقعی ایسا سمجھتا ہوں۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا پھر وہ سرد لہجے میں بولی۔ "میں تم سے اسی جواب کی توقع کر رہی تھی لیکن یقین رکھو، ہم بہت جلد ایک مناسب امیدوار تلاش کر لیں گے۔ البتہ پولیس کے کسی فرد کے نام پر غور نہیں کیا جائے گا۔"

اس نے فون رکھ دیا۔ اب اسے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ پورا کلب ہی اس دھوکے میں شامل تھا اور ہر کوئی اپنی ذہانت کے بل بوتے پر پولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے پہلے ہی یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اچھا ہوا کہ اس نے کلب میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ذہانت کا امتحان دینے کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو ان کی طرح متقی، ترش رو اور دوسروں کو حقارت سے دیکھنے والا سمجھنے لگتا۔ کم از کم اس کا یہی تجربہ تھا۔ اسے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ کلب کے اراکین نے اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کا بھی قیمتی وقت ضائع کیا تھا اور اب وہ یقیناً اپنی مشکوک ذہانت کا جشن منا رہے ہوں گے۔

"لعنت ہے ان پر۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "ایک نہ ایک دن انہیں اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔"

لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور اس کے بغیر وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔ اس نے رتھ کا نمبر ملایا اور جذباتی لہجے میں بولا۔

"مس رتھ! مجھے تمہاری پیشکش منظور ہے۔"

یہی ایک طریقہ تھا جس کے ذریعے وہ ان ذہین مجرموں کے درمیان رہ کر ان کے جرائم کے ثبوت اکٹھے کرتا اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچاتا۔ اس بار اس کا مقابلہ ذہین لوگوں کے کلب سے تھا اور یہی اس کی ذہانت کا امتحان بھی تھا۔

◆◆◆



# زیرِ زمین

مریم کے خان

وحشی پن انسان کی جبلت کا حصہ ہے۔ جدت طرازی نے جہاں انسان کو ترقی کی بلند ترین منازل پر پہنچا دیا ہے... اور یہ وسیع دنیا سمٹ کر ایک بڑے گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے، وہیں اب بھی انسان اور اس کا وحشی پن کہیں بہروپ بدل کر تو کہیں اپنے اصل رنگ میں موجود ہے... مہذب و جدید دنیا سے دور ایک نئے ماحول اور نئے اطوار و آہنگ سے روشناس کراتی سنسنی خیز کہانی...

**نئی راہوں کی تلاش و جستجو میں سرگرداں وحشیوں کی مشتبہ کارروائیاں**

نیو یارک پولیس ڈپارٹمنٹ جسے مختصراً این وائی پی ڈی بھی کہا جاتا ہے، اس کے ایک میٹنگ روم میں شعبۂ جاسوسی کے چند اعلیٰ افسران کی میٹنگ جاری تھی۔ زیرِ نظر کیس ایک سب وے اسٹیشن سے ہونے والی پُراسرار گمشدگیاں تھیں۔ گزشتہ ایک سال میں گمشدگی کے کوئی ایک درجن کیسز کا سراغ بالآخر اس سب وے اسٹیشن سے جا کر ملا تھا۔ عام طور سے غائب ہونے والا شخص آخری بار یہیں دیکھا گیا تھا لیکن یہاں سے وہ کہاں گیا، اس کا کسی کو پتا نہیں

تھا۔ سب وے اسٹیشن کے کیمروں میں غائب ہونے والا مختلف پلیٹ فارمز کی طرف جاتا دکھائی دیتا یا دیتی تھی۔ اس سے آگے پولیس کچھ نہیں جان سکی تھی۔ سراغ رسانوں نے مختلف بھیس بدل کر ہفتوں سب وے اسٹیشن کے مختلف پلیٹ فارمز کی نگرانی کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پولیس کے سراغ رسانوں نے یہاں سے گزرنے والی ٹرینوں کو چیک کیا کہ کہیں ان میں مجرمانہ سرگرمیاں جاری نہ ہوں مگر ایسی بھی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ پولیس افسر ایڈمنڈ ریمے اپنے آدمیوں پر گرج برس رہا تھا۔

"یہ بات طے ہے کہ گمشدگیاں اسی سب وے اسٹیشن میں ہورہی ہیں لیکن پولیس نہ تو کسی گمشدگی کا سراغ لگا سکی اور نہ ہی کسی آدمی کو مشکوک قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجرم بہت چالاک ہیں یا سب وے میں کوئی برمودا ٹرائی اینگل بن گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پولیس درست طریقے سے تفتیش نہیں کررہی ہے۔ تم لوگوں کو اپنی کارکردگی بہتر بنانا ہوگی، اسی صورت میں تم مجرموں تک پہنچ سکو گے۔" بات مکمل کرکے اس نے میز پر مکا مارا۔

"ہم پوری کوشش کریں گے سر۔" کیس انچارج جوزف بائر نے کہا۔ وہ ادھیڑ عمر اور بھاری بھرکم شخص تھا۔ اسے پولیس میں بیس سال ہوگئے تھے اور اس کا شمار ڈپارٹمنٹ کے ذہین ترین افسران میں ہوتا تھا۔

"اسی میں پولیس کی بہتری ہے۔ اگر یہ معاملہ پریس تک پہنچ گیا تو سوچ سکتے ہو ہمارا کیا حال ہوگا؟" پولیس افسر نے میٹنگ برخاست کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

نواحی علاقے کے اس سب وے اسٹیشن میں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا..... صرف صبح اور شام کے اوقات میں دفتر آنے جانے والوں کا رش ہوتا تھا۔ ورنہ عام طور سے اس کے پلیٹ فارمز خالی پڑے رہتے تھے۔ خاص طور سے دوپہر اور رات آٹھ بجے کے بعد یہاں الّو بولتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ اسٹیشن خاصا معروف ہوتا تھا لیکن جب اس کے پاس ایک پرانے کاروباری علاقے کی قدیم عمارتیں گرا کر اسے پارک اور رہائشی علاقے میں بدلنے کا فیصلہ ہوا تو اس کی حیثیت کم ہوگئی اور اب یہ ایک نواحی اسٹیشن شمار ہوتا تھا۔ شہر میں ہونے والی ایک درجن گمشدگیوں کا سرا اسی اسٹیشن سے آکر ملا تھا جن میں آٹھ عورتیں اور چار مرد شامل تھے۔ وہ یہاں سے کہاں چلے گئے، اس کا کچھ سراغ نہیں ملا تھا۔ یہ سب افراد یا تو اس اسٹیشن پر اترنے والے تھے یا وہ یہاں سے کہیں اور جارہے تھے لیکن وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے اور غائب ہوگئے۔

ان ایک درجن افراد کی عمریں مختلف تھیں، ان میں ساٹھ سال سے لے کر بائیس سال تک عمروں کے افراد تھے۔ خواتین بائیس سے چالیس تک کی تھیں اور تقریباً تمام ہی اچھی شکل وصورت کی تھیں۔ اس سے پولیس کو شبہ ہوا کہ عورتوں کی گمشدگی میں جنس کا بھی عمل دخل ہے لیکن وہ اس نظریے کو ثابت نہیں کرسکی۔ درحقیقت پولیس کچھ ثابت نہیں کرسکی اگرچہ اس کے آدمیوں نے بہت محنت کی تھی اور کافی وقت سب وے اسٹیشن کی نگرانی میں صرف کیا تھا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔ پولیس افسر کا خیال تھا کہ مجرم پولیس افسران سے زیادہ ذہانت کا مظاہرہ کررہے تھے اس لیے وہ ناکام رہے تھے۔ اس لیے ریمے نے کیس کی تفتیش کرنے والے افسران کی میٹنگ بلا کر انہیں نئی حکمت عملی کے ساتھ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ نو بجے اسٹیشن نصف رات کا منظر پیش کررہا تھا۔ پلیٹ فارم نمبر نو کا آخری سب وے گارڈ جو ٹکٹ چیکنگ اور کسی کو بغیر گیٹ سے گزرے پلیٹ فارم پر جانے سے روکنے کے لیے موجود ہوتا تھا، اپنی ڈیوٹی ختم کرکے جارہا تھا۔ وہ ایک نوجوان اور اسمارٹ لڑکا تھا جو عام طور سے شام کی ڈیوٹی پر آتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد پلیٹ فارم پر ایک بوڑھی عورت کے سوا کوئی نہیں رہا تھا جو ایک طرف بینچ پر بیٹھی تھی اور اس نے ایک گدڑی نما کوٹ اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ کوئی بے گھر اور بھکاری عورت لگ رہی تھی۔ گارڈ نے جانے سے پہلے اس سے کہا۔

"مام! اب تم بھی جاؤ، یہاں کوئی نہیں رہے گا۔"

عورت نے اس کی بات کے جواب میں سر اٹھانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔ گارڈ چلا گیا اور اب وہاں صرف وہی عورت تھی۔ نو بجے کے بعد اس پلیٹ فارم پر صرف ایک ٹرین آتی تھی اور یہ ساڑھے دس بجے والی ٹرین تھی جو نیوجرسی تک جاتی تھی۔ اس پر شاذ ہی کوئی مسافر اس اسٹیشن سے بیٹھتا تھا۔ ابھی دس بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ اوپر سیڑھیوں سے کسی کی ہیل کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر پہلے دو عدد سڈول ٹانگیں نمودار ہوئیں جن کے اوپر اس موسم میں بھی منی اسکرٹ تھا۔ اسکرٹ کے اوپر فر کی بنی چست جیکٹ تھی۔ وہ تقریباً تیس برس کی بہت خوب صورت اور دلکش عورت تھی۔ اس کے سنہری بال اس کے شانوں پر لہرا





رہے تھے اور جیکٹ کی نصف آستینوں سے نکلے بازو سب وے اسٹیشن کی تیز روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ اس نے دونوں کلائیوں میں سرخ رنگ کے موٹے دھاتی کڑے پہن رکھے تھے۔ مختصر کپڑوں میں وہ سردی سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ ایڑیاں بجاتی وہ بوڑھی عورت کے ساتھ والی بینچ تک آئی اور بیٹھ گئی۔ اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگی۔ اس کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی ملازم پیشہ ہے اور اس وقت نو گھنٹے کی ڈیوٹی بھگتا کر آرہی ہے۔ وہ کسی تقریب میں جانے کے لیے ہر لحاظ سے تیار تھی۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا جو اس کے خوب صورت وجود کی بہترین نمائش کررہا تھا۔

بوڑھی عورت نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی اس نے آنے والی عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا لیکن ایسا لگ رہا تھا، وہ اسے دیکھ چکی ہے اس کے وجود سے بے خبر نہیں ہے۔ آئینے میں اپنا معائنہ کرکے عورت نے آئینہ پرس میں رکھا اور پلیٹ فارم کے اوپر لگی گھڑی کی طرف دیکھا..... ابھی ساڑھے دس بجنے میں بہت وقت تھا۔ اس نے پشت بینچ سے لگالی اور اپنی ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلا لیں۔ یہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ کھل کر بیٹھی تھی۔ ایک دو بار اس نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ سب وے اسٹیشن کے اندر کا ماحول خوش گوار تھا اور یہاں باہر کی سردی کا نام ونشان نہیں تھا۔ دس بجنے پر گھڑی نے دس کا گھنٹا بجایا اور جیسے ہی گھنٹے کی گونج ختم ہوئی، سیڑھیوں کی طرف سے بھاری جوتوں کی آہٹ سنائی دی..... یہ ایک سے زیادہ افراد تھے۔

بوڑھی عورت نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن جوان عورت چوکنا ہوگئی۔ وہ جلدی سے سیدھی ہوکر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا اسکرٹ کھینچ کر ممکن حد تک نیچے کرلیا لیکن ابھی بھی اس کی نصف ٹانگیں نمایاں تھیں۔ سیڑھیوں سے دو مردانہ جوتوں کے جوڑے نمودار ہوئے۔ ان کے اوپر بھاری جینز کی پتلونیں تھیں اور پھر دو جوان لڑکے لیدر جیکٹس میں نمودار ہوئے۔ وہ حلیے سے اوباش نظر آرہے تھے۔ ایک کے چہرے پر کٹ کا نشان تھا جبکہ دوسرے کے سر پر مشین پھری ہوئی تھی اور صرف درمیان میں کھڑے بالوں کی لکیر تھی۔ انہوں نے نیچے آکر پلیٹ فارم کا معائنہ کیا اور پھر جوان عورت کو دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ عقب سے ہی اندازہ کرچکے تھے کہ وہ کیا قیامت ہوگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلایا اور پھر اس عورت والی بینچ کی طرف بڑھ گئے۔ حالانکہ پلیٹ فارم پر کئی بینچیں خالی پڑی تھیں۔

"بے بی! ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟" کھڑے بالوں والے نے ذرا جھک کر کہا۔ اس کی نظریں عورت کی ٹانگوں پر تھیں۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا اور بولی۔

"یہاں اور بینچیں بھی ہیں۔"

کھڑے بالوں والا ڈھٹائی سے ہنسا۔ "ہاں..... لیکن ہم نے سوچا تم اکیلے بور ہورہی ہوگی۔"

"تمہیں کمپنی کی ضرورت ہے؟" دوسرے نے کہا۔

"مجھے کمپنی کی ضرورت نہیں ہے۔" عورت نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور شانے اچکا کر دوسری بینچ کی طرف چلے گئے۔ عورت نے سنا، ان میں سے کسی نے زیرِ لب اسے کتیا کہا تھا لیکن وہ اندازہ نہیں کرسکی کہ کس نے کہا ہے۔ بہرحال، یہی غنیمت تھا کہ وہ اس کی جان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جوان عورت اب بے چین نظر آنے لگی۔ وہ بار بار پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دس بج کر پانچ منٹ ہونے والے تھے۔ ان لڑکوں کے آنے کے بعد اس کا سارا اطمینان اور سکون کافور ہوگیا۔ وہ سکڑ سمٹ کر بیٹھی تھی۔ دوسری بینچ پر ہونے کے باوجود لڑکوں کی نظریں اس کے وجود میں گڑی جارہی تھیں۔

بوڑھی عورت بدستور ساکت بیٹھی تھی۔ جب دونوں لڑکے اس سے بات کررہے تھے، تب بھی اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور اسی طرح اپنی گدڑی میں سمٹی بیٹھی رہی۔ لڑکے اب بلند آواز سے گفتگو کررہے تھے اور ان کی باتیں فحاشی کے زمرے میں آتی تھیں۔ جوان عورت کے چہرے پر ناگواری تھی لیکن اس نے نظر اٹھا کر ان دونوں کی طرف نہیں دیکھا۔ ویسے وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ دونوں اسے ہی یہ گفتگو سنا رہے ہیں اور شاید اس طرح اس کے انکار کا بدلہ لے رہے تھے مگر عورت کو شاید ان کی گفتگو پر اعتراض نہیں تھا یہی بہت تھا کہ وہ اسے عملی طور پر تنگ نہیں کررہے تھے۔

پھر لڑکوں کی آوازیں مدھم پڑگئیں..... ایسا لگا جیسے وہ کسی بات پر بحث کررہے ہوں۔ عورت چوکنا ہوگئی اور پہلی بار اس کے چہرے پر خوف وہراس نمایاں ہوا۔ اس نے چور نظروں سے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں بات کررہے تھے اور ان کی آواز اتنی مدھم ہوگئی تھی کہ الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ عورت نے اپنا پرس گود میں رکھ لیا اور اسے یوں کس کر پکڑ لیا جیسے اسے خدشہ ہو کہ وہ اس کا پرس چھین کر لے جانا چاہتے ہوں۔ وہ اب ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اچانک اسے وہ

دونوں اپنے سر پر کھڑے نظر آئے۔ ان کی پُر ہوس نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں، وہ ہکلائی۔
"کک..... کیا بات ہے؟"
"بے بی! کیا تم ہمارے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارنا پسند کروگی؟" کھڑے بالوں والا بولا۔
"کیا..... بکواس کر رہے ہو؟" عورت کانپتی آواز میں بولی اور کھڑی ہوگئی۔ لڑکوں نے فوراً اسے دبوچ لیا، وہ چلّائی۔ "چھوڑو مجھے۔"
لیکن لڑکے اس کی چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر اسے کھینچ کر پلیٹ فارم کے ایک طرف بنے کاؤنٹر کی طرف لے جانے لگے۔ دن میں یہاں ٹکٹ کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی ملتا تھا لیکن اس وقت کاؤنٹر خالی تھا۔ جوان عورت ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور خود کو ان لفنگوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے اسے ہاتھوں اور پیروں سے قابو کر کے عملاً ہوا میں اٹھا رکھا تھا۔ اس کا پرس وہیں بینچ کے پاس گر گیا تھا اور کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ بوڑھی عورت اس ہنگامے اور شور سے بے پروا ویسے ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب لڑکے عورت کو کاؤنٹر والے حصے تک لے گئے تو اس نے چلّا کر بوڑھی عورت سے کہا۔
"تم دیکھ رہی ہو..... میری مدد کرو..... پلیز! پولیس کو بلاؤ۔"
لیکن بوڑھی عورت نے گویا سنا ہی نہیں اور لڑکے اسے کاؤنٹر کے عقب میں لے گئے۔ انہوں نے اسے زمین پر پٹخ دیا۔ عورت کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں اور لڑکے جانوروں جیسی آوازیں نکال رہے تھے۔ رفتہ رفتہ عورت کی چیخیں سسکیوں میں بدل گئیں۔ انہوں نے شاید اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اب پلیٹ فارم پر چیخوں کا شور نہیں تھا لیکن اس کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ بوڑھی عورت بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ تقریباً بیس منٹ بعد جوان عورت کاؤنٹر کے عقب سے لڑکھڑاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ اس پر کیا گزر چکی ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور میک اپ تباہ ہوگیا تھا۔ مختصر لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ وہ قدم گھسیٹتی ہوئی بینچ تک آئی اور اس پر ڈھیر ہو کر سسکیاں لینے لگی۔ اس کے بازو پر خراشوں کے نشان تھے۔
وہ ذرا سنبھل کر بیٹھی تو اس کی نظر اپنے گرے ہوئے پرس پر گئی۔ اس نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے بیگ سے ٹشو نکال کر آنسو اور چہرہ صاف کیا اور بال ٹھیک کرنے لگی۔ لڑکے ابھی تک کاؤنٹر کے پیچھے تھے۔ انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا اور اب انہیں عورت کی پروا نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی بیلٹیں باندھتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے استہزائیہ نظروں سے جوان عورت کی طرف دیکھا اور پھر اسی بینچ پر آگئے جہاں وہ کچھ دیر پہلے بیٹھے تھے۔ ان کے انداز میں شرمندگی کے بجائے خوشی کا عالم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ ان کے آنے سے عورت سہم گئی۔ وہ انہیں یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ درندے ہوں اور کسی لمحے بھی دوبارہ اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ اس کے اس انداز سے دیکھنے پر وہ اور خوش ہوگئے اور واہیات اشارے کرنے لگے۔ ٹرین آنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اچانک کھڑے بالوں والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔
"ایک اور ٹرپ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
یہ سنتے ہی جوان عورت اٹھی اور تیزی سے بوڑھی عورت کی طرف آئی۔ اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "ام! مجھے ان درندوں سے بچالو۔"
عورت نے پہلی بار سر اوپر کیا، وہ بہت بوڑھی تھی..... اس کا چہرہ جیسے سوکھی جھریوں سے بنا ہوا تھا۔ آنکھیں گدلی ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا۔ اس دوران میں لڑکے پھر کھڑے ہوگئے۔ ان کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ جوان عورت نے بڑھیا کو جھنجوڑ ڈالا۔ "خدا کے لیے مجھے ان سے بچاؤ ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔"
شاید خودکشی کی دھمکی کا بڑھیا پر اثر ہوا تھا، اس بار وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سرگوشی نما آواز میں بولی۔ "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"
"پلیز مام۔" عورت گھگیائی۔ "وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔"
واقعی لڑکے اسی طرف آرہے تھے اور اس بار ان کے تیور زیادہ خطرناک تھے۔ وہ شاید عورت کو لوٹنے اور اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ورنہ پولیس تک بات جانے کی صورت میں انہیں کئی سال جیل میں گزارنے پڑتے۔ بڑھیا نے چونک کر لڑکوں کی طرف دیکھا اور اس بار اسے بھی خطرے کا احساس ہوگیا۔ اگر وہ عورت کو لوٹنے اور قتل کرنے آرہے تھے تو عینی گواہ کی حیثیت سے اسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی خیال نے بڑھیا کو حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے عورت سے کہا۔
"میرے ساتھ آؤ۔"





"کہاں؟" عورت چلتے ہوئے بولی۔ بڑھیا اپنی عمر سے قطع نظر بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔
"سوال مت کرو۔ اگر ان سے بچنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ آؤ۔"
بڑھیا کا رخ پلیٹ فارم کے آخری سرے کی طرف تھا لیکن اس طرف کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہاں، وہ پلیٹ فارم سے اتر کر پٹری پر جا سکتے تھے لیکن ایسا کرنا بہت خطرناک ہوسکتا تھا، ٹرین آنے والی تھی اور وہ کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔ عورت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بڑھیا اسے کہاں لے جارہی ہے۔ دونوں لڑکے بھی تیزی سے ان کے پیچھے آرہے تھے۔ ابھی وہ فاصلے پر تھے۔ عورت کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ بڑھیا اسے کہاں لے جارہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔
"مام! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"
"ابھی دکھاتی ہوں۔" بڑھیا اسے پلیٹ فارم کے سرے تک لے آئی۔ یہاں سے لکڑی کی بنی مختصر سی سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں اور پٹریوں کے ساتھ بس اتنی جگہ تھی کہ ٹرین آنے کی صورت میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہوا جا سکے، اسی صورت میں جان بچ سکتی تھی۔ بڑھیا نے اس کی طرف دیکھا۔ "ہمیں نیچے جانا ہوگا۔"
"نہیں۔" عورت سہم گئی۔ "ٹرین آنے والی ہے۔"
"اگر ان سے بچنا چاہتی ہو تو میری بات مانو۔" بڑھیا نے بدمزاجی سے کہا۔ "ورنہ چلی جاؤ ان کے پاس..... اس بار یہ تمہیں اور مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"
عورت اب کسی صورت ان درندوں کو دوسرا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ بڑھیا اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس نے کہا۔ "جلدی کرو، وقت کم ہے۔"
جوان عورت ہچکچاتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتری پھر اس نے سہارا دے کر بڑھیا کو نیچے اتارا۔ بڑھیا نے پلٹ کر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی ان سے کچھ دور کھڑے تھے اور شاید منتظر تھے کہ اب وہ کیا کرتی ہیں۔ بڑھیا نے آہستہ سے عورت سے کہا۔ "میری نظر کمزور ہے، کیا تم پلیٹ فارم کی گھڑی میں وقت دیکھ سکتی ہو؟"
عورت نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "دس بج کر انتیس منٹ ہو رہے ہیں۔"
بڑھیا نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے ٹرین آنے والی ہے۔"
"ٹرین.....!" عورت گھبرا گئی۔ "اس طرح تو ہم مارے جائیں گے۔"
"تم فکر مت کرو، بس میرے کہنے پر عمل کرتی رہو۔"
"جب یہ درندے میری عزت برباد کر رہے تھے، تب تم نے کچھ کیوں نہیں کیا؟" عورت نے شکوہ کیا۔
"میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔" بڑھیا نے آہستہ سے کہا۔ "اس وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا جس سے مدد طلب کی جائے اور میری ان دونوں کے مقابلے میں کوئی اوقات نہیں ہے، جب تم جیسی جوان اور مضبوط عورت ان کا مقابلہ نہیں کر سکی۔"
بڑھیا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر یہاں آس پاس کوئی ہوتا تو یہ لڑکے اتنی دیدہ دلیری سے اس پر نہ جھپٹ پڑتے اور اسے یوں زیادتی کا نشانہ نہ بناتے۔ کسی کی موجودگی نہ پاکر ہی وہ اس حد تک چلے گئے تھے بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد بھی اطمینان سے وہیں موجود تھے۔ اب لگ رہا تھا کہ وہ اسے ٹھکانے لگانا چاہتے ہوں۔ شاید وہ ساڑھے دس بجے والی ٹرین کا سوچ کر رکے ہوئے تھے۔ ورنہ اپنے ارادے پر عمل درآمد بھی کر چکے ہوتے۔ اسی لمحے سرنگ میں شور ہوا، ٹرین آرہی تھی۔ پٹریاں اور آس پاس کی زمین لرزنے لگی۔
"جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو، ہم پٹری پار کر کے دوسری طرف چلے جائیں گے۔" بڑھیا نے آہستہ سے کہا۔ لڑکے اتنی دور تھے کہ اس کی یا عورت کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ عورت نے سر ہلایا، وہ کسی حد تک بڑھیا کا مقصد بھانپ گئی تھی۔ پٹری کے دوسری طرف وہ اس وقت تک کے لیے ان لڑکوں سے محفوظ ہو جاتے جب تک ٹرین نہیاں ہوتی۔ اتنی دیر میں وہ کسی محفوظ مقام تک پہنچ سکتی تھیں۔ جیسے ہی پلیٹ فارم پر پہلا ڈبا نمودار ہوا، بڑھیا نے عورت کا ہاتھ تھام کر قدم آگے بڑھایا اور وہ دونوں پٹری پار کر گئیں۔ لڑکوں کو ان کا مقصد ذرا دیر سے سمجھ میں آیا۔ وہ ان کی طرف لپکے لیکن ان کی آمد سے پہلے ہی ٹرین پلیٹ فارم کی دوسری طرف جا پہنچی تھی اور اب اترنے کا راستہ بند تھا۔ عورت فکر مند ہوگئی کیونکہ اس طرف کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔
"اب ہم کہاں جائیں گے؟"
"فکر مت کرو، آؤ میرے ساتھ۔" بڑھیا بولی اور اس کا ہاتھ تھام کر آگے چلنے لگی۔ اس بار اس کی رفتار خاصی تیز تھی اور وہ اس ناہموار زمین پر تیزی سے چلی جارہی تھی جبکہ عورت کو اپنی اونچی ایڑی کی جوتی کی وجہ سے خاصی مشکل ہو رہی تھی۔ کئی بار وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"مجھ سے اس طرح نہیں چلا جا رہا۔"

''سینڈل اتار دو۔ ٹرین بس جانے والی ہے، اس کے بعد وہ ہمارے پیچھے آئیں گے اور یہاں ہمیں بہت آسانی سے قتل کر دیں گے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

بڑھیا ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ سرنگ میں خاصا آگے نکل آئی تھیں۔ یہاں دونوں لفنگے نہایت سکون سے بغیر کسی کی مداخلت کے ان سے نمٹ سکتے تھے۔ مجبوراً اس نے سینڈل اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور ننگے پاؤں چلنے لگی۔ اس طرح وہ لڑکھڑا تو نہیں رہی تھی لیکن زمین پر بچھے پتھر اس کے پیروں میں چبھ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی روشنیاں اب دور رہ گئی تھیں اور کچھ دیر بعد ٹرین ان کے برابر سے گرجتی ہوئی گزری تھی۔ بڑھیا بولی۔

''تیز چلو، وہ بھی نیچے آ گئے ہوں گے۔ ان کے پیروں میں جوتے ہیں، وہ یہاں دوڑ بھی سکتے ہیں۔''

عورت بڑھیا کا ساتھ دینے کے لیے دوڑ رہی تھی، وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اگر اسی طرح دوڑتے رہے تو وہ بالآخر ہمیں پکڑ لیں گے۔''

''بس کچھ دور اور ۔۔۔ پھر ہم محفوظ ہو جائیں گے۔''

عورت بھاگتے ہوئے بار بار مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں لڑکے ان تک نہ پہنچ جائیں۔ پھر اس نے سرنگ کی گھومتی دیواروں پر سائے نمودار ہوتے دیکھے اور بڑھیا سے بولی۔ ''وہ آ گئے ہیں، جلدی کرو۔''

''بس ہم پہنچ گئے۔'' بڑھیا بولی اور رک کر زمین پر بیٹھتے ہوئے کچھ ٹٹولنے لگی۔ پھر اس نے ایک فولادی تختہ زمین سے اوپر اٹھایا۔ یہ قبضوں کی مدد سے زمین میں لگا ہوا تھا اور بالکل بھی نہیں پتا چل رہا تھا کہ یہاں زمین میں کوئی فولادی تختہ موجود ہے۔ یہاں مستقل آئل گرتے رہنے سے زمین ایک جیسی ہو رہی تھی۔ بڑھیا نے تختہ اٹھاتے ہوئے عورت سے کہا۔ ''چلو.... جلدی اترو۔''

''یہ.... کیا ہے؟''

''ایک سرنگ ہے.... ہمیں ایک دوسری جگہ جا کر نکالے گی۔'' بڑھیا نے کہا اور پیچھے دیکھا۔ ''جلدی کرو، اگر انہوں نے دیکھ لیا تو اس میں بھی ہمارے پیچھے آ جائیں گے۔''

لڑکوں کے قدموں کی آواز سرنگ میں گونج رہی تھی۔ وہ ان کے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ عورت اندر اتر گئی۔ یہ مشکل سے چار فٹ اونچی اور شاید تین فٹ چوڑی سرنگ تھی۔ اس کے بعد بڑھیا بھی اتر آئی اور اس نے تختہ بند کر دیا۔ اندر گھپ اندھیرا ہو گیا تھا لیکن فوراً ہی بڑھیا نے کہیں سے ایک چھوٹی سی ٹارچ برآمد کر کے جلائی اور اس کی روشنی میں آگے چلنے لگی۔ عورت اس کے پیچھے تھی، اس نے پوچھا۔

''تمہیں اس سرنگ کا کیسے پتا ہے؟''

''میں یہیں رہتی ہوں۔'' بڑھیا بولی۔

''یہاں.... اس تاریکی اور گھٹن میں؟''

''یہ میرا گھر ہے.... لیکن نہیں، یہ تو راستہ ہے۔ گھر میرا کہیں اور ہے۔''

''تم نے کہا تھا ہم کہیں اور جا کر نکلیں گے؟''

''ہاں، بس نکلنے والے ہیں۔ یہ لو آ گیا۔''

اس بار سرنگ کا راستہ اوپر نہیں بلکہ نیچے نکلا تھا۔ اس کا دہانہ ایک ریل سرنگ میں نکل رہا تھا۔ وہ چار فٹ نیچے زمین پر کودے۔ یہاں روشنی تھی لیکن سرنگ استعمال میں نہیں تھی کیونکہ پٹری پر جا بجا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ بڑھیا نے کہا۔ ''یہ متروک سرنگ ہے۔ یہاں اس سے بھی پرانی متروک سرنگیں ہیں۔''

''پرانی سرنگیں!'' عورت نے حیرت سے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے، نیچے بس وہی سرنگیں ہیں جن میں ٹرین چلتی ہے۔''

''یہ تمہاری اور بہت سارے دوسرے لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ نیویارک میں زیر زمین ٹرینیں آج سے کوئی ایک صدی پہلے چلنا شروع ہوئی تھیں۔ میرا باپ اس ریل نیٹ ورک کو بنانے والے کارکنوں میں سے ایک تھا اور میرا بچپن انہی سرنگوں میں کھیلتے گزرا ہے۔ آج بھی یہ سرنگیں مجھے پناہ دیے ہوئے ہیں۔ جو سرنگیں میرے باپ اور اس کے ساتھیوں نے بنائی تھیں، وہ تیس سال بعد متروک ہو گئی تھیں کیونکہ شہر اوپر جا چکا تھا۔ پھر ریل نیٹ ورک کے لیے دوسری سرنگیں بنیں۔ نیٹ ورک وسیع ہوا اور تیسری بار سرنگیں بنیں۔ ہر بار اوپر تلے بے شمار سرنگیں بنیں۔ غلط پلاننگ کی وجہ سے پہلے بنائی جانے والی بہت ساری سرنگوں کو استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ ایسا ہی دوسری اور تیسری بار بھی ہوا۔'' بڑھیا بولتے ہوئے آگے چل رہی تھی۔ وہ ایک جگہ پہنچے جہاں سیڑھیاں تھیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو عورت دنگ رہ گئی کیونکہ یہ بھی ایک سرنگ تھی۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نیویارک کی کوئی شاہراہ ہو۔ وہاں بہت سارے لوگ آ جا رہے تھے اور ان کے حلیے اور لباس عجیب و غریب تھے۔ یہاں سردی اور نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ آتے جاتے یہ لوگ جن میں زیادہ تر مرد تھے، اسے گھور رہے تھے۔ عورت نے گھبرا کر بڑھیا سے کہا۔





''سنو.... مجھے واپس پہنچا دو۔ میرا خیال ہے وہ لڑکے مایوس ہو کر چلے گئے ہوں گے۔''

''تم فکر مت کرو، میں تمہیں اپنے ٹھکانے پر لے جا رہی ہوں۔ کچھ دیر تم آرام کرنا اور اپنی حالت بہتر بنانا۔ پھر میں تمہیں اوپر پہنچا دوں گی۔''

عورت خوف زدہ اور حیران تھی جیسے اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہو کہ نیویارک شہر کے نیچے بھی ایک شہر ہو گا۔ اسے یہاں باقاعدہ گلیاں اور راستے بنے نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں کام ہو رہا تھا۔ ایک گلی میں لوگ زمین پر چیزیں بکھیر کر خرید و فروخت کر رہے تھے۔ حد یہ کہ اسے ایک نوجوان لڑکا سرنگ میں بائیک دوڑاتا دکھائی دیا۔ اس نے نوٹ کیا کہ یہاں عورتیں بہت کم ہیں اور جو ہیں، وہ اپنے حلیوں اور انداز سے ہی طوائف لگ رہی تھیں۔ اسے ایک جگہ ایسی ہی چند عورتیں جمع نظر آئیں اور انہوں نے اسے دیکھ کر نہایت واہیات فقرے کسے۔

وہ سرنگ در سرنگ گزر رہے تھے اور عورت کا خیال تھا کہ وہ زمین میں خاصی گہرائی میں آ چکے تھے۔ اس نے بڑھیا سے کہا۔ ''تمہارا ٹھکانا اور کتنی گہرائی میں ہے؟''

بڑھیا چلتے چلتے رک گئی اور اس کی طرف دیکھا۔ ''تو تمہیں معلوم ہے ہم گہرائی میں جا رہے ہیں؟''

''ہاں، ہم اتنی سرنگوں سے گزر کر آئے ہیں اور ہر سرنگ دوسری سے نیچے ہی ثابت ہوتی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے ہم کئی سو فٹ گہرائی میں اتر چکے ہیں۔''

بڑھیا نے سر ہلایا۔ ''تمہارا خیال درست ہے۔''

''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شہر کے نیچے بھی پورا ایک شہر آباد ہو گا۔ یہاں کتنے لوگ ہیں؟''

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس اپنے گھر نہیں ہیں اور وہ ان سرنگوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔''

عورت کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''مجھے تو دوسرا چکر لگ رہا ہے۔ یہ جرائم پیشہ لگ رہے ہیں اور قانون سے بچنے کے لیے یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ بھلا پولیس یا انتظامیہ کو کیا معلوم کہ زمین کے نیچے بھی ایسی جگہ ہے جہاں لوگ چھپ سکتے ہیں۔''

بڑھیا ایک بار پھر چلتے چلتے رک گئی اور اس نے خوفناک نظروں سے عورت کو گھورا۔ ''فضول باتوں سے گریز کرو۔ اگر کسی نے سن لیا تو ۔۔۔'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ایسی سرنگ میں داخل ہوئی جس کے دونوں طرف کھدائی کر کے کمرے بنائے گئے تھے۔ ان

میں نائٹ کلب، بارز اور کال گرل شو روم قائم تھے۔اس جگہ داخل ہونے سے پہلے انہیں دو بدمعاش ٹائپ کے لوگوں نے روکا اور جب بڑھیا نے اپنا چہرہ دکھایا تو انہوں نے انہیں جانے دیا۔عورت کی گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔

''سنو، یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟''

''بکواس مت کرو۔'' بڑھیا اس بار بدلے ہوئے لہجے میں غرائی۔ ''خاموشی سے چلتی رہو۔''

عورت سہم گئی۔ بڑھیا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور تقریباً کھینچ کر اسے لے جانے لگی۔اس وقت عورت کو اندازہ ہوا کہ اس کے اندر خاصی جان ہے اور وہ بڑھیا ضرور ہے لیکن کمزور نہیں ہے۔وہ بے بسی سے اس کے ساتھ کھنچی چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ سرنگ کے ایک توسیع شدہ حصے میں داخل ہوئیں۔اندر آنے پر یہ جگہ ایک نائٹ کلب ثابت ہوئی تھی۔ بڑھیا اسے لے کر فلور سے گزرتی ہوئی ایک سجے سجائے کمرے میں آئی اور عورت کو ایک طرف دھکیل دیا۔وہاں تین ہٹے کٹے اور صورت سے بدمعاش نظر آنے والے مرد بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے سرد نظروں سے عورت کا جائزہ لیا۔ان میں سے ایک نے بڑھیا سے کہا۔''اس بار تم اچھی چیز لائی ہو، پچھلی بار اپنی جیسی بڑھیا اٹھا لائی تھیں۔ دو مہینے بھی نہیں چل سکی تھی۔''

''اسی لیے میں اس بار دو ہزار لوں گی۔'' بڑھیا نے کہا۔

''یہ ---- یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' عورت ہکلائی۔''تم مجھے ان کے ہاتھ بیچ رہی ہو؟''

''تم خاموش رہو۔'' بولنے والا مرد غرایا۔''نہیں، دو ہزار زیادہ ہیں۔ایک ہزار دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں اسے جیک کے پاس لے جاتی ہوں۔ وہ خوشی سے مجھے دو ہزار دے گا۔ایسی چیز کسی کے پاس نہیں ہوگی۔''

''تم مجھے اغوا کرکے لائی ہو۔'' عورت تیز لہجے میں بولی۔''اس سب وے پر غائب ہونے والے لوگوں کو تم ہی اغوا کرتی ہو۔''

بڑھیا نے اچانک اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔وہ لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے جا لگی۔ مرد نے قہقہہ لگایا۔''اس کی زبان دیکھ رہی ہو، یہ آسانی سے کام کے لیے راضی نہیں ہوگی۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ یہ بتاؤ دو ہزار دے رہے ہو یا میں اسے جیک کے پاس لے جاؤں؟''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' عورت چلائی۔

مرد نے پھر قہقہہ لگایا۔''مجھے اس کی یہ بات پسند آئی ہے۔ یہ کہیں نہیں جائے گی، یہیں رہے گی اور میرے لیے نوٹ کمائے گی۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں اس کے دو ہزار دوں گا۔''

''نہیں۔'' عورت چیخ اٹھی۔

بڑھیا نے ایک بار پھر اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن اس بار عورت نے حیرت انگیز پھرتی سے اس کا وار خالی جانے دیا اور جھک کر بڑھیا کو اپنے شانے پر اٹھاتے ہوئے دیوار کی طرف پھینک دیا۔ وہ تقریباً اڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی اور ایک کریہہ چیخ کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ جتنی دیر میں وہ تینوں آدمی سنبھلتے، عورت نے کہیں سے ایک چھوٹا لیکن خطرناک پستول برآمد کرکے ان پر تان لیا۔ پھر اس نے اپنی بائیں کلائی پر موجود موٹے سے کڑے کو منہ کے پاس لا کر کہا۔ ''تم لوگ کہاں ہو؟ میں نے یہاں صورتِ حال قابو میں کر لی ہے۔''

کڑے سے آواز آئی۔''ہم پاس ہی ہیں، بس راستہ کلیئر کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا تم گیس ماسک پہن لو۔''

عورت نے ایک طرف ہو کر تینوں مردوں سے کہا۔ ''اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر اوندھے منہ نیچے لیٹ جاؤ۔ کسی نے کوئی اور حرکت کی تو میں سر میں سوراخ کر دوں گی۔''

عورت کا لہجہ نپا تلا اور سرد تھا۔انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس کے حکم کی تعمیل کریں۔ بڑھیا تو ایک ہی چوٹ کھا کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود عورت نے اپنے پرس سے ایک چھوٹی سی ہتھکڑی برآمد کرکے اسے پہنا دی اور پھر پرس ہی سے ایک ایسا گیس ماسک نکال کر پہن لیا جو صرف ناک اور منہ کو چھپاتا تھا۔ مرد خاموش تھے اور شاید بھاگ نکلنے کی فکر میں تھے لیکن جیسے ہی ان میں سے ایک دروازے کی طرف بھاگا، عورت نے نہایت اطمینان سے نشانہ لے کر اس کے پاؤں پر گولی ماری۔ وہ فرش پر گر کر کراہنے لگا، عورت نے انہیں خبردار کیا۔

''اب کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں سر میں گولی ماروں گی۔ میرا تعلق نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ ایلیٹ فورس سے ہے۔''

یہ سن کر تینوں مرد بچ ساکت ہوگئے۔ گیس ماسک کی آزمائش کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ ایلیٹ فورس کے اہلکار اس کے استعمال کے بغیر ہی اس حصے میں داخل ہونے میں کامیاب رہے تھے جہاں عورت موجود تھی۔انہوں نے اندر آ کر وہاں موجود ہر فرد کو ہتھکڑی لگا دی۔ جوزف بائر بھی ایلیٹ فورس کے ساتھ تھا۔ یہ آپریشن اسی کی کمانڈ میں ہو رہا





تھا۔اس نے آتے ہی عورت سے ہاتھ ملایا۔

''ویلڈن مس ماریا کورل! تم نے اپنا کام بہت خوبی سے انجام دیا ورنہ ہم اتنی آسانی سے یہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔''

''شکریہ لیفٹیننٹ۔'' ماریا مسکرائی۔''یہ میری ڈیوٹی ہے۔''

جوزف بائر کے ساتھ وہ دونوں لڑکے بھی تھے جنہوں نے پلیٹ فارم پر ماریا کے ساتھ زیادتی کا ڈراما کیا تھا۔ وہ بھی ایلیٹ فورس کا حصہ تھے اور اس وقت ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں۔ جوزف بائر نے ماریا سے کہا۔ ''میں یا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سب وے کے نیچے اتنے لوگ موجود ہیں اور ان میں سے اکثر پولیس کو مطلوب مجرم تھا۔ یہاں قاتل اور منشیات فروش پناہ لیے ہوئے ہیں۔''

''میں نے جو دیکھا ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ مجرموں کی زیرِ زمین جنت ہے۔ یہاں تک پولیس کی رسائی بہت مشکل کام ہے۔ آپریشن جاری ہے؟''

جوزف بائر نے سر ہلایا۔''کئی جگہوں پر ہمیں شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ فائرنگ سے کئی افراد ہلاک ہو چکے ہیں جن میں دو ایلیٹ کے جوان بھی شامل ہیں۔ میں نے مزید نفری بھیجنے کی درخواست کی ہے اور ممکن ہے ہمیں فوج سے بھی مدد طلب کرنا پڑے۔ اس پوری جگہ کو مکمل طور پر کلیئر کرنا ضروری ہے۔''

''لیکن سر! مجھے ایک خطرہ ہے کہ مجرموں نے بھاگنے کے کئی راستے رکھے ہوں گے اور وہ مختلف سب وے اسٹیشن کے راستے نکل سکتے ہیں۔اس لیے .....''

جوزف نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''میں نے پہلے ہی آس پاس کے تمام سب وے اسٹیشنز اور سرنگوں کی نگرانی کا حکم دے دیا ہے۔''

''غائب ہونے والے لوگوں میں سے کوئی ملا ہے؟''

''بہت سارے لوگ ملے ہیں۔ فی الحال تو سب کو حراست میں لیا جارہا ہے۔ بعد میں ان میں سے لوگوں کو علیحدہ کیا جائے گا کہ کون مجرم ہے اور کون عام آدمی ہے۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ یہاں کوئی عام آدمی ملے گا۔''

''گرفتار ہونے والے کہاں ہیں؟''

''سب وے اسٹیشن پر۔'' جوزف بائر نے کہا۔''آؤ، ہم وہیں جارہے ہیں۔''

ماریا اور جوزف بائر سرنگوں سے گزرتے ہوئے سب وے اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک آئے۔ وہاں درجنوں گرفتار شدگان موجود تھے اور مزید کی آمد جاری تھی۔ انہیں مسلح گارڈز کی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ان میں ماریا کو وہ بڑھیا بھی دکھائی دی۔ اس نے ماریا کو دیکھا تو زمین پر تھوک دیا جو کسی طریقے سے اس سب وے اسٹیشن میں آنے والوں کو نیچے لے جاتی تھی۔ وہ شاید اسی طرح اپنی گزر بسر کرتی تھی۔ ماریا ہنس دی۔ اگر وہ یہ ڈراما نہ کرتی تو ان لوگوں تک رسائی کیسے ہوتی جو زمین کے نیچے چھپے بیٹھے تھے۔ جوزف بائر دوسرے سب وےز پر موجود اپنے آدمیوں سے رابطہ کر رہا تھا۔ وہاں سے بھی فرار کی کوشش کرنے والوں کو پکڑنے کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ ان لوگوں نے واقعی فرار کے لیے کئی راستے رکھے ہوئے تھے۔ صبح تک زیرِ زمین سرنگوں سے کئی سو افراد گرفتار ہو چکے تھے لیکن ماریا کو یقین تھا کہ اس سے کہیں زیادہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے کیونکہ اس نے اس زیرِ زمین دنیا میں اس سے کہیں زیادہ افراد دیکھے تھے۔ اسٹیشن پر ماریا کی ملاقات اس نوجوان گارڈ سے بھی ہوئی جس نے سب سے پہلے نشان دہی کی تھی کہ غائب ہونے والے افراد جس وقت سب وے میں آئے تھے تو یہ بڑھیا پلیٹ فارمز پر موجود ہوتی تھی۔ پولیس جاسوسوں نے اس کا کئی بار تعاقب کیا لیکن وہ ہمیشہ پُراسرار انداز میں غائب ہو جاتی تھی۔ اس لیے ماریا کی مدد سے یہ جال بچھایا گیا۔ اس نے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا تھا کیونکہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ نیچے کس قسم کے خطرات موجود ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں دو دھاتی کڑے تھے جن میں سے ایک دو طرفہ ریڈیو اور دوسرا است اور فاصلے کی نشان دہی کرنے والا آلہ تھا اور اس کی مدد سے ایلیٹ فورس کے کمانڈوز اس زیرِ زمین دنیا میں داخل ہونے میں کامیاب رہے۔

دو دن بعد ایک درجن میں سے سات گمشدہ افراد مل گئے۔ یہ سب ٹھیک ٹھاک لیکن قید میں تھے۔ عورتوں سے زبردستی جسم فروشی اور نائٹ کلب میں اسٹریپ ٹیز کرایا جاتا تھا جبکہ مردوں سے دوسرے کام لیے جاتے تھے۔ وہ ایک طرح سے غلام ہوتے تھے، فرار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس زیرِ زمین دنیا سے.... مغوی... منشیات ، اسلحہ اور بندرگاہ کے گوداموں سے چرائے گئے سامان کی بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی تھی۔ گرفتار ہونے والوں میں کئی نامی گرامی مجرم تھے۔ کئی نئے مجرم گرفتار ہوئے تھے اور کئی کیسز کی گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ شہر کے نیچے ابھی ایسی اور کتنی دنیا ئیں آباد تھیں۔

اسما قادری

قسط 34

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے. جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانی طبقے سے ہو. محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پا کر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نخاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں سوساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ ماہ بانو آری کمنڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہر یار، ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آ جاتے ہیں۔ شہر یار جگو کو فون کر کے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالستان شہر یار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہر یار مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہر یار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے کارندے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جمرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جمرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ للی اس تصادم میں جمرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر پولیس والے شبانہ کے ذریعے آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔ ادھر شہر یار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مراد شاہ کو ماں کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ پاکستان آ جاتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیر لیتے ہیں۔ پھر وہاں دو بدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں

اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشابرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی [illegible] دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار یہ خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ نالی والا جاکر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ وہ پیر سائیں کے ہرکاروں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اس پر تشدد کرتے ہیں۔ لیکن وہ نور بخش کے بیٹے کی مدد سے وہاں سے فرار ہو کر شہریار کے پاس پہنچتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کر جاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر ویرانے میں آجاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کر کے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ چانڈیو کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو ماہ بانو آڑے آجاتی ہے اور اسے اس عمل سے روکتی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر وہاں سے چل دیتے ہیں اور شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کی مدد کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ شہریار کو مشابرم خان کے ذریعے نالی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ نالی والا پہنچتا ہے۔ میجر ذیشان اور شہریار زیرِ حراست افراد سے تفتیش کے لیے جانے لگتے ہیں تو اچانک میجر ذیشان اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے تو وہ کوئی شرٹ پر چپکی کوئی ہم رنگ شے ہوتی ہے۔ بعد ازاں پتا چلتا ہے کہ وہ جاسوسی کرنے والی جدید چپ ہوتی ہے۔ شہریار یہ پتا لگانے کے لیے کھوج میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں ایسی کسی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں مل جاتی ہے۔ شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشابرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کر لیتا ہے اور اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔ پھر نکاح فارم پر دستخط کے وقت شہریار فارم پر انگلی رکھے کھڑا ہوتا ہے۔ ماہ بانو کے ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا ہے اور وہ اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگتی ہے۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

وہ رو رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ بس ایک نظر ہی کی تو بات تھی جس نے اس پر کیسے کیسے راز افشا کر دیے تھے۔ اسے آج پہلی بار صحیح معنوں میں اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ وہ جس کی چاہت دل میں لیے پھرتی ہے، وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے نہ سہی لیکن عمل سے تو تعلق خصوصی کا ثبوت ایک عرصے سے دیتا چلا آرہا تھا... لیکن وہ اس کی اس توجہ کو اس کے خلوص اور ہمدردی پر ہی محمول کرتی رہی تھی، ورنہ وہ کونسا موقع تھا جب شہریار نے اس کا خیال نہ رکھا ہو۔ پیر آباد سے پہلی بار چودھری کے چنگل سے بچنے کے لیے فرار ہونے سے لے کر اب تک وہ اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی کہ وہ اس کی ایک فون کال پر اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اتنی دور دوڑا چلا آیا تھا اور اس وقت اس کا وکیل بنا اس سے نکاح کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ لیکن اس پل اس کی آنکھوں میں جو کرب تھا، اس نے ماہ بانو کو رلا دیا تھا۔ کرب کی یہ تحریر صاف بتا رہی تھی کہ وہ اسے کسی اور کا بنتے دیکھ کر کتنا آزردہ ہے اور یہ آزردگی ہی تو اس کی چاہت کی گواہ تھی۔ لیکن یہ گواہی سامنے آنے میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ وہ عروسی جوڑا پہنے کسی اور کے نکاح میں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

آج اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ شہریار کی ماریا سے شادی کسی مجبوری کے باعث ہوئی ہو گی لیکن وہ پہلے یہ بات سمجھ ہی نہیں سکی اور جذبات میں اسلم سے شادی کا وعدہ کر بیٹھی۔ اب اس کے لیے اپنا وہ وعدہ نبھانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن کیا کوئی جائے فرار تھی؟ کیا وہ قاضی اور گواہوں کی موجودگی میں نکاح نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر سکتی تھی؟ کیا وہ اسلم کی محبت اور احسانات کو فراموش کر کے اسے ایک بار پھر تنہائیوں کے حوالے کر سکتی تھی؟ ان تنہائیوں کے حوالے جو اسے ایک بار پھر برائی کی دلدل میں گھسیٹ لے جاتیں...

سوالات کا ایک ریلا سا تھا جو اس کے ذہن سے گزر رہا تھا لیکن انگلیوں میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ذرا سی جنبش کر کے نکاح نامے پر دستخط کر دیتیں۔ ہاتھ سے گر جانے والا قلم اب بھی اس کے قدموں میں پڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے نکاح نامے کے اوراق کو تر کر کے وہاں ایک ایسی داستان رقم کر دی تھی جسے پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان تھی جو حالات کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی کسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی لیکن زندگی اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ زبان سے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔

”دستخط کر دو ماہ بانو! قاضی صاحب انتظار کر رہے





[ہیں]۔“ شہریار نے جھک کر اس کے قدموں میں پڑا قلم اٹھا کر [نک]اح نامے کے فارم پر رکھا اور آہستہ سے کہا۔ اس کا یہ چھوٹا [سا جم]لہ ماہ بانو کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا لیکن انگلیوں میں [کپکپاہٹ] اس قدر تھی کہ قلم تھامنے کی تاب ہی نہ رہی۔ شہریار نے [خاموشی] سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ یکا یک [اسے اپ]نا وجود کسی تناور درخت کے سائے میں آیا محسوس ہوا۔ [آنسو] تھم گئے اور جسم کی لرزش رک گئی۔ اگر یہی محبوب کا حکم تھا [تو سرِ ت]سلیم خم تو کرنا ہی تھا۔ اس نے قلم مضبوطی سے انگلیوں [کی] گرفت میں لیا اور ایک ایک کر کے ہر بتائی ہوئی جگہ پر [دستخ]ط کرتی چلی گئی۔ اس کے دستخط کرتے ہی قاضی صاحب [نے کا]رروائی آگے بڑھائی۔ مختصر سے خطبۂ نکاح اور دعا کے [بعد] وہاں مبارک سلامت کا شور اٹھ گیا۔ تمام حاضرین نے [اسل]م کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔

”تمہیں اللہ نے اپنی بہت بڑی نعمت کا تحفہ دیا ہے۔ [اس] تحفے کی ہمیشہ قدر کرنا۔“ شہریار نے اسلم سے گلے ملتے [ہو]ئے اسے نصیحت کی۔

”اطمینان رکھیے۔ مجھے خود بھی اپنی خوش نصیبی کا [احس]اس ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کی تسلی کروائی۔

اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مرد [ح]ضرات دل کھول کر اشیائے خورونوش سے انصاف کرنے [لگ]ے۔ ماہ بانو ایک تو دلہن تھی اور دوسرے وہاں موجود واحد [خ]اتون۔ اس کے لیے کچھ بھی کھانا پینا دشوار ہو رہا تھا۔ سب [کے] بہت اصرار پر وہ بس ذرا سی گلاب جامن ہی چکھ سکی۔

شہریار نے بھی حسبِ عادت بہت ناپ تول کر بس [ذر]ا سا ہی کھایا۔ وہ اپنے معمول کا اتنا پابند تھا کہ وقت بے [وق]ت کھانا پینا ہمیشہ ہی ناپسند کرتا تھا اور اس وقت تو طبیعت بھی [ب]و جھل سی تھی۔ اس وقت تو وہ اس محفل میں بس رسمِ دنیا [نب]ھانے کو شامل تھا ورنہ دل تو تنہائی کا خواہاں ہو رہا تھا۔ بیس [منٹ] میں وہ لوگ اس سلسلے سے بھی فارغ ہو گئے۔ [قا]ضی صاحب کو ان کی فیس کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ [نک]اح کی تقریب سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں پہنچنے [و]الے سی ایف پی کے اہلکار بھی اپنے اپنے دھندوں سے لگ [گ]ئے۔ دو ملازمین کھانے پینے کے سلسلے میں ہو جانے والے [پھ]یلاوے کو سمیٹنے لگے۔ ایسے میں شہریار ان دونوں کی طرف [متو]جہ ہوا۔

”میں نے تم دونوں کے لیے ایک فائیو اسٹار ہوٹل [میں] اسپیشل روم بک کروا دیا ہے۔ ڈرائیور تم لوگوں کو وہاں [چھوڑ آ]ئے گا۔ روم چوبیس گھنٹے کے لیے تمہارے ناموں سے [ٹھ]یک ہے۔ تمہاری مرضی ہے کہ تم وہاں کتنا وقت گزارتے ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔“ اس نے بولتے ہوئے اپنی نظریں زیادہ تر اسلم کے چہرے پر ہی مرکوز رکھی تھیں۔ گلے میں موتیا سا پھولوں کا ہار ڈالے وہ خاصا پُرکشش لگ رہا تھا۔ خوشی نے اس کے چہرے کو عجیب سی رونق عطا کر دی تھی۔

”میری طرف سے یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔“ اس بار وہ ماہ بانو کی طرف مڑا اور ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے شہریار صاحب! پہلے ہی آپ نے ہمارے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔“ لفافہ دیکھ کر اسلم نے شرمندگی سے کہا۔

”یہ تکلف نہیں، میری خوشی ہے۔ اب تم دونوں یہاں وقت ضائع مت کرو اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔ ڈرائیور تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔“ اس نے بزرگانہ انداز اختیار کرتے ہوئے حکم دیا تو اسلم، ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

”یہاں سے جا کر اس جگہ کو بالکل بھول جانا۔ یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔ آئندہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام ہو تو براہِ راست مجھ سے ہی رابطہ کرنا۔“ اس نے ضروری سمجھا کہ انہیں نصیحت کر دے۔ اس کی خاطر ذیشان نے اگر سی ایف پی کے اس ٹھکانے کو استعمال کروا لیا تھا تو اس کا بھی فرض تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے احتیاط سے کام لے۔

”جیسا آپ کا حکم۔“ اسلم نے جواب دیا۔ ماہ بانو البتہ بالکل خاموش تھی۔ نکاح کے بعد سے اس نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ مبادا نظر اٹھے اور اس چہرے پر پڑ جائے جسے دیکھنا اب وہ اپنے لیے جائز نہیں سمجھتی تھی۔ اسلم کے نکاح میں آنے کے بعد اب وہ بس اسی کی وفادار بن کر رہنا چاہتی تھی اور وفاداری کے لیے احتیاط ضروری تھی۔

”تمہارے مہمان تو گئے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ذیشان جو کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا تھا، ان دونوں کی روانگی کے ساتھ ہی واپس آیا اور اس سے استفسار کرنے لگا۔

”واپس نور کوٹ جانا ہے۔“ اس نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دیا۔

”ایسا کرو، تم اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ کر کسی ٹرک یا ویگن وغیرہ کے ڈرائیور بن جاؤ۔ جس حساب سے تم گھنٹوں ڈرائیو کرتے رہتے ہو، تمہارے لیے یہ کام بہت بہتر رہے گا۔“ اس کا جواب سن کر ذیشان نے جل کر جواب دیا تو وہ

ہنس پڑا۔

''اچھا پھر تم بتاؤ کہ کیا کروں؟''

''یہاں ایک ریسٹ روم ہے۔ وہاں تھوڑی دیر آرام کرلو۔ تمہارے لائے ہوئے بندے پر بھی کام ہورہا ہے۔ وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا ہے تو پھر تمہیں اس کی کہانی اس کی زبانی سناتے ہیں۔ پھر آگے دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ فوراً ہی ذیشان کے پروگرام سے متفق ہوگیا۔ اعصاب اتنے بوجھل ہورہے تھے کہ کچھ دیر کے لیے تنہائی اور آرام کی شدت سے خواہش ہورہی تھی۔ تنہائی ملتی تو وہ اپنے عہدے اور بڑے پن کے خول سے نکل کر خود سے یہ اعتراف کرنے کی جرأت کرپاتا کہ وہ بھی ایک عام انسان ہے جس کا دل اس وقت احساسِ زیاں سے لہولہو ہے۔ یہ لہو اگر پانی بن کر آنکھوں سے نہ بہتا تو شاید اس کے جسم و جاں کے پرخچے اڑ جاتے اور اسے بہرحال زندہ رہنا تھا۔ اپنے لیے نہ سہی، اپنوں کے لیے اور اپنے وطن کے لیے۔

☆☆☆

سیاہ جینز پر سیاہ اور سرخ دھاریوں والی ٹی شرٹ پہنے وہ لڑکی غضب کی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس لباس نے اس کی دراز قامت اور خوب صورت فگر کو خوب نمایاں کرکے دکھایا تھا۔ دمکتی رنگت پر شانوں سے ذرا نیچے آتے براؤنش بال بھی خوب جچ رہے تھے اور ہونٹوں پر جمی چمکتی سرخ رنگ کی لپ اسٹک نے تو گویا غضب ہی ڈھار کھا تھا۔ اس کے کبوتر جیسے سفید پیروں میں سیاہ رنگ کی نازک سی اونچی ایڑھی کی سینڈل تھی۔ اس اونچی ایڑھی پر وہ کھٹ کھٹ کرتی چلتی ہوئی بڑے انہماک سے شیلفس میں رکھی مختلف چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب کوئی چیز اس کی نظرِ انتخاب میں آجاتی تو وہ بایاں ہاتھ اٹھا کر اسے اس ٹرالی میں منتقل کرلیتی جسے وہ اپنے دائیں ہاتھ سے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اپنی خریداری میں وہ اتنی منہمک تھی کہ اطراف سے بالکل بے خبر معلوم ہورہی تھی۔ اسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ نہ تو اسے شیلفس کے بالکل آخری سرے پر معروف ادھیڑ عمر گریس فل سے آدمی کی موجودگی کی خبر ہے اور نہ ہی اپنے پیچھے پیچھے چلتے ان دو جوان العمر حلیے سے ذرا اوباش لگنے والے لڑکوں کی۔ وہ لڑکے بھی لگتا تھا کہ موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ کچھ نکالنے کے لیے جیسے ہی شیلف کی طرف پلٹی، ان میں سے ایک نے اپنا پسٹل نکال کر اس کی پشت پر رکھ دیا۔

''سیدھی طرح خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ یہیں ڈھیر کردیں گے۔'' اوباش لڑکے کی سرد آواز سن کر وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں لیکن اس نے لڑکے کی ہدایت پر عمل کرکے خاموش رہنے کے بجائے ایک دہشت زدہ سی چیخ ماری اور اپنی اونچی ایڑھی کے باوجود بگٹٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی سمت بھاگی جہاں ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ اس کے چیخنے کی آواز پر وہ فوراً ہی اس طرف متوجہ ہوگیا اور بھاگتی لڑکی کے ساتھ پستول لہراتا لڑکا اور اس کا ساتھی بھی اس کی نظر میں آگیا۔ اس سے قبل کہ وہ اس صورتِ حال پر کوئی قدم اٹھاتا، لڑکی تیز رفتاری سے درمیانی فاصلہ طے کرکے اس کے قریب آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

''پلیز ہیلپ... ہیلپ پلیز۔'' وہ اس سے لپٹی خوف زدہ آواز میں درخواست کرنے لگی اور اسے یہ بھی خبر نہیں ہوسکی کہ دھمکانے والے بدمعاش اسے کسی دوسرے شخص کی پناہ میں جاتے دیکھ کر فوراً ہی مخالف سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک بڑا سپر اسٹور تھا جہاں سیکیورٹی کا مناسب انتظام تھا۔ شاید اسی لیے معاملہ گڑبڑ ہوتا دیکھ کر اوباشوں نے فوراً ہی راہِ فرار اختیار کرلی تھی۔

''کیا ہوا سر! کیا مسئلہ ہے؟'' فوراً ہی وہاں ایک سیکیورٹی اہلکار برآمد ہوا اور ادھیڑ عمر شخص سے دریافت کرنے لگا جو لڑکی کے ابھی تک خود سے لپٹے ہونے کی وجہ سے جز بز نظر آرہا تھا لیکن صرف اس کے خوف کی وجہ سے برداشت سے کام لے رہا تھا۔

''کچھ بدمعاش ان خاتون کو تنگ کررہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نہیں بتا سکتا۔'' لڑکی کو خود سے الگ کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

''میں دیکھتا ہوں۔ آپ لوگ پلیز ریلیکس رہیں۔'' سیکیورٹی اہلکار فوراً ہی پلٹ گیا۔

''آپ ٹھیک ہیں مس؟'' ادھیڑ عمر شخص نے گہرے گہرے سانس لیتی لڑکی سے دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ آس پاس ہی نہ چھپے ہوئے ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا اور بُری طرح ہانپنے کی وجہ سے پیدا ہوتا اس کے سینے کا زیروبم چست ٹی شرٹ میں خوب محسوس ہورہا تھا۔ وہ یقینی طور پر تباہ کن حد تک حسین و پرکشش تھی جس کے لیے کسی بھی اوباش کی نیت خراب ہوسکتی تھی اور شریف آدمی کے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھ سکتی تھی۔ اس شریف آدمی نے بھی اسے





نظر انداز نہیں کیا اور نرمی سے بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ مادام، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اگر آپ مزید شاپنگ کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں۔''

''نہیں، اس وقت شاپنگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس آپ میرے ساتھ چل کر بل بنوا دیں۔ مجھے اکیلے یہاں سے باہر نکلتے ہوئے بھی خوف محسوس ہورہا ہے۔'' لڑکی نے ان سے درخواست کی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر حامی بھرلی اور وہ دونوں اپنی اپنی ٹرالیوں کے ساتھ آگے چل پڑے۔

''مجھے یہاں کے سیکیورٹی انچارج سے ملنا ہے۔'' بل بنوانے کے لیے ٹرالیاں سامنے کرتے ہوئے انہوں نے پُررعب لہجے میں کہا جس پر انہیں مین گیٹ پر بنے ایک کیبن کی طرف گائیڈ کردیا گیا۔

وہ لڑکی سمیت اس جگہ پہنچے تو وہاں وہ سیکیورٹی اہلکار پہلے ہی موجود تھا جس سے واقعے کے فوراً بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ یقینی طور پر وہ اپنے افسر کو واقعے کی رپورٹ دے رہا تھا۔

''سر! یہ ہیں وہ لوگ جن کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا۔'' ان دونوں کو دیکھتے ہی سیکیورٹی گارڈ نے اپنے افسر کو مطلع کیا۔

''واقعہ ان خاتون کے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں نزدیک ہونے کی وجہ سے اتفاقاً اس میں شامل ہوگیا ہوں۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے مسکراتے ہوئے گویا صورتِ حال واضح کی۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو زحمت ہوئی۔ میں خود اس واقعے کی تفتیش کروں گا۔'' انچارج نے ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو افسوس ہونا بھی چاہیے۔ اتنے بڑے سپر اسٹور میں مسلح افراد کا گھس آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ مسلح آدمی اندر آئے کیسے؟ کیا آپ کے پاس اسلحے کو اندر آنے سے روکنے کے لیے متعلقہ آلات نہیں ہیں؟'' اس بار ان کا لہجہ سرد اور بارعب تھا۔ سیکیورٹی انچارج نے خود کو ان کے سامنے کافی کمزور محسوس کیا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

''میں خود اس سلسلے میں حیران ہوں سر! ہمارا سیکیورٹی سسٹم بہت اچھا ہے اور کوئی چاہے بھی تو ہتھیار چھپا کر اندر نہیں لے جاسکتا۔ ان حالات میں تو میں یہی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ کوئی کھلونا پسٹل تھا جس سے خاتون کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی۔''

''ہوسکتا ہے ایسی ہی کوئی بات ہو۔ میں اچانک ان دونوں کے آجانے سے بہت خوف زدہ ہوگئی تھی اس لیے کسی قسم کی ججمنٹ نہیں کرسکی۔ ویسے بھی مجھے ہتھیاروں کی کوئی خاص پہچان نہیں ہے۔'' لڑکی نے فوراً ہی اس کے خیال سے اتفاق کرلیا جس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اپنی صفائی دینے کے لیے مزید بولا۔

''میرے ماتحت نے صرف خاتون کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ وہ کسی کو وہاں سے بھاگتا ہوا نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی کسی اور سیکیورٹی گارڈ نے اسٹور سے کسی شخص کو افراتفری میں نکلتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ کوئی مشکوک بات سامنے آنے پر ہم خود ہی فوری ایکشن لے لیتے ہیں۔''

''اس بات کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں اب بھی اسٹور میں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور ذرا سی کوشش سے انہیں پکڑا جاسکتا ہے۔'' ادھیڑ عمر آدمی کچھ خیال انداز میں بولا۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت اسٹور میں جتنے کسٹمرز موجود ہیں، انہیں خاتون کے سامنے شناختی پریڈ کروائی جائے؟'' سیکیورٹی انچارج نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''مجرموں تک پہنچنے کے لیے ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟'' ادھیڑ عمر شخص نے مضبوطی سے جواب دیا۔

''اس ایکشن کا اسٹور کی ساکھ پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ ہمارے معزز کسٹمرز اسے اپنی انسلٹ سمجھیں گے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ خاتون کے ہراساں ہونے کے سوا کوئی بڑی بات ہوئی بھی نہیں۔ اگر انہیں کسی قسم کا جسمانی یا مالی نقصان پہنچتا تو ہم اس قسم کے سخت اقدامات اٹھا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ میں اسٹور کے مختلف حصوں میں نصب کیمروں میں موجود ویڈیو آپ دونوں کو دکھا دوں تاکہ اگر کسی کیمرے کی گرفت میں ان مشکوک افراد کے چہرے آئے ہوں تو آپ انہیں پہچان لیں۔'' سیکیورٹی انچارج نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ایک متبادل تجویز پیش کی۔

''رہنے دیں۔ میں ایسے کسی جھنجٹ میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ جو ہونا تھا ہوچکا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا کوئی نقصان نہیں ہوا اور میں صحیح سلامت اپنے گھر جاسکتی ہوں۔'' لڑکی نے اچانک مداخلت کرکے معاملہ ہی ختم کردیا تو ادھیڑ عمر شخص بھی شانے اچکا کر رہ گیا۔ لڑکی کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد اس کا کچھ کہنا مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہوجاتا۔ وہ دونوں سیکیورٹی انچارج کی طرف سے سوفٹ ڈرنکس کی پیشکش کو مسترد کرکے گارڈ روم سے باہر

آ گئے۔ اس دوران میں ان کی بلنگ کا کام ہو چکا تھا اور خریدی ہوئی اشیا تھیلیوں میں منتقل کی جا چکی تھیں۔

"آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ سر! ہوسکتا ہے آپ کو میرے رویّے سے مایوسی ہوئی ہو لیکن میں نے جان بوجھ کر اس معاملے کو طول دینا پسند نہیں کیا۔ مجھے تنگ کرنے والے اوباش جو بھی ہوں، میں ان کو بھیجنے والے سے واقف ہوں اس لیے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔" ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ ساتھ باہر نکلتے ہوئے لڑکی نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے رویّے کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اوہ۔۔۔ یعنی یہ ذاتی دشمنی کا کیس ہے؟"

انہوں نے پوچھا جس پر لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم کسی ریسٹورنٹ میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ پھر میں آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گی۔"

"چائے پینے میں وہ بھی اتنی خوب صورت خاتون کے ساتھ کوئی حرج تو نہیں ہے۔۔۔ لیکن بڑی عجیب سی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ابھی تک متعارف نہیں ہوئے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ نجی معاملات تک آ پہنچا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر احساس دلایا تو لڑکی کے لب بھی کھل اٹھے اور ایسا لگا کہ سرخ پنکھڑیوں کے درمیان رکھے موتیوں کی سفید لڑی نے اپنی جھلک دکھائی ہو۔

"میں فلک ہوں۔۔۔ فلک خان اور آپ؟" اس نے تعارف کروانے میں پہل کرتے ہوئے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"توحید احمد۔" ادھر سے مختصر جواب آیا۔ اس دوران وہ لوگ چلتے ہوئے پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ اتفاق سے دونوں کی گاڑیاں ایک دوسرے سے قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں۔ فلک کے پاس سفید رنگ کی سوزوکی مہران کا کافی پرانا ماڈل تھا جبکہ توحید احمد کے پاس شان دار پجیرو تھی۔ اس نے اپنا سامان سوزوکی مہران کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر دروازہ دوبارہ لاک کیا اور توحید احمد کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس دوران میں وہ بھی سامان رکھنے کا کام کر چکے تھے۔

"میری گاڑی آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں، میں آپ کی طرف آ جاتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے توحید احمد سے کہا۔

"میں اس قسم کی سوچ کا مالک نہیں ہوں لیکن تمہارے میری گاڑی میں بیٹھنے سے میری گاڑی کی شان بڑھ جائے گی اس لیے واقعی تم میرے ساتھ آ جاؤ۔" انہوں نے اسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جو ایک خوش شکل اور خوش لباس لڑکی کے سامنے کسی مرد کے لیے لازم تھا۔ فلک ایک ادا سے جھنتی ہوئی ان کی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"آپ خاصے خوش مزاج اور ہینڈسم آدمی ہیں۔" جوابی تعریف گویا اس کا فرض بن چکا تھا۔

"حسن کے آگے تو سب ہی خوش مزاج ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان بدمعاشوں پر حیرت ہے کہ انہوں نے تمہیں ہراساں کرنے کی گستاخی کیسے کی؟" وہ اب بھی مائل بہ شوخی تھے۔

"ان کا ذکر رہنے دیں۔ وہ کرائے کے ٹٹو تھے اور اپنا کام کر کے بھاگ گئے۔" اس نے ہونٹوں کو سکوڑتے ہوئے بیزاری کا اظہار کیا اور فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی توحید احمد نے گاڑی پارکنگ سے نکال لی۔

"آپ کیا جاب کرتے ہیں؟" گاڑی چلتے ہی فلک نے ان سے سوال کیا۔

"میں تو ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ اب اس عمر میں کیا جاب کروں گا۔" انہوں نے بات اڑائی۔

"میں نہیں مانتی۔ اوّل تو آپ اتنے عمر رسیدہ لگتے نہیں ہیں، دوسرے آپ جتنے فٹ ہیں، کوئی ریٹائرڈ پرسن ہو ہی نہیں سکتا۔" اس نے ایک ادا سے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ان کی بات ماننے سے انکار کیا۔

"تم مجھے مسلسل خوش کر رہی ہو لڑکی! یہ نہ ہو کہ خوشی میں میرا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہو جائے کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے۔" انہوں نے گویا اسے تنبیہ کی جسے سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تمہاری طرح تمہاری ہنسی بھی بہت خوب صورت ہے۔" توحید احمد نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن وہ انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"اصل میں یہ آپ کا حُسنِ نظر ہے۔ اگر میں اتنی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی تو میرا سابقہ شوہر مجھ پر دوسری عورتوں کو ترجیح کیوں دیتا۔" اس کی انکساری نے جملے کے آخر میں اداسی کا رنگ اختیار کر لیا۔

"اوہ۔۔۔ تو چوٹ کھائی ہوئی ہو۔ اندر چلو پھر تمہاری داستان بھی سنتے ہیں کہ کس بدنصیب نے اتنی پیاری لڑکی کی ناقدری کی۔" انہوں نے قریبی ریسٹوران کا انتخاب کیا تھا اس لیے فاصلہ فوراً ہی طے ہو گیا۔

ریستوران کی فضا بڑی خواب ناک تھی۔ دھیمے سروں میں چھڑی موسیقی نے بڑا خوش گوار سا تاثر پیدا کر رکھا تھا۔ ان دونوں نے ویٹر کی راہنمائی میں ایک ٹیبل پر پہنچ کر قبضہ کر لیا اور توحید احمد نے فوراً ہی اسنیکس کے ساتھ چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔





"میں نے آپ کو آفر کی تھی اس لیے یاد رکھیے گا کہ میزبان میں ہوں اور بل میں ہی پے کروں گی۔" ویٹر کے جاتے ہی اس نے فوراً انہیں ٹوکا۔

"خوب صورت خواتین کی میزبانی بس اس حد تک اچھی لگتی ہے کہ وہ چائے بنا کر پیش کر دیں۔ ان سے بل کوئی بدذوق ہی پے کروا سکتا ہے اور میں کم از کم اتنا بدذوق نہیں ہوں۔" انہوں نے بات ٹالی۔

"آپ بہت جولی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ جوانی میں تو آپ لیڈی کلر رہے ہوں گے۔" اسے شاید بہت زیادہ ہنسنے کی عادت تھی اس لیے ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

"چلو اسی بہانے تم نے مجھے بوڑھا تو تسلیم کر لیا۔" انہوں نے گویا اس کی زبان پکڑی۔

"بوڑھے تو خیر آپ نہیں ہیں، بس میچورڈ کہلا سکتے ہیں۔ ویسے بھی میرے نزدیک چھچھورے نوجوانوں سے بڑھ کر آپ جیسے خوش مزاج اور گریس فل شخص کی صحبت زیادہ اچھی ہے۔ اگر جوانی میں اتنی کشش ہوتی تو میں سال بھر کے اندر اپنے شوہر کو چھوڑ کر نہ آ جاتی۔" اس نے شانے جھٹکتے ہوئے انہیں جواب دیا تو جیسے انہیں بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"ارے ہاں، تم کچھ بتا رہی تھیں اپنے شوہر کے بارے میں۔ ذرا بتاؤ تو وہ کون احمقِ اعظم تھا جس نے تمہاری قدر نہیں کی؟"

"احمق وہ نہیں، میں تھی۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور میں اس کی دولت اور خوب صورتی سے مرعوب ہو کر اس کی بن گئی۔ حالانکہ میری فیملی نے اس شادی کی بہت مخالفت کی تھی۔ میرے والد اور بھائی کا کہنا تھا کہ ہم خود سے اتنے زیادہ ہائی اسٹیٹس کے بندے سے رشتہ نہیں نبھا سکتے۔ پھر وہ تھا بھی فیوڈل بیک گراؤنڈ کا بندہ۔۔۔ جس کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہیں تھی۔ میری آنکھوں پر اس وقت عشق کی پٹی بندھی تھی اس لیے میں نے کسی کی ایک نہ سنی اور مجبوراً میرے گھر والوں نے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ دینے کے اعلان کے ساتھ میری شادی کر دی۔ شادی کے بعد مشکل سے دو مہینے وہ شرافت کے جامے میں رہا پھر اِدھر اُدھر کی بازاری عورتوں پر منہ مارنے لگا۔ میں نے بہت سمجھایا۔ لڑی جھگڑی لیکن اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ مجبور ہو کر میں نے طلاق مانگ لی جسے اس نے اپنی توہین سمجھتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ میں بھی ضد میں آ گئی اور اس کا گھر چھوڑ کر اس گھر میں شفٹ ہو گئی جو مجھے اس نے مہر میں دیا تھا۔ یہ بھی میرے والد کی مہربانی تھی کہ انہوں نے خفگی کے باوجود میری سیفٹی کا خیال کرتے ہوئے اس سے مہر میں مکان لکھوا لیا تھا۔ اپنے مکان میں شفٹ ہو کر میں نے کورٹ میں خلع کی درخواست دائر کر دی۔ اسے یہ بات بھی پسند نہیں آئی اور اب وہ مختلف حربوں سے کوشش کر رہا ہے کہ میں درخواست واپس لے لوں۔ کبھی دھمکی آمیز فون ملتے ہیں۔ کبھی گھر سے نکلتے وقت میری گاڑی کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ اور آج جو ہوا، وہ آپ نے بھی دیکھ لیا۔" وہ جیسے تھک کر چپ ہو گئی۔

"تمہیں چاہیے تھا کہ اپنے میکے چلی جاتیں۔" انہوں نے سب سن کر مشورہ دیا۔

"وہاں اب کوئی نہیں ہے۔ والد کا میری شادی کے پندرہ دن بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد بھائی بھی جاب کے لیے کینیڈا چلا گیا۔ ان دونوں کے سوا میری فیملی میں کوئی تیسرا فرد تھا ہی نہیں۔ باقی دور کے رشتے داروں کا تو آپ کو بھی علم ہوگا کہ آج کل کوئی کسی کے پھڈے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی حالات ہیں، مجھے ان سے تنہا ہی مقابلہ کرنا ہے۔" مایوسی سے بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"پلیز رونا نہیں۔ مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جائے گا۔" انہوں نے فوراً اسے ٹوکا تو وہ ہنس دی۔ اسی وقت ان کی ٹیبل پر چائے سرو کی جانے لگی۔ چائے اور اسنیکس سے انصاف کرتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے اور بھی کھل مل گئے۔ دونوں ہی کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں اور ایک دوسرے کی کمپنی کو انجوائے کر رہے ہیں۔

"تم کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر پر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ رات ہونے والی ہے، تمہارا اکیلا جانا مناسب نہیں۔ تمہاری گاڑی میں کسی سے کہہ کر تمہارے گھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔" ریستوران سے نکل کر وہ واپس توحید احمد کی گاڑی میں ان کے پہلو میں آ کر بیٹھی تو انہوں نے پیشکش کی۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔ دل کی بات بھی سمجھ لیتے ہیں۔ میں خود بھی آپ سے یہی کہنا چاہ رہی تھی لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔" اس نے بے ساختہ ہی ان کے بازو کو دونوں

ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے تشکر کا اظہار کیا اور پھر اپنا سر ان کے شانے سے لگالیا۔ انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

''میں اس دنیا میں بہت تنہا رہ گئی ہوں۔ آج آپ کے ساتھ وقت گزار کر ایسا لگا جیسے مجھے میرا کوئی اپنا مل گیا ہو۔'' وہ ان کے شانے سے سر لگائے خوابیدہ لہجے میں بولنے لگی۔ ایک تو اس کا حسنِ بے مثال، پھر اس کے بدن سے پھوٹتی مہک اور اس پر سے خود سپردگی کا یہ انداز... گاڑی کی فضا بڑی رومان پرور ہوگئی۔ توحید احمد اس کی باتیں سنتے اس کی بتائی ہوئی سمتوں میں گاڑی دوڑاتے رہے۔ آخرکار ایک اپر مڈل کلاس ایریا کے مکان پر پہنچ کر ان کا سفر اختتام پذیر ہوا۔

''اندر چلیے نا۔ جانے کیوں آج خالی مکان میں تنہا جاتے ہوئے روزانہ سے زیادہ وحشت ہو رہی ہے۔'' گاڑی رکی تو اس نے بجائے نیچے اترنے کے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''اوکے... ایز یو وش۔'' توحید احمد نے اسے مایوس نہیں کیا اور گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ وہ دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ اس کے ساتھ ساتھ تھے اور جانے اسے تنہائی کی دحشت سے نجات دلانے کے لیے کیا کرنے والے تھے۔

☆☆☆

فائیو اسٹار ہوٹل کا وہ کمرا کسی خواب کی تعبیر کی طرح تھا۔ کمرے کو دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے خصوصی طور پر تیار کروایا گیا ہے۔ پورے کمرے میں پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جن کی بھینی بھینی خوشبو نے کمرے کی فضا کو معطر کر رکھا تھا۔

''آپ کے کمرے میں پھل، دودھ، مٹھائیوں اور مشروبات وغیرہ سے بھری ٹرالی پہنچا دی گئی ہے۔ اگر آپ کو کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو انٹرکام پر ہمیں مطلع کر سکتے ہیں۔ مطلوبہ شے فوراً آپ تک پہنچا دی جائے گی۔'' وہ انتظامیہ کا کوئی فرد تھا جو ریسیپشن سے ان کے ساتھ یہاں تک آیا تھا اور اب کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا احترام سے کہہ رہا تھا۔ کمرے میں موجود بے شمار پھولوں کے علاوہ پھولوں کا ایک گلدستہ اس نے بھی ہوٹل انتظامیہ کی طرف سے پیش کیا تھا جو اس وقت ماہ بانو کے ہاتھوں میں تھا۔

''تھینکس! اگر ہمیں ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور آپ کو مطلع کریں گے۔'' اسلم نے اسے نرمی سے جواب دیا۔ یہ ایک طرح سے اس کے لیے اشارہ بھی تھا کہ اب وہ وہاں سے جا سکتا ہے۔

''وش یو گڈ لک۔'' وہ بھی عقل مند تھا، اشارہ پاتے ہی فوراً پلٹ گیا۔ اسلم دروازہ بند کر کے کمرے کے وسط میں کسی مجسمے کی طرح ایستادہ ماہ بانو تک آیا۔

''ایسا لگتا ہے کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہم خانماں بربادوں کو بھی ایسا خوب صورت حجلۂ عروسی نصیب ہوگا، سوچا ہی نہیں تھا۔ میرا تو بس یہ خیال تھا کہ ہمارا نکاح ہوگا اور ہم واپس فلیٹ پر لوٹ جائیں گے لیکن محترم اے سی صاحب نے تو اس جنت میں پہنچا دیا۔'' اس کی کمر میں ہاتھ ڈال اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ آج کا دن اس کے لیے بڑا مرادوں والا تھا جسے دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ آج وہ پورے حقِ ملکیت کے ساتھ اس کے ہمراہ اس خوب صورت خلوت کدے میں موجود تھی۔ دل چاہتا تھا بہک جائے اور اسے بھی اپنے ساتھ جذبات کی تیز رو میں بہا لے جائے مگر وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ بیش قیمت عروسی جوڑا، نکاح کا بھرپور انتظام، مہنگے ترین ہوٹل میں یہ سجا سجایا خوب صورت کمرا اور اس کے پرس میں پڑا بھاری مالیت کے چیک کا لفافہ... یہ سب کیا تھا؟ اس سے تعلقِ خصوصی کا اظہار یا پھر کوئی مداوا؟

اس نے ہوٹل آتے ہوئے راستے میں شہریار کے دیے لفافے کو کھول کر دیکھ لیا تھا اور اس میں موجود چیک پر لکھی رقم دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ اتنی بڑی رقم کا تحفہ ہر کس و ناکس کو نہیں دیا جاتا۔ نہ ہی ہمدردی میں اس حد تک جایا جاتا ہے۔ یہ تو بس اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ سامنے والا دینے والے کو بہت عزیز ہو۔ آج ایک دن میں شہریار نے اسے اپنی محبت کے اتنے ثبوت دیے تھے کہ اس کے دل میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب اپنے یقین کا وہ کیا کرتی؟ اب تو اسے سوچنا بھی جرم تھا۔ وہ اب اسلم کی بیوی تھی اور قانوناً و مذہبی طور پر اس سے وفا نبھانے کی پابند۔ فرضِ وفاداری کا تقاضا تھا کہ اب اس کے سوا کسی دوسرے کے خیال کو بھی ذہن سے نہ گزرنے دیا جائے اور اس وقت وہ خود سے اسی جنگ میں مصروف تھی۔

''لوگ اپنے محبوب کو ساری زندگی پھولوں بھری... راہ گزر پر چلانے کی خواہش کرتے ہیں۔ تم مجھے اتنی عزیز ہو کہ میرا دل چاہتا ہے، تمہیں اتنی بھی زحمت نہ کرنی پڑے اور میں تمہیں اپنی بانہوں کے جھولے میں جھلاتا رہوں۔''

اس کی کیفیت سے انجان اسلم نے یکایک اسے زمین سے اٹھا کر اپنی بانہوں میں تھام لیا اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے آہستگی سے پھولوں کی پتیوں سے بھرے نرم بستر پر





اتار دیا پھر وہ خود بھی گرنے والے انداز میں اس کے قریب ہی دراز ہوگیا۔ ماہ بانو اس کے بہکے بہکے تیور دیکھ رہی تھی لیکن آج وہ اسے کسی صورت نہیں روک سکتی تھی۔ آج وہ پورے حق سے اس کے قریب آیا تھا۔ وہ فطری حیا سے محجوب ہوتی ہوئی سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے مزید پیش قدمی کی اور اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماہ بانو کا ہاتھ کانپنے لگا۔

''بالکل چھوئی موئی ہو۔'' اس کی حالت دیکھ کر وہ سرشاری سے ہنسا پھر ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''حسبِ قاعدہ مجھے اس وقت تمہیں منہ دکھائی میں کچھ دینا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ میرے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ میرے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے، اس کے باوجود میں کوئی انتظام نہیں کر سکا... تو جانِ من... اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ لوٹ کا مال ہے جسے میں انتہائی ضرورت کے لیے تو پھر بھی مجبوراً استعمال کر رہا ہوں لیکن ان انمول لمحوں میں تمہیں کوئی یادگار تحفہ دینے کے لیے ہرگز وہ رقم خرچ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہارا تحفہ مجھ پر ادھار ہے۔ جب میرے پاس حق حلال کی آمدنی ہوگی تو میں ضرور تمہیں پیارا سا تحفہ دوں گا۔ ابھی تو میرے پاس بس میری خالص محبت ہے جسے میں تمہارے قدموں میں رکھ کر قبولیت کی درخواست کر سکتا ہوں۔'' وہ بڑی دل سوزی سے سب کچھ کہتا چلا گیا۔ اب ماہ بانو کے لیے اپنی خاموشی کو برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے اپنے لب وا کیے۔

''مجھے خوشی ہے اسلم کہ آپ نے اس انداز میں سوچا۔ میں نے زندگی میں کبھی مادی چیزوں کو اہمیت نہیں دی۔ میرے نزدیک انسانی جذبات کوہِ نور ہیرے سے بھی بڑھ کر قیمتی ہیں۔ آپ نے میری انگلی میں موجود یہ انگوٹھی دیکھی ہے نا۔ یہ زہر مہرہ پتھر کی انگوٹھی ہے جو مجھے مشابرم خان کی ماموں زاد بہن نے دی تھی۔ اس بظاہر معمولی اور بھدی انگوٹھی کو میں اس دن سے مسلسل اپنی انگلی میں پہن کر اس لیے رکھتی ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے خلوص نے بہت متاثر کیا تھا۔ پھر آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔'' روانی سے بولتے ہوئے اس نے ذرا سا توقف کیا اور پھر دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے ذرا مسکرا کر بولی۔

''محبت قدموں میں رکھنے والی چیز نہیں ہوتی جناب... اسے دل میں بہت عزت و احترام سے رکھا جاتا ہے۔ میں نے بھی آپ کی محبت کو یہی مقام دیا ہے۔'' اسلم کے شوہر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی اس نے اس کے ساتھ اپنا طرزِ تخاطب بدل لیا تھا اور ''تم'' کا صیغہ چھوڑ کر اسے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت کے لیے کچھ جگہ نکل آئی ورنہ تم تو صاف انکار کر چکی تھیں۔'' اسلم نے اس کی ماضی میں کہی بات کے حوالے سے کہا۔

''ہاں... اس وقت مجھے یہی لگا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے جذبات و خیالات میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ پھر محبت تو بہتے پانی کی طرح ہے۔ جیسے بہتا پانی اپنی جگہ بنا لیتا ہے، اسی طرح محبت بھی خود بخود اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہے۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے اعتراف کیا۔ سچ بھی یہی تھا کہ بے شک وہ شہریار کی محبت کی اسیر تھی لیکن اسلم کی محبت کے تند و تیز ریلوں نے کچھ مقامات پر ایسی دراڑیں پیدا کر دی تھیں کہ وہ خود کو بہت سے دلائل سے قائل کرنے کے بعد ہی سہی، اس سے شادی کرنے پر راضی ہوگئی تھی اور آج اس کی بیوی کی حیثیت سے اس خلوت کدے میں موجود تھی۔

''میرا مقصد تمہیں کچھ جتانا نہیں تھا۔ میں تو بس بتانا چاہتا تھا کہ آج میں کتنا خوش ہوں اور آج دنیا کا ہر غم بھول کر خود کو بس تمہاری ذات میں گم کر لینا چاہتا ہوں۔'' اس کا لہجہ یکدم ہی مخمور ہوگیا اور ماہ بانو کے لیے پھر ممکن نہ رہا کہ مٹے محبت پی کر بہتے ہوئے اس شخص کے جذبات کے آگے بند باندھ سکے۔ وہ بس اس منہ زور سمندر میں ڈوبتی ابھرتی رہ گئی۔

☆☆☆

''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ میرے پاس نئی پرانی شرابوں کی کئی اقسام ہیں۔'' توحید احمد اور فلک کے درمیان بے تکلفی کے مراحل اس تیزی سے طے ہوئے تھے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ بیڈروم تک لے آئی تھی اور اب ایک الماری کھولے ان سے پوچھ رہی تھی۔

''گویا تم یہ شغل بھی کرتی ہو؟'' وہ بہت آرام سے اس کے نرم گداز بستر پر بیٹھے ہوئے اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان کی پسند پوچھی تو کہے بغیر نہ رہ سکے۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرا شوہر ایک لینڈ لارڈ کا بیٹا تھا۔ اس طبقے میں شراب اور شباب کی فراوانی سے استعمال سے بھی آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ شروع شروع میں، میں اس کے اصرار پر صرف اسے خوش کرنے کے لیے پیتی تھی، بعد میں عادی ہوگئی۔ اب تو یہ مجھے اپنی دوست لگتی ہے جس میں ڈوب کر میں وقتی طور پر سہی، اپنے سارے دکھ

اور پریشانیاں بھول جاتی ہوں۔'' اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی کے رنگ جھلکنے لگے۔

''اوہ پلیز نو... اداس مت ہونا۔ قسمت سے اگر مجھے تم جیسی حسینہ کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل ہی گیا ہے تو میں اسے ہنس کھیل کر گزارنا چاہتا ہوں۔'' توحید احمد نے اسے فوراً ٹوک دیا۔

''او کے جناب! میں اداس نہیں ہوتی۔ آپ بتائیں کہ کیا پینا پسند کریں گے؟'' وہ سر جھٹک کر فوراً ہی اداسی کے نرغے سے نکل آئی اور ان سے ان کی پسند پوچھنے لگی۔

''تم میزبان ہو، جو پلا دو مجھے منظور ہوگا۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ شراب سے زیادہ تم مدہوش کر دینے والی چیز ثابت ہوگی اور تمہارے ہاتھ سے تو سادہ پانی پی کر بھی بندے کو نشہ ہو جائے گا۔''

سپر اسٹور میں نظر آنے والی ان کی بارعب شخصیت کہیں دب کر رہ گئی تھی اور اب صرف ایک ٹھیٹ عاشق نظر آ رہا تھا۔ فلک نے ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف دھیمے سروں میں ہنسنے پر اکتفا کیا اور ٹرے میں شراب کی بوتل کے ساتھ دیگر لوازمات سجا کر ان کے مقابل آ بیٹھی۔

''آپ شاید یقین نہ کریں کہ آج بہت عرصے بعد میں یوں کھل کر ہنسی ہوں۔'' گلاسوں میں شراب ڈال کر اس میں سوڈے اور برف کی آمیزش کرتے ہوئے اس نے ان سے کہا اور ایک گلاس انہیں تھما دیا۔

''ہماری دوستی کے نام۔'' گلاس منہ سے لگانے سے قبل توحید احمد نے اس کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا اور پھر ان دونوں نے بیک وقت سنہری رنگ کا وہ آتشیں محلول اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ فلک نے فی الحال دونوں کے لیے ہی چھوٹا پیگ تیار کیا تھا چنانچہ وہ تیزی سے اپنے گلاس خالی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فلک نے فوراً ہی دوبارہ ساقی گری کی ذمے داری سنبھال لی اور اس بار ڈبل پیگ تیار کیا۔

''تمہارے سابقہ شوہر کا ذوق بہت عمدہ ہے۔ شباب سے لے کر شراب تک اس نے ہر عمدہ شے جمع کی ہے۔'' فلک کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم پر ایک حریصانہ سی نظر ڈالتے ہوئے توحید احمد نے شاید شراب کی تعریف میں وہ کلمات ادا کیے تھے۔

فلک نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ''آپ انجوائے کریں توحید صاحب! میں ذرا چینج کر آؤں۔ اصل میں ان کپڑوں میں، میں کچھ ایزی فیل نہیں کر رہی ہوں۔''

''او کے جاؤ لیکن ذرا جلدی آنا۔'' توحید احمد نے ٹھیٹ عاشقوں کے انداز میں کہا اور گلاس ایک بار پھر لبوں سے لگا لیا۔ فلک لہراتی ہوئی ملحقہ باتھ روم میں گھس گئی۔ چھ سات منٹ لگا کر وہ واپس آئی تو اس حال میں تھی کہ بڑے بڑے زاہدوں کا ایمان ڈگمگا جائے۔ ٹی شرٹ اور جینز کی جگہ کپڑے کے جن دو چیتھڑوں نے لی تھی، وہ کہیں سے بھی لباس کہلائے جانے کے لائق نہیں تھے اور اس کا کندن سا بدن کسی کھلی کتاب کی طرح توحید احمد کے سامنے ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے ایک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کی یہ محویت نوٹ کی اور یہ دیکھ کر مزید مطمئن ہو گئی کہ درمیانی وقفے میں انہوں نے اپنا گلاس خالی کر لیا ہے۔

''آہ... شہزادہ سلیم نے تمہارا یہ روپ دیکھ لیا ہوتا تو انارکلی کو بھول جاتا۔ میرا بڑی شدت سے دل چاہ رہا ہے کہ کاش میں کسی ملک کا بادشاہ ہوتا اور اپنا تخت و تاج تمہارے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔'' توحید احمد نے لب کشائی کی۔ الفاظ میں اس کے لیے پذیرائی ہی پذیرائی تھی۔

''اصل میں مجھے بہت زیادہ کپڑے پہن کر سکون سے نیند نہیں آتی۔'' وہ جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''اور تمہیں اس حال میں دیکھ لینے والوں کی عمر بھر کی نیندیں اڑ جاتی ہوں گی۔'' وہ برجستہ بولے۔

''مجھے اس حال میں میرے شوہر کے سوا صرف آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں کوئی بازار میں بیٹھی طوائف نہیں جو سب مجھے یوں دیکھ سکیں۔'' اس کی ادائیں کچھ کہہ رہی تھیں اور زبان پر کچھ تھا۔ توحید احمد نے اس سے بحث نہیں کی اور اس کے اپنے قریب بیٹھنے پر اسے مخمور نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس نے غیر محسوس طور پر ایک جام اور تیار کر کے ان کے لبوں سے لگا دیا۔

''آپ میں کچھ انوکھا ہے جو آپ کے مختلف ایج گروپ کے ہونے کے باوجود مجھے آپ کی طرف کھینچ رہا ہے۔ آپ مجھ سے اپنا تفصیلی تعارف کروائیے نا۔ میں بھی جانوں کہ خاص دکھنے والے اس شخص کا ظاہر ہی اتنا شان دار ہے یا پھر بیک گراؤنڈ میں بھی کچھ ایسا ہے جو آپ کو خاص بنا رہا ہے۔'' انہیں اپنے ہاتھوں سے پلاتی وہ بہت لاڈ سے پوچھ رہی تھی۔ توحید احمد کے غبارے میں گویا ہوا بھر گئی اور وہ سرشاری سے ہنس دیے۔

''تم نے دیکھا ہی کیا ہے جانِ من! جب ہم جوانی فوج کی یونیفارم پہنتے تھے تو لڑکیوں کے غول کے غول ہم پر

منڈلانے لگتے تھے۔ کوئی اِدھر گرتی تھی تو کوئی اُدھر۔۔۔ اور ہم یوسفِ ثانی بنے بے نیازی سے گزرتے چلے جاتے تھے۔" ہاتھ سے لڑکیوں کے اِدھر اُدھر گرنے کا اشارہ کرتے ہوئے ان کی زبان میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ یقینی طور پر بنتِ انگور نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

"اب آپ کس عہدے پر ہیں؟" ان کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے فلک نے تجسس سے پوچھا۔

"اب ہم آرمی انٹیلی جنس میں کرنل کے عہدے پر کام کرتے ہیں۔ بڑا نام ہے ہمارا آرمی میں بھی۔ صدر اور وزیراعظم تک ہمارا دم بھرتے ہیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگایا ہے۔" ایسا لگتا تھا کہ وہ فلک کے سامنے اپنی شان بڑھا چڑھا کر بیان کرنا چاہتے ہوں۔ حالت بتا رہی تھی کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ نشہ گہرا ہوتا جا رہا ہے لیکن وہ پینے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ فلک بھی پوری مستعدی سے انہیں پلا رہی تھی اور ان کا گلاس خالی نہیں ہونے دے رہی تھی۔

"آپ تو واقعی سچ مچ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ آپ نے تو بڑے بڑے مجرموں کو ٹھکانے لگایا ہوگا؟" پلانے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں چڑھ جانے کا کام بھی کر رہی تھی۔

"یہ تو ہے۔ میری سروس بھری پڑی ہے ایسے کارناموں سے۔" انہوں نے ایک ہچکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ان مجرموں میں را کے جاسوس بھی ہوتے ہوں گے؟" یہ یقین ہونے پر کہ ان کا نشہ گہرا ہو چکا ہے اور دماغ مخصوص سمت میں چل رہا ہے، اس نے گفتگو کو نازک مرحلے میں داخل کیا اور خود ان سے کچھ اور بھی قریب ہو گئی۔

"را کے کتے تو میرا خاص شکار ہیں۔ جہاں ملیں، انہیں چُن چُن کر پکڑتا ہوں اور پھر ان کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا ہوں۔" انہوں نے نفرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

"سنا ہے پچھلے دنوں آپ نے اشیش کمار نامی کسی را کے ایجنٹ کو پکڑا ہے؟" وہ ان پر پوری طرح لد گئی اور واضح سوال کیا۔

"اشیش۔۔۔ کو۔۔۔ مار۔۔۔ یہ سالا کون ہے؟" انہوں نے اپنی کنپٹی کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے اس نے آپ کو اپنا نام غلط بتایا ہو۔ یہ وہ شخص ہے جسے آپ لوگوں نے پنڈی سے کافی دور ایک پسماندہ گاؤں سے پکڑا تھا۔ وہاں وہ مولوی کے بھیس میں رہ رہا تھا۔" فلک نے اس کی یادداشت بحال کرنے کے لیے اشارے دیے۔

"آ۔۔۔ چھا۔ وہ اشیش کو۔۔۔ مار۔ وہ سالا تو ابھی بھی میرے ہی پاس ہے۔" وہ مکمل طور پر بہکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"ہاں، وہی اشیش کمار۔ آپ نے اسے کہاں رکھا ہے؟ اس تک پہنچنے کا طریقہ بتائیں؟" اس نے دیکھا کہ کرنل اتنا مدہوش ہو گیا ہے کہ غنودگی میں جانے لگا ہے تو اس کا کالر پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ریلیکس ڈارلنگ ریلیکس۔۔۔ تمہیں اتنی بے تابی ہے تو میں خود تمہیں ہی اشیش کمار تک پہنچا دوں گا۔" یکدم ہی کرنل سیدھا ہو بیٹھا اور صاف لہجے میں سنجیدگی سے بولا تو فلک اچھل پڑی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ آنکھوں کی سرخی کے علاوہ کرنل توحید کہیں سے بھی شراب کے نشے میں محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ مجھے را کی کس ایجنٹ سے شرفِ ملاقات حاصل ہو رہا ہے؟" اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے انہوں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ میں کسی را کے ایجنٹ کو نہیں جانتی۔" وہ بدکی۔

"ساری جان پہچان ہم خود اگلوا لیں گے۔ میں اور میرے آدمی اس کام میں ایکسپرٹ ہیں۔" انہوں نے اسے اپنی نظروں میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آ رہا۔" وہ ان سے دور سرک کر تقریباً بیڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی تھی۔

"لیکن میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم سپر اسٹور میں زبردستی میرے گلے پڑ گئی تھیں۔ تمہارا ایکٹ کیا ہوا ڈراما کافی بھونڈا تھا۔ پھر پارکنگ میں کھڑی تمہاری جعلی نمبروں والی گاڑی نے بھی مجھے احساس دلایا کہ تم کچھ گڑبڑ چیز ہو۔ اس لیے تمہاری حقیقت جاننے کے لیے میں جان بوجھ کر تمہارے جال میں پھنستا چلا گیا۔ تم نے مجھے اپنے شباب اور شراب کے نشے میں ڈبونا چاہا تو بھی میں نے خود کو تمہارے سامنے بے بس ظاہر کیا اور بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ تم کن لوگوں کے لیے کام کر رہی ہو، یہ تو میں جان ہی چکا ہوں، اپنا باقی بائیوڈیٹا تم خود بتاؤ گی۔ شرافت سے بتاؤ گی یا ٹارچر روم میں، یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔" وہ بہت اطمینان سے بول رہے تھے۔ فلک جو بیڈ کے کنارے تک کھسک آئی تھی، یکدم ہی تیزی سے حرکت میں آئی اور سائڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ اٹھا کر انہیں کھینچ مارا۔ وہ ریلیکس نظر آنے کے باوجود ہوشیار تھے اس لیے فوراً جھکائی دے گئے اور پھرتی سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف دوڑتی فلک کو چھاپ لیا۔ اس کا نازک جسم ان کے لمبے چوڑے وجود کے نیچے پس کر رہ گیا لیکن وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی جو فوراً ہار مان لیتی۔ اس نے الٹا گرے گرے ہی اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کہنی کی زوردار ضرب کرنل کے پہلو میں پڑی۔ اس نے اس ایک ضرب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگاتار اپنے ہاتھوں پیروں اور سر کو حرکت میں لاتی چلی گئی۔ یقینی طور پر وہ ایک ماہر لڑاکا تھی جو انتہائی خراب پوزیشن میں ہونے کے باوجود اپنے دفاع سے دست بردار نہیں ہوئی تھی۔

کرنل کو مجبوراً اسے چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا اور انہوں نے بائیں پیر کی ایک زوردار ضرب اس کی کمر پر لگائی۔ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرائی اور یہ یقینی طور پر اس کی بدقسمتی تھی کہ دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بُری طرح چکرا گئی۔ کرنل نے فوراً موقع کا فائدہ اٹھایا اور ہتھیلی کی ایک جچی تلی ضرب اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ وہ لہرا کر فرش پر گر گئی۔ کرنل نے حقارت سے اس کے بے ہوش وجود کو دیکھا اور اپنے پاس موجود آپریٹس کا بٹن پش کیا۔ "اندر آ جاؤ۔" مختصر حکم دے کر انہوں نے آپریٹس واپس رکھ لیا اور خود اطمینان سے دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے شراب کی بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ گلاس اور دیگر سامان تو ان کی ہاتھا پائی میں اِدھر اُدھر گر کر برباد ہو گیا تھا لیکن بستر پر لڑھک جانے والی بوتل محفوظ رہی تھی اور اب وہ مزے سے نیٹ ہی پی رہے تھے۔ ان جیسے بلانوش کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی اور دو چار پیگ تو ان کے لیے پانی کی طرح بے ضرر ثابت ہوتے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے سامنے فرش پر پڑی حسینہ کو آسانی سے مات دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"اس کی تلاشی لو اور کپڑوں کو چھوڑ کر معمولی سے معمولی شے بھی الگ کر کے اپنے قبضے میں لے لو۔ دانت وغیرہ بھی اچھی طرح چیک کر لینا کہ کہیں اس نے کسی کھوکھلی ڈاڑھ میں کوئی زہریلا کیپسول وغیرہ نہ چھپا رکھا ہو۔ مجھے یہ لڑکی ہر حالت میں زندہ سلامت چاہیے، اس لیے خیال رکھنا کہ کسی صورت اسے سوسائڈ کا موقع نہ ملے۔ اسے مقامی یونٹ پہنچانے کے بعد اپنے انچارج سے کہو کہ مجھے رپورٹ کرے۔" وہ مفت ہاتھ آئی بوتل کا کام تمام کرنے میں لگے تھے کہ قدموں کی آہٹ ابھری اور ایک نوجوان سیکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ نوجوان نے اندر آتے ہی فوجی انداز میں انہیں سیلیوٹ مارا۔ وہ فوراً ہی اسے تفصیلی احکامات جاری کرنے لگے۔ ان کی ہدایات کو مستعدی سے ذہن نشین کرتا وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ کرنل بنتِ انگور سے لطف اندوز ہوتے خاموشی سے اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہے۔

☆☆☆

وہ بالکل چت لیٹا ہوا تھا۔ اپنے جذبات کو قابو کر لینے کے لیے اسے کافی مہلت مل گئی تھی اور اب اس پر طوفان کے گزر جانے کے بعد کی سی خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی میں اس کے موبائل کی وائبریشن نے معمولی سا ارتعاش پیدا کیا۔ رنگ ٹون اس نے جان بوجھ کر بند کی ہوئی تھی کہ وہ اس وقت اپنے اندر کی آوازوں کے سوا کوئی آواز نہیں سننا چاہتا تھا لیکن ماحول پر چھائے جمود کو توڑنے کے لیے صرف وائبریشن ہی کافی ہوئی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نام دیکھا۔ مشابرم خان کی طرف سے کال آ رہی تھی۔ اسے یکدم ہی یاد آیا کہ اس نے مشابرم خان کو ایک اہم ذمے داری سونپ رکھی تھی لیکن خود اس بُری طرح الجھ گیا تھا کہ اسے فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔ اتنے گھنٹوں بعد مشابرم خان کے کال کرنے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے، اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

"ہاں خان! بولو کیا بات ہے؟"

"صاحب! میں آپ کے حکم پر مسلسل بیگم صاحب کے پیچھے ہوں اور کسی بھی معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر ان پر نظر رکھ رہا ہوں۔ وہ کدھر کدھر گئیں، یہ تفصیل بتانے کا تو ابھی موقع نہیں ہے۔ ابھی میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کئی گھنٹے پہلے وہ ایک ہیجڑے والے آدمی کے ساتھ ایک گھر میں گئی تھیں۔ گھر کی چابی ان کے پاس تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ خود اس آدمی کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ کافی دیر ہو گئی، میں باہر چھپ کر ان کے نکلنے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن وہ باہر نہیں آئیں۔ البتہ سیکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں ایک آدمی جو پتا نہیں کہاں چھپا ہوا تھا، ابھی ابھی اندر گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اندر کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گھر کے اندر جا کر دیکھوں؟" مشابرم خان نے جلدی جلدی اسے مختصراً حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

"ابھی باہر رہ کر ہی نگرانی کرو اور مجھے گھر کا پتا لکھوا دو۔ میں خود وہاں آ رہا ہوں۔ اس دوران اگر کوئی گڑبڑ نظر آئے تو تم مجھے انفارم کر کے حرکت میں آ جانا۔" شہریار نے

اسے ہدایات دیں۔

”آپ ادھر لاہور میں ہی ہیں سر؟“ مشابرم خان حیران ہوا۔

”ہاں لیکن تم پہلے کام کی بات کرو اور مجھے پتا بتاؤ۔“ اس نے سختی سے جواب دیا۔ مشابرم خان نے گڑبڑا کر فوراً ہی پتا بتا دیا۔

”ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔“ وہ رابطہ منقطع کر کے جانے کے لیے کھڑا ہوا۔ اسی وقت ذیشان دستک دے کر اندر داخل ہوا۔

”میں تو تمہیں جگانے کے لیے آیا تھا لیکن لگ رہا ہے کہ تم تو پہلے ہی سے جانے کی تیاری کر رہے ہو۔“ اس نے ایک نظر میں ہی اس کی حرکات کو بھانپ لیا۔

”ہاں، مجھے جانا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کچھ دیر رک جاتے تو ہم تمہارے لائے ہوئے بندے کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم قیدی سے تمہاری موجودگی میں ہی تفتیش کر ڈالتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ کرنل صاحب آج کل لاہور میں ہی ہیں اور کرنل صاحب نے ہی اس آفت کی پرکالہ کو پکڑا ہے۔ اس وقت وہ ماڈل ٹاؤن کے ایک مکان میں موجود ہے اور تھوڑی ہی دیر میں میرا آدمی اسے لے کر پہنچ جائے گا۔“ ذیشان کے کہے کو غیر دلچسپی سے سنتا وہ ماڈل ٹاؤن کا نام سن کر چونک پڑا۔ مشابرم خان نے بھی تو اسے ماریا کی ماڈل ٹاؤن کے کسی مکان میں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

”مکان نمبر معلوم ہے تمہیں... ذرا مکان نمبر تو بتاؤ؟“ اس نے بے تابی سے ذیشان سے پوچھا تو وہ حیرت زدہ تو ضرور ہوا لیکن جواب دے دیا۔ اس کے جواب نے تصدیق کر دی کہ ذیشان جس آفت کی پرکالہ کا ذکر کر رہا ہے، وہ ماریا ہی ہے۔ وہ ڈھے جانے والے انداز میں واپس بیٹھ گیا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی وائبریشن پھر محسوس ہوئی۔ کال کرنے والا مشابرم خان ہی تھا۔

”سیجیرو والا اکیلا واپس جا رہا ہے سر... لیکن اس نے ابھی اپنی گاڑی آگے نہیں بڑھائی ہے۔ سیکیورٹی گارڈ کی گاڑی بالکل مکان کے دروازے کے ساتھ لگی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سیجیرو والا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ بتائیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟“ مشابرم خان کا لہجہ سخت ہیجان زدہ تھا۔ شہریار سمجھ گیا کہ ماریا کو مکان سے نکال کر یہاں لانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے اور کرنل صاحب یہ کام اپنی زیر نگرانی کروا رہے ہیں۔

”تم خاموشی سے وہاں سے نکل کر رانا ہاؤس چلے جاؤ خان! میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔“ اس نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دے کر فون بند کیا اور ذیشان کی طرف متوجہ ہو کر اسے مخاطب کیا۔

”پرل کانٹی نینٹل کے روم نمبر سکسی ایٹ پر ریڈ کرواؤ ذیشان۔ ممکن ہے وہاں سے ایک اور اہم مجرم تمہارے ہاتھ لگ سکے۔“

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟“ ذیشان حیران ہوا۔

”مسز جوزف کی۔ کرنل صاحب کی طرف سے بجوائی جانے والی قیدی ڈاکٹر ماریا جوزف کی ماں اور یقینی طور پر شریک جرم۔“ وہ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔ ماریا کے مشکوک ہونے کو محسوس کر لینے کے باوجود اس وقت وہ شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہوا تھا۔ شاید آج کا دن اس کے لیے تھا ہی سخت کہ اسے ایک کے بعد ایک امتحان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

ذیشان نے چاہے اس کی بات کا بیک گراؤنڈ پوری طرح نہ سمجھا ہو لیکن فوراً ہی حرکت میں آگیا اور ایک سہ رکنی پارٹی کو پرل کانٹی نینٹل کی طرف دوڑا دیا۔ شہریار البتہ سر تھامے ایک جگہ بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان حالات کا سامنا کیسے کرے۔ ماریا کا جو کردار سامنے آیا تھا، وہ اس کے نیک نام خاندان کی عزت کو بٹا لگانے کے لیے کافی تھا۔ یہ بے عزتی لیاقت رانا اور آفرین کے لیے ایک اور بڑا صدمہ ثابت ہوتی۔ وہ بے چارے پہلے ہی اتنے صدمے سہہ کر بیٹھے تھے، اس نئے صدمے سے جانے ان پر کیا گزرتی۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

”کیا بات ہے شہریار! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ ذیشان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

”میں تمہیں گواہ بنا کر کچھ کہنا چاہتا ہوں ذیشان!“ اس نے یکدم ہی اپنا سر اوپر اٹھایا۔ ”میں تمہیں گواہ بنا کر اپنی بیوی کو بقائمی ہوش و حواس طلاق دیتا ہوں۔ آج سے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مجھ پر حرام ہے۔“ وہ بہت روانی سے کہتا چلا گیا۔

”مگر کیوں دوست؟“ ذیشان حیران پریشان تھا کہ وہ اتنی اچانک اور اتنا ذاتی فیصلہ آخر اسے کیوں سنا رہا ہے؟

”وہ اس لیے کہ جب تم ڈاکٹر ماریا جوزف سے تفتیش کا آغاز کرو تو اسے صرف ملک دشمن کی حیثیت سے دیکھو اور میرا اس سے رشتہ تمہیں پریشان نہ کرے۔“ اس کا لہجہ بہت صاف تھا۔

”تو کیا ماریا جوزف تمہاری...؟“ ذیشان نے حیرت سے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں، وہ میری بیوی تھی۔ اپنی صفوں میں موجود غدار کو تلاش کرتے کرتے اس کا مشکوک کردار میرے سامنے آگیا تھا۔ اسی لیے آج کل میں اس کی نگرانی کروا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل میرے آدمی نے مجھے اس کی اسی مکان میں موجودگی کی اطلاع دی تھی جہاں سے بقول تمہارے ایک اہم مجرمہ کو گرفتار کر کے لایا جا رہا ہے۔“ اس نے ذیشان کو مختصراً آگاہ کیا۔

”اوہ... آئی ایم سوری۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔“ اس مختصر تفصیل نے ہی ذیشان کو اس کی کیفیت سمجھا دی۔

”تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میری حماقت تھی کہ میں اپنے گرد بُنے جانے والے جال میں پھنستا چلا گیا۔ ماریا میری زندگی میں بالکل اچانک آئی تھی اور حقیقتاً اس نے اس شادی کے لیے مجھے باقاعدہ ٹریپ کیا تھا۔“ ذیشان کو یہ بتاتے ہوئے وہ وقت کسی فلم کے منظر کی طرح اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا جب جانے کیسے وہ ماریا کے حسن کے آگے بے بس ہو گیا تھا اور پھر اپنی غلطی کی تلافی کے لیے اس سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت وہ اتنا شرمندہ تھا کہ اپنے بہکنے پر شدید حیران ہونے کے باوجود یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ اس کے خلاف کوئی چال چلی گئی ہے۔ شاید اس روز ماریا نے اپنے فلاسک میں سے اسے جو کافی پلائی تھی، اس میں ایسی کوئی دوا شامل تھی جس نے اس کے جذبات کو بھڑکا ڈالا تھا اور وہ جائز و ناجائز کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔ یہ بات اسے اس روز سمجھ نہیں آئی تھی لیکن آج بہت اچھی طرح سمجھ آرہی تھی۔

”میں تمہارے معاملے کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ ہمارے دشمن بہت فعال ہیں اور اس طرح سے جال پھینکتے ہیں کہ بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی پھنس جاتا ہے۔ میرے خیال میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ بلتستان کی پہاڑیوں میں تباہ ہونے والے دہشت گردوں کے اڈے والے کیس پر کام کرتے ہوئے ایک ایسی قتالہ مجھ سے ٹکرائی تھی جو صرف چند گھنٹوں میں مجھے بے وقوف بنا کر مجھ سے کافی معلومات اڑا لے گئی تھی۔ میں آج تک اسپیلی پار کرتا ہی اس حسینہ کا دیا زخم بھول نہیں سکا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مسلم ممالک کو چھوڑ کر دنیا بھر کی



سیکرٹ سروسز، عورتوں کو جاسوسی کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ عورت کے حسن اور چالبازیوں کے سامنے بڑے بڑے سورما ہار مانتے آئے ہیں۔ یہود و ہنود تو اس معاملے میں خصوصاً بڑے بے غیرت ہیں۔ اپنی عورتوں کو غیر مردوں کی بانہوں میں بھیج کر ان کے ذریعے اہم رازوں تک پہنچنا ان کا بڑا پرانا ہتھکنڈا ہے۔ ہم مسلمان اپنی مذہبی اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے اس انداز میں کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیکرٹ سروس میں خواتین کام بھی کرتی ہیں تو بہت محدود پیمانے پر... اور وہ بھی زیادہ تر دفاتر کے اندر۔“ ذیشان دلائل اور مثالوں سے اس کا احساسِ شرمندگی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اپنے کرنل صاحب اس جال میں پھنسنے سے کیسے بچ گئے؟“ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال ٹینشن کو جھٹک کر خود کو ماحول کا حصہ بنا لے تاکہ کم از کم ذیشان کی تسلی ہو جائے اور وہ ماریا کے ساتھ اسی طرح پیش آسکے جس کی وہ مستحق تھی۔

”اپنے کرنل صاحب بڑے عجیب و غریب بندے ہیں۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں پھر بھی نشے میں آؤٹ آف کنٹرول نہیں ہوتے۔ عورت کے بارے میں البتہ شریعت کے سخت پابند ہیں۔ بغیر نکاح کے کسی عورت سے تعلق قائم کرنے کو سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ اسی لیے تین خواتین کو اپنی زوجیت میں لے رکھا ہے۔“ ذیشان نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور بولا۔ ”تم خود ہی سوچو، ایسے بندے کو روایتی ہتھکنڈوں سے بھلا کیسے زیر کیا جا سکتا ہے؟ اگلوں کو مات تو ہونی ہی تھی۔“

”تمہارا آدمی ابھی تک پہنچا نہیں؟ میرے خیال میں ماڈل ٹاؤن سے یہاں تک کا راستہ اتنا زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے اتنی دیر لگ گئی۔“ باتوں کے دوران شہریار کو خیال آیا تو اس نے ذیشان کو احساس دلایا۔

”نارمل حالات میں اسے اب تک پہنچ تو جانا چاہیے تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ ٹریفک میں کہیں پھنس گیا ہو۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔“ اطمینان سے جواب دے کر وہ رابطے کی کوششیں کرنے لگا لیکن دوسری طرف سے اس کی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اسی وقت ایک شخص دستک دے کر اندر داخل ہوا اور رپورٹ دی۔

”پرل کانٹی نینٹل جانے والی ٹیم کی طرف سے رپورٹ آئی ہے سر! ہمارا ٹارگٹ وہاں سے ہٹ چکا ہے۔ روانگی سے قبل اس نے ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ نہیں کیا تھا لیکن ہمارے

آدمی کمرے کی تلاشی لے کر دیکھ چکے ہیں کہ وہاں سے زنانہ کپڑوں سے بھرے ایک بیگ کے سوا سب کچھ ہٹا لیا گیا ہے۔ وہ بیگ ہمارے آدمی اپنے ساتھ لے کر آرہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو واپس آنے دو، فی الحال ہمیں ایک دوسرا بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ میں اشرف کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا۔ اسے ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔" ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دیا تو وہ فوراً ایڑیوں کے بل واپس گھوم گیا۔

"میرے خیال میں ہم آپریشن روم میں چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں فوری رپورٹس ملتی رہیں گی اور میرے ماتحتوں کو بار بار بھاگ کر رپورٹ دینے یہاں تک نہیں آنا پڑے گا۔" ماتحت کے روانہ ہوتے ہی وہ خود بھی کھڑا ہوگیا اور شہریار سے بولا تو اس نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے آپریشن روم میں پہنچے۔ اس کمرے میں دو افراد پہلے سے موجود تھے جبکہ کمرا مختلف قسم کے مواصلاتی آلات اور کمپیوٹرز وغیرہ سے بھرا پڑا تھا۔

"سر! اشرف کی کسی اجنبی نمبر سے کال آئی ہے۔ وہ اس وقت شدید زخمی حالت میں ہاسپٹل میں موجود ہے۔" ذیشان کو دیکھتے ہی ایک آدمی نے ہیجان زدہ لہجے میں اطلاع دی۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ لمحوں قبل اسے پرل کانٹی نینٹل جانے والی ٹیم کی ناکامی کی خبر سنانے آیا تھا۔

"اوہ، پھر تو ہمیں بھی ہاسپٹل پہنچنا ہوگا۔" ذیشان فوراً الرٹ ہوگیا اور ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر وہ لوگ فوراً وہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں اس نے کرنل توحید کو بھی حالات سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اشرف کی جگہ ایک دوسرا شخص ان کی موجودہ قیام گاہ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ اصل میں ذیشان، کرنل توحید کی سیکیورٹی کی طرف سے بہت محتاط تھا اس لیے اس نے ہی زبردستی اصرار کر کے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ جب تک لاہور میں ہیں، ہی ایف پی کا ایک اہلکار ان سے دور رہ کر ان کی حفاظت کرتا رہے گا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اس کا فیصلہ مناسب تھا۔ کھیل شروع ہوگیا تھا اور اب وہ لوگ تیزی سے اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔

وقت کی اہمیت سے واقف ڈرائیور نے چند منٹوں میں ہی انہیں منزل تک پہنچا دیا۔ ذیشان نے شہریار کے علاوہ اپنے ایک ماتحت کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی وہ لوگ تیزی سے اتر کر شعبۂ حادثات کی طرف بڑھ گئے۔ ذرا سی پوچھ گچھ کے بعد انہیں اشرف تک پہنچنے میں کامیابی ہو گئی۔ وہ بُرے حال میں تھا۔ اسے چار گولیاں لگی تھیں، دو پیروں میں، ایک بازو پر جبکہ ایک گولی نے کان کی لَو اڑا دی تھی۔ وہ ہوش میں تھا لیکن کافی تکلیف میں اور نقاہت زدہ محسوس ہو رہا تھا۔

"تھینک گاڈ، آپ لوگ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مجھے تکلیف سے بچانے کے لیے ٹرنکولائزر دینے والا تھا لیکن میں آپ کو رپورٹ دینے تک ہوش و حواس میں رہنا چاہتا تھا۔" اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے یقیناً وہ شدید تکلیف برداشت کرنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اگر اس کا احساسِ فرض اتنی شدت سے نہ جاگ رہا ہوتا تو یقیناً وہ تکلیف سے بچ کر مسکن دوا کے زیرِ اثر سو رہا ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ سی ایف پی کا رکن ہی کیوں ہوتا؟ اس ادارے میں تو شامل ہی ان لوگوں کو کیا جاتا تھا جن کی حب الوطنی اور ایمان داری کا یقین ہوتا تھا۔

"شاباش اشرف! اب جلدی جلدی مجھے ساری رپورٹ دے دو تاکہ تم ریسٹ کر سکو۔" ذیشان نے اسے سراہا۔

"پہلے آپ برن وارڈ کے آئی سی یو پر کسی کی ڈیوٹی لگا دیں۔ میں جس عورت کو لے کر مرکز پہنچ رہا تھا، وہ اس وقت وہیں موجود ہے۔" اس نے ایک اہم اطلاع دی جسے سن کر ذیشان کے ماتھے پر شکنیں ابھریں لیکن اس نے زبان سے کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے ماتحت کو اشارہ کر دیا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ اب وہاں صرف وہ تینوں ہی تھے۔ طبی عملے کو پہلے ہی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

"اب بتاؤ۔" ذیشان نے اشرف سے کہا تو وہ شروع ہوگیا۔

"میں اور کرنل صاحب اپنی اپنی گاڑیوں میں اس مکان سے ساتھ ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ ماڈل ٹاؤن سے نکلنے کے بعد کرنل صاحب اپنے راستے پر چلے گئے اور میں مرکز کی طرف چل پڑا۔ اس مرحلے میں، میں اطراف سے ہوشیار رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا ہے لیکن پھر ایک نسبتاً سنسان سڑک پر میرا یہ یقین غلط ثابت ہوا اور اچانک ہی سامنے سے ایک گاڑی نے آکر راستہ روک لیا۔ گاڑی رکتے ہی ان لوگوں نے بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ میرا کان اور ہاتھ زخمی ہوگیا لیکن میں نے ہمت کی اور گاڑی سے اتر کر اس کی آڑ لیتے ہوئے خود بھی جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور میں تنہا اس





لیے وہ مجھ پر بھاری پڑ رہے تھے۔ مجھے دو گولیاں مزید لگ گئی تھیں۔ اتفاق سے آپ کے لیپ ٹاپ اور موبائل دونوں ہی گاڑی میں رہ گئے تھے اس لیے میں کسی کو کال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو سمجھیں غیبی مدد پہنچی اور فائرنگ کی آوازیں سن کر پولیس کی ایک موبائل نے وہاں کا رخ کرنے کی ہمت کر لی۔ پولیس موبائل کا سائرن سن کر حملہ آور فرار ہوگئے لیکن جاتے جاتے انہوں نے شدید فائرنگ کی اور میرے خیال میں جان بوجھ کر پیٹرول کی ٹینکی کو نشانہ بنایا۔ فوراً ہی گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں معاملہ بھانپ کر دور نہ ہٹ گیا ہوتا تو خود بھی اس آگ کی زد میں آ سکتا تھا۔ میرے شور مچانے پر جانے کس طرح جلتی ہوئی گاڑی سے قیدی لڑکی کو نکالا گیا لیکن اتنی دیر میں وہ اچھی خاصی جھلس چکی تھی۔ ہمیں ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ پولیس والے میرا بیان لینا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے یہ بات سمجھائی کہ یہ پولیس کا کیس نہیں ہے۔ میری درخواست پر مجھے ٹیلی فون فراہم کر دیا گیا اور اس طرح میں آپ تک اطلاع پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے پولیس آفیسر سے لڑکی کی حفاظت کے لیے برن وارڈ کے باہر سپاہی تعینات کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ اس نے میری بات مان لی ہوگی۔" اشرف نے بہت ہمت کر کے پورا قصہ سنا دیا تھا لیکن اس کی نقاہت زدہ آواز بتا رہی تھی کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔

"اوکے جوان! تم نے اپنا کام کر دیا اب دل بھر کر آرام کرو۔ باقی معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔" ذیشان نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شہریار بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا اور حیرت زدہ تھا کہ اس کی کسی کوشش سے قبل ہی کس طرح ماریا کے لیے اذیت ناک سزا کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

"تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟ وہاں کیا ہوا ہوگا؟" کمرے سے نکل کر برن وارڈ کی طرف جاتے ہوئے ذیشان نے اس سے اس کی رائے جاننی چاہی۔

"میرے خیال میں ماریا سے کام لینے والوں کو کسی طرح بازی پلٹنے کی خبر ہوگئی تھی۔ ہوسکتا ہے ماریا کی کرنل توحید کے ساتھ موجودگی کے دوران وہ ایسا کوئی آلہ استعمال کر رہے ہوں جس کی مدد سے وہاں ہونے والی گفتگو سنی جا رہی ہو۔ اسی لیے مسز جوزف بھی ہوٹل سے غائب ہوگئی اور کچھ لوگوں نے شاید ماریا کو چھڑانے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ انہیں ناکامی ہوئی ہے تو پیٹرول ٹینکی میں گولیاں مار کر ماریا کی موت کا انتظام کر گئے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن معلوم نہیں کچھ بتانے کے لائق ہے بھی یا نہیں۔" اس نے حالات کا تجزیہ پیش کر دیا۔

"میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ اب اللہ کرے کہ وہ اس قابل ہو کہ ہمیں کچھ کام کی باتیں بتا سکے۔" اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے خواہش ظاہر کی، جواباً وہ خاموش رہا لیکن ظاہر ہے اس کی بھی یہی خواہش تھی۔

"از ایوری تھنگ اوکے؟" آئی سی یو پہنچ کر اپنے آدمی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ذیشان نے پوچھا۔

"یس سر! لیکن پولیس والوں سے پتا چلا ہے کہ کچھ دیر پہلے یہاں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کسی آدمی نے ڈیوٹی نرس کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ اس کا دیا ہوا انجکشن مریضہ کو لگا دے تو بدلے میں اسے بھاری رقم ملے گی۔ نرس ڈر گئی اس لیے اس نے اس آدمی کو انکار کر دیا اور یہاں موجود پولیس والوں کو اطلاع دے دی۔ اس اطلاع پر نرس کی مدد سے اس مشکوک آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہاتھ نہ آسکا۔" انہیں جو کچھ سننے کو ملا، اس سے ظاہر تھا کہ ماریا کے سرپرست موت کا تحفہ لیے سائے کی طرح اس کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔

"بی کیئرفل۔ جب تک ہم اس کا بیان حاصل نہیں کر لیتے اس کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ چاہو تو کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا لو لیکن یہ یاد رکھنا کہ اندر پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔" سخت لہجے میں کہتا ہوا ذیشان اسے ساتھ لیے اندر گھس گیا۔ اندر ڈاکٹر اور ایک نرس موجود تھی۔

"میں اسپیشل برانچ سے ہوں اور مجھے مریضہ کا بیان لینا ہے۔" ڈاکٹر کو اپنا کارڈ پیش کرتے ہوئے ذیشان نے اس سے کہا۔

"میں آپ کو چند منٹ سے زیادہ اجازت نہیں دے سکتا۔ مریضہ ہوش میں ہے لیکن اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اتنی شدید تکلیف میں اسے زیادہ بولنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔" ڈاکٹر نے شاید اس کا کارڈ دیکھ کر ہی بادلِ ناخواستہ انہیں بیان لینے کی اجازت دے دی تھی لیکن واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آرہی ہے۔

"زیادتی کرنے والوں کو کبھی نہ کبھی خود بھی زیادتی برداشت کرنی پڑتی ہے ڈاکٹر صاحب! بہرحال، آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب آپ ہمیں ہمارا فرض ادا کرنے دیں۔" ذیشان نے ایک طرح سے ڈاکٹر کو وہاں سے جانے کا اشارہ دیا اور خود بیڈ پر دراز ماریا کی طرف متوجہ ہوا۔ شہریار

پہلے ہی اس طرف متوجہ تھا۔ سوختہ حال ماریا کے جسم کو کچھ ایسی ترکیب سے ڈھانپا گیا تھا کہ جسم کو ڈھانپنے والی چادر اس کے جسم سے ٹچ نہیں ہو رہی تھی اور صرف چہرہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کا بایاں رخسار بُری طرح جھلسا ہوا تھا اور بھویں غائب تھیں۔ ہونٹوں پر اب تک موجود سرخ سرخی نے اس ہیئت کذائی کے ساتھ مل کر اسے کسی خون آشام بلا کا سا روپ دے دیا تھا۔ اس حسن کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا جس کے زور پر وہ جانے کتنوں کو فتح کرتی رہی تھی۔

''مسٹر شہریار کو میرے ساتھ دیکھ کر تم یہ بات تو اچھی طرح سمجھ گئی ہو گی کہ تمہارا بھانڈا پوری طرح سے کھل چکا ہے اور تمہیں کہیں سے کوئی تحفظ نہیں مل سکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب بغیر کسی حیل وحجت کے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی جاؤ۔'' ذیشان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

''تم مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں اگلوا سکو گے۔ یہ بات تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ جتنی شدید تکلیف میں، میں اس وقت ہوں، اس سے زیادہ اذیت تم مجھے نہیں دے سکتے۔ اگر کوشش کی تو میں مر جاؤں گی لیکن تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' یقینی طور پر وہ بے پناہ تکلیف میں تھی اور جو کچھ کہہ رہی تھی، اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے بُری طرح جھلسے ہوئے جسم پر وہ آخر اور کیا تشدد کر سکتے تھے۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ اس کے چھالوں پر نمک چھڑک دیا جاتا لیکن ظاہر ہے کہ اس عمل سے وہ اتنی اذیت محسوس کرتی کہ فوری طور پر مر بھی سکتی تھی۔ پھر یہ کہ اس ترکیب سے وہاں جو شور مچتا، وہ الگ مسائل کا سبب بنتا۔ ملاقات کے لیے چند منٹ سے زیادہ کی اجازت نہ دینے والا ڈاکٹر تو ہنگامہ مچا دیتا اور پھر یہ میڈیا کا دور تھا۔ میڈیا والے تو ویسے ہی ہر جگہ اپنی ناک گھسانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس معاملے کی حساس نوعیت کو سمجھے بغیر کوئی بے وقوف رپورٹر چٹ پٹی اسٹوری بھی بنا سکتا تھا۔

ذیشان نے لحظہ بھر ان مسائل کے بارے میں سوچا اور پھر دروازے پر جا کر اپنے آدمی سے بولا۔ ''سوڈیم پینٹوتھل منگوالو۔ ہم اس کا استعمال کریں گے۔''

''آپ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ مریضہ کی حالت پہلے ہی بہت خراب ہے۔ وہ اپنی جان سے بھی جا سکتی ہے۔'' ڈاکٹر شاید آئی سی یو کے باہر ہی منڈلا رہا تھا۔ ذیشان کا حکم سن کر اس نے فوراً احتجاج کیا۔

''تم ہمیں کسی بات سے نہیں روک سکتے۔ میرا کارڈ دیکھ کر تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمیں ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔'' ذیشان نے اسے ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے سختی سے بولا۔

''لیکن یہ غیر انسانی سلوک ہے۔ بے شک یہ عورت کوئی مجرم ہو گی لیکن اس وقت یہ ایک مریضہ ہے جسے بہترین طبی امداد پہنچانا ہمارا فرض ہے۔'' ڈاکٹر پر فرض شناسی کا دورہ پڑا ہوا تھا اس لیے وہ اعتراض سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''انسانی سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، درندوں کے ساتھ نہیں۔ یہ عورت کتنے بھیانک جرائم میں ملوث ہے، تمہیں اندازہ نہیں۔ اگر ہم اس کی جان لے بھی لیں تو ان بے شمار لوگوں کے خون کی تلافی نہیں ہو سکتی جن کی جانیں اس کی وجہ سے گئی ہیں۔ ویسے بھی یہ موت کے قریب ہے۔ اگر ہم نے دیر کر دی تو ہو سکتا ہے طبعی موت مر جائے ورنہ اس کے اپنے ساتھی تو گھات لگائے بیٹھے ہی ہیں۔ اسے مروانے کی ایک کوشش تو کی ہی جاچکی ہے۔ اب کیا تم اس بات کے منتظر ہو کہ وہ اسپتال کے اس حصے کو ہی اڑا ڈالیں؟'' ذیشان نے تلخی سے جواب دیا۔

''پھر بھی ایک ڈاکٹر کس طرح یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے سامنے اس کی مریضہ کو...'' ڈاکٹر منمنایا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ شہریار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سی ایف پی کا اہلکار ہاتھ میں کسی محلول سے بھری چھوٹی سی بوتل اور سرنج لیے کھڑا تھا۔

''ایک شیشی گاڑی میں موجود میڈیکل باکس میں ہی موجود تھی اس لیے مجھے آفس سے منگوانے کی ضرورت نہیں پڑی۔'' اس نے سرنج اور بوتل تھماتے ہوئے بتایا۔

''او کے! ذرا تم اس ڈاکٹر کو سنبھالو۔ ہم اپنا کام کر لیں۔'' ذیشان فوراً ہی مصروف ہو گیا۔

''یقیناً تم اس کے اثر سے واقف ہو گی؟'' محلول سرنج میں بھر کر وہ ماریا کے قریب گیا اور اس کا جھلسا ہوا بازو چادر سے باہر نکالا۔ اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی حالت اتنی بُری تھی کہ ذرا سی حرکت پر خود ہی کراہ اٹھی اور بے بس ہو کر مغلظات بکنے لگی۔ ذیشان نے ان سنی کر کے سوئی اس کے بازو میں چبھو دی۔

''عام طور پر منجھے ہوئے سیکرٹ ایجنٹس کو اس کا زیادہ ڈوز دینا پڑتا ہے لیکن اس کی خراب حالت کی وجہ سے میں نے بہت معمولی ڈوز دیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے لیے اتنی مقدار کافی ہو گی۔'' وہ شہریار کو آگاہ کرنے لگا البتہ نظریں ماریا پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ فی الحال اس کی آنکھیں بند ہو گئی





تھیں لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ جلد آنکھیں کھول دے گی۔ شہریار خاموشی سے لیکن دلچسپی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کافی عرصے سے ان ملک دشمنوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کے باوجود اس کے لیے یہ طریقۂ کار نیا تھا کیونکہ بہرحال وہ کوئی تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ نہیں تھا اور سی ایف پی کے ساتھ اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ آخر ماریا نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی آنکھوں میں شعور کی کوئی رمق نہیں تھی اور دھندلاہٹ سی اتری ہوئی تھی۔

''تمہارا اصل نام کیا ہے؟'' ذیشان نے سوالات کا آغاز کیا۔

''کلارا اینڈرسن۔'' اس نے خوابیدہ سے لہجے میں جواب دیا جسے سن کر ہی وہ لوگ چونک گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اصلاً ہندو ہو گی لیکن اس کا جواب تو کچھ اور ظاہر کر رہا تھا۔

''تمہیں را کے لیے کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''دوران تعلیم ہی میں نے ان کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری ممی اس سے بھی پہلے سے ان کے لیے کام کر رہی تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''ہم یہودی ہیں۔'' اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

''پھر تمہیں را میں کیسے شامل کیا گیا؟'' ذیشان نے اضطراب سے پوچھا۔

''میری ممی کے سیکنڈ شوہر ایک ہندو تھے اور را کے لیے کام کرتے تھے۔ انہی کی وجہ سے پہلے ممی کو وہاں کام کرنے کا موقع ملا اور پھر میں بھی شامل ہو گئی۔''

''خود تمہارے والد یہودی تھے؟''

''ہاں۔'' اس نے تصدیق کی۔

''یعنی تم خود بھی ایک یہودی ہو پھر تم نے ہندوؤں کی سیکرٹ سروس کے لیے کام کرنا کیوں قبول کیا؟''

''عظیم اسرائیل کے مفاد کے لیے۔ میری ممی نے اپنے پہلے شوہر کے مرنے کے بعد انیل مکرجی سے شادی کی ہی اس لیے تھی کہ وہ جانتی تھیں کہ انیل مکرجی را کا ایجنٹ ہے اور پاکستان میں رہ کر را کے لیے کام کرتا ہے۔'' انہیں اس سے تفتیش تو دوسرے پہلو پر کرنی تھی لیکن ابتدا ہی میں گفتگو کچھ ایسے رخ پر چلی گئی تھی کہ حیرت انگیز انکشافات ہو رہے تھے۔

''یعنی تمہاری ممی حقیقت میں موساد کی ایجنٹ ہیں اور تم بھی؟'' ذیشان نے فوراً نتیجہ اخذ کر لیا۔

''ہاں۔'' جواب دیتے دیتے اس نے سر جھٹکا۔

''یہ اپنے حواسوں میں واپس آ رہی ہے۔ اسے مزید ڈوز دینی پڑے گی۔'' ذیشان بڑبڑایا اور پہلے کے مقابلے میں ذرا زیادہ دوا اس کے بازو میں انجیکٹ کی۔

''تم ماں، بیٹی ڈبل ایجنٹ بن کر رہ رہی ہو اور را کے ساتھ تمہارا معاملہ اس لیے چل رہا ہے کہ دونوں ہی طرف کے لوگ پاکستان کے دشمن ہیں؟''

''ہاں، ہم مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اور ہر صورت انہیں نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''اس مقصد کے لیے تمہاری کیا حکمتِ عملی ہے؟'' ذیشان نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تمہارے لوگوں کے ذہنوں کو برباد کر دیں گے۔ ہم نے تمہارے ملک میں نشے اور اسلحے کی وبا اس بُری طرح پھیلا دی ہے کہ اب تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کر دو گے۔ را کے تعاون سے ہم نے تمہارے کئی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں اپنے ایسے ایجنٹس پھیلا دیے ہیں جو ناپختہ ذہنوں میں بغاوت کا بیج بو کر انہیں دہشت گرد بنا رہے ہیں۔ آنے والے وقتوں میں یہ شدت پسند تمہارے ملک کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ تم دنیا میں اتنے بدنام ہو جاؤ گے کہ عالمی برادری تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ خاص طور پر طرم خان بننے والا امریکا جو پہلے ہی تمہارا دوست نہیں اور بھی دشمن بن جائے گا۔'' وہ فخر سے بتاتی جا رہی تھی۔

''کیسے؟'' ذیشان نے صرف ایک لفظی سوال کیا۔

''جب تمہارے ہاں سے بھاری مقدار میں وہاں ہیروئن سپلائی کی جائے گی تو وہ کیسے تمہیں بخشے گا؟''

''امریکا تو تمہارا سب سے بڑا سپورٹر ہے پھر تم لوگ وہاں کیوں ہیروئن پھیلا رہے ہو؟''

''اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے...'' یکدم ہی اس کی آواز ڈوبنے لگی اور تنفس بے ترتیب ہونے لگا۔ ذیشان نے لب بھینچ لیے پھر ڈاکٹر کی طرف مڑا۔

''اسے دیکھو ڈاکٹر۔'' ڈاکٹر پہلے ہی ماریا جو کہ اصل میں کلارا اینڈرسن تھی کی حالت دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے آکسیجن ماسک لگایا اور پہلے سے جاری ڈرپ کے کینولا میں ہی دو تین انجکشن پے در پے داخل کر دیے۔ ذرا دیر کے لیے لگا کہ اس کی حالت سنبھل

رہی ہے اور سانس ہموار ہوتی جارہی ہے لیکن پھر اچانک ہی اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا اور ڈاکٹر کی کوششوں کے باوجود وہ ایک ڈیڑھ منٹ کے دورانیے میں ساکت ہوگئی۔

''شی از نو مور۔'' ڈاکٹر نے پلٹ کر مایوسی سے بتایا۔

''مجھے اندازہ تھا۔ اس حالت میں اگر اس کی جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو دو منٹ بھی ہمارے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکتی تھی لیکن یہ کلارا اینڈرسن تھی، موساد کی وفادار رہ کر را کے لیے کام کرنے والی ڈبل ایجنٹ۔ اس کے اعصاب عام عورتوں کے مقابلے میں بہت مضبوط تھے جو یہ اتنا بھی جی گئی۔'' ڈاکٹر کی بات سن کر ذیشان نے تبصرہ کیا پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس عورت سے انسانیت کی عمومی قدروں سے ہٹ کر اس طرح پیش آنا کیوں ضروری تھا۔ اگر یہ ہمیں کچھ بھی بتائے بغیر مر جاتی تو یہ ملک و قوم کے حق میں کسی صورت مناسب نہیں ہوتا۔ اب بھی یہ بہت سے راز اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔ اس عورت سے حب الوطنی کا سبق سیکھنا اور جو کچھ سنا اسے بالکل بھول جانا۔ اگر اس کمرے میں ہونے والی گفتگو لیک آؤٹ ہوئی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''آپ بے فکر رہیں سر! میں اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہوئے اس گفتگو کو ہمیشہ راز رکھوں گا۔'' ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا پھر خیال آنے پر چونک کر پوچھنے لگا۔ ''ڈیڈ باڈی کا کیا کرنا ہے؟ کیا اسے آپ کے لوگ اپنے ساتھ لے جائیں گے؟''

''اس لاش کو لاوارث لاشوں میں شامل کر دو۔'' ذیشان کے جواب دینے سے قبل شہریار نے سرد مہری سے جواب دیا تو اس نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا کر اس کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ زبردستی اس کی زندگی میں شامل ہونے والی اس دھوکے باز عورت کا یہی انجام مناسب تھا۔

☆☆☆

''کلارا تو اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گئی ہے۔ اس سے ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ موساد والے را کی مدد سے یہاں کیا کھیل کھیل رہے ہیں لیکن افسوس کہ ہمیں اس سے ان کے طریقۂ کار اور خاص آدمیوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اشیش کمار سے بھی ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ اتنی بارآور ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ اس نے ہمیں اپنے جن ٹھکانوں کے بارے میں بتایا تھا، وہ خالی پڑے ہیں۔ مسلسل ہاتھ پیر مارنے کے باوجود ہمارے آدمیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔'' وہ دونوں ذیشان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ذیشان کے لہجے میں شدید افسوس تھا۔

''میرے خیال میں اگر ہم تھوڑی احتیاط سے کام لیتے تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ کلارا کو صرف ایک آدمی کے ساتھ یہاں بھیجنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔ اگر اشرف کو کور دینے کے لیے کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہوتے تو حملہ آوروں سے بہتر طریقے سے نمٹا جا سکتا تھا۔'' شہریار نے خیال آرائی کی۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کرنل صاحب کو خود بھی افسوس ہے کہ انہوں نے عجلت میں یہ قدم اٹھا لیا۔ بس اس وقت ان کے ذہن میں یہ تھا کہ جلد از جلد لڑکی کو ہماری تحویل میں پہنچا دیا جائے۔'' ذیشان خود کفِ افسوس مل رہا تھا۔

''گھر کی تلاشی لینے پر بھی کچھ نہیں ملا؟''

''ہاں، وہ گھر صرف ہفتے بھر پہلے اسٹیٹ ایجنسی کی مدد سے کرائے پر لیا گیا تھا اور کرائے پر لینے والے نے اپنے جو کوائف ظاہر کیے، وہ جعلی ثابت ہوئے ہیں۔ ابھی رات بیتی نہیں تھی لیکن سی ایف پی والوں نے تیزی سے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ رات گئے تک کھلی رہنے والی اسٹیٹ ایجنسی سے معلومات حاصل کر کے ان کی تصدیق کا کام بھی کر چکے تھے۔''

''ایسا تو ہونا ہی تھا۔ دنیا کا کوئی بھی سیکرٹ ایجنٹ کوشش کرتا ہے کہ اپنے پیچھے کوئی کلیو نہ چھوڑے، یہاں تو را کے ساتھ ساتھ موساد کے ایجنٹ بھی برسرِ پیکار تھے۔'' شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہاں، موساد والے را کے ایجنٹس سے کہیں زیادہ ذہین اور بہادر ہوتے ہیں۔ کلارا کی جامہ تلاشی سے حاصل ہونے والا سامان اگرچہ گاڑی کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی جیولری وغیرہ کی آڑ میں خودکشی کا کوئی سامان اور حساس مائیکرو فون ضرور ہو گا جب ہی تو اس کی ماں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔۔۔ اور کلارا کو بھی چھڑانے اور ناکامی کی صورت میں مروانے کی کوشش کی گئی۔''

ذیشان نے اس کی تائید میں دلیل پیش کی پھر ذرا پُرخیال انداز میں بولا۔ ''شہریار۔۔۔ میں ایک پوائنٹ پر غور کر رہا ہوں۔ آخر ایسی کیا بات تھی کہ ان لوگوں نے تم پر اتنی خاص نظر رکھنا ضروری سمجھا کہ کلارا سے تمہاری شادی ہی کروا ڈالی؟''

''میں انجانے میں ان کی راہ پر لگ گیا تھا۔ نور پور میں ہونے والے بم بلاسٹ کے بعد میں نے اللہ آباد کے اس مدرسے کو دریافت کر لیا تھا جہاں را کا ایک ایجنٹ شاہنواز کے روپ میں گاؤں کے معصوم اور بھولے بھالے بچوں کی برین واشنگ کر رہا تھا۔ پھر میں درما تک بھی جا پہنچا تھا اور اشیش کمار کی گرفتاری میں بھی میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ شامل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ سب ٹھیک ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ آخر اس علاقے میں وہ لوگ اتنے سرگرم کیوں ہیں؟ کلارا تو چلو تمہاری نگرانی کر رہی تھی لیکن اس کی ماں کیوں پیر آباد میں رہ رہی تھی؟ وہ کلارا سے کہیں زیادہ سینئر اور منجھی ہوئی ایجنٹ تھی پھر اسے کیوں ایک گاؤں میں ڈال دیا گیا؟ اسکول میں ٹیچنگ کے ذریعے بچوں کے ذہنوں کی برین واشنگ کرنے والا کام بھی مجھے اس کے اسٹینڈرڈ کا نہیں لگتا۔ پیر آباد میں یقیناً کچھ اور بھی خاص بات ہے جو سنتھیا جوزف وہاں موجود تھی۔'' ذیشان کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پیر آباد میں تو چودھری افتخار کا ہی سکہ چلتا ہے بلکہ وہ اتنا بااختیار ہے کہ اردگرد کے دیہاتوں کے دوسرے چودھری بھی اس سے دبتے ہیں۔ میری اصل جنگ تو شروع ہی چودھری سے ہوئی تھی۔ میں اس کے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہوا تھا اور پھر پتا نہیں کیسے یہ را اور موساد کا چکر شروع ہو گیا۔'' وہ خود بھی الجھنے لگا۔

''ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چودھری خود بھی درونِ خانہ ان ملک دشمن ایجنٹوں سے ملا ہوا ہو؟ تم نے کلارا کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کلارا کو تم تک پہنچانے میں چودھری کا پورا ہاتھ تھا۔ بظاہر تمہیں اپنی مظلومیت کی کہانی سنا کر تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے والی کلارا شاید شروع ہی سے چودھری سے تعاون کر رہی تھی یا پھر یہ کہ چودھری اس سے تعاون کر رہا تھا اور اصل منصوبہ اسی کا تھا۔ اگر تم غور کرو تو تمہارے گرد بہت خوب صورتی سے جال بُنا گیا۔ تمہاری نیچر کے بارے میں تو چودھری شروع میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ تمہیں کسی بازاری عورت کے ذریعے قابو میں نہیں کیا جا سکتا اس لیے انہوں نے تمہیں شادی کے جال میں پھانس کر اپنی ایک اہم ایجنٹ کو تمہارے قریب کر دیا تاکہ تمہارے ہر عمل پر نظر رکھ سکیں۔ اب تم غور کرو کہ تمہاری وجہ سے چودھری کو کہاں کہاں رکاوٹ کا سامنا تھا اور اپنی شادی کے بعد کن معاملات سے تمہاری نظر ہٹ گئی۔'' ذیشان بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا، خود وہ بھی سوچ میں ڈوب گیا۔



''بنیادی طور پر میرے چودھری سے دو ہی اختلافات ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ خاص طور پر تعلیم کا سخت مخالف ہے۔ دوسرے میں نے سابقہ فاریسٹ آفیسر اور ایس پی کے گٹھ جوڑ سے کی جانے والی لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ پر سخت پہرا لگوا دیا ہے۔ موجودہ فاریسٹ آفیسر اور ایس پی دونوں ہی پہلے والوں سے بہت بہتر ہیں اس لیے چودھری کا دھندا ٹھپ ہو گیا ہے۔'' سوچتے ہوئے اس نے چودھری سے اپنے اختلافات کی وجوہات بیان کیں۔

''نہیں یار! یہ دونوں ہی پوائنٹ ایسے نہیں ہیں جن کی وجہ سے موساد والے تمہاری راہ پر لگ جائیں۔ تعلیم و ترقی کے معاملے میں چودھری کا جو رویّہ ہے، وہ ہمارے جاگیرداروں کے ہاں عام ہے۔ رہی اسمگلنگ والی بات تو لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ سے بھی را یا موساد جیسی ایجنسیوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ یہ سارے ہمارے اندرونی مسائل ہیں جو ہر جگہ ہیں۔ اس لیے بالخصوص تمہارے علاقے میں ان کے سرگرم ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔'' ذیشان نے دونوں ہی پہلوؤں کو فوراً رد کر دیا۔

''بات تمہاری بھی صحیح ہے لیکن اگر چودھری کے را یا موساد میں سے کسی سے روابط ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ بے شک چودھری کا اعلیٰ افسران میں اٹھنا بیٹھنا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کی ایسے اہم ملکی رازوں تک پہنچ ہو گی جن سے کسی غیر ملکی خفیہ ایجنسی کو دلچسپی ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہے تو اس صورت میں تو انہیں بالکل بھی مجھے نہیں چھیڑنا چاہیے تھا تاکہ جو کام خاموشی سے چل رہا ہے، وہ چلتا رہے۔'' اس نے فوراً قائل ہوتے ہوئے خود بھی صورتِ حال کا تجزیہ کیا۔

''یہ ملکی راز اِدھر سے اُدھر کرنے والا معاملہ نظر نہیں آتا۔ اگر تم کلارا کی باتوں کو یاد کرو تو ہمیں ان کے تین ہدف نظر آتے ہیں۔ کسی بھی قسم کی تعلیم کے ذریعے ذہنوں کی برین واشنگ کرنا۔ ہیروئن کے پھیلاؤ اور اسلحے کے ذریعے دہشت گردی کا فروغ۔ اور دیکھا جائے تو ان تینوں طریقوں سے بھی وہ ایک ہی ہدف حاصل کر رہے ہیں۔۔۔ ہماری یوتھ کو ناکارہ بنانا۔ اب اگر ہم ان معاملات میں چودھری کے کردار کو دیکھیں تو صرف وہ ایک اکیلا ہی کیا، اس کے دوسرے بھائی بند بھی اپنی رعایا کو جدید تعلیم سے محروم رکھ کر پہلے ہی ان سے تعاون کر رہے ہیں۔ چودھری اگر ان سے تعاون کر سکتا ہے تو ہیروئن اور اسلحے کے پھیلاؤ کے سلسلے میں۔ اور اب تک

ان دونوں معاملات میں اس کے ملوث ہونے کی کوئی سن گن نہیں ملی ہے۔ اس لیے فی الحال ہم اس امکان کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ویسے بھی جہاں تک میں سمجھا ہوں، چودھری کو جو بھی اہمیت ہے، وہ علاقے کے حوالے سے ہے اور تم وہ واحد بااثر شخص ہو جو اختیارات کے معاملے میں چودھری سے ٹکر لے سکتے ہو اس لیے وہ تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''اور علاقے میں سب سے اہم شے ہے پیر آباد سے متصل جنگل۔'' وہ خود بھی ذیشان کے تجزیے میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

''بالکل صحیح... اور اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہاں جنگل میں ایسی کیا خاص بات ہے جو موساد والے براہ راست دلچسپی لے رہے ہیں۔ کلارا کی ماں جس کا نام ہم فی الحال سنتھیا جوزف ہی مان لیتے ہیں، پیر آباد میں آخر کس لیے سکونت پذیر تھی؟ وہاں ایسا کیا ہو رہا ہے کہ موساد کی ایک ایجنٹ کی وہاں مستقل موجودگی کو ضروری سمجھا گیا؟'' ذیشان نے سوالات اٹھانے شروع کیے تو اس کا ذہن بھی کھلتا گیا اور یہ بات بھی یاد آ گئی کہ جب وہ اقبال باجوہ کی جگہ کسی ایمان دار فاریسٹ آفیسر کی تقرری کے لیے کوشاں تھا تو اسے ماریا نے ہی عابد انصاری کا نام تجویز کیا تھا۔ موجودہ حالات میں سوچا جا سکتا تھا کہ بظاہر فرض شناس اور ایمان دار آفیسر نظر آنے والا عابد انصاری انہی کا کوئی ایجنٹ ہوگا۔ اس نے فوراً ہی ذیشان کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔

''تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔ اب ہمیں اتنا کرنا ہے کہ عابد انصاری کی خفیہ نگرانی کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے تعاون سے مخبروں کا ایسا جال بچھا دیں جو ہمیں اندر کی خبر لا کر دے سکیں۔ اس سلسلے میں تم ہی زیادہ بہتر کام کر سکتے ہو اس لیے کہ تمہارے مقامی آبادی میں روابط ہیں۔'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کر دیا۔

''ڈونٹ وری۔ میں یہ معاملہ سنبھال لوں گا۔ اب میرا یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے کہ کس طرح میرے راز لیک آؤٹ ہو رہے تھے اس لیے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ کانفیڈنٹ ہوں۔''

اس نے ذیشان کو تسلی دی تو وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلو یہ معاملات تو طے پا گئے۔ بہتر ہے کہ کچھ دیر نیند لے لی جائے۔ صبح پھر تمہیں روانہ ہونا ہوگا اور مجھے بھی باقی کی بھاگ دوڑ کرنی ہوگی۔''

شہریار نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور خود بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ذیشان اسے اپنے ساتھ اس کمرے تک لے گیا جہاں وہ کچھ گھنٹے قبل بھی موجود تھا اور خود کو ماہ بانو کی شادی کے صدمے سے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کہاں جانتا تھا کہ چند گھنٹوں بعد خود اس کی اپنی شادی شدہ زندگی ختم ہو جائے گی اور اسے ایک اور بڑے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔

''ایک بات پوچھوں شہریار؟'' کمرے کے دروازے پر رک کر ذیشان اس سے مخاطب ہوا تو وہ زبان سے کچھ کہے بغیر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ویسے تو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے لیکن میں صرف اس وجہ سے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ ایک دوست کی حیثیت سے اگر تمہیں ضرورت محسوس ہو تو میں تمہاری مدد کر سکوں۔'' وہ سوال کرنے سے جھجک رہا تھا اس لیے تمہید باندھی۔

''کیا تم ماریا کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟'' شہریار نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

''ہاں، تم نے اسے لاوارث لاشوں میں شامل تو کروا دیا لیکن ظاہر ہے لوگ اسے تمہاری بیوی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ تم اس کے اچانک غائب ہو جانے کی کیا وضاحت دو گے؟''

''تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟'' اس نے ذیشان کو غور سے دیکھا۔

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ تم اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی تسلی کے لیے یہ کہہ سکتے ہو کہ ماریا کا ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ماں کی خواہش پر اس کی تدفین پاکستان کے بجائے امریکا میں کی جائے گی۔ اس طرح تم ماں بیٹی کی عدم موجودگی کا جواز پیدا کر سکو گے۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ماریا کے مرنے کی خبر پھیلا دی تو میرے گرد افسوس کرنے والوں کا ہجوم لگ جائے گا اور مجھے اس عورت سے اتنی نفرت ہے کہ میں اس کے لیے خود کو جھوٹ موٹ بھی افسردہ ظاہر نہیں کر سکتا۔'' اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

''پھر...؟ اس کے علاوہ کیا کرو گے تم؟''

''میں بتا دوں گا کہ میں نے ڈاکٹر ماریا کو ذاتی وجوہات کی بنا پر طلاق دے دی ہے اور وہ طلاق کے بعد اپنی ماں کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد کسی میں یہ جرأت نہیں ہوگی کہ مجھ سے طلاق کی وجوہات دریافت کر سکے۔'' وہ بڑے بے تاثر لہجے میں اپنا پروگرام





بتانے لگا جس سے ذیشان کو اندازہ ہوا کہ سارا وقت اس کے ساتھ مصروف رہنے کے باوجود اس کا ذہن اپنے مسئلے کے حل کے لیے بھی سوچتا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم مناسب سمجھو۔'' وہ اس کا شانہ تھپک کر واپس مڑ گیا تو شہریار بھی اندر جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ بستر پر لیٹ کر گھڑی پر نظر پڑی تو اسے اندازہ ہوا کہ صبح ہونے ہی والی ہے۔ اسے خیال آیا کہ گزری رات میں اس کے علاوہ یقیناً ماہ بانو نے بھی رت جگا ہی منایا ہوگا لیکن فرق اتنا تھا کہ وہ آباد ہوئی تھی اور وہ خود برباد... لیکن اس کے لیے ماہ بانو کی آبادی اپنی بربادی سے زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ دل میں ایک اطمینان سا محسوس کرتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور حیرت انگیز طور پر نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ شاید اس لیے کہ آج وہ ایک بوجھ کی طرح زندگی میں شامل رہنے والے رشتے سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سنتھیا جوزف کسی زخمی شیرنی کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کی حیثیت سے اس کی ساری زندگی قربانیاں دیتے ہوئے گزری تھی۔ وہ برسوں سے اپنے عزیز و اقارب سے کٹ کر اپنے وطن سے اتنی دور رہی تھی۔ اپنے عزیز شوہر اینڈرسن کی موت کے بعد دلی جذبات کے برخلاف را کے ایک ایجنٹ سے شادی کرنا اور پھر را میں اپنے لیے جگہ بنانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ کئی بار اپنی آبرو کی قربانی بھی دے چکی تھی۔ ایک عام عورت جیسی معمولی نوعیت کی لیکن انمول خوشیاں تو کبھی اس کا مقدر بن ہی نہیں سکی تھیں۔ سیکرٹ ایجنٹ کی زندگی نے اس سے ایک گھریلو عورت کا سکھ چھین لیا تھا لیکن وہ پھر بھی خوش تھی کہ وہ اپنے وطن کے لیے کچھ کر رہی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے دل میں بھی اسرائیل کی محبت پروان چڑھائی تھی چنانچہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی معاون و مددگار بھی بن گئی تھی۔

کلارا کو اپنے ڈھب سے پالنے میں اسے اس لیے مشکل نہیں ہوئی تھی کہ اس کا دوسرا شوہر انیل مکرجی اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے عموماً گھر سے دور ہی رہتا تھا پھر شادی کے صرف پانچ سال بعد وہ ہارٹ اٹیک سے مر گیا تو اس کی راہ کی ہر دیوار ہٹ گئی۔ انیل مکرجی چونکہ پاکستان میں جوزف کے نام سے عیسائی بن کر رہ رہا تھا، اس لیے اسے مسز سنتھیا جوزف کے نام سے پکارا جاتا تھا جبکہ اپنی بیٹی کلارا اینڈرسن کو اس نے ہر جگہ ماریا جوزف کا ہی نام دیا تھا۔ کاغذات کی رو سے وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی ایک پاکستانی لڑکی تھی لیکن سنتھیا نے اپنے بڑوں سے وعدہ لے رکھا تھا کہ جب بھی ماریا اسرائیل واپس جانے کی خواہش کرے گی، اسے وہاں کلارا اینڈرسن کے نام سے شہریت دے دی جائے گی۔ اپنی زندگی کے خشک تجربے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کلارا کو طویل عرصہ وطن سے دور رہ کر جاسوسی کرنے پر مجبور نہیں کرے گی بلکہ چند سال میں اسرائیل واپس بھیج کر وہاں کسی معقول شخص سے اس کی شادی کروا دے گی۔ اس نے بہت سال کام کیا تھا اور آنے والے وقت میں ریٹائر ہو کر اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ زندگی کا لطف لینا چاہتی تھی لیکن اس کا ہر خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ کلارا کے دنیا میں نہ رہنے سے اس کے لیے آنے والے کل کے لیے کوئی پلاننگ، کوئی خوشی باقی نہیں رہی تھی اور یہ دکھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

''بیٹھ جاؤ سنتھیا! تمہارے اس طرح ٹہلنے سے ماریا واپس نہیں آ جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا غم بہت بڑا ہے لیکن ایسا تو ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم جو کام کر رہے ہیں، اس میں جان کی بازی ہارنے کا سب سے زیادہ ڈر رہتا ہے۔'' اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ورما کچھ دیر تو اسے ٹہلتا ہوا دیکھتا رہا لیکن پھر ٹوکنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے سنتھیا اور ماریا کی موساد سے وابستگی کا قطعی علم نہیں تھا لیکن را کی ایجنٹس کے علاوہ ان کے ماں بیٹی ہونے سے بہرحال واقف تھا۔

''ماریا کے واپس آنے کا تو میں تب سوچوں گی جب مجھے اس کے چلے جانے کا یقین آئے گا۔ مجھے بتاؤ ورما کہ میری بیٹی کیسے مر گئی؟ میں نے تمہارے کہنے پر اسے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا تو کیا تمہارا فرض نہیں بنتا تھا کہ اس کی پروٹیکشن کا بھی خیال رکھتے۔ وہ اتنے اہم مشن پر تھی اور تمہارا کوئی آدمی اسے کور دینے کے لیے قرب و جوار میں موجود نہیں تھا۔ کرنل کے اس کی اصلیت جان لینے کے بعد اس گھر سے روانہ ہونے تک تمہیں اتنی مہلت ملی تھی کہ اگر تمہارے آدمی کہیں نزدیک میں ہوتے تو اٹیک کر کے ماریا کو چھڑا سکتے تھے۔ لیکن تم نے تو میری بچی کو موت کے منہ میں اکیلا ہی چھوڑ دیا تھا۔'' وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور ٹیبل پر ایک ہاتھ ٹکاتے ہوئے غصے سے بولی۔

''مجھے ماریا کی صلاحیتوں پر پورا وشواس تھا۔ میں سمجھتا

تھا کہ وہ کرنل کو اس طرح قابو کرے گی کہ وہ اس کے آگے بے بس ہو جائے گا۔ لیکن وہاں تو کہانی ہی الٹ گئی۔ پھر بھی میں نے جو کچھ کرنا ممکن تھا، وہ کیا۔ میرے آدمی بہت تیزی سے ماریا کی مدد کے لیے پہنچے تھے اور انہوں نے اس گاڑی کو گھیر بھی لیا تھا۔ انہیں مقابلے میں کامیابی بھی مل جاتی لیکن اسے ماریا کی بیڈ لک کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو وہاں پولیس موبائل پہنچ گئی اور دوسرے اتفاقاً ہی ایک گولی گاڑی کے پیٹرول ٹینک میں لگ گئی۔ مجھے خود اپنی اتنی ذہین ورکر کو کھونے کا دکھ ہے لیکن میں اس کا نصیب تو نہیں بدل سکتا تھا نا؟'' چہرے پر افسردگی سجائے ورما نے اسے صفائی پیش کی حالانکہ وہ اتنا معصوم نہیں تھا جتنا خود کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ماریا کی مدد کے لیے بھیجتے وقت ہی انہیں یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر وہ ماریا کو چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیں اور اس کی ہدایت ہی ماریا کی اذیت ناک موت کا سبب بنی تھی۔

''تم نہیں سمجھ سکتے ورما! تم کبھی اس تکلیف کو محسوس ہی نہیں کر سکتے جس سے میں ماریا کے پکڑے جانے سے لے کر اب تک گزر رہی ہوں۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی وہاں کی آوازیں سن رہی تھی۔ اس کرنل نے بہت چالاکی سے میری بچی کو بے وقوف بنایا تھا۔ میں نے ہوٹل سے فرار ہونے سے بھی پہلے تمہیں ماریا کی مدد کے لیے کال کر دی تھی لیکن تم نے دیر کر دی اور وہ اتنی بھری جوانی میں موت کے منہ میں چلی گئی۔ اس کی موت کا دکھ ایک طرف، مجھے یہ غم بھی مار رہا ہے کہ میری جان سے بھی پیاری بیٹی ایک لاوارث لاش کی حیثیت سے اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر تم اسے مرنے سے نہیں بچا سکے تو کم از کم اس کی ڈیڈ باڈی تو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اس کا لاوارثوں کی طرح دفن ہونا برداشت نہیں کر سکوں گی۔'' اب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ پُرزور مطالبہ کر رہی تھی۔

''بے وقوف مت بنو سنتھیا! یہ ایک ٹریپ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان انٹیلی جنس کے آدمی مردہ خانے کے اردگرد ہی منڈلا رہے ہوں اور ہم لاش لینے جائیں تو وہ ہمارے آدمیوں کو ہی چھاپ لیں۔ میں ایک لاش کے لیے اپنے جیتے جاگتے قابل آدمیوں کو کسی صورت نہیں گنوا سکتا۔'' ورما نے سختی سے اسے انکار کر دیا تو وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

یہاں موساد کے ورکرز اتنی بڑی تعداد میں نہیں تھے کہ وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے انہیں حرکت میں لا سکتی۔ عموماً اپنے کاموں کے لیے وہ لوگ را والوں ہی کو استعمال کرتے تھے۔ اگر کوئی کام راز میں رکھنا ہو تو پھر اس کے لیے کرائے کے آدمی استعمال ہوتے تھے لیکن اس وقت وہ کرائے کے آدمی استعمال کرتی تو را والے چونک جاتے کہ اس کا ان کے علاوہ کن لوگوں سے رابطہ ہے اور وہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیونکر کر سکتی ہے۔ پھر یہ رسک تو واقعی تھا کہ جو بھی ماریا کی لاش لینے جاتا، اس کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔ کرائے کے کسی آدمی کی صلاحیتوں پر ایک حد سے زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انٹیلی جنس کے تربیت یافتہ جوانوں کے مقابلے میں ان کی ناکامی کا امکان بہت زیادہ تھا۔ پہلے ہی وہ اپنے اس آدمی کے غیاب پر پریشان تھی جسے شہریار کی نگرانی کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے جو آخری رپورٹ پہنچائی تھی، اس کے مطابق شہریار نور کوٹ سے لاہور کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ آدمی رابطے میں نہیں رہا تھا اور یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پکڑا جا چکا ہے۔ اس یقین کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسپتال میں شہریار کو دیکھا گیا تھا۔ ماریا کے آخری لمحات میں وہ اس کے کمرے میں تھا اور اس کے بعد اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر مردہ خانے میں ڈال دیے جانے کا مطلب تھا کہ بہت سے راز افشا ہو چکے ہیں اور اب تک خود کو انجان ظاہر کر کے وہ انہیں دھوکا دیتا رہا ہے۔

وہ لوگ یہ تو پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ شہریار کو اپنی نگرانی کے لیے استعمال کی جانے والی ڈیوائسز کے بارے میں علم ہو گیا ہے لیکن اس نے اپنے رویّے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ماریا پر شک کر رہا ہے پھر بھی ماریا فکرمند تھی اور سنتھیا کے سامنے تشویش کا اظہار کر چکی تھی۔ سنتھیا نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ جیسے ہی وہ محسوس کرے کہ شہریار اس پر شک کر رہا ہے فوراً منظر سے غائب ہو جائے لیکن اس معاملے کی تصدیق یا تردید ہونے سے قبل ہی درمیان میں کرنل توحید والا معاملہ نکل آیا اور ماریا کی کہانی ہی ختم ہو گئی۔ اور یہ تو طے تھا کہ پہلے چاہے شہریار اس کی حقیقت سے واقف نہ ہو سکا ہو لیکن اب بہت کچھ جان گیا ہوگا۔ اس لیے اسے خود بھی اب اس سے دور رہنا تھا اور اپنے اوپر والوں کو بھی رپورٹ دینی تھی کہ پیرآباد میں رہ کر جو ذمے داریاں وہ نبھا رہی تھی، وہ کسی اور کو سونپ دی جائیں۔

''صبر کرو سنتھیا! ماریا کی موت کا مجھے بھی افسوس ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکایا جائے گا۔ لیکن ماریا کی ڈیڈ باڈی سے محروم رہنا ہماری مجبوری ہے۔





اس کی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف کے باوجود ہم اس کی آخری رسومات اعزاز سے انجام دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور یہ بات تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ کسی سیکرٹ ایجنٹ کا ایسا انجام خلافِ معمول نہیں ہے۔ ہم اپنے من میں تو اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھا سکتے ہیں لیکن سرِعام اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کر سکتے۔'' اسے خاموش پا کر ورما نے اپنا لہجہ بدلا اور نرمی سے سمجھانے لگا۔ سنتھیا نے یونہی سر ہلا کر اس کی تائید کی پھر ذرا وقفے سے بولی۔

''ورما... میں دو بندوں کا وجود اس زمین پر زیادہ عرصے تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ ایک کرنل توحید اور دوسرا اے ی شہریار عادل۔ میں نے اور میری بیٹی نے عمر بھر جو خدمات اور قربانیاں دی ہیں، ان کے بدلے میں مجھے جلد از جلد ان دونوں کی موت چاہیے۔ اور میرے خیال میں تمہارے لیے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ تمہارے تربیت یافتہ خودکش حملہ آور آسانی سے یہ کام کر ڈالیں گے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ لیکن آنکھوں میں انتقام کی چنگاریاں تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے ہی ممکن ہوا، ہم یہ کام کر گزریں گے۔'' ورما نے شاید اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''موقع ابھی موجود ہے۔ کرنل توحید جس شادی میں شرکت کے لیے آیا ہے، وہاں گھات لگاؤ ورنہ دوسرا موقع نہ جانے کب ملے۔ شہریار کے معاملے میں البتہ تم سہولت سے پلاننگ کر سکتے ہو۔ وہ ایسا ٹارگٹ ہے جو ہمارے سامنے ہے اور ہم کبھی بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اس کا تربیت یافتہ ذہن اپنا کام کر رہا تھا اور وہ پوری مستعدی سے انتقامی کارروائی کا سوچ رہی تھی۔

''تم جلد بازی سے کام لے رہی ہو سنتھیا۔'' ورما نے اسے ٹوکنا چاہا۔

''نہیں، میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ بروقت ایکشن لینا کتنا ضروری ہے، ورنہ دیر ہو جائے گی۔ پاکستانی انٹیلی جنس کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ را کے کسی ایجنٹ کا خون اتنا ارزاں نہیں ہے کہ انہیں اس کی قیمت نہ چکانی پڑے۔ انہیں اپنے کیے کی بھاری قیمت چکانی ہوگی۔'' وہ بہت ٹھوس لہجے میں بول رہی تھی۔ ورما کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سنتھیا کے اوپر تک تعلقات ہیں۔ اگر وہ انکار کر دے گا تو وہ اوپر سے منظوری حاصل کر لے گی اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی تعاون کی ہامی بھر لے۔

☆☆☆

''ماسی! مجھے کوئی کام دلوا دے۔ منشی جی کی تو حویلی میں وڈی گل ہے۔ چودھری صاب کا تو سنا ہے نوالہ منہ میں نہیں جاتا ان سے مشورہ کیے بغیر۔ وہ سفارش کریں گے تو مجھے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔'' شہزادی کی گود میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور وہ بے خیالی میں بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتی منشی اللہ رکھا کی بیوی سے درخواست کر رہی تھی۔

''دیکھ شہزادی! تیرا معاملہ وڈا نازک ہے۔ پنڈ میں کوئی تیری شکل دیکھنے کو تیار نہیں۔ تُو نے جو حرکت کی تھی، اسے کون بھول سکتا ہے۔ ایسے میں، میں تیری سفارش کروں گی تو لوگوں کا دل مجھ سے بھی بُرا ہو جائے گا۔ تیری خاطر میں سارے پنڈ سے بھلا کیوں بُری ہوں؟'' ماسی نے منہ ٹیڑھا کر کے اسے جواب دیا۔

''میں نے تجھے بتایا ہے نا ماسی کہ اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اماں اور بالے نے مجھے مجبور کیا تھا۔ بالا جس ڈبا پیر کے چکر میں پڑ گیا تھا، اسی نے اسے الٹی سیدھی پٹی پڑھائی تھی اور اماں میرے سر ہو گئی تھی کہ کسی بھی طرح مردہ بچے کی ہڈیاں لا کر دے ورنہ ساری حیاتی کے لیے تجھے تیرے بچوں کی شکل سے ترسا دوں گی۔ اب تُو ہی دل پر ہاتھ رکھ کر بتا کہ کوئی ماں اپنے بچوں کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے۔ میں نے بھی بہت مجبور ہو کر وہ کام کیا تھا۔ اب تو ویسے بھی ساری گل کھل گئی ہے۔ پولیس والوں نے بھی مجھے بے قصور جان کر چھوڑ دیا ہے، فیر پنڈ والے تو میرے اپنے ہیں۔ میں ان کے سامنے بچی سے جوان ہوئی ہور فیر ماں بنی۔ کیا ان لوگوں کو نہیں ملوم کہ شہزادی کوئی بُری عورت نہیں ہے۔ مجبوری میں بندے سے غلطی ہو جائے تو اللہ بھی بخش دیتا ہے، فیر پنڈ والے کیوں ماف نہیں کریں گے؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر روانی سے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ بولتی جا رہی تھی۔

ٹاہلی والا میں ہونے والی کارروائی نے اس کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف جہاں پیر سائیں کا پول کھلا تھا وہیں بالے کی ماں بھی شرمسار ہو کر پوتوں کو سینے سے لگائے روتی پیٹتی پیرآباد واپس آ گئی تھی اور رو رو کر گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ جہاں وہ بیٹے کی معذوری دور کرنے کے لیے بڑی آس سے گئی تھی، وہاں اس کی زندگی کھو کر آ رہی ہے۔ بالے کی چودھری سے وابستگی کے عرصے میں اس نے جس طرح گاؤں کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رکھا ہوا تھا، لوگ ویسے ہی اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن خوف کی وجہ سے دب کر بات کرنے پر مجبور تھے۔ چودھری نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹایا تو گاؤں والے بھی اس سے بے رخی برتتے

لگے۔ اس پر سے شہزادی کے مردہ بچے کی ہڈیاں قبر سے نکالنے کا واقعہ پیش آگیا تو بالے کے خاندان سے ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اب بالے کی ماں اور شہزادی بچوں سمیت گاؤں واپس تو آگئے تھے لیکن گاؤں والوں نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ شہزادی کو حالات سے لڑنے کا کوئی اور حل نہ سوجھا تو وہ گاؤں کی بااثر عورتوں میں سے ایک منشی اللہ رکھا کی بیوی کے پاس مدد کی درخواست لے کر پہنچ گئی۔

''اچھا چل میں دیکھوں گی، پر ابھی تو تُو عدت میں ہے۔ عدت پوری ہوجائے تو فیر میرے پاس آنا۔ اس وقت مجھ سے جو بن پڑا کروں گی۔'' اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اس نے ذرا نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کیسی عدت ماسی! گھر میں بچوں کے کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ تُو ہی بتا، مرنے والوں کے ساتھ بھلا کون مرتا ہے۔ ہور زندہ آدمی کے ساتھ تو پیٹ لگا ہوا ہے۔ مجھ سے ہور اپنے بچوں کا بھوک سے بلکنا نہیں دیکھا جائے گا۔ تُو دیکھنا میں پہلے انہیں گلے دبا کر ماروں گی فیر خود بھی نہر میں چھال مار کر اپنی جان دے دوں گی۔'' روتے روتے اس نے عزائم کا اظہار کیا تو ماسی گھبرا گئی۔

''کیسی گل کر رہی ہے کڑیے؟ معصوم جانوں کا کیا قصور ہے جو تو ان کی جان لے لے گی۔ ذرا صبر سے کام لے۔ منشی جی آتے ہیں تو میں ان سے گل کرتی ہوں۔ وہ تیرے لیے ایسا کوئی کام دیکھیں گے کہ تیرا پنڈ کی عورتوں سے زیادہ سامنا ہی نہ ہو۔ ابھی میں تجھے اپنے پاس سے آٹا اور دال دے دیتی ہوں۔ گھر لے جا کر پکا کر خود بھی کھا اور بچوں کو بھی کھلا۔ کل تک اللہ نے چاہا تو میں تجھے خوش خبری سناؤں گی۔'' اس کی خودکشی کی دھمکی کام کر گئی تھی چنانچہ ماسی گھبرا کر وعدہ کرنے لگی۔ اس کی بات سن کر شہزادی کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

''یہ تو ڈاڈی چنگی گل ہوگی ماسی کہ مجھے پنڈ کی دوسری عورتوں سے الگ کوئی کام مل جائے۔ میں سامنے رہوں گی تو وہ مجھے طعنے دینے سے باز نہیں آئیں گی ہور کیا پتا کہ کبھی غصے میں میرے منہ سے بھی کچھ الٹی سیدھی نکل جائے، انہیں تو کچھو موقع ہی مل جائے گا۔ سب کی سب مل کر میری گردن ہی مروڑ دیں گی۔'' وہ گویا ماسی کو اس بات پر پکا کر رہی تھی کہ اسے باقی عورتوں سے ہٹ کر کوئی کام دیا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ تھی بھی حقیقت کہ اسے گاؤں کی عورتوں کی بدسلوکی کا خدشہ تھا لیکن اس اصرار کے پیچھے ایک وجہ شہریار کی طرف سے سونپی

گئی ذمے داری بھی تھی۔ اس نے اسے اسی شرط پر رہائی دلوائی تھی کہ وہ چودھری کے خلاف شواہد جمع کرنے میں اس کی مدد کرے گی اور وہ یہ اسی صورت کرسکتی تھی کہ اسے چودھری کے ہاں ملازمت مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنی تنگ دستی کی داستان لے کر منشی اللہ رکھا کی بیوی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اللہ رکھا کی بیوی اس کی ماں کی رشتے کی بہن بھی ہوتی تھی۔ اس لیے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اسے اپنے حق میں ہموار کرلے گی اور اس کا یقین غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے اور بچوں کے فاقے کرنے کا سن کر پسیج گئی تھی حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اس کے حالات جان کر شہریار نے پہلے ہی اے سی آفس سے وظیفہ جاری کروا دیا تھا لیکن شہریار ہی کی وجہ سے اسے چودھری کے ہاں ہر صورت ملازمت کی راہ نکالنی تھی۔

''اچھا جا، زیادہ بک بک نہ کر۔ وڈی آئی غصے والی۔ اتنے برسوں میں اپنے مرد ہور ساس کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ وہ دونوں جب چار چوٹ کی مارتے تھے تو تیرا غصہ کدھر چلا جاتا تھا؟ ان سے ڈر کر تو تُو نے اپنے لیے ایسی مشکل پیدا کرلی ہے کہ کوئی تیری شکل دیکھنے کو راضی نہیں۔ ہور تو اپنے غصے کا ڈراوا دیتی ہے۔'' ماسی اس کی بات سن کر بڑبڑانے لگی۔

''وہ الگ گل ہے ماسی پر تُو نے دیکھ لیا نا کہ مجھے ستانے والوں کو اللہ نے سکھ سے نہیں رہنے دیا۔ مجھ سے زبردستی ویاہ اور خوب مار کٹائی کرنے والا خود تڑپ تڑپ کر مرا، ہور اس کی ماں آج میرے آسرے پر پڑی ہے۔ میں چاہوں تو بڑھیا کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں... پر نہیں، میرے دل میں رب سوہنے کا ڈر ہے۔ میں کیوں بھلا کسی کے ساتھ بُرا کروں؟ جس کو جو سزا دینی ہوگی، میرا رب خود دے دے گا۔'' وہ اپنے اندر کی سچائی بیان کر رہی تھی۔ ماسی نے اس بار کوئی تبصرہ نہیں کیا اور دال، آٹے کے تھیلوں کے علاوہ گھی کا ایک چھوٹا ڈبا بھی اس کے آگے رکھ دیا۔

''تہاڈی وڈی مہربانی ماسی... رب سائیں تینوں ساری حیاتی خوش رکھے۔'' وہ چیزیں دیکھ کر خوش ہوگئی اور چھوٹے کاکے کے ساتھ اس سارے سامان کو بھی سنبھالتی ہوئی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اس سبزہ زار پر رنگ و نور کی برسات سی ہو رہی تھی۔ کہیں لہراتے آنچل تھے تو کہیں قیمتی ڈنر سوٹوں میں اکڑی ہوئی گردنیں۔ بلند و بانگ مردانہ قہقہوں کے درمیان سریلی ہنسی کی آوازیں ابھرتیں تو جلترنگ سا محسوس ہونے لگتا۔ طرح طرح کی خوشبوؤں کے درمیان سگار و پائپ کا کثیف





ہواں بھی چکراتا پھر رہا تھا لیکن اس کثافت کو مختلف قسم کے کھانوں کی مہک نے زیر کر رکھا تھا۔ اصل میں یہ ایک شادی خانہ آبادی کی تقریب تھی جس میں کرنل توحید احمد بھی شریک تھے اور بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ان کا عزیز و اقارب سے کم ہی ملنا ہو پاتا تھا۔ اس لیے آج وہ سب کے گلے شکوے دور کرنے کی کوشش میں ہر ایک سے ہی بڑے تپاک سے مل رہے تھے۔ اعزاء میں بعض نوجوان چہرے تو ایسے تھے جنہیں وہ شناخت بھی نہیں کرسکے تھے اور انہیں خود اپنا تعارف کروانا پڑا تھا کہ وہ ان کے فلاں کزن یا فلاں عزیز کے بچے ہیں۔ اس خالص نجی تقریب میں انہیں ذیشان کے اصرار پر سی ایف پی کے چار جوانوں کو بھی شرکت کی اجازت دلوانی پڑی تھی۔ ان میں سے دو جوان انہیں مسلسل اپنے آس پاس منڈلاتے نظر آرہے تھے جبکہ دو فی الحال نظروں سے اوجھل تھے۔ نوٹس میں آجانے والے جوانوں سے وہ جان بوجھ کر بے نیازی ظاہر کر رہے تھے اور عزیز و اقارب کے درمیان گھرے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایسے میں انہیں اپنی بیگم کا پیغام ملا کہ خاندان کی کچھ بزرگ خواتین ان سے ملاقات کی خواہش رکھتی ہیں تو وہ زنانہ حصے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کا خاندان ذرا روایت پسند تھا اس لیے جہاں آج کل مخلوط محافل کا رواج ہو چلا تھا، ان کے ہاں اب بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ مردانہ اور زنانہ حصے الگ ہی رکھے جائیں۔ مرد حضرات عموماً رسومات کے موقع پر یا خصوصی بلاوے پر ہی زنانہ حصے کا رخ کرتے تھے جیسا کہ اس وقت توحید احمد کو کرنا پڑا تھا۔

وہ جیسے ہی وہاں پہنچے، قریبی رشتے دار خواتین نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان خواتین سے دعا سلام اور خیر و عافیت کا سلسلہ نمٹاتے انہوں نے ان دونوں خواتین کا نوٹس بھی لے لیا تھا جو زنانہ حصے میں ان کی آمد کے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے لیکن غیر محسوس طور پر ان کے دائیں بائیں آکھڑی ہوئی تھیں۔ لمبے قد اور چھریرے جسموں والی ان خواتین نے زرق برق شلوار قمیص زیب تن کر رکھے تھے اور شادی کی تقریب کی مناسبت سے میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ پھر بھی کرنل توحید کو انہیں دیکھ کر ہنسی آرہی تھی اور وہ اس ہنسی کو خاندان کی خواتین سے خوش خلقی نبھانے میں خوب استعمال کر رہے تھے۔

''ہمارا توحید تو فوج کو ایسا پیارا ہوا کہ برسوں گزر جاتے ہیں ہمیں ڈھنگ سے اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ پتا نہیں اسے یاد بھی ہے کہ بچپن میں یہ گھنٹوں میری گود میں چڑھا رہتا تھا۔ آج اپنے پوتا پوتی کو دیکھتی ہوں تو توحید کا بچپن یاد آجاتا ہے۔'' ایک نہایت عمر رسیدہ خاتون نے پیار سے گلہ کرتے ہوئے ان کے بچپن کا دور یاد کیا۔

''میں وہ وقت کیسے بھول سکتا ہوں پھپی جان... وہ تو میری زندگی کا سنہری دور تھا۔ اور میری سب سے لاڈلی پھپی! ملازمت ہی ایسی ہے کہ مجھے مجبوراً آپ سب سے دوری سہنی پڑتی ہے۔'' وہ بہت خوش اخلاقی سے خاتون کے شکوے کا جواب دینے لگے۔ اسی وقت جانے کیا ہوا کہ ان کے بائیں طرف موجود خاتون نے انہیں ایک زوردار دھکا دیا اور اگلے ہی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ مہمان خواتین میں یک دم ہی کھلبلی سی مچ گئی اور خواتین اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتی چیخیں مارنے لگیں۔ توحید احمد نے بھی فوراً ہی کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا اور اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔

''ابھی یہیں بیٹھے رہیں سر! نواز کی طرف سے کلیئرنس مل جائے تو پھر میں آپ کو یہاں سے نکال لوں گا۔'' فوراً ہی ان کے قریب سے سرگوشی ابھری تو انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ یہ وہی خاتون تھی جس نے انہیں دھکا دے کر نیچے گرایا تھا اور ان کے گرتے ہی فوراً وہاں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ البتہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خاتون کے منہ سے برآمد ہونے والی آواز خالصتاً مردانہ تھی جسے سن کر وہ ان مخدوش حالات میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے اور ان کی مسکراہٹ نے خاتون کو جھینپ جانے پر مجبور کر دیا۔ اصل میں وہ عورت کے بہروپ میں سی ایف پی کا ہی ایک نوجوان اہلکار تھا جس کو خوب کھرچ کھرچ کر شیو بنانے کے بعد میک اَپ اور زنانہ لباس پہنا کر اس تقریب میں شامل کر دیا گیا تھا۔

ذیشان ان کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد اتنا کانشیئس تھا کہ ان کی سیکیورٹی کے سلسلے میں ذرا بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ جب اسے ان کی اس روایت کا پتا چلا کہ خواتین کے حصے میں مردوں کو بلا روک ٹوک جانے کی اجازت نہیں ہوتی تو اس نے فورس میں خواتین کی کمی کا سدباب کرتے ہوئے فوراً ہی اپنے دو نوجوان اہلکاروں کو عورت کے بہروپ میں تقریب میں شامل کرنے کا بندوبست کر ڈالا... اور اب حالات بتا رہے تھے کہ یہ بندوبست کتنا مناسب اور ضروری تھا۔

''آپ کا اور بیگم صاحبہ کا یہاں سے فوراً نکل جانا مناسب ہے سر! آپ کی گاڑی ریڈی ہے۔ ہم آپ کو گاڑی

تک پہنچا دیتے ہیں۔ یاسر اور کاشف آپ کے ساتھ جائیں گے جبکہ میں اور نواز یہاں رک کر معاملات نمٹائیں گے۔"

فائرنگ کی آواز یقیناً مردانہ حصے میں بھی سنی گئی تھی اور وہاں موجود سیکیورٹی اہلکار فوراً دوڑ کر اس طرف آ گئے تھے۔ ان اہلکاروں میں سے ہی ایک ان سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ انہیں اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ سخت سیکیورٹی میں وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی دیکھا کہ میزوں کے درمیان ایک عورت کی لاش پڑی ہے اور سی ایف پی کے اہلکار لوگوں کو اس لاش سے دور رہنے کی ہدایات دے رہے ہیں۔

"معافی چاہتا ہوں سراج! میری وجہ سے تمہاری تقریب خراب ہوئی۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں خاندانی تقریبات میں شرکت سے اتنا گریز کیوں کرتا ہوں۔" گاڑی کی طرف جاتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے اپنے اس عزیز کے قریب رکے جس کے بے حد اصرار پر اس کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور معذرت کرنے لگے۔ حقیقتاً انہیں اپنی وجہ سے اس خوشیوں بھری تقریب کے رنگ میں بھنگ پڑنے پر دلی افسوس تھا۔

"کوئی بات نہیں توحید بھائی! جو بھی نصیب میں لکھا تھا سو ہوا۔" اس شخص نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ شاید کچھ اور لوگ بھی اس گفتگو میں شریک ہوتے لیکن یاسر اور کاشف نے کسی کو موقع نہیں دیا اور انہیں ان کی بیگم سمیت وہاں سے لے کر نکلتے چلے گئے۔

"وہاں کیا ہوا تھا؟" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی چل پڑی تو انہوں نے سنجیدہ چہرے سے یاسر نامی نوجوان سے جو اس وقت بھی لڑکیوں والے حصے میں تھا، دریافت کیا۔

"آپ اپنی رشتے دار خاتون سے بات کر رہے تھے تو میری نظر یکدم ہی اس عورت پر پڑی جو ایک قریبی میز پر سے اچانک ہی کھڑی ہوئی تھی اور آپ کو نشانہ بنانا چاہتی تھی۔ میں نے فوراً ہی آپ کو اس کی زد پر سے ہٹانے کے لیے دھکا دے دیا اور اس کی طرف ایک فائر بھی کر ڈالا۔ میرے خیال میں میری چلائی ہوئی گولی اس کے بازو پر لگی تھی لیکن وہ گولی کھا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے تیزی سے میز کے پیچھے سے نکلی اور اس سمت میں دوڑ کر آنے لگی جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر کوئی رسک لینا ممکن نہیں تھا اس لیے نواز نے اس کے سینے میں گولی مار دی۔ میرا اندازہ ہے کہ گولی ٹھیک دل میں لگی تھی اس لیے اسے دوبارہ اٹھنے کی مہلت نہیں ملی۔" یاسر فوراً ہی انہیں رپورٹ دینے لگا۔

"کیا اس عورت کا کوئی دوسرا ساتھی وہاں موجود نہیں تھا؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"کوئی دوسرا مشکوک شخص سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ عورت خودکش حملہ آور تھی جو اپنا فائر ناکارہ جانے کے بعد آپ کے قریب پہنچ کر خود کو بلاسٹ کر لینا چاہتی تھی۔ نواز کی سینے پر ماری گئی گولی نے اسے مہلت ہی نہیں دی ورنہ وہاں بڑے پیمانے پر تباہی پھیل سکتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ اسی وقت کرنل توحید کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے دوسری طرف ذیشان کی موجودگی کے باعث فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

"آپ خیریت سے تو ہیں سر؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"الحمدللہ! تمہارے جوانوں نے بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا ورنہ شاید اس وقت تمہیں مجھ سے بات کرنی نصیب نہیں ہوتی۔" انہوں نے کھل کر سی ایف پی کے اہلکاروں کی کارکردگی کو سراہا۔

"ہمارے ہر جوان کے پیچھے آپ ہی کی محبت اور منصوبہ بندی ہے سر! بس مجھے یہ خوشی ہے کہ انہوں نے اپنی تربیت کو ضائع نہیں جانے دیا۔ مجھے ایسے کسی حملے کا پہلے ہی خدشہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں کلارا اینڈرسن کے انجام نے را اور موساد دونوں کو بلبلانے پر مجبور کر دیا ہوگا اس لیے کسی نہ کسی طرف سے تو انتقامی کارروائی لازمی تھی۔ میں ایسے ہی کسی حملے کے ڈر سے آپ کی حفاظت کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ جو کچھ ہوا، اس میں دو ہی افراد قابلِ شناخت تھے، ایک آپ اور دوسرا شہریار... باقی ہم سارے تو پسِ پردہ ہیں۔ آپ کا معاملہ اس لیے زیادہ نازک ہے کہ آپ انٹیلی جنس سے وابستہ ہیں اور کلارا آپ ہی کو پھانسنے کے چکر میں اپنی جان سے گئی۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"اندازہ تو مجھے بھی تھا لیکن میں ایک فیملی فنکشن کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آدمی کی خواہش سے کیا ہوتا ہے، جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور میرے حصے میں خوامخواہ کی ندامت آ گئی۔ اب میں ان لوگوں سے کتنی ہی معذرت کر لوں لیکن جس طرح ان کی تقریب برباد ہوئی ہے، اس کا تو کوئی مداوا ہو ہی نہیں سکتا۔" ان کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

"یہ حقیقت تو اپنی جگہ ہے سر! میرے ماتحت نے مجھے وہاں کی جو رپورٹ دی ہے، وہ واقعی قابلِ افسوس ہے۔ معاملہ صرف فائرنگ کا بھی ہوتا تو افراتفری اور بدمزگی سے بچا جا سکتا تھا لیکن حملہ آور لڑکی کے جسم پر موجود خودکش جیکٹ





نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم تقریب کے منتظمین سے شادی لان خالی کروا لینے کی درخواست کریں۔ مجھے نواز نے فون پر جیسے ہی رپورٹ دی تھی، میں نے بم ڈسپوزل اسکواڈ اور مزید نفری کو اس طرف روانہ کر دیا تھا۔ بم کو ناکارہ بنانے اور ایکسپرٹس کی دیگر کارروائی کے لیے ضروری تھا کہ وہاں سے لوگوں کا رش ختم کیا جائے اس لیے جو کچھ ہوا، بہت مجبوری میں ہوا۔ آپ میری طرف سے بھی اپنے عزیز سے معذرت کر لیجیے گا لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی سمجھائیے گا کہ شکر ہے زیادہ بڑا نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہمارے لوگ الرٹ نہ ہوتے تو اس وقت وہاں کئی بے گناہوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔ شادی کا کیا ہے، وہ لوگ گھر جا کر سادگی سے بھی دلہن کو رخصت کر سکتے ہیں... یا اگر ایسا قابلِ قبول نہ ہو تو پھر کسی دن فنکشن ارینج کر سکتے ہیں۔ آدمی زندہ سلامت ہو تو رکے ہوئے کام تو کسی نہ کسی طور نمٹا ہی لیتا ہے۔ البتہ انسانی جان کے نقصان کی تلافی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔" ذیشان ایک آفاقی حقیقت بیان کر رہا تھا۔

"تمہاری بات درست ہے۔" انہوں نے اس کی تائید کی اور مزید بولے۔ "تمہارے لوگ کارروائی مکمل کر لیں اور لڑکی کی شناخت وغیرہ ہو جائے تو مجھے رپورٹ کر دینا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کل صبح ہی لاہور سے روانہ ہو جاؤں گا۔ جب حالتِ جنگ میں ہی رہنا ہے تو پھر دوسروں کو کیوں اپنے ساتھ گھسیٹا جائے۔ ہم اپنی روکھی پھیکی زندگی میں ہی ٹھیک ہیں۔" آزردگی سے کہتے ہوئے انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سبک رفتاری سے دوڑتی گاڑی کے شیشے سے باہر تیزی سے گزرتے مناظر پر نظریں جما لیں۔ گاڑی میں موجود دیگر نفوس میں سے کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ انہیں مخاطب کر سکتا۔

☆☆☆

"میں تہاڈے نال آنے کی تیاری کر رہا ہوں پتر! کچھ علوم نہیں کہ دو چار دن میں پہنچ بھی جاؤں۔" چودھری افتخار فون پر اپنے بیٹے مراد شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

"ضرور اباجی! کیوں نہیں۔ یہاں بھی آپ کا ہی گھر ہے۔ جب دل چاہے آئیں اور جب تک چاہیں رہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس بار آپ اتنی جلدی دوبارہ کیسے آ رہے ہیں، میں خود ابھی تو وہاں سے آیا ہوں۔" اسے خوش آمدید کہنے کے ساتھ مراد شاہ نے حیرت کا اظہار بھی کیا۔ وہ برسوں سے امریکا میں تھا لیکن پہلے کبھی چودھری نے اتنے مختصر وقفے سے وہاں کا دورہ نہیں کیا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ابھی کچھ دن قبل ہی تو وہ بیوی بچی سمیت پاکستان میں رہ کر آیا تھا۔

"بس پتر! ادھر دل نہیں لگتا۔ تو تھا تو فیر بھی حویلی میں تھوڑی رونق تھی، اب تو جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ تیری ماں کے بعد میرا دل ہی نہیں لگتا اس لیے سوچا کہ تھوڑے دن تیرے پاس آ کر رہ لیتا ہوں۔" اس نے لہجے میں افسردگی بھرتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔ اب وہ بیٹے کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے اپنے نئے آقا مسٹر الفا کی طرف سے پیغام موصول ہوا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ میری طرف سے کلیئرنس ملے تو واپس آ جانا۔ اس حکم کا پس منظر کیا تھا، اسے نہیں معلوم تھا لیکن اس نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور واپس حویلی جانے کے بجائے لاہور سے ہی سیدھا اسلام آباد پہنچ گیا تھا۔ ویزا لگتے ہی وہ فوراً امریکا کے لیے فلائی کر جاتا۔ جاگیر کے کاموں کی طرف سے اسے اتنی فکر نہیں تھی۔ منشی اللہ رکھا تجربہ کار اور قابلِ بھروسا آدمی تھا جو اس کے پیچھے سارے انتظامات بخیر و خوبی سنبھال لیتا۔

"حوصلے سے کام لیں اباجی! آپ تو بڑے مضبوط دل کے آدمی ہیں، آپ سے مجھے یوں ہمت ہارنے کی امید نہیں تھی۔ آپ کا سایہ حویلی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اماں کے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن اور بھی لوگ ہیں جنہیں وہاں آپ کی ضرورت ہے۔ تاجور، صنوبر، بہزاد شاہ، اس کی بیوی بچہ اور چھوٹی ماں۔ یہ سارے لوگ بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں بھی آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔" مراد شاہ اسے احساس دلانے لگا۔

"چھڈ دے پتر! میں سب کو جانتا ہوں۔ تاجور، صنوبر اپنے سسرالیوں کے ساتھ مل کر جائداد ہتھیانے کے لیے میرے خلاف سازشوں میں شامل رہی ہیں۔ بہزاد شاہ سے میں کیا دل بہلاؤں، اسے اپنا ہوش نہیں ہے۔ ہور رہی چھوٹی چودھرائن تو اس سے میرا دل سب سے زیادہ کھٹا ہے۔ اس کی جنی اولاد نے مجھے ایسا دکھ دیا ہے کہ میں جب بھی بستر پر لیٹتا ہوں لگتا ہے کانٹے چبھ رہے ہیں۔ پرکھوں کی بنائی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے اس الودی پنچھی نے۔ ایک واری میرے ہاتھ آ جائے تو میں اس کا گلا ہی دبا ڈالوں۔" چودھری کے لہجے میں نفرت کا زہر بھر گیا۔

"جانے دیں اباجی! اب معاف کر دیں کشور کو۔ دیکھا جائے تو اس کے ساتھ زیادتی بھی ہو رہی تھی۔ ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا گھر بار ہو۔ وہ اپنے بچوں کو پالے پوسے، پر آپ نے تو عمر بھر اس کی شادی نہ کرنے کا ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایسے میں اسے جو راہ دکھائی دی، وہ اس پر چل پڑی۔" اس نے حقائق جتاتے ہوئے باپ کا دل نرم کرنے

کی کوشش کی۔

"تو زیادہ فلسفہ نہ بگھار۔ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی رشتہ تھا ہی کہاں جو میں اس کا دیاہ کرتا۔ مجھے بھی احساس تھا اس کے دکھ کا اس لیے اسے تاجور اور صنوبر سے بڑھ کر آزادی دی تھی، پر اسے میری دی ہوئی آزادی ہضم نہیں ہوئی ہور وہ میرے ہی منہ پر کالک مل کر چلی گئی۔" چودھری دہاڑا۔

"اگر آپ خاندان میں رشتہ جوڑنے کی شرط ہٹا کر کسی دوسرے ہم پلہ خاندان میں اسے بیاہ دیتے تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ آدمی کو حالات دیکھ کر تھوڑی بہت اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنی پڑتی ہے۔" باپ کا مزاج جاننے کے باوجود وہ اسے آئینہ دکھانے سے باز نہیں آیا۔ ادھر حسب توقع چودھری کا مزاج برہم ہوگیا۔

"تو تو امریکا میں رہ کر بے غیرت ہوگیا ہے مراد! پر میں تیرے جیسے کل کے چھوکرے کے کہنے میں آکر اپنے بزرگوں کی ریت رواج نہیں بھول سکتا۔ ہم نے نسلوں سے کبھی اپنی دھی غیر برادری میں بیاہ کر اپنا سر کسی کے آگے نیچے نہیں ہونے دیا۔ ہور اگر کسی نے کشور کی طرح بغاوت کی کوشش کی تو اس کا سر کچل دیا۔ کشور بھی جتنا چاہے بھاگ لے لیکن ایک دن تو میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے گا ہور وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔" اس نے نہایت سفاکی سے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

"توبہ کریں ابا جی! آپ کتنے آرام سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی باتیں کرتے ہیں۔" مراد شاہ نے جھرجھری سی لے کر اسے ٹوکا۔

"ہمارے اپنے قاعدے قانون ہیں مراد شاہ! ہم دوسروں کے بنائے ہوئے قانون پر نہیں چلتے۔ کشور کی سزا طے ہے، بس مجھے موقع ملنے کی دیر ہے۔ تو میرا پیو بن کر مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی کوشش نہ کر ہور سن لے... اگر تو نے ایسی ہی گلاں کرنی ہیں تو فیر میں ادھر آکر تیرے نال نہیں رہوں گا۔ پچھلی واری کی طرح کسی ہوٹل میں کمرا بک کروالوں گا۔" چودھری نے آخر میں اسے دھمکانا ضروری سمجھا۔ اس کی دھمکی سن کر مراد شاہ کو وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے باپ کو سنہری بالوں والی ایک بے باک عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی اور دل چاہا کہ مری ہوئی بیوی کے لیے ضرورت سے زیادہ محبت جتانے والے باپ کو اس کی آوارگی یاد دلا دے لیکن پھر رشتے کا احترام مانع آگیا اور اس نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔

"ناراض نہ ہوں ابا جی! ٹھیک ہے، میں آپ سے بحث نہیں کرتا۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"بس تو فیر خدا حافظ۔ میں نے تو تجھے صرف اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا... تو نے آپ ہی لمبی بحث چھیڑ دی۔" اس نے فون بند کر دیا اور سامنے رکھی بوتل سے سنہری سیال گلاس میں انڈیل کر اپنے لیے جام تیار کرنے لگا۔ مراد شاہ کی تلخ باتوں نے اس کا موڈ سخت آف کر دیا تھا اور اس خراب موڈ کی بحالی کے لیے شراب ضروری تھی۔ شراب نوشی کے دوران موبائل کی گھنٹی نے اسے ڈسٹرب کر دیا لیکن دیکھنا تو تھا کہ کس کی کال ہے۔ احتیاط کے پیش نظر اس نے اپنے زیر استعمال رہنے والا نمبر فی الحال بند کر رکھا تھا اور ایک نئے نمبر کی سم لے کر بس گنتی کے چند لوگوں کو جن سے رابطہ ضروری تھا، یہ نیا نمبر دے دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بادل ناخواستہ موبائل اٹھا کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا تو شیخ صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔ شیخ صاحب طبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے آلات کی سپلائی کا کام بڑے پیمانے پر کرتے تھے اور اس کاروبار سے ان کی ٹھیک ٹھاک انکم بھی ہو جاتی تھی لیکن جب چودھری نے ڈالرز کا لالچ دیا تو ہیروئن فروشی میں بھی کوئی عذر نہیں جانا۔ ویسے بھی وہ اپنا کام کون سا ایمان داری سے کرتے تھے۔ جہاں موقع ملتا تھا، سامنے والی پارٹی کو چونا لگا ہی دیتے تھے اس لیے ہیروئن کے کاروبار میں شامل ہونے پر ان کے ضمیر نے انہیں ذرا ملامت نہیں کی اور چودھری سے ان کی گاڑھی چھننے لگی۔

"فرمایئے شیخ صاحب! کیسے یاد کیا آپ نے؟ آپ کا آدمی تو خیریت سے پہنچ گیا نا؟" یس کا بٹن پش کرتے ہی اس نے بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

"نہیں چودھری صاحب! گڑبڑ ہوگئی۔ وہ دونوں میاں بیوی لندن ائرپورٹ پر پکڑے گئے ہیں اور اب ان سے ایک بند کمرے میں پوچھ گچھ ہورہی ہے۔" دوسری طرف سے شیخ صاحب کی پریشان آواز سنائی دی تو چودھری کا دماغ اڑ گیا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے شیخ صاحب! ہم نے تو اتنا اچھا بندوبست کیا تھا۔ کہیں آپ کا آدمی گھبراہٹ کی وجہ سے تو کسٹم والوں کی نظر میں نہیں آگیا؟" چودھری سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

"اسے تو میں نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا، بس جیولری بکس دے کر یہی کہا تھا کہ جب تم لندن پہنچ کر ہوٹل میں ٹھہر و گے تو جن صاحب کی یہ امانت ہے، وہ خود آکر اسے وصول کرلیں گے۔ رواج کے مطابق میں نے جیولری بکس کو گفٹ پیپر میں





پیک بھی اسی لیے نہیں کروایا تھا کہ بند پیکٹ ایک تو لے جانے والے بندے کا ذہن الجھا دے گا، دوسرے کسٹم والے بھی کھوج میں پڑ جائیں گے... لیکن پھر بھی نہ جانے کیسے ہماری منصوبہ بندی ناکام رہی اور مال پکڑا گیا۔" شیخ صاحب کی پریشانی بھی کم نہیں تھی۔ وہ واقف تھے کہ پہلی کھیپ پیپرز کی آڑ میں امریکا پہنچائی جا چکی ہے اس لیے چودھری کی طرح ان کا اعتماد بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔ مسٹر الفا کی ہدایت پر چودھری نے پیپرز والی تدبیر دوبارہ نہیں دہرائی تھی اور اس بار نیا طریقہ کار استعمال کیا گیا تھا۔ انہوں نے پلاسٹک کی مدد سے ایک ایسا جیولری بکس تیار کروایا تھا جو دیکھنے میں بالکل سنگ مرمر کا لگتا تھا۔ اس جیولری بکس میں ایسا خلا رکھا گیا تھا جس میں ہیروئن بھر دی گئی تھی۔ ظاہری شکل وصورت اور وزن کی وجہ سے بہت غور کیے بغیر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جیولری بکس سنگ مرمر کا نہیں بلکہ پلاسٹک کا ہے۔ اس جیولری بکس کو شیخ صاحب نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے بھجوانے کا بندوبست کیا تھا اور وہ ملازم اسے لندن پہنچا دیتا تو وہاں سے اسے دوسرے ذریعے سے امریکا بھجوایا جا سکتا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے جس ملازم کو استعمال کیا تھا، وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا جس سے وہ زیادہ تر مارکیٹنگ کا کام لیتے تھے۔ نوجوان قابل اور محنتی تھا اس لیے شیخ صاحب اس کی اکثر دوسروں کے سامنے تعریف بھی کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حال ہی میں ہونے والی اس کی شادی کے تحفے کے طور پر اسے لندن کا ٹکٹ اور ویزا دلوایا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنے تئیں شیخ صاحب کی مہربانی کے طفیل ہنی مون منانے لندن جا پہنچا۔ اب یہ تو اسے لندن ائرپورٹ پر معلوم ہورہا ہوگا کہ غریب آدمی کو اس قسم کے ہنی مون کا خواب کتنا مہنگا پڑتا ہے۔

"مال جس طرح بھی پکڑا گیا ہو، گردن تو میری پھنسے گی۔ تم تو پتا نہیں کیسے ہوا کہہ کر ایک طرف بیٹھ سکتے ہو لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔" چودھری کا موڈ ایک بار پھر بہت خراب ہو چکا تھا اور اس کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے نہایت بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لائن کاٹی اور پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے الفا کی طرف سے بھجوایا گیا خصوصی موبائل نکال کر دھڑکتے دل سے اس ناکامی کی خبر ایس ایم ایس کے ذریعے بھجوا دی۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ خبر الفا کو بہت بری لگے گی اور وہ کٹ کھنے بلے کی طرح اس پر چڑھ دوڑے گا۔ وہ خائف سا خود کو ہونے والی بے عزتی کے لیے تیار کرنے لگا۔ ادھر موبائل نے کال کی آمد کا اعلان شروع کر دیا۔ اس نے مرے ہوئے ہاتھوں سے یس کا بٹن پش کیا۔

"مال پکڑے جانے کی اطلاع تمہارے پیغام سے پہلے ہی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ میرے آدمی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ تمہارے کیریئر کی زبان بند کرنے کا بندوبست ہو سکے۔ لڑکا بہت گھبرایا ہوا ہے، اسے تھوڑا ریلیکس کرنے کے لیے انویسٹی گیشن آفیسر نے کافی منگوائی ہے۔ کافی کے مگ میں ڈالی جانے والی ایک گولی اس لڑکے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کردے گی۔ لڑکی فی الحال بے ہوش ہے لیکن یہی اندازہ ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں اس لیے اسے نہیں چھیڑا جائے گا۔" اس کی کچھ بھی سنے بغیر الفا خود اسے سپاٹ سے لہجے میں بتاتا چلا گیا۔ اس کی اتنی باخبری اور مستعدی نے چودھری کو بے حد مرعوب کر دیا۔

"میں شرمندہ ہوں سر! معلوم نہیں میرے آدمی کی کس غلطی کی وجہ سے مال پکڑا گیا۔" الفا کی طرف سے برہمی کا اظہار نہ ہونے کے باوجود اس نے معذرت ضروری سمجھی۔

"مال پکڑے جانے کی فکر مت کرو۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ تمہاری پلاننگ اتنی خراب نہیں تھی لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اتفاقاً ہی جیولری بکس کسٹم آفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور اس کے ٹوٹنے کی وجہ سے مال باہر نکل آیا۔ عام طور پر ہم کیریئرز کی اتنی فکر نہیں کرتے ہیں لیکن ابھی تم ناتجربہ کار ہو اس لیے ہمیں تمہارے کیریئرز پر نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔ یاد رکھو، کیریئر بھلے پکڑا جائے لیکن کسی بھی انویسٹی گیشن آفیسر کو اس کے ذریعے تم تک نہیں پہنچنا چاہیے۔" آج الفا کسی خرانٹ باس سے ہٹ کر مربیانہ لب و لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

"بہت بہتر سر! آئندہ میں پورا خیال رکھوں گا۔" چودھری کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوا تو وہ مستعدی سے بولا۔

"فی الحال تو تم اپنا خیال رکھو۔ تمہارے علاقے میں ہماری اسپیشل ایجنٹ ماریا ماری گئی ہے اور مسز جوزف کو فرار ہونا پڑا ہے۔ ہمیں امید تو نہیں ہے کہ مرنے سے پہلے ماریا نے تمہارے بارے میں زبان کھولی ہوگی پھر بھی تمہارا محتاط رہنا ضروری ہے۔ وقتی طور پر ساری سرگرمیاں روک دینا مناسب ہے۔ آگے حالات واضح ہوں گے تو پھر کام شروع کیا جا سکتا ہے۔" اس بار الفا نے جو اطلاعات فراہم کیں، انہیں سن کر چودھری کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ خاص طور پر ڈاکٹر ماریا کی موت کی خبر اس کے لیے کسی دھماکے سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔

"وہ کب اور کیسے ماری گئی سر! یہاں تو کہیں اس بارے میں کوئی خبر ہی نہیں سننے میں آئی؟" اس نے اپنی

حیرت کا اظہار کیا۔ اور یہ حیرت ٹھیک بھی تھی۔ شہریار کی بیوی کی حیثیت سے تو ماریا کی موت کی خبر بہت تیزی سے پھیلنی چاہیے تھی لیکن وہاں تو بالکل خاموشی تھی۔

"اس کی موت میں پاکستانی انٹیلی جنس شامل ہے اور جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے ثابت ہو رہا ہے کہ شہریار کے بھی انٹیلی جنس سے روابط ہیں۔ ماریا کی موت کے وقت وہ اس کے پاس ہی موجود تھا لیکن اس کے باوجود ماریا کی ڈیڈ باڈی لاوارث لاشوں کے درمیان رکھ دی گئی جس کا مطلب ہے کہ اس نے ماریا کے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے۔ بہرحال جو بھی بات ہے، وہ دو چار دن میں سامنے آجائے گی۔ اسے اپنی بیوی کے سلسلے میں پبلک کے سامنے کچھ نہ کچھ جواب دہی تو کرنی پڑے گی۔" وہ جس اسپیشل موبائل پر بات کر رہے تھے، اس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ اس کی کال ٹریس نہیں کی جاسکے گی اس لیے کھل کر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاید ماریا کی موت کا ہی اثر تھا کہ الفا اس سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا ورنہ پہلے کبھی اس نے چودھری کو اس لائق کب سمجھا تھا۔

"اس اے سی کا پتا صاف کروائیں جی... خوامخواہ خدائی فوجدار بن کر ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔ جب سے ہمارے علاقے میں پوسٹ ہوا ہے، ناک میں دم کر کے رکھا ہوا ہے۔" چودھری کے دل میں شہریار کے لیے پرانا بغض تھا اس لیے وہ موقع ملتے ہی الفا کو بھی اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اس کے بارے میں فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ جلد نتیجہ سامنے آجائے گا... لیکن یاد رکھو کہ اے سی کی موت ہمارے مسائل کا واحد حل نہیں ہے۔ وہ مر بھی گیا تو انٹیلی جنس والے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ہماری راہ پر لگ چکے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بہت ہوشیار رہیں اور ہر لمحے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔" الفا نے اسے نصیحت کی۔

"ٹھیک ہے سر! اب ہم پہلے سے زیادہ احتیاط کریں گے۔" اس نے یقین دہانی کروائی۔

"بس اب مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ گڈ بائے۔" الفا کی طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس فون کال سے فارغ ہو کر چودھری نے ایک بار پھر پینے کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن اب وہ ٹھہر ٹھہر کر اور مُتفکرانہ انداز میں پی رہا تھا۔

☆☆☆

"دشمن کی جسارتیں بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ میں توقع نہیں کر سکتا تھا کہ کرنل توحید پر اتنا کھلا حملہ کیا جائے گا۔" ذیشان کی زبانی سارے حالات جان کر اس نے تبصرہ کیا۔

"میرے لیے یہ حملہ خلافِ توقع نہیں تھا۔ چوٹ کھایا ہوا دشمن ہلا ہلا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پھر ٹارگٹ بھی سامنے تھا۔ روٹین سے ہٹ کر کسی نجی تقریب میں ان کے لیے کرنل صاحب کو نشانہ بنانا زیادہ آسان تھا، اس لیے انہوں نے جوابی وار کرنے میں دیر نہیں کی۔ وہ تو شکر ہے کہ میرے لوگ الرٹ تھے ورنہ ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"حملہ آور عورت کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، عورت کو شناخت کیا جاچکا ہے۔ دو سال قبل اس عورت کے شوہر اور بچے ایک جلوس میں شامل تھے کہ وہاں بم بلاسٹ ہو گیا اور اس حادثے میں وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔ ظاہر ہے عورت کو شدید صدمہ پہنچا پھر حیرت انگیز طور پر یہ اچانک ہی اپنے گھر سے غائب ہو گئی۔ عزیز و اقارب نے گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اب جبکہ وہ ایک خودکش حملہ آور کے طور پر سامنے آئی ہے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسے کسی دہشت گردوں کے گروہ نے ٹریپ کر لیا ہوگا اور برین واشنگ کے ذریعے حکمرانوں اور انتظامیہ کے خلاف اس کے اندر زہر بھر دیا ہوگا۔ کسی صدمے سے بے حال عورت کے دماغ میں اس قسم کے خیالات بھرنا زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔ چنانچہ جب اسے اپنی جان داؤ پر لگا کر کرنل صاحب کے خاتمے کا مشن سونپا گیا ہوگا تو وہ دل و جان سے راضی ہو گئی ہوگی۔" ذیشان نے حالات کا تجزیہ کیا۔

"تم درست کہہ رہے ہو۔ میں خود اپنی آنکھوں سے ان ملک دشمنوں کے کام کرنے کا طریقہ دیکھ چکا ہوں۔ میرے ذہن سے آج تک اللہ آباد کا وہ لڑکا نہیں نکل سکا جسے اپنے خاندان کے ساتھ ہونے والے ظلم نے اتنا مشتعل کیا تھا کہ وہ اپنے جسم سے بارودی مواد باندھ کر بھرے مجمع میں گھس گیا تھا اور مجھ سمیت بیورو کریسی اور سیاست سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے میں کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ مجھ سمیت اسٹیج پر موجود دیگر افراد کو معمولی زخموں کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔" اس نے ایک گزرا ہوا واقعہ دہرایا۔

"تمہیں اب بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں نے تمہیں فون کیا ہی اس تاکید کے لیے ہے کہ اپنا خیال رکھو۔ کرنل صاحب کے بعد دشمنوں کا دوسرا ٹارگٹ تم ہی ہو سکتے ہو۔" اس نے شہریار کو اپنے اندیشے سے آگاہ کیا۔



"جب اوکھلی میں سر دیا تو موصلوں سے کیا ڈرنا۔ ...ت میرے بھی سامنے ہیں لیکن اب میں ڈر کر خود کو کسی ...دار خاتون کی طرح گھر کی چار دیواری تک تو محدود نہیں ...کتا۔" اس نے ہنسی میں بات اڑانے کی کوشش کی اور اپنی ...ت کو مزید موضوعِ گفتگو سے بچانے کے لیے فوراً ہی اگلا ...ال داغ دیا۔

"اس بندے کا کیا ہوا جسے میں نے اپنا تعاقب ...رتے ہوئے پکڑا تھا؟ بعد پے درپے پیش آنے والے واقعات ...ں وہ بندہ تو میرے ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ اس نے کچھ ...ا کہ وہ کون ہے اور کس کے کہنے پر کام کر رہا تھا؟"

"وہ ایک کرائے کا ٹٹو ہے اور ہمارے لیے قطعی ...ارہ۔ اس کا شمار ان جرائم پیشہ افراد میں ہوتا ہے جو رقم کے ...لیے کسی بھی پارٹی کا کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ...ہارے سلسلے میں اس سے فون پر معاملات طے کیے گئے ...تھے اور معاوضے کی رقم بھی بند لفافے میں کسی نہ کسی طریقے ...سے اس تک پہنچ جاتی تھی۔ یعنی پارٹی اس کے سامنے نہیں تھی ...اور وہ صرف اتنا بتا سکا ہے کہ فون پر اسے کسی عورت سے ...ہدایات ملتی تھیں۔ جو فون نمبر اس سے ملا ہے، وہ بھی بیکار ہے ...کیونکہ سم کسی فرضی نام سے خریدی گئی تھی۔ میں نے اس ...بندے کو اس کے سابقہ ریکارڈ کی بنیاد پر پولیس کے حوالے کر ...دیا ہے۔ پولیس والے خود ہی حسبِ توفیق اس کی خاطر ...مدارات کر دیں گے۔" ذیشان نے مفصل جواب دیا۔ اس ...جواب سے اتنا تو بہرحال واضح ہو گیا تھا کہ اس بندے کو اس ...کے پیچھے ماریا اس کی ممی نے ہی لگوایا تھا۔

"اس کا مطلب ہے، ہمارے پاس لے دے کر ایک ...ڈینش کمار ہی بچا ہے جس کی مزید دھنائی کر کے کچھ اور معلومات ...حاصل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"اس پر تو خیر کام جاری ہی ہے۔ اس کے علاوہ ...تمہارے چودھری صاحب اور عابد انصاری پر نظر رکھنی ہے۔ ...تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ چودھری مسلسل منظر سے غائب ...ہے اور کہیں سے اس کی کوئی سن گن نہیں مل رہی۔"

"یہ تو واقعی بڑی افسوس ناک خبر ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ...وہ واقعی ملک دشمنوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہا تھا جب ہی ...حالات بگڑتے ہی منظر سے غائب ہو گیا۔ تم اس کا نام ای سی ...ایل میں ڈلوانے کی کوشش کرو۔ کم از کم اسے ملک سے باہر ...نہیں نکلنا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"یہ کام میں ابھی کر دیتا ہوں۔ تم بتاؤ، تمہاری طرف ...کیا خبریں ہیں... تمہاری مخبر نے کچھ کام دکھایا؟" اس سے

اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے استفسار کیا۔
"وہ میری توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اسے منشی اللہ رکھا کی سفارش پر عابد انصاری کے بنگلے پر کام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ امید ہے کہ جلد اس کی طرف سے اہم اطلاعات آنی شروع ہوجائیں گی۔" اس نے خوش خبری سنائی۔
"یہ تو اچھی بات ہے۔ تم احتیاط سے اپنے حصے کا کام کرتے رہو۔ میں یہاں رہ کر معاملات پر نظر رکھتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر ہم فوراً حرکت میں آجائیں گے۔ میں نے اپنی فورس کو ہائی الرٹ کر رکھا ہے اس لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت میں آنے کی پوزیشن میں ہیں۔" ذیشان نے اسے بتایا اور پھر ان دونوں کے درمیان چند ایک مزید باتیں ہونے کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ شہریار نے بھی اپنی توجہ دفتری امور کی طرف مرکوز کرلی۔ اسے احساس تھا کہ دوسری سرگرمیوں میں الجھنے کی وجہ سے وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں پہلے کی طرح بھرپور طریقے سے انجام نہیں دے پا رہا ہے اس لیے اس وقت پوری توجہ اسی طرف مرکوز تھی۔ آج صبح ہی اس نے عبدالسنان کو یہ احکامات بھی جاری کردیے تھے کہ وہ اللہ آباد اور نور پور کے دورے کرے گا چنانچہ گاڑی تیار رکھوائی جائے۔ اس دورے پر وہ مشابرم خان کو اپنے ساتھ نہیں لے جارہا تھا کیونکہ مشابرم کو اس نے اس سے اہم ذمے داری سونپ رکھی تھی جسے نبھانے کے لیے وہ صبح صادق سے بھی پہلے روانہ ہوگیا تھا۔ اب یہ عبدالسنان کا مسئلہ تھا کہ وہ اس کی جگہ کسے ڈرائیونگ کی ذمے داری سونپتا۔ ایک متبادل ڈرائیور تو بہرحال دفتر میں موجود ہی تھا۔
"ایک بجنے میں چند منٹ ہی باقی ہیں سر! آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے آپ کے لیے گاڑی تیار کروادی ہے۔ آپ ٹھیک ایک بجے یہاں سے روانہ ہوسکتے ہیں۔" وہ نہایت انہماک سے فائلوں میں الجھا ہوا تھا کہ عبدالسنان نے اسے مؤدبانہ اطلاع دی۔
"ٹھیک ہے۔ تم یہ فائلیں بھی گاڑی میں رکھوا دو۔ راستہ لمبا ہے۔ میں راستے میں انہیں دیکھ لوں گا۔" اس نے ہدایات جاری کیں۔ دو منٹ بعد ہی وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان تھا۔ اپنی غیر موجودگی میں کچھ ضروری کاموں کی نگرانی کی خاطر وہ عبدالسنان کو اپنے ساتھ نہیں لے جارہا تھا۔ اس کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی اور وہ ایک بار پھر فائلوں میں کھوگیا۔ ڈرائیور ماہر تھا اس لیے گاڑی بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اپنے انہماک کی وجہ سے وہ وقت اور فاصلے کا تعین نہ رکھ سکا لیکن جب کھیتوں کے ایک سلسلے کے درمیان سے گزرتے ہوئے گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو وہ چونک گیا۔
"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔
"میں دیکھتا ہوں سر!" ڈرائیور جواب دیتا ہوا نیچے اتر گیا اور بونٹ اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ شہریار کے لیے بڑی کوفت میں مبتلا کردینے والی صورتِ حال تھی۔ اس نے شروع ہی سے اپنے عملے کو ان معاملات میں تاکید کر رکھی تھی کہ کہیں کسی قسم کی بدنظمی نہ ہو لیکن جانے کیسے اس ڈرائیور نے غفلت برت دی تھی کہ گاڑی بیچ راستے میں داغِ مفارقت دے گئی تھی۔
"انجن گرم ہوگیا ہے سر! میں ابھی قریبی ٹیوب ویل وغیرہ سے پانی لاتا ہوں۔" ڈرائیور نے اسے اطلاع دی اور اسے تادیب کا موقع دیے بغیر بوتل اٹھا کر سیدھا کھیتوں میں گھس گیا۔ کوفت زدہ شہریار کے پاس فی الحال برداشت سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ڈرائیور مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا جارہا تھا شاید اسے ڈر تھا کہ مڑ کر دیکھا تو شہریار کی غضب ناک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انتہائی کوفت محسوس کرنے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ادھر ڈرائیور کافی فاصلہ طے کرچکا تھا اور کھیت میں موجود اس کنوئیں کے قریب پہنچ گیا تھا جہاں دو کھیت مزدور پہلے ہی سے کھڑے شاید کسی موضوع پر آپس میں تبادلہ خیال کررہے تھے اور ان کی توجہ ابھی تک اس کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔ ڈرائیور ان سے بہ مشکل دو قدم کے فاصلے پر ہی ہوگا کہ فضا میں ایک کان پھاڑ دھماکا گونجا۔ ڈرائیور سمیت ان دونوں کھیت مزدوروں نے بھی اپنے قدموں تلے زمین لرزتی ہوئی محسوس کی۔ چند ثانیوں بعد جب وہ اپنے حواسوں میں واپس آئے تو ان کی نظروں نے جو پہلی چیز نوٹس کی، وہ دور سڑک پر بلند ہوتے آگ کے شعلے تھے۔ آگ کے یہ شعلے اس گاڑی سے بلند ہورہے تھے جس سے ابھی کچھ دیر قبل ہی ڈرائیور اتر کر کھیتوں کی طرف آیا تھا اور جس کی پچھلی نشست پر شہریار براجمان تھا۔
"صاحب...!" ڈرائیور دیوانہ وار چیختا ہوا اس سمت بھاگا جہاں گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے کے سوا شاید اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

**یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے**
**مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں**



# بندوبست

جمال دستی

زندگی اور موت... فنا و بقا قدرت کے غیر متغیر سلسلے ہیں... زندگی کی رنگینی ہے تو موت کی تاریکی سے بھی واسطہ پڑے گا... زندگی میں مرجانے والوں کا دکھ وقت کے ساتھ کم ہوجاتا ہے... مگر جو لوگ اچانک کہیں کھو جائیں... روپوش ہوجائیں... ان کی گمشدگی ہمیشہ بے کل رکھتی ہے... وہ ایسے ہی گمشدہ افراد کی کہانی ....!

**پیچ در پیچ الجھی تحریر جس کے کردار ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہونے کے باوجود جدا جدا تھے**

جیک نیگرو پونٹی کی کہانی سننے کے بعد انجلینا کلارک کے دل میں اس کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش انگڑائی لینے لگی جو اسے بندرگاہ کے قریب واقع پارک میں بیٹھے ایک نیم مدہوش شخص نے سنائی تھی۔ وہ ایک ٹریول میگزین کے لیے کام کرتی تھی اور گھوم پھر کر مختلف مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کرتی تھی جن سے پڑھنے والوں کے تجسس میں اضافہ ہوتا اور وہ ان جگہوں پر سیاحت

کی غرض سے جانے کے لیے سوچنے لگتے۔ اس دوران میں اسے ایسی رنگین اور سنگین کہانیاں بھی سننے کو ملتیں جو پڑھنے والوں سے زیادہ خود اس کے لیے باعثِ تجسس ہوتیں اور وہ ان کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو جاتی۔ ان دنوں وہ ریاست الاسکا کے دورے پر تھی اور اسی دوران گیون نامی ایک کان کن نے اسے ایک ایسی کہانی سنائی جو اس کے رونگٹے کھڑے کروینے کے لیے کافی تھی۔

جب اس نے اپنا تعارف کروایا تو گیون اپنی جگہ سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اسے ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش رہتی تھی جنہیں وہ اپنے سینے میں محفوظ قصے سنا سکے۔ ایک گھنٹے تک وہ اپنی کان کنی کے زمانے کے ناقابلِ فراموش واقعات، سیاحوں کی بے مروتی کی داستانیں اور مقامی سیاست پر بے لاگ اور بے رحم تبصرے کرتا رہا۔ وہ منتظر ہی رہی کہ کوئی ایسی بات سامنے آئے جو اس کے اور پڑھنے والوں کے لیے باعثِ تجسس ہو پھر اس سے برداشت نہ ہوا اور وہ بول پڑی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ یہاں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں اگر کوئی بھٹک جائے تو ایک دو گھنٹے بعد اس کا نام ونشان بھی نہیں رہتا؟ یہ بات مجھے جہاز پر ایک پروفیسر نے بتائی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں ریچھ بہ کثرت پائے جاتے ہیں اس لیے بھٹک جانے والے کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''ہاں لیکن ریچھ اپنی حد سے باہر نہیں آتے۔ اس کے باوجود کچھ احمق ان کے علاقے میں چلے جاتے ہیں اور تم تو جانتی ہی ہو کہ ریچھ کے سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ اگر کسی کے پیچھے لگ جائے تو اسے نہیں چھوڑتا۔''

''لوگ ایسی جگہوں پر جاتے ہی کیوں ہیں؟''

''میں تو اسے حماقت ہی کہوں گا۔ یہ لوگ محض مہم جوئی کے شوق میں وہاں جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ریچھ انسانوں کا دشمن ہے۔ میرے دوست چارلی میلٹ نے ایک ایسے ہی شخص کی لاش کے بارے میں بتایا تھا جو انہیں اینڑک پارک کے جنگل میں ملی تھی۔ یہ شخص گزشتہ خزاں میں لاپتا ہو گیا تھا۔ اس کی باقیات کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے لایا گیا۔ ویسے تو لاش کو پہچاننا مشکل تھا لیکن اس کے شناختی کارڈ سے نام پتا معلوم ہو گیا۔ میں دو سال پہلے اس سے مل چکا تھا۔ نیکرو پونٹی نام تھا اس کا۔ اگر وہ کسی گائڈ کی خدمات حاصل کر لیتا تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔''

اس رات جب انجلینا سونے کے لیے لیٹی تو نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ اسے اپنے باپ کے کہے ہوئے الفاظ آ رہے تھے۔ ''ہمیشہ یاد رکھو۔ اجنبی راستوں پر جانے کے ایک اچھے گائڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔'' انجلینا نے اس بات کو ذہن میں رکھا اور اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کرتی رہی کہ انہیں تفریح یا سیاحت کی غرض سے کن مقامات کا رخ کرنا چاہیے اور کیا کچھ دیکھنا چاہیے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے شعبے میں بہت مقبول تھی اور اسے اس کام کا معقول معاوضہ ملتا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ جیک محض اپنی غلطی کی وجہ سے مارا گیا۔ رات بھر اس کا ذہن انہی خیالات میں الجھا رہا۔ وہ تصورہ تصور میں اس کہانی کا تانا بانا بنتی رہی۔

دوسرے روز اس نے اپنے ایڈیٹر ویلی کو فون کر کے جیک کو پیش آنے والے حادثے کی تفصیل بتائی۔ اسے یقین تھا کہ اس واقعے کے حوالے سے اس کے ذہن میں سوالات ابھر رہے ہیں، ویلی ان کا جواب تلاش کرنے میں اس کی ضرور مدد کرے گا۔ مثلاً یہ کہ جب جیک کو اس جگہ ریچھ کی موجودگی کا علم ہو گیا تھا تو اس نے کہیں چھپنے یا وہاں سے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یا یہ کہ اس نے وہاں رک کر ریچھ کا مقابلہ کیا تھا؟

اسے یقین تھا کہ ویلی اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تمام ممکنات کے بارے میں سوچ بچار کر رہا ہوگا۔ وہ خود کہیں نہیں جاتا تھا اور اس کی دوڑ صرف گھر اور دفتر تک ہی محدود تھی۔ اسی لیے اس کا واسطہ پڑوسی کے کتے کے سوا کسی دوسری جاندار مخلوق سے نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ویلی نے خود سوچ بچار کے بجائے یہ ذمے داری بھی اسی کے سر ڈال دی اور بولا۔ ''تم خود ہی دیکھ لو۔ میں نومبر کے شمارے کے لیے ایک فیچر تیار کر رہا ہوں۔ تم اگر اپنی تحقیق مکمل کر لو تو یہ کہانی بھی اسی شمارے میں لگ سکتی ہے۔''

''اس کے لیے مجھے کچھ اور وقت درکار ہوگا۔'' انجلی نے بلند آواز سے کہا۔

''میں تمہیں زیادہ سے زیادہ دو دن دے سکتا ہوں اس کے بعد یہ کہانی میرے لیے بیکار ہو جائے گی۔''

انجلینا عرف انجلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ویلی ہمیشہ کی طرح اپنی اہمیت جتا رہا ہے۔ حالانکہ اسے خود بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس کہانی کی اشاعت پرچے کی فروخت پر کتنا اثر پڑ سکتا ہے۔

انجلی نے اس کہانی کا مواد حاصل کرنے کے پبلک لائبریری میں جا کر مقامی اخبارات کے پرانے شمارے کھنگال ڈالے۔ انجلی نے اپنی نوٹ بک نکال کر





اس سے متعلق معلومات درج کرنا شروع کیں۔ عمر سینتیس سال، جائے پیدائش بالٹی مور، رہائش مین ہٹن، غیر شادی شدہ، قریبی رشتے دار کوئی نہیں، پیشہ نامعلوم۔ یہ تفصیلات اسے گیون نے بھی بتادی تھیں اور ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔

ڈیلی نیوز مائنر کے رپورٹر ایڈم بیلی نے اپنی اسٹوری میں انکشاف کیا کہ جیک اس حادثے سے ایک سال پہلے بھی فیئر بینکس آچکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے اور مقامی لوگوں سے روابط بڑھانے آیا ہے۔ بہر حال، وہ یہاں کے لوگوں پر اچھا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہا۔ بیلی نے اس سلسلے میں جتنے لوگوں سے بھی بات کی، ان سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ یہاں کے قوانین اور ضابطوں کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ اس سے سب سے بڑی حماقت یہ سرزد ہوئی کہ اس جنگل میں جانے کے لیے بندوق کے بجائے محض ایک چاقو حفاظت کے لیے ساتھ رکھنے پر اکتفا کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ بندوق دیکھ کر ریچھ مشتعل ہو جاتے ہیں۔

انجلینا نے یہ ساری تفصیلات اپنی نوٹ بک میں لکھ لیں۔ وہ غالباً ناشتے کے فوراً بعد ہی اپنے خیمے کے نزدیک مارا گیا تھا۔

دوسرے اخبار میں اس حادثے سے متعلق ایک مختلف کہانی شائع ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیک کا یہ سفر محض اتفاقیہ نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ جیک کے دوست ٹام مولی نے رپورٹر کو بتایا کہ اس نے اس سفر کے لیے پہلے سے تیاری مکمل کر لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سفر کے لیے اسے کون کون سے کپڑے اور کتنی خوراک درکار ہوگی۔ نیز یہ کہ مچھلیاں پکڑنے کا کانٹا اور دوسرے آلات کتنے مضبوط اور قابلِ اعتبار ہیں۔ پارک رینجرز کو اس کے خیمے سے ایک تفصیلی نقشہ بھی ملا تھا جس میں جیک نے اپنے روٹ کی نشاندہی کی تھی جس سے اس کی منصوبہ بندی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ انجلی کو اسی بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی منصوبہ بندی اور احتیاط کے باوجود جیک کس طرح حادثے کا شکار ہو گیا؟

☆☆☆

انجلینا نے الاسکا میں عارضی قیام کے لیے ایک ہونے سے گیسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا۔ اس کی مالکن اینا فیئر بینکس کے سابق میئر کی بیوہ تھی۔ گو کہ وہ اور اس کا خاندان دو عشرے سے قبل ہجرت کر کے الاسکا آ گیا تھا لیکن اتنا عرصہ یہاں قیام کرنے کے باوجود اس کے لہجے میں دیہی رنگ جھلکتا تھا۔ اسے فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا اور گیسٹ ہاؤس کی دیواروں پر جابجا اس کی کھینچی ہوئی تصاویر آویزاں تھیں جن میں الاسکا کے خوب صورت مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ انجلی برآمدے میں کرسی پر... بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔ اس کے قدموں کے پاس ہی اینا کی پالتو بلی منکی بیٹھی تھی کہ اینا آئس ٹی کی پیالی اور ایک کتاب ہاتھ میں لیے اس کے پاس آئی۔ اس نے وہ کتاب میز پر رکھی اور چائے کی پیالی انجلینا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ مہمانوں کی کتاب ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی دوسرے مہمانوں کی طرح اس میں اپنے تاثرات لکھو۔''

انجلینا نے بے دلی سے وہ کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ گرمی زوروں پر تھی اور تیز ہوا کے تھپیڑوں نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ ایک رات کے قیام کے دوران اسے اس گیسٹ ہاؤس میں ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آئی تھی جس کے بارے میں وہ اپنے تاثرات قلم بند کرتی۔ البتہ ائرکنڈیشنر کی عدم موجودگی کی شکایت کی جاسکتی تھی لیکن فی الحال ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی نظریں ایک تحریر پر جم گئیں جو تقریباً دو سال پرانی تھی۔ وہ عام لکھائی نہیں تھی بلکہ خوش خطی کا بہترین نمونہ تھا۔ یہ ایک چونکا دینے والی تحریر تھی۔ انجلینا اسے غور سے پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔ ''یہ دورہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ اب میں انجام کے بارے میں پرامید ہوں اور اینکوریج واپس جا کر ایک نئی زندگی شروع کروں گی۔ سوزن، دو ستمبر۔''

اس تحریر کو پڑھنے کے بعد انجلینا کے تجسس میں اضافہ ہو گیا اور وہ سوچنے لگی کہ لفظ انجام سے کیا مراد تھی؟ اس نے مزید صفحات پلٹے تو ایک اور تحریر سامنے آئی۔ ''یوں لگتا ہے کہ میں سرحد کے پار دھکیل دی گئی ہوں۔ الاسکا میرے دل سے زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا۔'' انجلینا ان الفاظ پر غور کرنے لگی۔ ان میں رومانس کے ساتھ ایک پکار بھی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ سوزن یہاں کیوں آئی تھی؟ اگر وہ سیر و تفریح کے لیے آئی ہوتی تو کبھی بھی اس کتاب میں یہ باتیں نہیں لکھتی۔ یقیناً وہ کسی مقصد کے تحت یہاں آئی تھی اور کسی خاص جگہ جانا چاہ رہی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اینا نے اس کا پُرخلوص مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا اور بولی۔ ''امید ہے کہ تمہیں رات کو اچھی نیند آئی ہوگی۔''

''تمہاری ایک سابقہ مہمان نے مجھے جگائے رکھا۔'' انجلی نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''سوزن بلیک برج! وہ تقریباً دو سال پہلے یہاں آئی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے نوٹ بک میں لکھے ہوئے اقتباسات سنانا شروع کر دیے اور بولی۔ ''بظاہر یہ احمقانہ سی باتیں لگتی ہیں لیکن مجھے یوں لگتا ہے

کہ ان کے پیچھے کوئی کہانی ہے۔"

اینا نے آہستہ سے اپنی پیالی میز پر رکھی اور بولی۔
"مجھے وہ لڑکی سوزن یاد ہے۔ وہ یہاں کسی گائڈ کی تلاش میں آئی تھی جو اسے جنگل تک لے جاسکے۔ میں اس سلسلے میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی لیکن اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔"

"پھر اسے کوئی گائڈ ملا؟"

"یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ نیویارک جیسے شہر میں رہنے والی سوزن نے گورڈن میٹز کا انتخاب کیا جس کا نہ کوئی فون نمبر تھا اور نہ ہی ایڈریس۔ اس کے باوجود وہ اب بھی ایک اچھا گائڈ سمجھا جاتا ہے۔"

"سوزن نے اسے کس طرح تلاش کیا؟"

"تم جانتی ہو کہ اس طرح کے لوگ ہوٹلوں، بارز اور ساحلی مقامات پر گھومتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی بڑ نامی ایک بار ہے جہاں گورڈن اکثر آیا کرتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات سوزن سے ہوئی تھی۔"

"اس کی تحریر سے تو میرے ذہن میں اس کی ایسی تصویر نہیں ابھرتی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ بار بھی جاتی ہوگی۔"

"تمہیں اس کی تصویر بنانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اینا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "جس روز وہ جارہی تھی تو میں نے اس کی کچھ تصویریں کھینچ لی تھیں۔"

جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فوٹو البم تھی جو اس نے انجلینا کی جانب بڑھا دی۔ سوزن ایک طویل قامت خوب صورت عورت تھی۔ اس کے سنہری بال بے ترتیبی سے بندھے ہوئے تھے لیکن خاکی پتلون اور دھاری دار قمیص میں بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ ایک تصویر میں وہ کار کی ڈکی پر جھکی کسی شخص سے باتیں کررہی تھی جس نے ایک بڑا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔

"یہ آدمی کون ہے؟ تمہارا کوئی پڑوسی؟" انجلینا نے پوچھا۔

"میں اسے نہیں جانتی۔" اینا نے تصویر کی جانب جھکتے ہوئے کہا۔ "جب سوزن اپنی کار میں سامان رکھنے گئی تو وہ شخص وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے سوزن کو مدد کی پیشکش کی اور خود ہی سارا سامان اٹھا کر کار میں رکھ دیا۔ سوزن کو انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ شاید خوب صورت ہونے کا یہ بھی ایک فائدہ ہے۔"

اینا کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی لیکن انجلینا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس بار کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"وہ بار ایک معروف چوراہے پر واقع ہے اور وہاں ہر طرح کے لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ سوزن اور گورڈن میٹز کی ملاقات بھی وہیں ہوئی تھی اور سوزن نے محسوس کیا کہ اسے بروک ریج لے جانے کے لیے مناسب شخص ہے۔"

انجلینا نے اپنی مٹھی زور سے بھینچ لی تاکہ اینا اس کا لرزتا ہوا ہاتھ نہ دیکھ سکے۔ "تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ کہاں گئی تھی؟"

"بالکل..... کیونکہ اس نے گورڈن میٹز کی خدمات ہی حاصل نہیں کی تھیں بلکہ ہمارے سب سے زیادہ ہوشیار پائلٹ کو بھی آمادہ کرلیا تھا کہ وہ انہیں وہاں لے جائے۔" اینا تھوڑا سا آگے کو جھکی اور بولی۔ "وہ میرا بھتیجا بل ہے۔ وہی انہیں وہاں لے گیا تھا اور دو ہفتے بعد واپس لے کر بھی آیا۔"

"اور وہ ستمبر کے شروع میں واپس آگئی تھی؟" انجلینا نے نوٹ بک میں لکھی دونوں تحریروں کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ وہ تحریر شناس تو نہیں تھی لیکن لکھائی سے سوزن کے موڈ کا اندازہ ہورہا تھا۔ پہلی تحریر سے اس کی پریشانی ظاہر ہورہی تھی جبکہ دوسری تحریر سے لگ رہا تھا کہ وہ خاصی مطمئن ہے۔ انجلینا سوچ رہی تھی کہ اتنے مختصر عرصے میں سوزن کا مسئلہ کس طرح حل ہوگیا؟ ایسی کیا بات ہوئی جس سے اس کی پریشانی، اطمینان میں بدل گئی؟ اس نے اینا سے پوچھا۔

"کیا اس نے جنگل میں اپنے قیام کے دوران پیش ہونے والے واقعات کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"نہیں۔" اینا نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا اور ناشتے کی میز صاف کرنے میں مصروف ہوگئی پھر وہ برتنوں سے بھری ہوئی ٹرے لے کر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا جس پر بھورے رنگ کا کاغذ چڑھا ہوا تھا اسے ایک سفید ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ اس پارسل پر سوزن بلیک برج کا نام تحریر تھا۔ اینا کی بلی نے میز پر چھلانگ لگائی اور پارسل کو سونگھنے لگی۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ پارسل اس تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ اس کے جانے کے بعد موصول ہوا تھا۔"

"کیا تمہارے پاس اس کا پتا نہیں تھا جہاں یہ پارسل بھیج دیا جاتا؟"

"میرے پاس اس کا نیویارک کا پتا تو تھا لیکن میں یہ پارسل کسی خالی اپارٹمنٹ میں نہیں بھیج سکتی تھی۔"

انجلینا کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہونے لگے اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا مطلب تمہارا؟ کیا وہ گھر نہیں پہنچی؟"

"ہاں۔" اینا نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ مر چکی ہے۔ یہاں سے جانے کے دو گھنٹے کے اندر ہی اس کی کار کو حادثہ پیش آگیا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ اینکوریج کی طرف جارہی تھی تاکہ ہماری ریاست کے مزید خوب صورت مقامات دیکھ سکے۔ کار کی رفتار کافی تیز تھی۔ ایک موڑ کاٹتے وقت وہ اسٹیئرنگ پر قابو نہ رکھ سکی اور اس کی کار ایک درخت سے ٹکرا گئی۔"

ان دونوں کی نظریں اس پارسل پر تھیں جبکہ بلی اپنے پنجوں سے اس کی ڈوری کھولنے کی کوشش کررہی تھی۔

انجلینا زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "عجیب اتفاق ہے کہ نیویارک سے آنے والے دونوں اجنبی اپنے گھر سے ہزاروں میل دور الاسکا میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور دونوں کی منزل ایک ہی تھی۔ وہ اس دور افتادہ جنگل کو دیکھنے آئے تھے۔"

"تم کس دوسرے شخص کی بات کررہی ہو؟" اینا چونکتے ہوئے بولی۔

انجلینا نے اسے جیک کی موت کے بارے میں بتایا۔
"جب وہ پہلی مرتبہ یہاں آیا تو سوزن بھی ان جنگلات کو دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ لگتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعلق تھا۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بولی۔ "کیا سوزن شادی شدہ تھی؟"

"اس نے کبھی اپنے شوہر کا تذکرہ نہیں کیا جس سے مجھے یہی تاثر ملا کہ وہ اکیلی رہتی تھی۔" اس نے سوزن کی تصویر اٹھائی اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "سوزن کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ ویسے تو یہاں آنے والے بھی مہمان مختصر قیام کے بعد چلے جاتے ہیں لیکن اس طرح......"

انہوں نے چونک کر پارسل کی طرف دیکھا۔ بلی اس کا ریپر اتارنے میں کامیاب ہوچکی تھی۔

وہ دونوں اس پارسل میں موجود چیزوں کو دیکھ کر حیران ہورہی تھیں۔ کئی منٹ کی خاموشی کے بعد انجلینا نے کہا۔
"سوزن کے بارے میں تمہیں جو کچھ بھی یاد آجائے، وہ سب مجھے بتادو۔"

اینا نے اسے سب کچھ بتادیا جو وہ جانتی تھی یا اسے کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا۔ اس نے سوزن اور گورڈن کو چیمپئن اور ہیٹر سے تشبیہ دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جاتے وقت گورڈن اسے اپنے قصے سنا کر متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس



نے گورڈن کی کسی بات پر دھیان نہیں دیا اور اپنی ہی سوچوں میں گم رہی۔ واپسی کے سفر میں گورڈن غیرمتوقع طور پر خاموش رہا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔

"مہمانوں کی کتاب میں اس کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے جیسے اسے کچھ مل گیا تھا۔ میرے خیال میں یہ محبت بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ اسے گورڈن یا کسی اور سے محبت ہو گئی ہو۔ مجھے اس میں وہ جوش اور سرخوشی نظر نہیں آئی جو کسی نئی محبت کو پانے کے بعد ملتی ہے۔ مجھے تو وہ بہت بکھری ہوئی عورت لگ رہی تھی جو کبھی مطمئن اور کبھی پریشان نظر آتی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ دونوں گھر کے باہر والی سڑک پر چہل قدمی کررہی تھیں جسے گھنے درختوں نے اپنی اوٹ میں لے رکھا تھا۔ اینا نے بتایا کہ سوزن اپنے معاملات میں بہت محتاط اور رازداری سے کام لیتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی اور یہاں آنے کے مقصد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں کہ اس کے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا تھا؟ جیک نے تو اپنے ٹور اور منصوبے کے بارے میں کوئی بات نہیں چھپائی جبکہ وہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ وہ اس کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں آئی تھی تو پھر اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟"

"جب میں سوزن کی تصویریں دیکھتی ہوں تو مجھے ایک پرانی سہیلی یاد آتی ہے۔" اینا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"اس کی شادی جس شخص سے ہوئی، اس کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ وہ اچھا شوہر ثابت ہوگا لیکن نشے کی حالت میں اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا اور وہ اسے بے تحاشا مارنے لگتا تھا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میری سہیلی نے اسے چھوڑنے کی کوشش کی تو وہ اسے مار ڈالے گا۔ وہ بے چاری ڈر گئی اور اس کا ظلم سہتی رہی۔ ایک دو مرتبہ پڑوسیوں نے پولیس کو بلا لیا لیکن اس کے نتیجے میں حالات اور بھی خراب ہوگئے۔ وہ اپنے شوہر سے اس قدر خوف زدہ تھی کہ اس کا نام لیتے ہی کانپنے لگتی اور اس کے بارے میں سرگوشیوں میں بات کرتی جیسے ڈرتی ہو کہ وہ اس کے خیالات بھی پڑھ سکتا ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں اس لیے بتائی کہ سوزن کی حرکتیں بھی اس سے ملتی جلتی تھیں۔ وہ بھی باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہوجاتی۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی سہیلی یاد آگئی تھی۔ دونوں کی مسکراہٹ ایک جیسی تھی..... گویا وہ دل سے نہیں بلکہ زبردستی

مسکرا رہی ہوں۔''

انجلینا نے تاسف سے سر ہلایا اور بولی۔ ''واقعی، تمہاری دوست کی کہانی بے حد دردناک ہے لیکن اس کا سوسن کے پُراسرار سفر سے کیا تعلق بنتا ہے؟''

اینا اچانک ہی واپس جانے کے لیے مڑی اور کہنے لگی۔ ''انجلینا! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر تمہیں اپنے کچھ سوالوں کا جواب مل سکے گا۔''

گھر آکر اس نے ایک فائل نکالی جس میں اخبارات کے تراشے لگے ہوئے تھے اور انجلینا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''عام طور پر میں اچھی خبریں جمع کرنے کی عادی ہوں لیکن سوسن میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں اسے نظرانداز نہیں کرسکی اور یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی میں اسے نہ بھلا سکی۔ اس فائل میں ان اخبارات کے تراشے موجود ہیں جن میں اس کی موت کا ذکر کیا گیا ہے۔''

گوکہ اس خبر میں اس کے شوہر اور بچوں کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے کبھی شادی کی ہو کیونکہ اس کے والدین کے نام کا آخری حصہ اس کے نام سے مختلف تھا۔ اخباری اطلاع کے مطابق اس کی عمر چونتیس سال تھی اور وہ واشنگٹن کے ایک معروف جوڑے جینیٹ اور کارل کرم کی بیٹی تھی۔

''ایڈم بیلی...... کیا تم اسے جانتی ہو؟'' انجلینا نے رپورٹر کا نام پڑھتے ہوئے کہا۔ ''اسی نے جیک کی موت کے بارے میں بھی لکھا تھا۔''

''میں نے صرف اس کا نام سنا ہے۔ کیا اس نے بھی تمہاری طرح ان دونوں کے مابین کوئی تعلق تلاش کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''مجھے شبہ ہے۔ دونوں کی موت حادثاتی ہے لیکن کسی پر شک نہیں کیا جاسکتا اور ان دونوں کے درمیان کافی وقفہ ہے۔ ممکن ہے کہ ایڈم بیلی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس سے زیادہ جانتا ہو۔ ہمیں اس سے ملنا چاہیے۔''

☆☆☆

ایڈم بیلی چھٹی کے بعد ان سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔ انجلی جانتی تھی کہ ایک ایسے شخص سے کچھ معلوم کرنا آسان نہ ہوگا جو خود دوسروں کی کھوج میں رہتا ہو۔ اس کے باوجود وہ اس سے ملنے کے لیے بڈ کے بار پہنچ گئی۔ وہاں کافی رش تھا اور انہیں اپنے لیے جگہ تلاش کرنے میں دشواری محسوس ہورہی تھی۔ وہ لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی کھڑکی کے پاس واقع ایک کیبن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں۔ انجلی نے [illegible] وہ البم اور تراشوں کی فائل میز پر رکھی اور ابھی اس نے [illegible] کو آفس ٹی کا آرڈر دیا ہی تھا کہ ایڈم بیلی، بار کے بغلی دروازے سے اندر آتا دکھائی دیا۔ وہ دبلا پتلا طویل قامت شخص تھا۔ اس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور انہیں دیکھ کر دور سے ہی ہاتھ ہلا دیا۔ پھر وہ بار کاؤنٹر کی جانب گھوما اور اپنے لیے بیئر کا آرڈر دے کر ان کی طرف چلا آیا۔ پہلے اس نے اپنا تعارف کروایا پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تم کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟''

انجلی نے اخباری تراشوں کی فائل اس کی جانب بڑھائی اور بولی۔ ''تم نے ان اموات کے بارے میں لکھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں کے مابین کوئی رشتہ ہے ممکن ہے کہ یہ میاں بیوی ہوں۔''

''جیک کی کوئی بیوی نہیں تھی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے جبکہ ان کا نام ایک ہے اور یہ دونوں نیویارک کے رہنے والے تھے؟''

''ایک ہی نام؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ہاں، جیک نیگرو پونٹی اطالوی لفظ ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بلیک برج ہی ہوتا ہے۔''

بیلی نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ممکن ہے کہ وہ اس کی سابقہ بیوی ہو۔ میں اس سے ایک مرتبہ اسی بار میں ملا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوست اور گرل فرینڈ تھی۔ وہ دونوں اس کی ہر بات پر قہقہے لگا رہے تھے اور وہ لڑکی اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر معلوم ہورہی تھی لیکن اس کا دوست مولی مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ کچھ یوں ظاہر کررہا تھا جیسے اس نے کوئی موٹی مرغی پھانس لی ہو لیکن جیک کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ راستہ بھٹک کر موت کے منہ میں جاسکتا ہے۔''

''اگر وہ راستہ بھٹک گیا تھا تب بھی اسے اس طرح نہیں مرنا چاہیے تھا۔'' انجلی نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اگر اس کے پاس بندوق ہوتی تو وہ ریچھ کو ہلاک کرسکتا تھا لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ وہ راستہ بھٹک گیا ہوگا۔ اس نے ایک سال پہلے ہی راستے اور کیمپ سائٹ کا تعین کرلیا تھا اور نقشہ اس کی جیکٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے طے شدہ راستے پر ہی سفر کررہا تھا...... لیکن بدقسمتی سے اس کا سامنا ریچھ سے ہوگیا۔''

''مجھے حیرت ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''اس کی لاش کیمپ کے قریب ہی پائی گئی تھی۔ سردیوں میں تیز ہوائیں چلتی ہیں جن کی وجہ سے جائے وقوعہ کے نشانات مٹ گئے اور یہ اندازہ لگانا ممکن نہ رہا کہ وہاں کیا ہوا ہوگا۔ لیکن لگتا یہی ہے کہ اسے اپنے بچاؤ کی مہلت بھی نہیں ملی کیونکہ چاقو اس کی جیب میں ہی تھا۔''

''کیا اسے خطرے کا اندازہ نہیں تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس مہم کے دوران اس کا واسطہ کسی ریچھ سے پڑ سکتا ہے؟''

''نہیں، جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے ٹور کے انتظامات کو آخری شکل دے رہا تھا اور اس کی منصوبہ بندی مکمل تھی۔ اس کے دوست نے مجھے بتایا کہ جیک نے پہلے ہی تمام معلومات حاصل کرلی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کا روٹ کیا ہوگا..... وہ کس مقام پر اپنا خیمہ لگائے گا۔ یہاں تک کہ اسے ان گوشت کے پارچوں کی کیلوریز کا بھی علم تھا جو وہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پیک کررہا تھا۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔'' انجلینا نے کہا۔ ''کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ ریچھ کے سونگھنے کی حس کتنی تیز ہوتی ہے اور گوشت کے پارچوں کی بو محسوس کرکے اس کی جانب لپک سکتا ہے۔ میں نے تمہاری کہانی میں پڑھا ہے کہ لاش کے اطراف میں ان پارچوں کے خالی ریپر پڑے ہوئے ملے تھے۔''

''ہاں، وہ لاش جیک کی ہی تھی۔''

''میں اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں اور اب سوسن کی کہانی بھی بیچ میں آگئی ہے۔ تمہیں تو وہ یاد ہوگی۔ جیک کی موت سے پہلے وہ ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئی تھی۔ اس واقعے کی رپورٹنگ بھی تم نے ہی کی تھی۔'' یہ کہہ کر انجلی نے اس کی جانب خبر کی فوٹو کاپی بڑھا دی۔

اس نے ابتدائی چند سطور پڑھیں اور بولا۔ ''جس مقام پر یہ حادثہ پیش آیا، میں وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر رہتا ہوں۔ لہٰذا ایڈیٹر نے میری ڈیوٹی لگا دی اور میں گھر سے سیدھا وہیں چلا گیا۔ اس کا ٹائر برسٹ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے کار قابو سے باہر ہوگئی۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ یہ حادثہ تیز رفتاری کے سبب پیش آیا؟'' اینا بولی۔

''کیا کرائے کی کاروں کے ٹائر درست حالت میں نہیں رکھے جاتے؟'' انجلینا نے پوچھا۔

''اس ٹائر کے ٹکڑے ہوگئے تھے۔ ضرور اس سے کوئی چیز پوری قوت سے ٹکرائی تھی یا پھر ٹائر کی بناوٹ میں کوئی خرابی تھی۔''

''ہمارے پاس سوسن اور کار کی تصویریں ہیں لیکن شاید ان میں ٹائر واضح طور پر نظر نہ آئیں۔''

بیلی نے سوسن کی تصویر غور سے دیکھی اور بولا۔ ''جب میں نے اسے دیکھا تو وہ اس تصویر سے کافی مختلف نظر آرہی تھی۔'' پھر اس کی نگاہ کار کی ڈِکی پر گئی اور وہ بولا۔ ''تم اس آدمی کو جانتی ہو؟''

ان دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا تو بیلی بولا۔ ''یہ جیک کا دوست ٹام مولی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' دونوں نے بیک آواز کہا اور اس کے ساتھ ہی انجلینا کے ذہن میں مختلف خیالات آنے لگے۔ وہ بے چین ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم سوسن کے حادثے کے بارے میں کچھ اور جانتے ہو؟ اس کے علاوہ جو تم نے اپنی کہانی میں لکھا ہے؟''

''نہیں، مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ یہ بالکل سادہ سا کیس ہے۔''

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ کیا پولیس نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ یہ حادثہ نہیں تھا؟''

''وہ ایسا کیوں کریں گے؟ یہاں سوسن کا کوئی قریبی دوست یا [illegible] نہیں ہو اس معاملے [illegible] کار اسٹینڈ والی کمپنی اس کیس کا جلد تصفیہ چاہ [illegible] انشورنس تسلیم کرسکے۔ اس کے بارے میں یہی سمجھا گیا کہ یہ حادثہ تیز رفتاری کی وجہ سے پیش آیا۔ کسی نے بھی اپنا ذہن استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں بھی انہی لوگوں میں شامل ہوں۔'' اینا نے کہا۔

''مجھے شبہ ہے کہ سوسن ہمیشہ ہی تیز گاڑی چلاتی ہوگی۔ کیا کوئی شخص اس بارے میں جانتا تھا؟ اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔''

''یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں۔ ہم کسی بھی موٹر وہیکل آفس سے اس کا ڈرائیونگ ریکارڈ معلوم کرسکتے ہیں۔ لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ تم لوگ کیا جاننا چاہ رہی ہو؟''

''یہ بات ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ان دونوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ سارے اشارے اسی طرف جارہے ہیں لیکن ہم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان دونوں کی موت کا آپس میں کیا تعلق ہے۔''

''گویا یہ محض تمہارا تجسس ہے؟''

''کسی حد تک کہہ سکتے ہو لیکن اب یہ میرے فرض میں شامل ہوچکا ہے۔ ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ اس واقعے کو بنیاد بنا کر ایک آرٹیکل لکھا جاسکتا ہے جس میں پڑھنے والوں کو دور دراز

کے سفر میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا جائے۔ جیک کی موت ایسا ہی ایک واقعہ ہے اور میں اس کی تہ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ سوزن کی موت ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان تعلق تلاش کرنے کے علاوہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کیا واقعی وہ کسی حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہوئی یا اس کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ تھا۔"

بیلی کے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔ اس نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"اس کی موت . . . . . پہلے واقع ہوئی تھی.... اس کے کچھ عرصے بعد جیک غائب ہو گیا اور بعد میں اس کی مسخ شدہ لاش ملی۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جس دن سوزن کی کار کو حادثہ پیش آیا تو جیک اور اس کا دوست الاسکا میں ہی تھے۔ اگر میں ان سے نہ ملا ہوتا تو یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا اور اب اس تصویر سے ثابت ہو گیا ہے کہ سوزن کی کار میں سامان رکھنے والا مولی ہی تھا۔ کیا وہ اس کے دوست کو جانتی تھی؟"

"اس کے تاثرات سے تو یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے جانتی ہے۔ وہ یہی سمجھی ہوگی کہ کوئی اجنبی شخص اس کی مدد کر رہا ہے۔" اینا نے جواب دیا۔

انجلینا جذباتی لہجے میں بولی۔ "میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ ان دونوں کی موت حادثاتی نہیں تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں اس طرح قتل کیا گیا ہو کہ وہ حادثہ ہی نظر آئے۔"

"انجلینا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" اینا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"تم کچھ زیادہ ہی تیزی دکھا رہی ہو۔" بیلی نے کہا۔

"فی الحال میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کیا سوچ رہی ہوں۔ ہمیں مزید حقائق تلاش کرنا ہوں گے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہو؟"

"ضرور، اگر تم سمجھتی ہو کہ اس سے کوئی کہانی بن سکتی ہے۔"

"ابھی میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

رخصت ہونے سے پہلے انجلینا نے بیلی سے ایک دو باتیں معلوم کرنے کے لیے کہا۔ اس دوران وہ گورڈن میئر سے بھی ملنا چاہ رہی تھی لیکن بیلی نے اسے سمجھایا کہ شاید وہ ایک اجنبی عورت سے کھل کر بات نہ کر سکے۔ لہٰذا وہ خود ہی اس سے مل کر مزید حقائق جاننے کی کوشش کرے گا۔ انجلینا مان گئی اور اس نے بیلی کو بتا دیا کہ اسے گورڈن میئر سے کیا پوچھنا ہے۔

☆☆☆

دو دن بعد جب بیلی، اینا کے گھر پہنچا تو اس کی نظر سیدھی اس میز پر گئی جہاں بہت سے کاغذات، اینا کی کھینچی ہوئی سوزن کی تصویریں، مہمانوں کی کتاب اور ایک پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ معاملہ مزید پیچیدہ ہوتا جائے گا۔"

اینا اور انجلینا اسے امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اینا نے اسے کافی کا مگ تھما دیا۔ اس نے جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اسے میز پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

"اس کے ڈرائیونگ ریکارڈ کے بارے میں تمہارا اندازہ درست تھا۔ چند سال پہلے اس پر کئی مرتبہ بھاری جرمانہ ہو چکا تھا۔ ریکارڈ میں اس کا نام سوزن نیگرو پونٹی ہے جبکہ درمیانی نام کرم لکھا گیا ہے۔"

انہوں نے ڈرائیونگ لائسنس پر لگی ہوئی تصویر دیکھنے کے بعد تصدیق کر دی کہ یہی سوزن ہے۔ بیلی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ڈرائیونگ لائسنس پر اس کا نام سوزن بلیک برج لکھا ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بعد میں کسی وقت اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔"

پھر اس نے ایک لفافے سے حادثے کی بڑے سائز کی تصویریں نکالیں اور بولا۔ "یہ میں نے اخبار کے دفتر سے حاصل کی ہیں۔ تم دیکھ سکتی ہو کہ کتنا بڑا حادثہ ہوا تھا۔"

وہ دونوں جھک کر غور سے ان تصویروں کو دیکھنے لگیں۔ کار درخت سے ٹکرا کر بُری طرح تباہ ہو گئی تھی۔ دوسری تصویروں میں سوزن کی مسخ شدہ لاش نظر آ رہی تھی اس دوران اینا کچھ نہیں بولی لیکن انجلینا نے دیکھا کہ اس نے بے چینی کے عالم میں اپنے ہاتھ میز سے نیچے کر لیے تھے۔

"میں نے نیویارک کے رجسٹرار آفس سے بھی اہم معلومات حاصل کی ہیں۔ وہاں ان کی شادی کا تو ریکارڈ ہے لیکن طلاق کا نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان آخری وقت تک میاں بیوی کا رشتہ موجود تھا۔"

"یہ نکتہ بہت اہم ہے۔ اس سے میرے بہت سے شبہات کی تصدیق ہو رہی ہے۔" انجلینا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میری ابھی تک گورڈن میئر سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔"

بیلی نے میز پر سے تصویریں اور کاغذات





ہوئے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ تمہارے خیال میں ان دونوں کو قتل کیا گیا ہے۔ اس بارے میں کیا کہتی ہو؟"

"میری تھیوری کا انحصار گورڈن میئر سے ملنے والی معلومات پر ہے۔ ممکن ہے کہ میری سوچ غلط ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میں تم دونوں کو کھانا کھلاؤں گی۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "میں تمہیں اس معاملے سے الگ ہونے کے لیے نہیں کہہ رہی لیکن مجھے تھوڑا سا مزید وقت چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑی ہوئی مہمانوں کی کتاب اٹھائی اور اس میں سے وہ صفحہ کھول کر بیلی کو دکھایا جس پر سوزن کی پہلی تحریر درج تھی۔ جب بیلی اسے پڑھ چکا تو اس نے صفحہ پلٹا اور دوسری تحریر اسے دکھائی۔ وہ پارسل بھی اس کے سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر سر ہلایا جیسے ہینڈ رائٹنگ کا جائزہ لے رہا ہو پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ان دو تاریخوں کے دوران سوزن اور گورڈن میئر دو ہفتے کے لیے اس جنگل میں چلے گئے۔ آخر کیوں . . .؟"

انجلینا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، اینا نے موضوع بدل دیا اور کہنے لگی۔ "جیک کے بارے میں تمہارے پاس مزید کیا معلومات ہیں؟"

"دیکھنے میں وہ لاابالی سا لگتا تھا لیکن اسے پیسے خرچ کرنے کا شوق تھا۔ بار میں وہ بڑے بڑے بل ادا کرنے کے علاوہ بیروں کو بھاری ٹپ بھی دیا کرتا تھا۔ جینز پہنتا تھا لیکن اس کے ہاتھ پر قیمتی گھڑی بھی ہوتی تھی اور گرل فرینڈ . . . ." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر کھسیانے انداز میں بولا۔ "تم تو جانتی ہی ہو۔"

انجلینا نے بتایا کہ اس نے اپنے طور پر بھی کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ اس نے نیویارک میں اپنے دوست جیفری کو فون کر کے سوزن کے والدین کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سوزن کی ازدواجی زندگی تلخ تھی اور وہ ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی ہے۔ البتہ وہ اس کے شوہر سے کبھی نہیں ملا تھا۔ البتہ دو سال پہلے اسے کرم کے یہاں ایک ڈنر پارٹی میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا تھا جہاں اس نے سوزن کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اور ناک سوجی ہوئی تھی۔ اس کے دوست مولی نے بتایا کہ جیک اکثر اپنی بیوی کو تشدد کا نشانہ بناتا رہتا ہے اور سوزن اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔"

بیلی نے اپنا بال پوائنٹ نکالا اور بولا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ جیک سے اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ علیحدگی کے بارے میں سوچنے لگی؟"

"بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔"

"لیکن اس نے جیک کو نہیں مارا۔ وہ تو ریچھ کے حملے کا نشانہ بنا تھا۔"

"اس پارسل کو کھول کر دیکھو۔ تمہیں بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔"

بیلی نے ہاتھ بڑھا کر پارسل اپنی طرف کھینچ لیا اور جب وہ اسے کھولنے لگا تو انجلینا بولی۔ "جب سوزن اپنے سفر سے واپس آ رہی تھی تو اس نے یہ پارسل اپنے ہی نام پوسٹ کر دیا تھا۔ تم اس پر مقامی ڈاک خانے کی مہر دیکھ سکتے ہو جہاں سے اینا کے بھتیجے نے انہیں اٹھایا تھا۔ اس لفافے میں ایک سو چالیس خالی ریپر ہیں جو گوشت کے پارچوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جبکہ دس کھولے ہی نہیں گئے۔ لیبر ڈے کی تعطیل کی وجہ سے یہ پارسل وقت پر نہیں پہنچ سکا اور اس سے پہلے ہی سوزن کی موت واقع ہو گئی۔"

"اور تم نے یہ پارسل کھول لیا جس پر سوزن کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا؟"

"میں نے نہیں بلکہ اینا کی بلی نے یہ حرکت کی ہے۔ اب گورڈن میئر ہی بتا سکتا ہے کہ سوزن اپنے ساتھ گوشت کے پارچے کیوں لے کر گئی تھی اور اس نے انہیں کہاں استعمال کیا؟"

ایڈم نے اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے دو دن کی مہلت دو تاکہ میں اسے تلاش کر سکوں۔ اس دوران جیک کے دوست سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا نمبر کہیں نہ کہیں سے مل ہی جائے گا۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ یہ دونوں اپنی موت مارے گئے یا ان کے مرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔"

☆☆☆

آئندہ چند روز تک انجلینا کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اس دوران اس نے الاسکا کے بارے میں لکھے ہوئے مضمون پر نظرثانی کی اور انتہائی دور دراز علاقے کے سفر کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ وہ جانتی تھی کہ ڈیلی اس آرٹیکل کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوگا لیکن جب تک سوزن اور جیک کی موت کا معما حل نہ ہو جاتا، تب تک یہ مضمون نامکمل تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے بیلی کے فون کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ اس کے لیے الاسکا میں زیادہ دیر تک قیام کرنا ممکن نہیں تھا۔ دو دن بعد اسے بیلی کا فون موصول ہوا۔ گورڈن سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی اور اب اس نے انجلینا اور اینا کو بڈ کے بار میں بلایا تھا۔

جب وہ تینوں بار میں اکٹھے ہوئے تو انجلینا نے کہا۔ ”پہلے میں سوسن کے حادثے کے بارے میں بتاؤں گی کیونکہ یہ معاملہ نسبتاً سادہ نظر آتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ٹائر پھٹ جانے یا تیز رفتاری کی وجہ سے ایسا ہوا بلکہ اس میں اس مددگار اجنبی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔“

”تمہارا اشارہ مولی کی طرف ہے؟“

”ہاں، یہ حرکت اسی بدبخت کی معلوم ہوتی ہے۔“ اینا غصے سے بڑبڑائی۔

”ایسا لگتا ہے کہ اس نے سوسن کی کار کی ڈکی میں کوئی ایسا آلہ رکھ دیا تھا جس کی مدد سے اس کے راستے کی نشاندہی ہو سکے۔ کوئی ایسا آلہ جو ریڈیو سگنل بھیجتا ہو۔“

انجلینا نے محسوس کیا جیسے بیلی کو اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔ اس نے مدد کے لیے اینا کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”جب وہ کار کی ڈکی میں سامان رکھ رہا تھا تو اس نے سوسن سے اس کی منزل کے بارے میں کچھ پوچھا تھا؟“

”ہاں، ایسی کوئی بات ہوئی تو تھی۔ ہائی وے پر سے گزرتے ہوئے اس کا ارادہ روزی کریک روڈ سے گھوم کر جانے کا تھا۔ میں نے ہی اسے بتایا تھا کہ وہ کتنی خوب صورت جگہ ہے۔ اس نے یہ بات اسے بھی بتا دی ہوگی۔“

”اور یہی وہ جگہ ہے جہاں یہ حادثہ پیش آیا؟“ بیلی نے پوچھا۔

”اینا! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ انجلینا جلدی سے بولی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اینا کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ”تم ایک منٹ کے لیے بھی ایسی بات مت سوچنا۔“

اینا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ مشورہ اس کے لیے اتنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔“

”جب جیک نے ایسا کوئی منصوبہ بنایا تو اس نے اس آلے سے بھی فائدہ اٹھایا ہوگا، اگر وہ واقعی سوسن کی گاڑی میں رکھا گیا تھا۔ کیا وہ واقعی اس کا تعاقب کر رہا تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں اس ذکر کو ختم کر دینا چاہیے۔“ انجلینا نے اینا سے کہا۔

”نہیں، نہیں۔“ بیلی جلدی سے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہم اس بارے میں مزید غور کریں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ ان باتوں کو دہرانے سے تمہیں تکلیف پہنچی۔“ انجلینا نے اینا کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”وہ جانتے تھے کہ سوسن اسی شہر میں ہے اور انہوں نے اس پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ جب وہ یہاں سے روانہ ہونے لگی تو مولی اچانک ہی آ گیا اور سامان رکھنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے بڑی ہوشیاری سے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر کار میں کسی جگہ رکھ دیا اور جیک کو فون کر کے بتا دیا کہ اس کی بیوی کہاں جا رہی ہے۔ جیک اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور سڑک کے قریب ایک سنسان جگہ پر رک کر سوسن کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے جیسے سوسن کی کار نزدیک آتی گئی، اس سے ملنے والے سگنل بھی صاف سنائی دینے لگے اور جب وہ بالکل قریب آ گئی تو اس نے ٹائر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ حادثہ ہونے کے بعد وہاں افراتفری مچ گئی اور کسی کا دھیان اس گولی کی جانب نہیں گیا جو وہیں کہیں پڑی ہوگی اور نہ ہی کسی نے ٹرانسمیٹر کی بیٹری کے ٹکڑوں کی جانب توجہ دی۔“

بیلی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”پولیس کا دھیان بھی اس جانب نہیں گیا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ حادثہ تیز رفتاری کی وجہ سے پیش آیا۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر ہی میں نے بھی اپنی رپورٹ میں یہی بات لکھ دی۔“

”آج کل لوگ سست اور کام چور ہو گئے ہیں۔ پولیس بھی انہی میں شامل ہے۔“ انجلینا بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

”لیکن جیک نے اسے قتل کیوں کیا؟“ اینا نے پوچھا۔

”جیک کا دوست مولی جانتا تھا کہ وہ اس شہر میں موجود ہے جس سے وہ یہ سمجھا کہ سوسن اس کی جاسوسی کر رہی ہے اور اسے طلاق لینے کے لیے کسی ثبوت کی تلاش ہے۔ تم نے بھی بتایا تھا کہ وہ یہاں کسی عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔“ انجلینا نے بیلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس کی نظریں سوسن کی دولت پر تھیں جو اس کے مرنے کے بعد اسے مل جاتی۔ لہٰذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ سوسن کو اس دنیا سے چلتا کر دیا جائے۔“

”گویا تم یہ کہہ رہی ہو کہ اس حادثے کی آڑ لے کر جیک نے سوسن کو مار دیا جبکہ میرا خیال تھا کہ تم ہمیں کچھ اور ہی بتانے والی ہو۔“

”کیا؟“

”یہی کہ جیک کی موت کی ذمے دار سوسن تھی۔“

”مجھے ڈر ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

”مگر یہ کیسے ممکن ہے جبکہ وہ جیک کی موت سے پہلے ہی مر چکی تھی۔“



انجلینا نے ایک گہری سانس لی اور قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”اس کے لیے ہمیں ایک بار پھر اس پارسل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جیک نے پہلے ہی اس سفر کے بارے میں تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ نقشے، روٹ اور کیمپ سائٹ، سب کچھ طے تھا۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس کی بیوی کو ان تیاریوں کا علم نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس نے وہی راستہ اختیار کیا اور وہاں گوشت کے پارچے پھینکتی چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی خوشبو اور ذائقہ، ریچھوں کو اس علاقے میں آنے پر مجبور کر دے گا۔ اگر ہم مہمانوں کی کتاب میں اس کی دوسری تحریر پڑھیں جو اس نے جنگل سے واپس آنے کے بعد لکھی تھی تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس نے یہی لکھا تھا نا کہ اب میں اس کا انجام جانتی ہوں۔ اس سے مراد جیک کا انجام تھا۔“

”لیکن اس نے خالی ریپر ڈاک سے کیوں بھیجے؟“ اینا نے پوچھا۔

”اگر وہ انہیں کسی کوڑے دان میں پھینکتی تو لوگوں کو شبہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں اتنی بڑی مقدار میں گوشت کے پارچے کوئی استعمال نہیں کرتا۔ لہٰذا اس نے احتیاطاً ان کا پارسل بنا کر ڈاک کے ذریعے... اپنے ہی پتے پر بھیج دیا۔“

”اگر اس امکان کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسے ہم قتل نہیں بلکہ حادثہ ہی کہیں گے۔“ بیلی بولا۔

”ممکن ہے کہ وہ اس سے جان چھڑانا چاہ رہی ہو لہٰذا اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔“

”لیکن اس کے لیے اس نے یہ راستہ کیوں منتخب کیا؟“ بیلی بولا۔ ”وہ اس براہِ راست طلاق بھی لے سکتی تھی۔“

”ممکن ہے کہ کسی خوف کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر پا رہی ہو۔“ اینا بولی۔ ”میں انجلینا کو اپنی سہیلی کا قصہ سنا چکی ہوں جو کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس کے شوہر نے واضح طور پر دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے طلاق لینے کی کوشش کی تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ ممکن ہے کہ سوسن کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ معاملہ ہو۔“

”کیا اس نے بھی اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا؟“

”نہیں، وہ کم ہمت تھی۔ حالات کا مقابلہ نہ کر سکی اور اس نے خودکشی کر لی۔“

وہ دونوں حیرت سے اینا کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ کافی دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا پھر بیلی نے اپنا گلا صاف کیا اور کاپی میں کچھ لکھنے لگا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو انجلینا بولی۔ ”گورڈن سے تمہاری ملاقات کیسی رہی؟ اس سے کوئی نئی بات معلوم ہوئی؟“

”گورڈن میئر بھی سوسن کے رویّے سے خاصا دلبرداشتہ تھا اور وہ اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے بیئر کے دو ٹن منگوائے تب کہیں جا کر وہ کچھ بولنے پر آمادہ ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اپنی بے عزتی کا شدید احساس ہو۔ سوسن نے اس کی خدمات تو حاصل کر لی تھیں لیکن اس نے اس سفر کے لیے ساری تیاری خود ہی کی تھی اور اس کے تجربے یا مہارت پر انحصار کرنے کے بجائے ہفتوں کی تیاری اور راستوں کا تعین اپنے طور پر کر لیا تھا۔ گورڈن میئر کا کہنا ہے کہ اس دوران سوسن کی سرگرمیاں خاصی پُراسرار تھیں۔ وہ علی الصباح گھومنے کے لیے نکل

بندوبست

## کفایت

ملیکہ شراوت بھارت کی نامور اور مقبول اداکارہ ہیں۔ ہم بھی یوں ان کے فین ہیں کہ جب بھی ان کی ٹی وی پر چلتی ہوئی کسی فلم پر نظر پڑی، ہمیں حرارتِ عزیزی میں یک لخت اضافے کے سبب پنکھے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان دنوں بجلی نایاب ہے اس لیے اکثر ہاتھ کا پنکھا کام آتا ہے۔

موصوفہ نہایت کفایت شعار خاتون ہیں۔ لباس کے معاملے میں ان کی یہ کفایت شعاری بیشتر فلموں میں نظر آتی ہے۔ ان کا فلسفہ ہے کہ لباس پورا ہو تو لوگ اداکارہ کو نظر انداز کر کے کپڑوں کے حسن و جمال میں الجھ جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ذرا سی کفایت کی جائے تو ہر نگاہ اداکارہ پر مرکوز رہتی ہے۔ لوگ بار بار اس کی فلمیں دیکھنے آتے ہیں اور سیٹیاں بجا کر اپنی خوشی کا والہانہ اظہار کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ پچھلے دنوں وہ تفریح کے لیے لندن گئیں تو گیٹ وک ائرپورٹ پر ایک کسٹم آفیسر نے ان کے ہاتھ میں جھولتے ہوئے ایک چرمی پرس کی طرف اشارہ کر کے پوچھ لیا۔ ”مادام! اس پرس میں کیا ہے؟“

موصوفہ برہم ہو گئیں اور غصیلے لہجے میں بولیں۔ ”اسے پرس کہہ رہے ہو... یہ میرا سوٹ کیس ہے۔ اس میں میرے سات جوڑے ہیں!“

(کراچی سے احمد رضا کی اٹکھیلیاں)

جاتی۔ اپنے کنستر سے پارچوں کے پیکٹ نکالتی اور مجھتی کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔"

انجلینا کے لیے یہ انکشاف غیر متوقع نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کئی سوال مچلنے لگے۔

بیلی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ اعتراف کرلینا چاہیے کہ گورڈن نے جو کچھ بتایا، اسے سننے کے بعد مجھے تمہارا نظریہ زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔"

انجلینا نے مطمئن انداز میں سر ہلایا جبکہ اینا قدرے افسردہ نظر آرہی تھی۔

بیلی نے اپنی کاپی کا صفحہ پلٹا اور بولا۔ "اب میں جیک کے دوست ٹام مولی کی طرف آتا ہوں۔ جیک کے غائب ہو جانے کے چند ماہ بعد تک وہ یہاں نظر آتا رہا پھر اچانک ہی کہیں چلا گیا۔ مالک مکان کا کہنا ہے کہ اس نے سال بھر کا کرایہ پیشگی ادا کردیا تھا۔ اس لیے اس نے مولی کے بارے میں کھوج لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسی طرح پڑوسیوں کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے اور کہاں سے آیا تھا۔ کسی نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں چلا گیا۔"

"پولیس کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"ان سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ وہ یہ کبھی اعتراف نہیں کریں گے کہ ان دونوں کی موت حادثاتی نہیں بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے...... اور یہ کہ اس سلسلے میں وہ کچھ اہم شواہد کو نظرانداز کر بیٹھے ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ کہانی ہے جس میں بہت سے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے تو مجھے بھی تمہاری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا لیکن اب میں تم سے پوری طرح متفق ہوں۔ لیکن مجھے اب بھی شبہ ہے کہ پولیس چیف اسٹینلے کو مولی کی تلاش پر آمادہ کرسکوں گا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا کہ وہ یہاں سے چلا گیا۔" انجلینا نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

"اسے تلاش کرنا آسان نہیں اور اگر وہ واقعی سوسن کے قتل میں ملوث ہے تو ضرور کہیں چھپا بیٹھا ہوگا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ پوری طرح جیک کے منصوبے میں شامل تھا۔ میرا خیال ہے کہ جیک نے اسے یہی کہا ہوگا کہ وہ سوسن پر نظر رکھے۔ صرف اس بات پر اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ وہ یہاں سے چلا گیا ہے۔"

"لیکن یہاں سے جانے کے بعد وہ مشتبہ ہوگیا ہے۔"

بیلی نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "اس طرح کے نہ جانے کتنے حادثات ہوتے رہتے ہیں اور میں ان کی رپورٹنگ کرتا رہتا ہوں لیکن جیک اور سوسن کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ناقابلِ یقین ہے۔"

"واقعی ان دونوں کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔" انجلینا نے کہا۔

"اس کہانی کا دردناک پہلو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔" اینا نے کہا۔

بیلی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "جیک ایک اعلیٰ درجے کا منصوبہ ساز تھا لیکن سوسن اس سے بھی زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی اور اس نے مرنے سے پہلے ہی اس کی موت کا بندوبست کردیا۔"

وہ تینوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب ان کے ذہن میں سوسن اور جیک کی موت کے بارے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس رات پہلی بار انجلینا سکون کی نیند سوئی اور جیک کے بھوت نے اسے نہیں ستایا۔

☆☆☆

نیویارک واپس آنے کے بعد انجلینا دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئی اور ان دونوں کی موت کا واقعہ اس کے ذہن سے نکل گیا۔ کئی ماہ بعد اسے ایک ای میل موصول ہوئی جس میں مولی کے خلاف بہت بڑی رقم کے ہرجانے کا ذکر کیا گیا تھا۔ واشنگٹن میں رہنے والے ایک جوڑے نے اس پر ان کی بیٹی کے اپارٹمنٹ پر قبضہ کرنے، گھر کی اشیا فروخت کرنے اور اس کا بینک اکاؤنٹ خالی کرنے کا الزام لگایا تھا۔

مولی کے وکیل نے موقف اختیار کیا کہ یہ اثاثے سوسن سے جیک کو منتقل ہوگئے تھے کیونکہ اس کی موت کے بعد وہی اس کا وارث تھا۔ جیک نے اپنے دوست مولی کو مختار مقرر کردیا تھا اور جب وہ ایک مہم کے دوران مارا گیا تو مولی نے قانونی طریقے سے وہ اثاثے اپنے نام منتقل کروالیے۔ عدالت نے وکیل کا موقف درست مانتے ہوئے مقدمہ خارج کردیا تھا۔

انجلینا نے اینا اور بیلی کو اس حوالے سے کئی ای میل بھیجیں جن میں مقدمہ ختم ہونے کی اطلاع بھی شامل تھی۔ اس سلسلے کی آخری ای میل میں اس نے لکھا کہ جب مولی اپنے وکیل سے رات گئے مل کر آرہا تھا تو 53 اسٹریٹ پر ایک ٹیکسی تیزی سے آئی اور اسے کچلتی ہوئی چلی گئی۔ مولی عدالت سے تو بری ہوگیا لیکن اوپر والے کے انصاف سے نہ بچ سکا۔ شاید اسی لیے انجلینا نے اس میل کا عنوان "آخری فیصلہ" تجویز کیا تھا۔

# تلاش زر

سیریناراض

شب وروز کے بدلنے سے زندگی کا منظرنامہ نہیں بدلتا... مگر جذبوں میں شدت اور روانی ہو تو کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آتا ہے جب جدائی کے لمحے... اور اداسی ویاسیت کا دھندلکا چھٹنے لگتا ہے... ان چاہے دنوں کو خیر باد کہہ دینے والے دوستوں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ... وقت نے ان کے درمیان فاصلے حائل کردیے تھے مگر دلوں کے مسکن ہنوز آباد تھے۔

**تلاش زر کے معاملات جو لمحہ بہ لمحہ سلجھنے کے بجائے الجھتے جارہے تھے**

اُس نے دھمکی دی تھی کہ اب دوبارہ ملٹن آنے کا سوچنا بھی نہیں مگر اب یہ دھمکی بے اثر ہوچکی تھی۔ دھمکی کو بیس سال گزر چکے تھے۔ اب میں لگ بھگ اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔ مشرق سے سورج ابھر رہا تھا اور میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا نیچے وادی کے دامن میں آباد، قصبے ملٹن کو دیکھ رہا تھا۔ ملٹن کی آبادی بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں سے پیالہ نما وادی کے دامن میں آباد قصبے کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ موسم سرد تھا اور میں نے اپنے ہاتھوں میں گرم کافی کا مگ تھام رکھا تھا جس کی حدت اُس وقت خاصی خوش گوار محسوس ہورہی تھی۔

میں بطورِ خاص اس مقام پر ملٹن کا نظارہ کرنے کے لیے نہیں ٹھہرا تھا۔ موٹیل ہائی وے کے ساتھ واقع تھا اور میرے لیے یہی مناسب تھا کہ یہیں ٹک جاؤں۔ رائل فلش موٹیل میں کئی سال پہلے موسمِ سرما میں ٹھہر چکا تھا۔ اُس وقت میرے ساتھ نامی ہینسن اور گریگ رینالڈ بھی تھے۔ ہم تینوں ملٹن پولیس فورس کے جوان تھے اور ہمیں منشیات فروشوں کے خاتمے کا مشن سونپا گیا تھا۔ منشیات فروش اور ان کے سرغنہ زیادہ تر اپنا کاروبار کار پارکنگ میں، سڑک کے کنارے یا پھر چلتے پھرتے کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ملٹن کے نہیں بلکہ باہر سے آنے والے جرائم پیشہ تھے۔ موبائل منشیات فروشی کے کاروبار میں ملوث جرائم پیشہ اپنا ٹھکانا بنانے سے خوف زدہ رہتے تھے۔ ایسے دو چار ہی مجرم تھے جو کرائے کا کمرا حاصل کر کے کہیں پر کچھ عرصے کے لیے ٹھہر جاتے تھے ورنہ تو زیادہ تر پکڑے جانے کے خوف سے ایک جگہ ٹک کر رہنے سے کتراتے تھے۔ بیس برس پہلے رائل فلش موٹیل بھی ایسی ہی جگہ تھی جہاں کچھ منشیات فروشوں نے اپنا عارضی بسیرا کرلیا تھا۔ اسی لیے اُس وقت ہم یہاں ٹھہرے تھے۔

طویل مدت کے بعد اب دوبارہ یہاں آیا تو پتا چلا کہ موٹیل کے پرانے مالک نے کچھ عرصہ پہلے اسے فروخت کر دیا تھا۔ نئے مالک نے اس کی تزئین و آرائش پر خاصی توجہ دی تھی۔ میں پچھلے تین روز سے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس دوران مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اب یہاں کا ماحول پہلے جیسا نہیں تھا۔ نئے مالک نے کافی کا معیار بھی بہتر بنا دیا تھا۔ "بہت عمدہ!" میں نے دل میں کہا اور آخری گھونٹ بھر کر کپ ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

سورج طلوع ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ دن سرد مگر خوش گوار تھا۔ میں کمرے میں واپس آیا۔ ایک چھوٹا بیگ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ میں نے کار کے بجائے پیدل ہی ملٹن جانے کا فیصلہ کیا۔ موٹیل سے باہر نکلتے ہوئے میں نے سڑک کنارے واقع ایک اسٹور سے پانی کی بوتل اور کھانے پینے کی کچھ دوسری چیزیں خرید کر بیگ میں رکھ لیں اور پھر قصبے کے لیے چل دیا۔ میں ایک خط کی وجہ سے یہاں آیا تھا جو ولیم کروک ... نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے مجھے لکھا تھا۔ ولیم کروک ... قصبے کی کونسل کا سیکریٹری تھا۔ خط اس وقت بھی میرے کوٹ کی جیب میں موجود تھا، جسے میں کئی بار پڑھ چکا تھا۔ راستہ لمبا تھا۔ میں نے جیب سے خط نکالا اور چلتے چلتے اسے ایک بار پھر پڑھنے لگا۔

گزشتہ بیس برسوں کے دوران میں نے ولیم کو کئی خط لکھے تھے مگر اس نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی لیے جب مجھے پہلی بار اس کا خط ملا تو بہت زیادہ حیرت ہوئی۔ خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہے اور مرض آخری اسٹیج پر ہے۔ وہ ہر روز موت کے قریب ہو رہا تھا۔ چار صفحوں پر مشتمل اُس کا خط ایک ایسا بیانِ حلفی تھا جیسے کوئی مجرم موت سے پہلے اس لیے اپنے کرتوتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید اسی بنا پر خالقِ کائنات اگلی زندگی اس پر سہل بنا دے۔ اس کے خط کا تعلق آرتھر بلوم کے قتل سے متعلق پوشیدہ حقائق سے تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے سب کچھ سچ سچ تحریر کر کے خط مجھے بھیج تھا۔

آرتھر قتل کیس کو بیس سال گزر چکے تھے۔ میں کیس کے بارے میں جانتا تھا۔ ساتھ ہی ان دو آدمیوں کے بارے میں بھی جن کا تذکرہ ولیم نے خط میں کیا تھا۔ ان دونوں کے ملوث ہونے کے بارے میں اُس وقت مختلف افواہیں گردش میں تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ قتل سے پہلے دو ایسے اجنبی دیکھے گئے تھے جو بظاہر مقتول کے بہت قریب تھے۔ قتل کے بعد ان کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ پولیس کو شک تھا کہ وہی اجنبی اس کے قتل میں ملوث تھے البتہ نامی ہینسن اُس کی محبوبہ سینڈرا پر شک کر رہا تھا۔ یہ بھی افواہ تھی کہ قاتل اس کی خطیر رقم لے کر فرار ہوئے تھے مگر ولیم نے خط میں شبہ ظاہر کیا تھا کہ آرتھر کی خطیر رقم اب تک ملٹن میں کسی جگہ پر موجود ہے۔

میں نے خط پڑھ کر ایک بار پھر جیب میں رکھ لیا اور ... اردگرد نظریں ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ راستہ اونچا نیچا تھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ چمکتے سورج کی نرم نرم دھوپ سینکتے ہوئے میرا پیدل سفر مزے سے کٹ رہا تھا۔ نظارہ بہت خوبصورت تھا لیکن اس کے باوجود ولیم کا خط بدستور ذہن کو گھیرے ہوئے تھا۔ میں ولیم کے اعترافات کے بارے میں سوچتا ہوا قصبے پہنچ گیا۔

پچھلے بیس سالوں میں قصبہ واقعی بہت بدل چکا تھا۔ مجھے اتنی تبدیلیوں کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اگرچہ کئی جگہیں جانی پہچانی تھیں۔ متعدد دکانیں ویسی کی ویسی تھیں مگر میرا خیال تھا کہ اب ان کے مالک بدل چکے ہوں گے۔ جتنے عرصے کے بعد میں یہاں آیا تھا، اس دوران تو ایک پوری نسل جوان ہو چکی ہوگی۔ میں ملٹن پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ جانا پہچانا تھا۔ کبھی اس راستے سے گزرنا میرا معمول تھا مگر اب وہ ماضی کی بات تھی۔

"یہاں تو کچھ نہیں بدلا۔" ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے سامنے پہنچ کر میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس عمارت سے اچھی طرح





واقف تھا۔ لابی سے گزر کر میں نے سیڑھیاں طے کیں اور پہلی منزل پر ایک دروازے پر لگی ڈور بیل بجادی۔

"کس سے ملنا ہے؟" جواب میں دروازے پر لگے اسپیکر سے آواز آئی۔

"اُس آدمی سے جس کا نام دروازے پر لکھا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا نام بتایا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دروازے پر لگے کیمرے سے مجھے دیکھ رہا ہوگا۔

"ایک منٹ رکیے۔" یہ کہہ کر اس نے اسپیکر بند کر دیا۔

نامی ہینسن تھوڑی ہی دیر میں دروازے پر آگیا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"مبارک ہو۔" رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا۔

"کس چیز کی؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"تم پولیس چیف بن گئے ہو۔"

"اوہ... بہت شکریہ تمہارا۔" اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"ویسے تمہیں یقین تھا کہ اس عہدے تک کبھی پہنچ پاؤ گے؟"

"شاید نہیں..." اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر میرا خیال ہے کہ خوش قسمتی اور ان تھک محنت مجھے یہاں تک لے ہی آئی۔"

میں نامی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت مہذب تھا مگر اس کے رویّے میں حسد تھا اور غرور بھی جھلکتا تھا۔ ہم دونوں بیس برس کے طویل عرصے کے بعد مل رہے تھے۔ اس دوران میں اس کی شخصیت میں خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ شاید یہ عمر کا تقاضا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں بھی اسی طرح سوچ رہا ہوگا۔

"تمہیں حیرت نہیں ہوئی مجھے دیکھ کر؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تجسس تو ہو رہا ہوگا کہ آخر میں یہاں کیوں آیا ہوں اور وہ بھی اتنے لمبے عرصے کے بعد۔"

"شاید..." اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟" اس نے مختصر سا جواب دے کر بات پلٹ دی۔

"رائل فلش موٹیل میں۔"

"اوہ... وہ تو خاصا مہنگا ہے۔" اس نے تعجب خیز لہجے میں کہا اور پھر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے تم خاصے امیر ہوگئے ہو۔ کب تک ٹھہرنے کا خیال ہے؟"

"فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ زیادہ دنوں تک ٹھہرنا پڑ جائے۔" یہ سن کر اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم سے پھر کبھی ملاقات ہو پائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "خیر... تو واپسی پر تم اپنے ساتھ کیا کچھ لے کر آئے ہو؟"

"بہت اہم چیز۔" میں نے لہجے کو پُراسرار بناتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ..." میں نے اسے ولیم کروک کے خط کے بارے میں تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آرتھر کی موت کے بعد اس کی ایک خطیر رقم غائب ہوگئی تھی۔ ولیم نے اپنے خط میں اس بات کی تصدیق بھی کی ہے۔

"اب تم بتاؤ، کیا کہتے ہو؟" ساری تفصیل سنانے کے بعد میں نے اس کے تاثرات جاننا چاہے۔ اس کا چہرہ بدستور سپاٹ رہا اور میں اس کے تاثرات بھانپنے کی لاکھ کوشش کے باوجود یہ جاننے میں ناکام رہا کہ میرے انکشافات سے اس کے دل و دماغ کی کیا حالت ہو رہی تھی۔

"آرتھر تو کم آمدنی والا آمنگر تھا۔" میری بات سن کر نامی نے کہنا شروع کیا۔ "اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ ولیم کو اس کی دولت کے بارے میں کیسے علم ہوا؟" یہ کہتے ہوئے بھی وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہ ہونے پائے۔

"وہ اہم عہدے دار تھا۔ اس کی نظر ہر شے پر تھی۔ وہ کاؤنٹی کے سسٹم کو جانتا تھا۔ وہ ہر افواہ پر نظر رکھتا تھا۔" میں نے اسے بتانا شروع کیا کہ ولیم کس طرح جان سکتا تھا کہ آرتھر کی دولت اب تک یہیں پر کہیں پوشیدہ ہے۔

"تم نے ٹھیک کہا مگر یہ مکمل طور پر درست نہیں۔" میری بات سن کر نامی نے جواب دیا۔ "جہاں تک ولیم کا تعلق ہے تو وہ ویلج کونسل کا سربراہ تھا۔ میئر کے بعد وہی یہاں کا سب سے اہم عہدے دار تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اہم لوگ اس سے ملتے تھے مگر اس لیے کہ وہ ان کے بارے میں اپنا منہ بند رکھے۔ میں حیران ہوں کہ تمہارے لیے اُس نے اپنی زبان کیوں کھولی؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"افسوس کہ اُس سے یہ سوال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اس نے سوچا ہوگا کہ مرنے سے پہلے کوئی نیک کام کر جائے۔ اسی لیے اس نے مجھے اعترافی خط لکھ بھیجا۔" یہ کہہ کر میں نے گہری نظروں

سے اسے دیکھا۔ "ممکن ہے وہ چاہتا ہو کہ کم از کم آرتھر کے ساتھ انصاف ہو جائے اور وہ لوگ پکڑے جائیں جنہوں نے کسی نہ کسی مرحلے پر اُس کی موت سے فائدے حاصل کیے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے چند لمحے توقف کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کی موت سے کئی لوگوں نے فائدے اٹھائے ہوں گے مگر تم ان میں شامل نہیں ہو سکتے۔"

"آرتھر کی موت سے کس کس کو فائدہ پہنچا تھا؟" ٹامی نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ "ولیم نے اس بارے میں کیا لکھا ہے اپنے خط میں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کندھے اُچکا دیے۔

"تم وہ خط اپنے ساتھ لائے ہو؟" ٹامی نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے صاف جھوٹ بولا۔ "مگر یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یونہی..." اس نے گھبرا کر جلدی سے جواب دیا۔ "وہ... میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات تو نہیں جو تم بتانا بھول گئے ہو۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا اور پھر لمحہ بھر کے بعد کہنے لگا۔ "ولیم نے کتنی رقم بتائی ہے جو غائب ہوئی تھی؟ آرتھر زیادہ مال دار تو تھا نہیں، بہت معمولی رقم ہوگی اُس کے پاس۔" اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ رقم اتنی نہیں تھی جس کے لیے اب بیس سال گزر جانے کے بعد میں خوار ہوتا پھروں۔

"تمہاری معلومات کے لیے بتا دوں کہ وہ معمولی رقم نہیں تھی۔" یہ کہہ کر میں دو سیکنڈ کے لیے رکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "بڑی بھاری رقم تھی وہ۔" میں اسے یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کی رائے سے قطعی متفق نہیں کہ آرتھر معمولی آدمی تھا۔

"خیر جتنی بھی رقم ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ بیس سال کے دوران یہ معاملہ حل نہیں ہوا تو اب تمہارے اس مختصر سے دورے میں کیا ہو پائے گا۔"

"مختصر دورہ..." میں نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔ "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہاں آنے کا تمہارا مقصد یہی ہے تو پھر تم نے صرف اپنا وقت ہی برباد نہیں کیا، رقم بھی ضائع کی ہے۔ اگر تم مجھے آنے سے پہلے فون کر لیتے تو شاید اپنا وقت اور پیسا دونوں بچا سکتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتا ہے... مجھے اب چلے جانا چاہیے۔

"اگر میں قصبے سے واپس جاتے ہوئے کچھ دیر کے لیے ولیج ہال پر رُک کر گریگ رینالڈ سے دعا سلام کر لوں تو تم بُرا تو نہیں مانو گے؟" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور... ویسے بھی اب وہ کونسل کا سیکریٹری ہے۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا۔ "میں یہ بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ ولیم نے اپنے خط میں گریگ کا تذکرہ کرنا کیوں ضروری سمجھا ہے گا؟" وہ دل کی بات زبان پر لے آیا۔ یہی جاننے کے لیے میں نے ولیج ہال کا ذکر کیا تھا۔

"وہی سبب ہوگا جس کی بنا پر اُس نے تمہارا اور میرا نام لیا ہے۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میرے پیچھے آنے لگا۔ میں دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بات سمجھ نہیں آرہی..."

"کیا؟" اس نے فوراً قطع کلامی کی۔

"ولیم نے سینڈرا کا نام کیوں نہیں لیا۔" میرے لہجے سے تجسس کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔ "کہاں ہے وہ، زندہ بھی ہے یا..." میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ "میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اب تک قصبے میں رہتی بھی ہے یا نہیں۔" مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بات سن کر اس کا چہرہ پتھرا گیا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خوش قسمتی سے زندہ ہے اور اب بھی قصبے میں ہی رہ رہی ہے۔

"ملٹن کو چھوڑ کر کوئی کہیں نہیں گیا ہے۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا۔ مجھے بھی اسی جواب کی توقع تھی۔ "تم جب یہاں گھومو گے تو خود ہی جان جاؤ گے۔"

"امید ہے کہ ہم جتنا جلد ممکن ہوا، دوبارہ ملیں گے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"یقیناً۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ کچھ دیر بعد میں ملٹن پولیس ہیڈ کوارٹر سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

آرتھر بلوم جیسے لوگ زندگی میں ہلچل کا سبب بنتے ہیں۔ ان جیسوں کی وجہ سے اکثر لوگوں کی زندگیاں ہمیشہ کے لیے اپنا رخ بدل لیتی ہیں۔ اس جیسے لوگ بھُس میں چنگاری لگا کر دور جانے والے ہوتے ہیں۔ آرتھر صرف گیارہ مہینے ملٹن میں رہا تھا، ہمارے لیے وہ طویل گیارہ مہینے تھے۔



آرتھر بلوم کی شخصیت غیر متاثر کن تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا موٹا اور بھدا سا آدمی تھا جس کے بڑے بڑے گول چہرے پر موٹے گول شیشوں کی عینک چڑھی رہتی تھی۔ اکثر وہ ہیٹ کے بغیر دکھائی دیتا تھا البتہ کبھی کبھار وہ سفید رنگ کا گول ہیٹ پہنتا تھا۔ کہتے ہیں کہ کسی رشتے دار سے ملنے کے لیے وہ لیونگسٹن کاؤنٹی سے ملٹن آیا تھا مگر اُس رشتے دار کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے رائل فلش میں کمرا لے کر ڈیرا ڈال رکھا تھا جس کا کرایہ وہ ہر ہفتے پیشگی ادا کر دیتا تھا۔ اکثر وہ شام کو ہیٹ کے بغیر موٹیل کے پارکنگ ایریا میں مٹرگشت کرتا نظر آتا تھا۔ بظاہر یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ ہوٹل میں ٹھہرنے والے اکثر لوگ پارکنگ ایریا میں شام کو تفریح کی غرض سے جمع رہتے تھے۔ اکثر من چلے جوڑے تو کار کے اندر بند ہو کر بیٹھے رہنا پسند کرتے تھے۔ جب تک پولیس کو اُس کے بارے میں علم ہوا، تب تک وہ اپنی اچھی شہرت قائم کر چکا تھا۔

وہ موٹیل میں تنہا نہیں رہ رہا تھا، اُس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس کا نام سینڈرا سومرز تھا۔ وہ دراز قامت خوبصورت عورت تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بزنس پارٹنر تھے مگر ایک بات طے تھی کہ اُن کے درمیان تعلقات دوستی سے بہت آگے تھے۔ وہ علیحدہ علیحدہ کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن اکثر وہ ہمیشہ اکٹھے نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود ٹامی کا کہنا تھا کہ آرتھر سے اُس عورت کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ ایک مرتبہ گریگ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ خاصی لیے دیے رہنے والی عورت ہے مگر دوسرے ہی دن جب موٹیل کی لابی میں سینڈرا نے آرتھر کے عقب سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھوں کا دل فریب اشارہ کیا تب سے گریگ نے اُس کے بارے میں اپنی رائے بدل لی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اشارہ مجھے کیا تھا۔ میری نظر میں آرتھر مشکوک تھا اور شاید میں اُس کے بارے میں اپنے ان دونوں ساتھیوں سے کچھ زیادہ جانتا تھا جس کی وجہ سینڈرا سومرز تھی۔ موٹیل میں قیام کے دوران ہم دونوں کے درمیان نہایت خفیہ طور پر بہت قریبی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔

☆☆☆

میں نے ٹامی سے ولیج ہال کا ذکر تو کیا تھا لیکن وہاں جانے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس جواز موجود نہیں تھا۔ یہ بات تو میں نے کسی خاص مقصد کے تحت کہی تھی۔ اب اس کا ردِعمل جاننے کا موقع آنے والا تھا۔

میں نے یہاں آتے ہوئے قصبے کے ایک ڈیلر سے کرائے پر ایک کار لے لی تھی جو اس وقت پولیس ہیڈ کوارٹر سے ایک بلاک آگے کھڑی تھی۔ میں نے ٹامی کے پوچھنے پر یہ تو بتا دیا تھا کہ موٹیل انتظامیہ کی معرفت ایک کار کرائے پر لے لی ہے مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون سے ماڈل کی کار ہے اور اس کا رنگ کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات اسے پتا چلے۔ وجہ یہ تھی کہ اگر میں اس کا تعاقب کرتا تو وہ بہ آسانی نہ جان سکتا تھا کہ کون پیچھا کر رہا ہے۔

ٹامی کے پاس سے اٹھنے کے بعد میں سیدھا درختوں کے اُس جھنڈ کی طرف چلا آیا جہاں کار پارک کی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے میں صاف طور پر ہیڈ کوارٹر کے اندر جانے اور باہر آنے والوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ گریگ کو فون پر میری ملاقات کے بارے میں نہیں بتائے گا بلکہ اس سے ملنے جائے گا۔ میرا خیال شاید درست تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ٹامی باہر نکلا۔

وہ پارکنگ میں کھڑی ایک کار میں بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ کار قصبے سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے ذرا بھی شبہ نہیں ہوگا کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ وہ جس راستے پر جا رہا تھا، وہ میرا جانا پہچانا تھا لیکن مجھے اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ اچانک موڑ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بس اسی دوران ایک موڑ مڑنے کے بعد اس کی گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے پلٹنے کے بجائے بدستور آگے بڑھتے رہنے کی ٹھان لی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ کچھ آگے جا کر، سڑک کنارے ایک تفریحی مقام ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ وہیں جائے گا کیونکہ اس کے بعد سو میل دور تک نہ تو کوئی ریسٹوران تھا اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ جہاں وہ جا سکتا تھا۔ تقریباً چار میل کا سفر طے کرنے کے بعد میں ایک ریسٹوران کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر رہا تھا۔

"یہ یہاں کا سب سے نمایاں ریسٹوران ہے۔ وہ یہاں آیا ہے تو اسی ریسٹوران میں گیا ہوگا۔" میں نے سوچا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ میرے خیال کے مطابق تو اس وقت اُسے گریگ کے پاس جانا چاہیے تھا۔ "خیر... کوئی بات نہیں۔ ابھی پتا چل جائے گا۔" میں بڑبڑایا۔

میں نے اندر بیٹھے بیٹھے باہر کی طرف نظریں دوڑائیں۔ پارکنگ میں بہت ساری گاڑیاں کھڑی تھیں مگر ٹامی جس کار میں ہیڈ کوارٹر سے نکلا تھا، وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اچھے

پارکنگ ایریا بھی خاصا کشادہ تھا۔ ممکن تھا کہ اس نے ایسی جگہ کار کھڑی کی ہو جہاں تک میری نظر نہیں پہنچ پا رہی ہو۔

یہ ایک سستا سا دو منزلہ ریسٹوران تھا۔ اُس وقت جو لوگ اندر آ جا رہے تھے، انہیں دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ کم آمدنی والے لوگوں کے لیے تو بالکل مناسب ہے، البتہ مجھے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ پولیس چیف کے اہم عہدے پر فائز تا ئی اتنی دور آ کر، اس جگہ پر لنچ کرنا پسند کرے گا۔

میں نے کار میں بیٹھے بیٹھے ریسٹوران کی شیشے والی دیوار کے پیچھے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اندر کا ماحول واجبی تھا۔ میں نے تا ئی کو دیکھنے کی بھی کوشش کی مگر وہاں خاصا ہجوم تھا، وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ ’ہوسکتا ہے کہ وہ بالائی منزل پر ہو۔‘ میں نے سوچا۔ میری نظریں بدستور ریسٹوران کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ کم از کم اتنی دیر تک یہاں ضرور ٹھہروں گا، جتنی دیر میں ایک آدمی لنچ مکمل کرسکتا ہے۔ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ لگ بھگ چالیس منٹ بعد تا ئی ایک دراز قامت عورت کے ساتھ باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دونوں باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور باتیں کرنے لگے۔

میں ان دونوں سے کافی فاصلے پر تھا اور میری کار کی ونڈ اسکرین پر بھی خاصی دھول جمی ہوئی تھی، اس کے باوجود میں ایک منٹ میں ہی اُس عورت کو پہچان گیا۔ وہ ذرا سی بھی نہیں بدلی تھی۔ اُسی انداز میں بالوں کا جوڑا باندھ رکھا تھا۔ وہی پرانے انداز کا لمبا سا گاؤن نما ڈریس، وہی جاذبِ نظر چہرہ... لگتا تھا کہ وقت اس کی عمر کو بڑھائے بغیر گزر رہا ہے۔ وہ سینڈرا تھی، وہی سینڈرا جس کے بارے میں بیس سال پہلے تا ئی نے یقین سے کہا تھا۔ ”اس عورت کا آرتھر سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے۔“ اُن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں سخت حیران تھا۔ کیا یہ تا ئی سے میری ملاقات کا نتیجہ ہے یا پھر دونوں کی ملاقات پہلے سے ہی طے شدہ تھی؟ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُن دونوں میں سے کس پر نظر رکھوں۔

وہ دونوں کافی دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ آخر سینڈرا نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور سر ہلاتے ہوئے اُس سے کچھ کہا۔ میں سمجھ گیا کہ ملاقات اب ختم ہونے والی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ پارکنگ کے انتہائی کنارے والے حصے میں پہنچے اور اپنی اپنی کار کے برابر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔

ان دونوں کو جاتا دیکھ کر میں نے اپنی گاڑی بھی اسٹارٹ کر لی۔ دو منٹ بعد سینڈرا کی کار پارکنگ ایریا سے باہر نکل رہی تھی۔ تا ئی اپنی کار کے برابر کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھ کر اب تک ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں سینڈرا کا پیچھا کرنے کے لیے تیار تھا۔ ویسے بھی یہ جاننا ضروری تھا کہ ان دنوں وہ زندہ رہنے کے لیے کیا کچھ کر رہی ہے۔

سینڈرا کی نئی سیڈان کار بہت عمدہ تھی۔ وہ خاصی تیز گاڑی چلاتے ہوئے میرے اندازے سے بھی کم وقت میں ملٹن پہنچ گئی۔ اس نے جس جگہ کار پارک کی تھی، وہ قصبے کا تجارتی علاقہ تھا جہاں بہت سارے دفاتر بھی واقع تھے۔ سینڈرا کئی منزلہ بڑی سی عمارت میں داخل ہو گئی۔ عمارت خوبصورت تھی اور اس کے بیرونی حصے میں شیشے کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ یہاں کسی دفتر میں کام کرتی ہوگی یا پھر خود اس کا اپنا کوئی دفتر ہوگا۔ وہ لنچ کرنے یا پھر سب کی نظروں سے بچ کر، تا ئی سے ملنے کے لیے اُس ریسٹوران میں گئی ہوگی اور لنچ بریک ختم ہونے پر دفتر لوٹ آئی ہے۔

جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ اپنے دفتر میں پہنچ چکی ہوگی، تب میں کار سے باہر نکلا اور عمارت کی لابی میں چلا آیا۔ لابی کی دیوار پر اُن تمام دفاتر کے نام اور کمرا نمبر لکھے ہوئے تھے جو یہاں پر کام کر رہے تھے۔ ان میں ڈینٹسٹ، وکیل، پراپرٹی ایجنٹ اور اسی طرح کے دیگر دفاتر واقع تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ سینڈرا جیسی خوبصورت اور بظاہر پُروقار نظر آنے والی دلکش عورت کو بھی زندہ رہنے کے لیے صبح نو سے شام پانچ بجے تک وہ کام کرنا پڑتا ہے جو میرے خیال میں شاید اس کی شخصیت کے شایانِ شان تو بالکل بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

میرے لیے اس سے بات کرنا بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ شاید اُس وقت تک آرتھر کی روح مکمل طور پر اپنے مسکن تک پہنچ چکی ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ پہلے صرف اشارہ کروں گا، بعد میں پوری بات کروں گا مگر شاید یہ سب کچھ بہت اتنا آسان نہیں تھا۔

اس رات باہر کا موسم قدرے سرد تھا مگر آتش دان کی وجہ سے میرے کمرے کا درجۂ حرارت خاصا خوش گوار تھا۔ میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور وہ ایک کنارے پر ٹکی ہوئی جوتے پہن رہی تھی۔ ”تم نے اُسے دیکھا تھا؟“ اس نے جوتے کے بند باندھتے ہوئے استفساریہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میرا کام نہیں ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔ ”بہتر ہے کہ جب تک تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتیں تم فضول سرگرمیوں سے ذرا پرہیز کرو۔“

”میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر میں مسکرا دیا۔

یہ آرتھر کے قتل کے کئی روز بعد کی بات ہے۔ ہمارے خفیہ تعلقات اس کی موت کے بعد بھی برقرار تھے۔ آرتھر قتل کیس میں سینڈرا کو بھی مشتبہ سمجھ کر تفتیش کی گئی لیکن اس کے خلاف پولیس کو ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ ویسے جب یہ تحقیقات ہو رہی تھیں، تب میری دلیل یہ تھی کہ وہ اس قتل میں ملوث نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُس کے ساتھ رہ رہی تھی اور یہ صرف اس کی ہی نہیں بلکہ آرتھر کی بھی مجبوری تھی۔ سینڈرا کی صورت میں اسے ایک ایسی پُروقار عورت کا ساتھ مل گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا سماجی رتبہ بھی بڑھا تھا۔ سینڈرا کے لیے تو یہی کافی تھا کہ وہ اس کا خرچ اٹھا رہا تھا۔ تفتیش کے وقت میرا یہی موقف تھا کہ ان کے درمیان اس مجبوری کے سوا اور کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں نے آرتھر کی زندگی میں کئی بار سینڈرا سے کہا کہ وہ اُسے چھوڑ کر میرے پاس چلی آئے مگر ہر بار وہ ہنس کر ٹال دیتی تھی۔ شاید وہ درست تھی۔ جس انداز میں آرتھر اس پر خرچ کرتا تھا، اس کا عشرِ عشیر بھی میں اپنی تنخواہ سے پورا نہیں کر پاتا۔ مجھ سے تعلق بھی شاید اس کی مجبوری تھی۔ ویسے بھی میں جوان اور صحت مند جبکہ وہ بوڑھا تھا۔ جذباتی لحاظ سے دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔

اُس دن میں اور کریگ رائل فلش کا ہفتہ وار خفیہ جائزہ لینے کے لیے وہاں پہنچے تھے، جب ہم نے پہلی بار آرتھر کو منشیات کے ساتھ پکڑا تھا۔ وہ پارکنگ میں ایک جوڑے کے ساتھ چرس کا سودا طے کر رہا تھا۔ اس کے قبضے سے بہت تھوڑی مقدار برآمد ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ سیمپل کے طور پر لایا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چرس بیچ نہیں رہا تھا بلکہ وہ اس کے جاننے والے تھے اور تینوں بس ذرا مزہ کرنا چاہتے تھے کہ پولیس نے دھر لیا۔ جس کی بنا پر جج نے اسے سزا دینے کے بجائے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔ اس واقعے کے دو ماہ کے اندر اندر وہ موٹیل سے کرائے کے ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا۔ سینڈرا بھی اس کے ساتھ ہی موٹیل سے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئی تھی۔ جو لوگ اُن دونوں کو موٹیل کے دو علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتا ہوا دیکھ چکے تھے، اُن کے





لیے یہ بات شبہے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ ان میں صرف دوستی کا نہیں بلکہ کچھ اور بھی رشتہ تھا۔

آرتھر کا اپارٹمنٹ دلکش انداز میں سجا ہوا تھا جس میں زیادہ ہاتھ سینڈرا کا تھا۔ ویسے آرتھر نے اسے آرام دہ بنانے کے لیے دل کھول کر پیسا خرچ کیا تھا۔ وہ دونوں ہر شام باہر گزارتے تھے۔ بہت جلد ملٹن کے ریسٹورانوں اور بارز میں اُن کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ وہ سو ڈالر کے بل پر کم از کم پچاس ڈالر ٹپ دیا کرتا تھا۔ وہ جس ریسٹوران میں چلے جاتے، ہر ویٹر کی خواہش ہوتی کہ اس کی میز پر وہ خدمات سرانجام دے۔ ملٹن بہت چھوٹا قصبہ تھا جہاں اس طرح کی باتیں بہت جلد زبانِ زدِ عام ہو جاتی تھیں۔

اگرچہ آرتھر موٹیل سے تو شفٹ ہو گیا تھا مگر اس نے وہ کمرا اب تک بدستور اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ موٹیل انتظامیہ کو باقاعدگی سے ہفتہ وار کرایہ ادا کرتا تھا۔ آرتھر نے انتظامیہ سے کہہ رکھا تھا کہ اس نے یہ کمرا اپنے ایک دوست کے لیے رکھ چھوڑا ہے جو کسی بھی وقت اُس سے ملنے کے لیے ملٹن پہنچے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کئی ہفتے گزر گئے مگر وہ دوست نہیں پہنچ سکا۔ یہ بات انتظامیہ کے لیے پریشانی کا باعث ہرگز نہیں تھی۔ انہیں تو کمرے کا کرایہ مل رہا تھا لیکن تا ئی، کریگ اور میں اس بات سے سخت پریشان تھے۔

ہم تینوں کو پولیس ڈپارٹمنٹ نے ملٹن میں منشیات فروشوں کے خلاف کارروائی کا ہدف دے رکھا تھا۔ ہم تینوں متفق تھے کہ آرتھر بڑی مچھلی ہے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود ہمیں اُس کے خلاف نہ تو ثبوت مل پا رہے تھے اور نہ ہی اُسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا موقع۔ ویسے بھی اس نے اپنی شاہ خرچیوں کے باعث قصبے میں شہرت اور اہمیت، دونوں حاصل کر لی تھیں۔ رہی سہی کسر سینڈرا نے پوری کر دی تھی۔ اب اس جیسی پُروقار حسینہ کو بغل میں لے کر چلنے والا پہلی نظر میں تو سب کو معزز ہی دکھائی دے گا۔ ان حالات میں ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی میں اُس پر ہاتھ ڈالنا خود ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ ہمیں لگتا تھا کہ وہ نہایت محتاط ہو کر کام کر رہا ہے۔

”یہ ہم سے کھیل رہا ہے۔“ اُس دن موٹیل کی پارکنگ میں جب ہم گاڑی سے نکل رہے تھے، تب کریگ نے کہا۔

”صرف ہم سے ہی نہیں، وہ پورے ملٹن سے کھیل رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔“ میں نے تا ئی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر وہ [illegible] تھا۔ ”سینڈرا اس کے ہاتھوں میں کھلونا بن رہی ہے۔“

آرتھر کی موت کے بعد جب پہلی بار وہ میرے اپارٹمنٹ پر آئی تھی، اُس وقت بھی میں نے اسے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ میرے پاس آجائے مگر وہ مسکرا کر رہ گئی۔ جب وہ جارہی تھی، تب ایک بار پھر میں نے اپنی پیشکش کو دُہرایا۔

''ابھی آرتھر کا دیا ہوا تھوڑا بہت میرے پاس ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''امید ہے کافی عرصے گزر بسر ہوجائے گی ورنہ میرے پاس اور بھی وسائل ہیں۔'' یہ کہہ کر سینڈرا خاموش ہوگئی اور میرے چہرے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میری خاطر پریشان مت ہو، میں اپنی زندگی خود گزار سکتی ہوں۔''

سینڈرا کی بات کو بیس برس گزر چکے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ شاہانہ طریقے سے زندگی گزارنے والی سینڈرا اب عام لوگوں کی طرح صبح نو سے شام پانچ تک کی ملازمت کرکے دن بِتا رہی ہے۔

میں پارکنگ میں اپنی کار میں بیٹھا اُس کا منتظر تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا، اگر وہ پانچ بجے نیچے آئی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی کی ملازمت کررہی ہے۔ مجھے کئی گھنٹے تک اس کا انتظار کرنا تھا۔ پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تو میں نے سیٹ پیچھے کی اور نیم دراز ہوکر وہ سینڈوچز کھانے لگا جو صبح موٹل سے نکلتے وقت خریدے تھے۔

☆☆☆

گزشتہ روز میں ولیم کروک کی بہن اینا سے ملنے گیا تھا۔ وہ ملٹن سے بیس میل دور واقع چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ اُس نے ہی مجھے خط لکھ کر بھائی کی موت کی خبر دی تھی مگر اُس کے مرنے کے کئی ہفتوں کے بعد۔ اُس کا گھر میرا دیکھا ہوا تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو بہت دکھ ہوا۔ کبھی یہ اچھا خاصا خوبصورت مکان ہوا کرتا تھا مگر اب بوسیدگی اُس کے در و دیوار سے ٹپک رہی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ اُس نے دروازہ کھولنے میں کافی دیر لگادی۔

''ہائے۔'' جب اُس نے دروازہ کھولا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ...'' وہ مجھے پہچان تو گئی تھی مگر اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اندر آگئی۔

ہم جس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ روشنی کے باوجود تاریک لگ رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی بہت چھوٹی تھی اور اندر کی حالت سے بھی عسرت جھلکتی تھی۔ ''ولیم کی موت کے بارے میں خط لکھنے کا بہت شکریہ۔'' میں نے بات شروع کی۔ ''مگر تم نے خط بھیجنے میں اتنی تاخیر کیوں کی... کیا کوئی پریشانی تھی؟''

''بھائی کی موت کے بعد جب میں نے اُس کے کمرے کی صفائی کی تو تمہارے لکھے ہوئے خطوط ایک الماری سے ملے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''انہیں دیکھنے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں اس بارے میں خبر کردی جائے، ورنہ خط لکھنے میں تاخیر کی کوئی اور وجہ نہیں تھی۔''

''اُس نے صرف ایک بار ہی مجھے خط لکھا ورنہ کبھی کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ تم اس کی وجہ جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا

''جب بھی تمہارا کوئی خط آیا تو اسے پڑھ کر وہ یہی کہتا تھا کہ جو کچھ جانتا تھا، وہ بتا چکا ہے۔ اب اور کیا بتائے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف بغور دیکھا۔ ''میرے خیال میں جواب نہ دینے کی شاید یہی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔''

''یہ درست نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس سے رابطے کی اہم وجہ تھی۔ اگر تم اُس کو لکھے گئے میرے تمام خطوط میں سے کسی ایک کو بھی پڑھ لو تو سمجھ جاؤ گی کہ میں کیا چاہتا تھا۔ دو تین ایسی باتیں تھیں، جن کے بارے میں جاننا چاہتا تھا ہر قیمت پر مگر...'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سرد آہ بھری۔ ''مگر اب تم سے یہ باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے کھڑکی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ یہ سُن کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا لگا جیسے وہ کمرے سے جانا چاہتی ہے مگر پھر رُک گئی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ مجھ سے نظریں چُرا رہی ہے۔

''جب آرتھر بلوم کا قتل ہوا، تب سے میں مسلسل یہی جاننے کی کوشش کررہا تھا۔''

''تم رقم کے بارے میں جاننے کے لیے بے قرار ہو مگر اُس کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔'' اینا نے سرد لہجے میں کہا۔

''اوہ...'' اُس کی بات سن کر میں مسکرادیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم وہ سارے خط پڑھ چکی ہو۔''

وہ مڑی اور ایک بار پھر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے خوف زدہ ہے۔ ''میں تمہیں خط لکھ کر اس کے مرنے کی اطلاع دینا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی میں آکر کھڑا ہوگیا۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا، سامنے والی سڑک سنسان پڑی تھی۔ دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا۔ میں پلٹا تو دیکھا کہ وہ خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے ڈر ہوگا





کہ کہیں میں پلٹ کر اس کا گلا نہ دبادوں۔ ''اینا...'' میں نے نرم لہجے میں اس کو مخاطب کیا۔ ''میں ہمیشہ سے یہی سمجھتا ہوں کہ آرتھر کی موت کے وقت کچھ اور لوگ بھی اس کے پاس تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کے گروہ کے ہی لوگ ہوں گے، جن کے ہاتھ اُس کے مرنے کے بعد جو لگا، سمیٹ کر نکل گئے۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس نے گھبرا کر نظریں نیچی کرلیں۔ ''تمہارا بھائی وہ واحد شخص تھا جو یہ بات جانتا تھا کہ اُس رقم کا بڑا حصہ ابھی تک یہیں پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جانتا تھا کہ جن لوگوں نے آرتھر کا کام تمام کیا تھا، وہ اب بھی قصبے میں آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔''

''اگر ایسا تھا تو پھر اُس نے تمہارے خطوط کے جواب میں یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں تو یہاں سے کب کا جاچکا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کہ جب وہ صحت مند تھا، تب یہ بات بتانے سے اس لیے گریزاں ہو کہ کہیں وہ لوگ اسے نقصان نہ پہنچائیں... کچھ بھی ممکن ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ نکال کر سلگالیا۔ میں اسے سوچنے کا وقت دینا چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ رقم کے بارے میں جانتی ہو اور مجھے بتادے کہ وہ کہاں ہے۔

خاصی دیر گزر گئی مگر وہ بدستور فرش پر نظریں لگائے خاموش بیٹھی رہی۔

''دیکھو، کوئی شخص یہ بات نہیں جانتا کہ میں یہاں آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم کسی ایسے شخص کے بارے میں جانتی ہو جسے اُس رقم کا علم ہے تو مجھے اس کا نام بتادو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دروازے سے باہر نکلتے ہی یہ بات بھول جاؤں گا کہ ولیم کی موت کے بعد کبھی یہاں پر آیا بھی تھا۔'' میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کچھ جانتی ضرور ہے لیکن اسے خوف بھی لاحق ہے۔ میں نے اسے اپنی ذات پر اعتماد کرنے کی امید دلائی مگر وہ خاموش رہی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ ''ویسے اگر وہ رقم مل گئی تو میں تمہیں اس میں سے اچھا خاصا حصہ بھی دوں گا۔'' اسے خاموش دیکھ کر میں نے لالچ کا تیر چلایا۔

''پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔ میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔ ''جاؤ اور جا کر رقم ڈھونڈ لو۔ مل جائے تو کریک اور ٹامی کے ساتھ مل کر آپس میں بانٹ لینا۔ تم سب ایک ہی جیسے ہو، گندے لوگ۔''

''اینا... ہم سب ایک جیسے گندے نہیں ہیں۔'' میں نے صفائی پیش کی۔ ''کچھ فرق ہے اُن دونوں اور مجھ میں۔''

اس نے میری بات سنی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

''میں جانتا ہوں کہ یہاں میری رقم محفوظ نہیں۔ صرف یہی نہیں، یہاں کہیں بھی میری رقم محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس رقم کی وجہ سے میں اور خود تم دونوں بھی خطرے میں پڑ سکتے ہو۔'' اُس روز اتوار کی چھٹی تھی۔ میں بار میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ سے اگلی میز پر آرتھر اپنے ساتھ آنے والے دو آدمیوں سے بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا جیسے اُن کی بات نہیں سُنی ہے۔ ویسے بھی ان دونوں کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟'' ایک نے آرتھر سے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں کہ کیا کیا جائے؟'' آرتھر نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا گلاس ختم کیا اور باہر آگیا۔

''سنو... خوشخبری ہے۔'' اگلے روز سینڈرا نے مجھے فون کیا۔

''کیا...'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''وہ تین چار دنوں کے لیے سینٹ لوسیا جارہا ہے کاروباری سلسلے میں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس کی غیر حاضری میں تم پوری طرح میری ہوگی۔''

''بالکل...'' یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''سنو، ہم یہ دن شکاگو میں گزاریں گے عیش کرتے ہوئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ ''میں نے فرسٹ کلاس کی دو ٹکٹیں بک کروالی ہیں۔ تم جمعرات سے اتوار تک کی چھٹی لے لو۔ پیر کو وہ لوٹے گا۔ اتوار کی شام ہم واپس آجائیں گے۔''

''واہ...'' میں نے بے ساختہ کہا۔

اِدھر آرتھر سینٹ لوسیا جانے کے لیے نکلا، اُدھر ہم دونوں شکاگو کے لیے پرواز کرگئے۔ میں زندگی میں پہلی بار جہاز کی فرسٹ کلاس میں سفر کررہا تھا۔ اس سیر پر سینڈرا نے دل کھول کر پیسا خرچ کیا اور گنتی کے اُن چند روز کے ہر پل کا لطف لیا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ سینڈرا تو اس دوران بہت ہی جذباتی نظر آرہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ برسوں بعد پہلی بار اتنا خوش ہورہی ہے۔

☆☆☆

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ اس وقت میں ڈرائیونگ سیٹ پیچھے کر کے نیم دراز ہو کر آرام کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پانچ بجنے میں ابھی کافی وقت باقی ہے۔ اس دوران موٹیل جا سکتا ہوں۔ کچھ دیر بعد میں اپنے کمرے میں نہا کر کپڑے بدل رہا تھا۔

جب میں پارکنگ میں دوبارہ واپس آیا تو اُس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے مگر مجھے سینڈرا کی کار کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ جاچکی۔" میں نے اپنے دل میں کہا اور گاڑی وہیں کھڑی کر کے پیدل ہی مٹرگشت کرنے لگا۔ سردیوں کے چھوٹے دن تھے۔ پانچ بجے تک شام ہو چکی تھی۔ میں نے ایک روڈ سائڈ کیفے سے کھانا کھایا اور واپس آگیا۔ میں سینڈرا کے بارے میں نامی سے پوچھنا چاہتا تھا مگر میری ہمت نہیں ہوئی تھی۔ آخر میں نے ملٹن کی ٹیلی فون ڈائریکٹری نکالی۔ تھوڑی ہی دیر میں سینڈرا سومرز کے نام سے اس کا نمبر اور پتا مل گیا۔ نام سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس نے شادی کی ہے، کسی کے ساتھ رہ رہی ہے یا اب تک تنہا ہے؟ آخر ہمت کر کے میں نے اُس کا نمبر ملایا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ہیلو کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ بیس سال بعد بھی اس کی آواز ویسی ہی کھنک دار اور دلنشیں تھی۔ اُس نے دوبارہ ہیلو کہا۔ میں نے ماؤتھ پیس پر سختی سے ہتھیلی رکھی ہوئی تھی تاکہ وہ میری آواز نہ سن سکے۔ اس وقت میں بے حد نروس تھا۔ کل مجھے دیکھ کر اپنا بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہی ردِّعمل سینڈرا کا بھی نہ ہو۔ اُس نے کئی بار ہیلو کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور لیٹ گیا۔ اس وقت میں صرف سینڈرا اور اُس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سینڈرا کے سحر نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا ہو۔ بیس سال میں پہلی بار اس کی آواز سنی تھی۔

کافی دیر تک میں اس کے خیال میں کھویا رہا۔ میں نے کافی منگوانے کے لیے فون اٹھایا تو لگا جیسے میرا سوٹ کیس وہاں نہیں رکھا جہاں سہ پہر کو ملٹن جانے سے پہلے میں نے اسے رکھا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ پہلے تو خیال آیا کہ صفائی کرنے والے کمرے میں آئے ہوں گے مگر پھر بھی میں ایک پولیس والا تھا۔ فوراً اٹھا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ سوٹ کیس کو کھول کر اندر سے سامان کی تلاشی لی گئی تھی۔ کھونٹی پر لٹکے کوٹ کی جیب اُلٹ کر دیکھا گیا تھا اور وہ اب تک ویسے ہی الٹی پڑی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر ناول رکھا ہوا تھا جس میں نشانی کے لیے میں نے 'بک مارک' لگا دیا تھا۔ میں نے صفحات کھولے۔ بک مارک وہاں نہیں تھا جہاں میں نے لگایا تھا۔ یہ اُس باب پر لگا ہوا تھا جو میں نے کل رات پڑھا تھا۔ ویسے تو میرا سامان ہی گنتی کا تھا مگر تلاشی لینے والے کے ہاتھوں سے کوئی بھی چیز بچی نہیں تھی۔ اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے یقین آگیا کہ سہ پہر میں کوئی کمرے میں آیا اور اطمینان سے تلاشی لے کر چلا گیا۔ البتہ میری یادداشت کے مطابق کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ چور نہیں تھا بلکہ اُسے کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ یہ سوچ کر میں مسکرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے جس چیز کی تلاش ہے، وہ اسے میری غیر موجودگی میں تو ہرگز اس کمرے سے نہیں مل سکتی۔ "پلیز... ایک کافی۔" میں نے انٹرکام پر روم سروس کو آرڈر دیا اور کچھ سوچنے لگا۔ آج صبح میں نے نامی سے کہا تھا کہ ولیم کا خط اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ شاید وہ یہ بات سچ سمجھا۔ اگر وہ خط میرے پاس نہیں تھا تو پھر اس کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ ویسے بھی نامی احمق نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس خط کی وجہ سے میں دوبارہ ملٹن آیا ہوں، اُسے گھر پر تو چھوڑ کر یہاں آنے سے رہا۔

دوسرے دن میں ناشتا کر کے پارکنگ کے قریب اُس ویو پوائنٹ پر آگیا جہاں سے نشیب میں ملٹن کا خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ سب کچھ کل جیسا ہی تھا۔ میں بینچ پر بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ کیوں اس سارے قضیے میں الجھا ہوا ہوں، کس لیے یہاں آیا ہوں؟ اگرچہ آرتھر کی مسروقہ رقم بہت زیادہ تھی مگر رقم میرے لیے یہاں آنے کی وجہ نہیں تھی۔ تو پھر اصل بات کیا تھی؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ شاید میرے دل کے کسی گوشے میں سینڈرا سے ملنے کی تمنا برسوں سے سو رہی تھی جو ولیم کا خط ملنے کے بعد جاگ اٹھی اور میں یہاں چلا آیا۔ کافی ختم کر کے میں اٹھا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر کل سہ پہر کے واقعے کے بعد مجھے یقین تھا کہ نامی کے بدمعاش اس وقت بھی مجھے اپنی نظروں میں لیے ہوں گے۔ نامی کو ہر حال میں وہ خط چاہیے تھا جس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ کمرے میں لوٹ کر میں کافی دیر تک آرام کرتا رہا اور پھر نہا کر کپڑے بدلے۔ میں ملٹن جا رہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طور سینڈرا سے ملنا چاہتا تھا۔

گاڑی کافی دور کھڑی کر کے میں قصبے کے جانے پہچانے راستوں پر پیدل ہی چل پڑا۔ کافی دیر... مٹرگشت کے بعد ولیج ہال کے قریب واقع کافی شاپ میں آکر بیٹھ گیا۔ چائے اور سینڈوچز کا آرڈر دے کر میں شیشے کی دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے میں محو ہوگیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے قریب کھڑا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، یہ کریگ رینالڈ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں کرسی سے اٹھا اور گرم جوشی سے اسے خوش آمدید کہا۔

"مجھے علم ہوا کہ تم ملٹن آئے ہوئے ہو۔" رسمی گفتگو کے بعد وہ کہنے لگا۔ "اتفاق ہے کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ تمہیں دیکھا تو اندر چلا آیا۔" یہ کہہ کر اُس نے میری طرف دیکھا۔ "اتنے طویل برسوں کے بعد تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"کتنی عجیب بات ہے۔ تم نے یہ سُن لیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں اور اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر اندر بھی آگئے ورنہ تو تم سیاست دانوں کی آنکھیں اور کان تو ہمیشہ بند رہتے ہیں۔" میرا لہجہ دوستانہ تھا۔ میری بات سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد سیاست میں آگیا تھا اور اب کاؤنٹی کونسل کے اہم عہدے پر فائز تھا۔

"تم بالکل نہیں بدلے، اب تک ویسے ہی شرارتی ہو۔" یہ کہہ کر کریگ نے میرے سراپا پر نظر ڈالی۔ "تم پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہوگئے ہو۔ مجھے بھی بتا دو، عمر کم کرنے کا کیا راز ہے تمہارے پاس۔"

"خوش باش رہنا۔"

میری بات سن کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک میں نے پوچھا۔ "سینڈرا کا کیا حال ہے... کیا کر رہی ہے وہ؟"

"سینڈرا..." میری بات سُن کر اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ وہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو سینڈرا کون ہے۔ "ارے یاد آیا، بھئی سچ پوچھو تو مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ویسے ٹھیک ہی ہوگی۔" یہ بات اس نے جس انداز سے کہی تھی، اس کا مطلب مجھے یہ سمجھ آیا کہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔

"بڑی عجیب بات ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس قصبے میں آئے صرف چھتیس گھنٹے ہوئے ہیں، تمہیں میرے بارے میں خبر بھی مل گئی اور مجھے دیکھ بھی لیا۔ وہ یہاں بیس، اکیس سال سے رہ رہی ہے مگر تم اس سے بالکل بے خبر ہو۔" میرا لہجہ نرم مگر طنزیہ تھا۔

"ناراض نہ ہو، مجھے علم ہے۔"

"تو بتاؤ۔"

"وہ ایک انشورنس کمپنی میں سیکریٹری کی جاب کرتی ہے اور تنہا رہتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا۔ "ویسے میں تم سے ملنے کے لیے یہاں آیا تھا، سینڈرا کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے نہیں۔" اس کے لہجے سے ناگواری کا تاثر عیاں تھا۔

"اُس نے شادی کی؟" میں نے اس کی ناگواری کو نظر انداز کر دیا۔

"نہیں، وہ آرتھر کی موت کے بعد سے اب تک بالکل تنہا زندگی گزار رہی ہے۔" اس بار کریگ کا لہجہ خاصا نرم تھا۔

"اس نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"مجھے کیا پتا کہ اس نے شادی کیوں نہیں کی۔" کریگ نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔ "ویسے یہ میرا کام نہیں ہے کہ کاؤنٹی کی عورتوں کا سروے کرتا رہوں کہ کس نے کیوں شادی نہیں کی۔" کافی دیر بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ "اب تم سینڈرا کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرنا، ہم کوئی دوسری بات بھی تو کر سکتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر سینڈرا کی بات نہ کرتے تو اس وقت کس بارے میں بات کر رہے ہوتے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسی دوران میں ویٹریس کافی لے آئی۔

"کم از کم اُس رقم کے بارے میں ہرگز بات نہیں کرتا جو آرتھر کے قتل کے بعد غائب کر لی گئی تھی۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس دیا۔ "اب تم وہ رقم ڈھونڈنے آئے ہو۔" اس نے مگ اٹھاتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

یہ سن کر میں کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ نامی نے اس کو ساری بات بتا دی ہے۔ "خیر چھوڑو، بات یہ ہے کہ تم میرے پرانے دوست ہو۔ میرا ایک کام کر دو۔"

"کہو، کیا کام ہے؟" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "جینی اب تک تمہاری بیوی تو ہے..."

"کیا مطلب؟" یہ سنتے ہی وہ چونک گیا۔ "پچھلے بائیس سالوں سے وہی میری بیوی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف شرارت سے دیکھا۔ "وہ چاہیے؟"

"مجھے چاہیے مگر صرف اس کی مدد۔"

"او کے، کہو کیا بات ہے؟"

"تمہیں پتا ہے کہ اس وقت میں رائل فلش میں ٹھہرا ہوا ہوں مگر مجھے یہاں کافی دن گزارنے ہیں۔ جینی سے کہو

نوڈوب کے علاقے میں کرائے پر مجھے کوئی مکان دلوادے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" میری بات سن کر کریگ نے کہا۔ "وہ دس سال پہلے ہی پراپرٹی کا کاروبار ختم کرچکی ہے۔"

"مگر پھر بھی اس کی واقفیت تو ہوگی نا۔"

"یہ ممکن ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اس سے کہہ دوں گا۔"

کچھ دیر تک ہم دونوں بیتی باتیں کرتے رہے۔ "اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ ملاقات آخری نہیں۔ جب تک تم یہاں ہو، کئی اور ملاقاتیں ہوں گی۔" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی میں اس کے پاس سے اٹھا، اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے موبائل فون نکالا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کا نمبر ملا رہا ہوگا۔

میں کافی دیر تک شیوی اسٹریٹ پر مٹر گشت کرتا رہا۔ اس وقت سڑک پر لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں ٹہلتا ہوا اُس طرف جا پہنچا جہاں ایک عمارت میں سینڈرا کا دفتر تھا۔ اُس کی کار پارکنگ میں کھڑی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے کھڑی کی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک پولیس کار عمارت کے دروازے پر کھڑی ہے۔ کار پر نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا: ملٹن پولیس چیف۔

میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ابھی میں کار اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ میری نظر عقبی شیشے پر پڑی۔ نامی آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری طرف ہی آرہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہ جانتا ہے... میں نے کار یہیں پارک کی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں مسکرا دیا۔ باوردی پولیس چیف کو دیکھ کر میں نے جیب پر ہاتھ رکھا۔ میرا لائسنس اور کرائے کی کار کا اجازت نامہ جیب میں تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد وہ میری کار کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے دو پولیس والے بھی موجود تھے۔ اس نے کار کے شیشے پر دستک دی۔

"کہیے۔" میں نے کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے جم، مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں مگر پھر بھی کیا تم بتانا پسند کروگے کہ آج صبح سے قصبے میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"تفریح کررہا ہوں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" نامی نے کہا۔ "کافی شاپ میں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ کریگ سے ملاقات ہوئی۔" یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "ویسے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بھی تم جانتے ہی ہوگے اچھی طرح۔" میرا لہجہ طنزیہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کتنی عجیب بات ہے۔ کبھی میں خود لوگوں سے اس طرح کے سوالات کرتا تھا مگر اس وقت میرے جسم پر وردی ہوتی تھی۔ آج میرا سابقہ ساتھی وردی میں کھڑا ہوکر مجھ سے اس انداز میں سوالات کررہا ہے، جیسے میں کوئی جرم کر بیٹھا ہوں یا پھر اس کی نظر میں مشکوک ہوچکا ہوں۔

"مجھے یقین ہے کہ ملٹن میں تمہارا قیام مختصر ہوگا۔" کچھ دیر تک مجھے گھورتے رہنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" میں نے بھی ہلکی سے مسکراہٹ لبوں پر سجا کر جواب دیا۔

"آرتھر کی موت کو زمانہ گزر چکا ہے۔" اس نے آہستہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ "پرانے زخم مندمل ہوچکے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ اب تم ان زخموں کو کرید کر پھر سے تازہ کرنا چاہتے ہو۔ کچھ نہیں ملے گا تمہیں گڑے مُردے اکھاڑنے سے۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑا سا جھکا اور کار کی کھڑکی کے اندر جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ میرا مشورہ بھی ہے اور ہدایت بھی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اسے جس طرح چاہے، سمجھو۔ چاہو تو دھمکی بھی سمجھ لو۔" یہ کہہ کر وہ سیدھا ہوا اور پلٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑے پولیس والوں کو دیکھنے لگا۔

"میں یہاں وہ کچھ کرنے نہیں آیا، جیسا تم سمجھ رہے ہو بلکہ کچھ ایسا کرنے آیا ہوں جو بالکل نیا ہے۔" میں اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا اس لیے میں نے بھی گول مول جواب دیا۔

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو جم۔ میں چاہوں تو ابھی تمہیں حوالات میں بند کرسکتا ہوں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے سب کچھ علم ہے کہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور لوگوں کو کیا کیا کہانیاں سنا رہے ہو۔"

"نامی... میں مسروقہ رقم کا پیچھا کررہا ہوں اور میرا ہاتھ اس شخص کی گردن تک پہنچ چکا ہے جو رقم لے کر چمپت ہوا تھا۔" میں نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔ "تم جو کہہ رہے ہو، وہ بھی ٹھیک ہے مگر یاد رکھو کہ آرتھر کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی ذمے داری کسی حد تک ہم تینوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں، تم اور کریگ۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ہماری خفیہ نگرانی میں تھا مگر پھر بھی قتل ہوگیا اور ہمیں کچھ پتا نہیں چل پایا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا؟" یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور اس کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ نامی کا چہرہ سپاٹ تھا اور اس نے آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ میری بات کا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ وہ بدستور خاموش تھا۔ "مجھے اپنے چند سوالوں کے جواب تلاش کرنے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جو رقم غائب ہوئی تھی، وہ اب تک یہیں ہے۔ وہ مل گئی تو ہمیں بھی اس کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

"ویسے اگر تم چاہو تو میرا ڈرائیونگ لائسنس چیک کرسکتے ہو۔" اسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ میری بات کا اس پر کیا اثر ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور پھر خاموشی سے پلٹ گیا۔ وہ اپنی کار کی طرف جارہا تھا۔ کچھ لمحے بعد اس کی گاڑی میری نظر سے اوجھل ہوگئی۔ میں اب تک پارکنگ میں، کار کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔

میں چاہتا تو کل کی طرح آج بھی نامی کا پیچھا کرکے یہ پتا چلانے کی کوشش کرسکتا تھا کہ وہ کس سے ملنے گیا ہے۔ امکان تھا کہ وہ کریگ سے ملنے کے لیے پہنچا ہے مگر فی الحال میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے میرے کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔ کریگ اور نامی میری آمد سے باخبر تھے۔ وہ دونوں ہی مجھ سے مل چکے تھے۔ البتہ کریگ کے مقابلے میں نامی جارحانہ انداز میں سامنے آیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس سے یہ برداشت ہی نہیں ہورہا کہ میں اب تک ملٹن میں کیوں موجود ہوں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آرتھر کا کیس تو داخلِ دفتر ہوچکا ہے مگر مجھے دیکھ کر وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں گڑا مردہ پھر سے باہر نہ نکل آئے۔ ویسے بھی اس کا پیچھا نہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آج میرا ہدف وہ دونوں نہیں بلکہ سینڈرا تھی۔

میں چاہتا تو سینڈرا سے براہِ راست مل سکتا تھا۔ مجھے یہ امید تھی کہ ان دونوں کی طرح وہ بھی ملٹن میں میری آمد سے باخبر ہوچکی ہوگی مگر پھر بھی میں اس طرح ملنا چاہتا تھا جس سے یہ تاثر دے سکوں کہ ملاقات اتفاقی ہے۔ اب یہ اتفاقی ملاقات کیسے ہو، میں یہ سوچ رہا تھا۔

نامی کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد تک میں پارکنگ میں ہی رہا۔ پھر میں نے کار اسٹارٹ کی اور قصبے کے مرکزی بازار کی طرف چل دیا۔ یہاں ایک دکان سے میں نے سستی مگر طاقتور دوربین خریدی اور پھر سینڈرا کے دفتر سے کچھ دور چھوٹی سی پہاڑی کے قریب کار کھڑی کرکے اوپر چڑھ گیا۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگالی۔ اس کی کار اور دفتر بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور دوربین





آنکھوں سے لگا کر سینڈرا کی کار کو فوکس کرلیا۔ گاہے بگاہے میں اس کے دفتر کے داخلی دروازے پر بھی نظر ڈالتا جارہا تھا۔

ایک بج کر پانچ منٹ پر وہ باہر آئی اور کار میں بیٹھ گئی۔ میں جلدی سے نیچے اترا اور اپنی کار میں بیٹھ کر سڑک پر نظریں گڑا دیں۔ دو منٹ بعد سینڈرا کی کار قصبے کی سڑک سے نکل مرکزی شاہراہ پر آگئی۔ جیسے ہی اس کی گاڑی کچھ دور گئی، میں نے کار اسٹارٹ کی اور مناسب فاصلہ رکھ کر پیچھا کرنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ لنچ کے لیے جارہی ہے مگر دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے ایک پارک کے سامنے گاڑی روکی۔ اسے رکتا دیکھ کر میں نے بھی رفتار کم کردی تھی۔ اس کے پارک میں جانے کے بعد میں نے ایک سنسان جگہ دیکھ کر گاڑی روکی۔

یہ پارک دراصل چند سو ایکڑ پر مشتمل ایک قدرتی جنگل تھا۔ یہ ملٹن کے لوگوں میں خاصا مشہور تھا اور ویک اینڈ پر تفریح کرنے والے خاصی تعداد میں یہاں آتے تھے۔ میں بھی جب ملٹن میں رہتا تھا تو اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ اسی لیے مجھے اس پارک کے راستوں سے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ ایک چھوٹی پہاڑی پر پہنچ کر میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ دور دور تک وہاں کوئی انسان نظر نہیں آیا، البتہ داخلی دروازے کے قریب بنے شیڈ کے نیچے ایک بینچ پر سینڈرا بیٹھی نظر آئی۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ وہ لنچ کرنے کے بجائے اس ویرانے میں کیوں آئی ہے؟ پہلے تو میرا دل چاہا کہ اس سے جا کر مل لوں مگر میں نے اپنے بے قرار دل پر فوراً ہی قابو پالیا۔ اُس کا یہاں آنا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ صرف تفریح کی غرض سے نہیں آئی... مگر کیوں آئی ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے چاہیے تھا۔ میں جس جگہ پر کھڑا دوربین سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ اونچائی پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے ہرگز نہیں دیکھ پائے گی۔ اس لیے میں اطمینان سے اُس پر دوربین فوکس کرکے جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے حسن و شباب کا بیس سال پہلے دیدار کیا تھا لیکن آج بھی اس کا سراپا قیامت خیز تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔

سینڈرا پارک کیوں آئی ہے؟ اس سوال کا جواب ملنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسے آئے تقریباً دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کریگ شیڈ میں پہنچ گیا۔ "اوہ... تو یہ بات ہے۔" کریگ کو دیکھتے ہی میں بڑبڑایا۔ آج صبح ہی میں اس سے ملا تھا۔ سینڈرا کے ذکر پر اس نے لاعلمی ظاہر کرنے

کے لیے غضب کی اداکاری کی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں مسکرا دیا۔

میں ان سے کافی فاصلے پر تھا اور دوربین سے ان کو دیکھ بھی رہا تھا لیکن اس کے باوجود یہ جاننا ناممکن تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ وہ دونوں کچھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جس انداز سے وہ دونوں باتیں کر رہے تھے، اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ خوش گوار موڈ میں ہرگز نہیں تھے۔ میرے لیے یہ حیرانی کی بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھے اور ٹہلنے لگے مگر وہ بدستور باتیں کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سینڈرا کافی غصے میں ہے اور خود کریگ بھی تیخ پا ہے۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے سینڈرا کو طیش آگیا ہے۔ وہ کریگ پر گرج برس رہی تھی۔ ایک بار کریگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پارکنگ کی طرف لے جانے کی کوشش کی مگر سینڈرا نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ کریگ سنبھلا اور اسے اپنی بانہوں میں دبوچ کر باہر لے جانے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر کھڑی اپنی اپنی گاڑیوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سینڈرا نے بھی اپنے غصے پر قابو پالیا ہے مگر پھر بھی وہ بدستور کریگ سے کچھ کہے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑبڑاتی ہوئی کار میں بیٹھ رہی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی کریگ بھی اپنی کار کی طرف بڑھا۔ انہیں جاتا دیکھ کر میں بھی تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میری منزل قریب ہے۔ اس نازک موڑ پر میں ایک لمحے کے لیے بھی سینڈرا کو نظروں سے اوجھل نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں سڑک پر پہنچے، میں اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ دونوں گاڑیاں خاصی تیز رفتاری سے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئیں۔ ان کا رخ ملٹن کی طرف تھا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ملٹن جا رہا تھا۔ تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے وہ دونوں گاڑیاں نظر آگئیں۔ میں خاصا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، میری پوری کوشش تھی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی تعاقب کا احساس نہ ہونے پائے۔

کریگ تو قصبے کے مرکز میں جانے والی شاہراہ پر مڑ گیا مگر سینڈرا اپنے دفتر کے بجائے کہیں اور جا رہی تھی۔ اب کریگ میرے لیے غیر اہم ہوچکا تھا۔ میں نے سینڈرا کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ لگ بھگ دس پندرہ منٹ بعد وہ رہائشی علاقے کی طرف مڑ گئی اور ایک موڑ پر واقع مکان کے قریب گاڑی روک دی۔ میں پہچان گیا۔ یہ سینڈرا کا گھر تھا۔ کل ٹیلی فون ڈائریکٹری سے اس کا پتا دیکھ کر میں یہاں کا چکر لگا چکا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ سیدھا گھر کی طرف بڑھی۔ اسے اندر جاتا دیکھ کر میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور خاصے فاصلے پر رک کر دوربین سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ شاید پانچ سات منٹ تک اندر رہی ہوگی۔ باہر آنے کے بعد وہ ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھی اور چل دی مگر اس بار میں نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ میں گھر کی تلاشی لینا چاہتا تھا مگر کار کی موجودگی سے مسائل کھڑے ہوسکتے تھے۔ مجھے گاڑی پارک کرنے کے لیے مناسب جگہ درکار تھی۔ آخر مجھے ایک میل کے فاصلے پر وال مارٹ اسٹور نظر آگیا۔ اس کی پارکنگ میں درجنوں کاریں کھڑی تھیں۔ میں نے بھی اپنی کار وہیں پارک کردی۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں میری گاڑی کی موجودگی کسی کے لیے نہ تو پریشانی کا باعث بنے گی اور نہ ہی کسی کو کوئی شبہ ہوسکتا ہے۔ سینڈرا جس جگہ رہائش پذیر تھی وہاں چند ہی گھر تھے۔ ایسے میں میری کار اس کے کسی بھی ہمسائے کی نظر میں آسکتی تھی اور یوں اُس کے گھر کی تلاشی کا منصوبہ چوپٹ اور میں خود کسی مشکل میں پھنس سکتا تھا۔ ویسے بھی ٹائی میرے خلاف ہوچکا تھا۔ میں اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے وہ مجھے...... راستے سے ہٹا دے۔ کار پارک کرنے کے بعد میری منزل سینڈرا کا گھر تھی۔ اب میں پیدل وہاں جا رہا تھا۔

گھر کا عقبی حصہ سنسان تھا۔ وہاں دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ خوش قسمتی سے قدآدم خودرو جھاڑیوں کی وجہ سے مجھے خود کو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ کر جیب سے دوربین نکالی اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہاں کوئی بھی انسان نظر نہیں آیا اور پھر دو منٹ کے بعد میں عقبی کھڑکی سے گھر کے اندر داخل ہوچکا تھا۔ کمرے کی لائٹیں بند تھیں۔ باہر سورج چمک رہا تھا اور کھڑکی پر سفید پردے پڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ یہ سینڈرا کا نفاست سے آراستہ بیڈروم تھا۔ اتنا تو مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر دفتر گئی ہوگی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا تین ہو رہے تھے۔ سینڈرا کے آنے میں کافی وقت تھا۔ اس دوران میں بڑے آرام سے گھر کی تلاشی لے سکتا تھا۔

میں نے اطمینان سے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر طرح کی آسائش مہیا تھی لیکن حیرت تھی کہ یہاں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی جسے کم از کم میں پہچان سکتا۔ بیس سال پہلے وہ جب موٹل سے کرائے کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئے تھے

تو اُس وقت سینڈرا نے آرتھر کے پیسوں سے بیش قیمت فرنیچر، کراکری اور بہت کچھ دوسرا گھریلو سامان خریدا تھا۔ میں ان چیزوں کو پہچانتا تھا مگر یہاں کی ہر شے میرے لیے اجنبی تھی۔ کچن سے لے کر باتھ روم اور بیڈ روم سے لیونگ روم تک۔ شاید آرتھر کی موت کے بعد سینڈرا نے ایسی ایک بھی شے اپنے پاس نہیں رہنے دی تھی جسے دیکھ کر آرتھر کی یاد آسکتی ہو۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد میں ایک بار پھر بیڈ روم میں گیا اور بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پانچ بجنے میں کافی وقت باقی تھا۔ میں اٹھا اور الماریوں کی طرف بڑھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں بُک شیلف کی طرف مڑ گیا۔ قرینے سے کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر رومانوی ناول تھے۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی اور ورق گردانی کے بعد رکھ دی۔ تین چار کتابوں کی ورق گردانی کے بعد اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے شیلف کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے اس کی بناوٹ میں کچھ خاص ترتیب کا احساس ہوا۔ میں پولیس میں سراغ رساں تھا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شیلف دراصل ایک آڑ ہے، اس کے پیچھے کچھ اور بھی ہے۔ میں نے کچھ ٹامک ٹوئیاں ماریں۔ آخر شیلف کا راز کھل گیا۔ میں تیاری کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تھیلی نکالی اور شیلف کی ایک جانب لگے دو بڑے بڑے پیچ کھول دیے اور جب اسے پکڑ کر باہر کھینچا تو میرا شک درست نکلا۔ شیلف کے پیچھے دیوار میں خفیہ خانہ تھا۔ میں نے لائٹ جلائی۔ روشنی میں وہاں کینوس کا ایک بڑا سا تھیلا دکھائی دیا۔ میں پہچان گیا۔ اس پورے گھر میں اب تک کی وہ واحد شے تھی جسے میں پہچان سکا تھا... یہی وہ تھیلا تھا۔

بیس اکیس سال پہلے جب سینڈرا اپنے نئے اپارٹمنٹ کی تزئین و آرائش میں مصروف تھی، تب اس نے میرے سامنے ایک اسٹور سے یہ تھیلا خریدا تھا۔ مجھے بھی یہ تھیلا پسند آیا تھا۔ اس وقت میں بھی اسی اسٹور میں کچھ سامان خریدنے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ میں نے دکان دار سے تھیلا مانگا مگر یہ آخری تھا۔ سینڈرا نے یہ سن کر وہ مجھے تھما دیا مگر میں نے اسے دیکھنے کے بعد واپس کر دیا۔ اب میں نے جب یہ تھیلا دیکھا تو گزرا ہوا منظر آنکھوں میں تیزی سے گھوم گیا۔ میں نے تھیلا باہر نکالا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے کھولا۔ اندر نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ میں نے نوٹ بیڈ پر اُلٹے اور گننے لگا۔

یہ پرانے انداز کے وہ نوٹ تھے جو متروک تو نہیں ہوئے تھے تاہم پھر بھی ان کا استعمال بہت زیادہ نہیں تھا۔ البتہ بیس سال پہلے یہی نوٹ چلا کرتے تھے۔ میں نے جلدی جلدی رقم گننا شروع کی۔ یہ ڈھائی لاکھ ڈالرز تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں لمحہ بھی نہیں لگا کہ یہ وہی رقم ہے جو آرتھر کا گلا کاٹنے کے بعد کوئی لے کر چمپت ہو گیا تھا۔ رقم کی چوری کا شبہ اُن دو اجنبیوں پر تھا جو آرتھر کی موت سے چند روز پہلے یہاں آئے اور جس رات اُس کا قتل ہوا، اُس سے اگلی صبح سے آج تک، اُن دونوں کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

آرتھر منشیات فروش تھا اور اس کا دھندا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں، کریگ اور ٹامی نے گیارہ مہینے تک اس کی کڑی نگرانی کی مگر پھر بھی اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہ کر سکے۔ البتہ اس کی موت سے دو روز پہلے مجھے علم ہوا تھا اس کے پاس بھاری رقم موجود ہے۔ ہمارا منصوبہ تھا کہ جیسے ہی ہمیں یہ پکا یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس بھاری رقم موجود ہے، پولیس اسے گرفتار کر کے تحقیقات کرے گی کہ یہ رقم جائز ہے یا نہیں۔ ناجائز رقم کی وجہ سے ہم اس پر منشیات کے دھندے کا الزام بھی لگا سکیں گے لیکن اس سے پہلے ہی اس کا قتل ہو گیا۔ جائے وقوعہ سے پولیس کو کوئی رقم نہیں ملی۔ سینڈرا کا کہنا تھا کہ جس رات قتل ہوا، وہ نیند کی گولی کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ ویسے بھی وہ دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں سوتے تھے۔ پولیس نے تفتیش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ میں بضد تھا کہ اُس کے پاس بھاری رقم تھی جو قتل کے بعد غائب کر دی گئی ہے۔ تاہم کریگ اور ٹامی مجھ سے متفق نہیں تھے مگر اب جب یہ پرانے نوٹ دیکھے تو یقین ہو گیا کہ میری اطلاع درست تھی۔

میں سکون سے نوٹ گننے کے بعد دوبارہ تھیلے میں رکھ رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا پانچ ہو رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ سینڈرا پہنچ گئی ہے۔ میرا خیال درست نکلا۔ میں نے دروازے پر نظریں لگائیں اور فرش پر بیٹھ گیا۔ حسبِ توقع چند لمحوں کے بعد میرے سامنے سینڈرا کھڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہونے کے بجائے اطمینان سے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ ہمارے لب خاموش تھے مگر نگاہیں بول رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس کی نظریں مجھ پر سے ہٹیں اور بیڈ پر جم گئیں۔ وہ کچھ دیر تک نوٹوں اور تھیلے کو دیکھتی رہی۔

”تم جس چیز کی تلاش میں آئے تھے، وہ تو مل ہی گئی۔“ پہلی بار اس نے زبان کھولی۔ ”تھیلا لو اور چلتے بنو۔“ اس کے لہجے میں چھپے طنز کو میں صاف محسوس کر رہا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے اپنے جذبات پر قابو





پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر صرف نوٹوں کا کیا ... اگر اس کے ساتھ...“ میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں بھی ساتھ چلتی مگر اُس وقت۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی۔ ”لیکن تمہیں تو اُس وقت بھاگنے کی جلدی تھی۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”شاید... تم اب تک غلط سمجھ رہی ہو۔“

”ایسا ہو سکتا ہے مگر ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس وقت بھی میرے کردار پر شبہ تھا اور آج بھی ہے۔“ سینڈرا کے لہجے سے افسوس عیاں تھا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاصی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

”میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں؟“

”کہو۔“

”آرتھر کو کس نے قتل کیا تھا؟“

”کیا فائدہ...“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا اور طنزیہ لہجے میں ہنسی۔

”شاید میری تسلی ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم کو بھی پکڑا جا سکے۔“

”نہیں پکڑ سکتے؟“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

”بہت یقین سے کہہ رہی ہو؟“

”سو فیصد یقین کے ساتھ۔“ اس نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے علم ہوا ہے کہ تم ولیم کے لکھے ہوئے خط کی وجہ سے یہاں آئے ہو۔“

”ہاں...“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”بیس سال پہلے اس نے کہا تھا کہ اسے اندازہ ہے کہ کس نے قتل کیا اور کون رقم لے کر فرار ہوا مگر اس نے نام نہیں بتایا اور مرنے سے پہلے مجھے لکھے گئے خط میں بھی اس نے کھل کر کچھ نہیں کہا۔“

”تو پھر سنو۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ میری پوری توجہ اس کی طرف تھی۔ ”آرتھر کو ولیم نے قتل کیا تھا اور وہ بھی اسی ہزار ڈالرز کے لیے۔ اس کے ہاتھ کچھ ثبوت لگ گئے تھے جس کی بنا پر وہ اپنا منہ بند کرنے کے لیے اسی ہزار ڈالرز مانگ رہا تھا۔“

”ثبوت؟“

”جس روز آرتھر قتل ہوا، اسی روز اس نے اپنے دو ساتھیوں کو پہاڑیوں میں لے جا کر ایک ویران مقام پر گولی ماردی تھی۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”مگر ولیم کے ہاتھ جو ثبوت لگے، وہ کیا تھے؟“ میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ سینڈرا کی بات میرے لیے حیران کن انکشاف سے کم نہ تھی۔

”ولیم نے آرتھر کو اُن دونوں کی لاشیں کھائی میں پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اصل میں اس وقت ولیم لومڑی کا شکار کھیل رہا تھا، وہاں پر۔“

”اوہ...“ میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”جس رات وہ رقم لینے کے لیے آیا، اس رات آرتھر سخت نشے میں تھا۔“ سینڈرا نے ایک بار پھر اپنی بات شروع کی۔ ”رقم میرے بیڈ کے خفیہ خانوں میں تھی اور میں کمرا بند کر کے سو رہی تھی۔ شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھی تو دیکھا کہ آرتھر اسے گالیاں دے رہا تھا۔ اسی دوران میں ولیم غصے سے آگے بڑھا۔ اس نے آرتھر کو دھکا دیا۔ وہ نشے میں تھا۔ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ ولیم اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور جیب سے چاقو نکال کر اس کی گردن پر پھیر دیا۔ یہ سب دیکھ کر میں سخت خوف زدہ ہو گئی اور اپنے کمرے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی۔ میں بڑی طرح سہم گئی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر آنکھ لگ گئی۔“

”مگر پولیس کو تو تم نے بیان دیا تھا کہ نیند کی گولی کھا کر سو رہی تھیں؟“ میں نے قطع کلامی کی۔

”وہ جھوٹ تھا۔“

”تم نے ولیم کے بارے میں پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟“

”میں کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔“ اس نے بیزار لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی میں آرتھر سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔“

”کیوں؟“ مجھے یہ سن کر سخت حیرانی ہوئی۔ بظاہر تو وہ اس کے ساتھ بہت خوش نظر آتی تھی۔

”میں اس کے لیے صرف شوپیس تھی۔ اگر مجھے جان کا خوف نہ ہوتا تو کب کا چھوڑ چکی ہوتی اسے۔“

”مگر آرتھر نے اُن دونوں کو کیوں مارا؟“ میں نے سینڈرا سے پوچھا۔

”وہ سینٹ لوسیا میں اس کے کارندے تھے مگر بے ایمانی پر اتر آئے تھے۔ انجام تمہارے سامنے ہے۔“ یہ کہہ کر وہ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔

”اوہو... یہ بات تھی۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”مگر وہ ٹامی اور کریگ...“

”دونوں میرے بستر پر سونے کے لیے بے قرار تھے اور اب تک صرف اسی امید پر جی رہے ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ پہلی بار وہ کھل کر ہنسی تھی۔ ”اب ایک میری بات کا جواب دو۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"پوچھو..."
"تم کیوں چلے گئے تھے ملٹن سے؟"
"اس لیے کہ اگر میں اُس رات ملٹن نہ چھوڑتا تو اگلی صبح تم اور میں، دونوں ٹامی کے ہاتھوں آرتھر قتل کیس میں گرفتار ہو چکے ہوتے۔" میں بیڈ سے اٹھا اور اس کے قریب جا کر کہا۔ "ٹامی نے ساری تیاری کرلی تھی۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ سینڈرا کو بھول جاؤں اور نوکری سے فوراً استعفا دے کر چلا جاؤں اور پھر کبھی ملٹن نہ لوٹوں۔" یہ کہہ کر میں رکا۔ "وہ تم پر بُری طرح مرتا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب وہ مجھے راستے سے ہٹا کر تمہیں پانے کی کوشش کرسکتا تھا یا پھر ہم دونوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر ڈالتا۔ وہ اُس وقت بھیڑیا بن چکا تھا۔"

"مجھے بھی یہی لگتا تھا۔" وہ اٹھی اور میرے سامنے کھڑی ہوکر کہنے لگی۔ "وہ دونوں اب بھی تم سے خوف زدہ ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ کسی طرح تمہیں یہاں سے واپس چلے جانے کا کہوں۔"

"تو کہہ دو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نوٹ اٹھاؤ اور چلتے بنو۔" سینڈرا نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"تم بھی ساتھ چلو ورنہ یہ رقم میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

یہ سنتے ہی وہ میرے گلے لگ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا، ہم دونوں کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

دو دن بعد اتوار تھا۔ میں اور سینڈرا مقامی چرچ میں شادی کر رہے تھے۔ کریگ اور ٹامی بھی موجود تھے۔ میں نے کار میں بیٹھنے سے پہلے کریگ کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آگیا۔ "سنو... اپنی بیوی سے کہنا کہ اب مجھے کرائے کے مکان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا تم واپس جا رہے ہو؟" ٹامی نے فوراً لقمہ دیا۔ مجھے کریگ سے باتیں کرتا دیکھ کر وہ بھی قریب آگیا تھا۔ یہ بات اس نے بھی سن لی تھی۔

"نہیں... مجھے دولت مل گئی۔ اب میں ملٹن میں ہی رہوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی اب یہ دھمکی غیر اہم ہوگئی ہے کہ میں ملٹن کبھی واپس نہیں لوٹوں۔ اب آ ہی گیا ہوں تو واپس کیوں جاؤں۔" ٹامی بظاہر مسکرایا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

تین دن بعد ہم دونوں شکاگو میں اپنی ہنی مون منا رہے تھے جب میں نے سینڈرا سے کہا۔ "تم نے شادی کے لیے فوراً کیوں ہاں کردی تھی... میں تو رقم کے لیے ملٹن آیا تھا؟"

"اچھا..." یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ "آرتھر نے بیس لاکھ ڈالرز کی نقدی چھوڑی تھی۔ خاصی بڑی رقم بینک لاکر میں ہے۔"

"اچھا..." میں نے حیرت سے کہا۔

"جب مجھے ٹامی نے بتایا کہ تم رقم کی تلاش میں آئے ہو تو میں نے یہ منصوبہ بنایا اور پیسے لاکر ایسی جگہ چھپا دیے کہ تم بہ آسانی تلاش کرسکو۔" سینڈرا نے کہا۔ "اگر تم رقم لے کر نکل جاتے تو میں سمجھتی کہ کریگ اور ٹامی درست کہہ رہے تھے مگر تم نے میرا انتظار کیا، وہ بھی رقم ملنے کے کافی دیر بعد تک... یہی اہم بات تھی۔" یہ کہہ کر وہ میرے گلے لگ گئی۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" میں نے کہا۔ "وہ تو رقم ہی اُسی وقت ملی، جب تم گھر میں داخل ہوئی تھیں۔"

"گھر میں لگے خفیہ کیمرے جھوٹ نہیں بولتے۔ ان پر ریکارڈنگ کے ہر لمحے کا وقت بھی درج ہو جاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

"باپ رے باپ۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ حسینہ تو پولیس سراغ رساں سے بھی زیادہ چالباز نکلی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔

"یہ عشق کی کرامات ہیں۔" اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤ۔" اس نے میری بانہوں میں سمٹتے ہوئے کہا۔ "ولیم نے اپنے خط میں کیا لکھا تھا؟"

"یہی کہ اس نے آرتھر کو قتل کیا تھا۔ اُس کی دولت اب تک ملٹن میں موجود ہے کیونکہ قتل سے پہلے اُس نے اپنے دو ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر ٹامی تو کہہ رہا تھا کہ..."

"میں نے سب جھوٹی کہانی سنائی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں ان دونوں کو ذہنی طور پر سخت پریشان دیکھنا چاہتا تھا۔ انہوں نے بھی تو مجھ سے میری زندگی کے بیس سال لیے تھے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔ "ورنہ اب تک تو ہم جوان بچوں کے والدین ہوتے۔"

یہ سنتے ہی وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ "میں بڑھاپے میں ماں کہلوانا پسند نہیں کروں گی۔"

"اور میری بوڑھی ہڈیوں میں بھی اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ بچوں کی پرورش کے لیے نوکری کرتا پھروں۔"

ایک بار پھر ہوٹل کے نیم تاریک مگر مہکتے کمرے میں ہم دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔

•••



# کالی بھیڑ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے اچھا سوچنے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے... لیکن نفس کی کمزوری اور دنیا کا لالچ انسان سے ایسے کام کرواتا ہے کہ کچھ دیر کی چھاؤں کے بعد صرف دھوپ ہی مقدر ہوتی ہے...!

**ان کمزور لمحوں کی کہانی جس نے کئی زندگیوں کے چراغ گل کردیے**

سڑک بالکل ویران تھی۔ پولیس نے اس رہائشی عمارت کا گھیراؤ کر رکھا تھا جس کی تیسری منزل پر رشید اور اس کی بیوی نے پناہ لے رکھی تھی۔ پوری عمارت خالی کرائی جا چکی تھی۔

رشید جیل توڑ کر فرار ہوا تھا جہاں وہ ایک مسلح ڈکیتی کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ انسپکٹر مراد شاہ اپنے ماتحت اے ایس آئی آصف علی کے ساتھ فلیٹ کے صدر دروازے پر موجود تھا۔

''رشید!''
انسپکٹر مراد نے چیخ کر کہا۔ ''خود کو ہمارے حوالے کر دو، اب تم نہیں بچ سکتے۔''

''تم مجھے بھی جیل واپس نہیں لے جا سکتے۔'' رشید بھی جواب میں چیخ کر بولا۔ ''میں خود کو اور اپنی بیوی کو گولی مارنے والا ہوں۔ بہتر ہے کہ اپنے کسی آدمی کو میرے پاس مذاکرات کے لیے بھیج دو۔''

انسپکٹر مراد، رشید کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے ذریعے مسلح وارداتیں کرنے والوں کے سرغنہ کو گرفتار کیا جا سکے جو جمال خان عرف بابو خان کے نام سے مشہور تھا۔

''بدبخت پتا نہیں کیا مذاکرات کرنا چاہتا ہے۔'' انسپکٹر مراد غصے سے دانت پیس کر بڑبڑایا۔''...... کون جائے گا اب اندر اس مردود کے پاس؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھ کھڑے آصف علی کی طرف دیکھا۔ شامتِ اعمال جان کر آصف علی نے حلق میں پھنسی کسی شے کو نگلتے ہوئے گویا اپنے ''سر'' کی نظروں کا مطلب بھانپ لیا اور فوراً کہا۔

''س... سر جی! اس کے پاس اپنے کسی آدمی کو بھیجنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اس طرح وہ مردود... ہمارے ساتھی کو بھی گن پوائنٹ پر رکھ سکتا ہے۔ بھلا اسے ہم سے کیا مذاکرات کرنے ہیں؟ جھوٹ بولتا ہے، وہ فرار ہونا چاہتا ہے۔''

انسپکٹر مراد سوچ میں پڑ گیا۔ آصف علی نے گویا اپنی طرف سے اس کا دھیان ہٹاتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''سر جی! میرا تو خیال ہے کہ عمارت پر ریڈ کر کے اسے گرفتار کر لینا چاہیے۔''

''نہیں۔'' انسپکٹر مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اس وقت جنونی ہو رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خود کو بھی گولی مار سکتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ہم بھی مشکل میں پڑ جائیں گے اور ان کا سرغنہ بابو خان بھی ہمارے ہتھے نہیں چڑھ سکے گا۔ تم جانتے ہو کہ بابو خان کس قدر خطرناک اشتہاری مجرم ہے اور یہ اس کا خاص کارندہ ہے۔ اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ رشید ہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انسپکٹر مراد نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''سر! میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کی بات سن لینی چاہیے۔'' معاً عقب میں قریب کھڑے ایک پولیس مین عرفان سعید نے چند قدم آگے آتے ہوئے کہا۔

''کیا تم یہ رسک لینے کے لیے تیار ہو عرفان؟'' انسپکٹر مراد نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انسپکٹر مراد نے اس کا شانہ تھپکا اور توصیفی لہجے میں بولا۔ ''تم بہت بہادر ہو مگر اس خطرناک کھیل میں دماغ کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یقیناً وہ تمہیں غیر مسلح ہی اندر آنے کی اجازت دے گا؟''

''میں سمجھتا ہوں سر۔'' عرفان نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اور پورے اعتماد سے کہا۔

''میں ضرورت پڑنے پر ہتھیار کی جگہ دماغ کو استعمال کرنا جانتا ہوں۔''

''گڈ۔'' انسپکٹر نے سر ہلایا۔

تھوڑی دیر بعد عرفان کو عمارت کے اندر بھیج دیا گیا۔ قریب کھڑا اے ایس آئی آصف علی اسے عجیب پُرسوچ نظروں سے تک رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

سپاہی عرفان کو غیر مسلح کر کے عمارت کے اندر داخل کرنے سے پہلے رشید کو بتا دیا گیا تھا جس نے اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اسے اندر آنے کا گرین سگنل دے دیا تھا۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر کسی نے کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو وہ بلا تامل اسے گولی سے اڑا دے گا۔

عرفان، دروازے سے اندر داخل ہوا اور زینے کے چبوترے پر چلا گیا۔ وہاں ایک اور دروازہ تھا۔ اس نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔

☆☆☆

دفعتاً ہی اس نے خود کو پستول کی زد پر پایا۔

رشید کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اور ریوالور کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ پستہ قامت پولیس مین عرفان نے اس کی بیوی کی طرف دیکھا جو کمرے کے ایک کونے میں رکھی کرسی پر سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اس پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رشید نے اسے بُری طرح سے زدوکوب کیا تھا... مگر کیوں؟ یہ وہ نہ سمجھ پایا۔

''یہ اسی سلوک کی مستحق تھی۔'' رشید اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔ ''جب میں جیل گیا تھا تو استاد بابو خان نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری رہائی تک اس کا خیال رکھے گا لیکن جیل میں مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ یہ حرافہ اس کی داشتہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ گھلی ملی رہی ہے۔'' اس کی آواز میں ہیجانی کیفیت شامل تھی۔

''میں یہ سن کر پاگل ہو گیا اور جیل توڑ کر فرار ہو گیا اب میں اسے بھی ہلاک کر دوں گا اور خود کو بھی گولی مار دوں گا۔ بابو خان کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ جنونیوں کے سے

انداز میں چیخا۔

عرفان کو ایک لمحے اس سے خوف سا محسوس ہوا کیونکہ وہ سب کچھ ختم کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ تاہم عرفان نے ہمت سے کام لیا اور اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

"اگر تمہیں یہی سب کچھ کرنا تھا تو پھر مجھے مذاکرات کے لیے کیوں بلایا؟" جواباً رشید کے ہونٹوں پر بے تاثر سی مسکراہٹ ابھری۔ اس اثنا میں اس کی بیوی کپکپاتے ہوئے لہجے میں اپنے شوہر سے بولی۔

"مم... میری بات کا یقین کرو رشید... میں مجبور تھی۔ تم جن حالات میں مجھے چھوڑ کے جیل چلے گئے تھے، ان حالات میں بابو خان جیسے بھوکے گدھ میرے اردگرد منڈلایا کرتے ہیں۔ پھر وہ ایک بڑا بدمعاش ہے، ایک کمزور سی چڑیا آخر کب تک شکاری باز سے بچ کر رہ سکتی تھی؟ اور پھر تم خود ہی تو مجھے اس کے سپرد کر گئے تھے۔"

عرفان نے دیکھا رشید پر اس کی بیوی کی داد و فریاد کا مطلق اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے تو اس کی بات پر دھیان تک نہیں دیا تھا۔ شاید وہ بیوی کی طرف سے کئی بار کی گئی صفائیوں سے بیزار ہو چکا تھا اور اسے اس کی کسی بات پر یقین نہ تھا۔ تاہم عرفان کو اس بات کا بھی کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کم از کم ابھی اپنی بیوی کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا اگر ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو وہ کب کا اس پر عمل بھی کر چکا ہوتا اور اس وقت اس کی بیوی کی لاش ہی پڑی نظر آ رہی ہوتی۔

البتہ عرفان کے لیے یہ بات چونکا دینے والی تھی کہ رشید کے علاوہ اس کی بیوی بھی بابو خان سے واقف تھی۔ اس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اس نازک صورتِ حال کو بڑی ہوشیاری، ہمت اور ذہانت سے سنبھالنا تھا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" عرفان نے بالآخر رشید کی طرف دیکھا۔

"میں عام معافی چاہتا ہوں اور بابو خان کے خلاف سلطانی گواہ بننا چاہتا ہوں۔" رشید نے جواب دیا۔ کچھ سوچ کر عرفان کے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہوگئی۔ اسے رشید جیسے مجرموں کا تجربہ تھا۔ جو ابتدا میں دانستہ جنونیت کا مظاہرہ کر کے خوف اور خطرناک فضا قائم کرتے ہیں تاکہ بعد میں اپنا اصل مدعا بیان کر کے مطالبات منوا سکیں۔ رشید نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

☆☆☆

عمارت کے باہر انسپکٹر مراد کے ساتھ کھڑے اے ایس آئی آصف علی کی پیشانی پر ہنوز سلوٹیں موجود تھیں۔ نظر ایسا ہی آتا تھا جیسے وہ اپنے ساتھی عرفان کی طرف سے فکر مند اور بے چین ہو رہا ہے۔ وہ ابھی تک اس بات پر قائم تھا کہ عمارت پر ریڈ کر کے رشید پر قابو پانے کی کوشش کی جائے خواہ وہ اس مقابلے میں مارا ہی جاتا مگر انسپکٹر مراد اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ ممکن ہے ریڈ کرنے کی صورت میں وہ اپنی بیوی کو بھی گولی مار سکتا ہے جبکہ آصف علی کا خیال اس کے برعکس تھا... کہ کچھ بھی ہو جائے رشید اپنی بیوی کو گولی نہیں مار سکتا۔ درحقیقت آصف علی یہی چاہتا تھا کہ رشید کا قضیہ جلد ہی نمٹ جائے، جس کا ایک ہی طریقہ تھا، پولیس مقابلہ... اور... رشید کی ہلاکت... اچانک عمارت کے اندر گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔

☆☆☆

کمرے کی فضا دم بخود تھی، ماحول میں عجیب سی سنگین خاموشی کا راج تھا۔

"اب تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔" عرفان نے اس کا مطالبہ سن کے مسکرا کر کہا۔ پھر اس کی بیوی کی طرف دیکھا جو زخمی ہونے کے باوجود خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ رشید سے بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولا۔ "اب یقیناً تم اپنی بیوی کو بھی قتل کرنے کا جرم نہیں کرو گے، بلکہ میرا خیال ہے، اگر تم ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو اس بے چاری کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ تم اسے معاف کر دو، بابو خان کو گرفتار کروانے میں قانون کی مدد کرو۔ پھر اس کے بعد اپنی خوب صورت بیوی کے ساتھ شرافت کی اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرو۔"

عرفان کی باتوں کا اثر رشید پر ہوا سو ہوا مگر اس کی بیوی رو پڑی اور اس نے آگے بڑھ کر رشید کے پاؤں پکڑ لیے۔

"مم... میں بھی یہی چاہتی ہوں رشید! مجھے معاف کر دو، اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ بابو خان جیسے خبیث انسان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے قانون کی مدد کرو۔ تمہیں یقیناً معافی مل جائے گی... اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ ٹھیک کہتی ہے۔" عرفان نے سوچ میں مستغرق کھڑے رشید کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہاری بیوی اب بھی تمہاری وفادار رہنا چاہتی ہے، ورنہ وہ بابو خان کے خلاف ایسے الفاظ کبھی استعمال نہیں





تی۔ سوچ لو... رشید! اب بھی وقت ہے، تمہاری گلوخلاصی ہو سکتی ہے۔ صرف تھوڑی سی سزا ہوگی تمہیں... اس کے بدلے میں تمہیں ایک پُرسکون زندگی ملے گی۔" عرفان نے سمجھایا۔

رشید نے اپنی بیوی کو بازوؤں سے تھام کر اٹھا لیا۔

جمیلہ! میں تمہیں نہیں مار سکتا... مجھے معاف کر دینا جان... میں نے تمہیں بہت مارا پیٹا، میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔"

جمیلہ کا سوجا ہوا چہرہ زخمی ہونے کے باوجود خوشی سے کھل اٹھا اور وہ بے اختیار "میرے رشید" کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔

پستول ابھی تک رشید کے ہاتھ میں تھا جس کی نال کا رخ سامنے کھڑے عرفان کی طرف تھا۔

رشید نے آہستگی کے ساتھ اپنی بیوی کو خود سے علیحدہ کیا پھر عرفان سے مخاطب ہو کے بولا۔

"قانون مجھے دھوکا تو نہیں دے گا؟"

"ہرگز نہیں... کیوں دھوکا دے گا تمہیں؟" عرفان نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "دیکھو... اصل اور خطرناک مجرم بابو خان ہے۔ تم جیسے لوگ تو اس کے معمولی کارندے ہو۔ اس طرح ہوتا آیا ہے، کسی بڑے مجرم کے گماشتے نے متنفر ہو کر اپنے ہی سرغنہ کو گرفتار کروانے میں قانون کی مدد کی اور پھر اسے عام معافی مل گئی۔ بھروسا کرو میری بات پر اور اپنا پستول میرے حوالے کر کے خود کو قانون کے سپرد کر دو۔" یہ کہتے ہوئے عرفان نے ہاتھ بڑھایا۔

رشید کے اعصاب اب کافی حد تک پُرسکون ہو گئے تھے۔ اس نے بالآخر اپنا پستول عرفان کے حوالے کر دیا۔ عرفان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"میں اب گرفتاری دینے کو تیار ہوں۔" رشید نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عرفان کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی نال نے ایک شعلہ اگلا۔ گولی رشید کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ مرتے وقت اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیرت گھنڈی رہ گئی تھی۔ دوسری گولی عرفان نے اس کی بیوی کے سینے میں اتار دی پھر جلدی سے اپنی جیب سے موبائل نکال کے ایک نمبر پنچ کیا۔

"ہیلو، بابو صاحب! آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں نے معاملہ نمٹا دیا ہے، کم بخت نے آپ کو پھنسانے کا سارا سامان کر رکھا تھا مگر مجھے موقع مل گیا۔ میرا انعام تیار رکھیے گا۔" یہ کہنے کے بعد عرفان نے فون آف کر دیا۔ اس وقت زینے پر دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز ابھری۔ عرفان نے جلدی سے دستہ صاف کیا اور پستول رشید کے بے جان ہاتھ میں تھما دیا۔

گولیوں کی آواز سن کر انسپکٹر مراد اور آصف علی چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گئے۔

"تم خیریت سے تو ہو نا عرفان؟" انسپکٹر مراد شاہ نے بدحواسی کے ساتھ اس سے خیریت پوچھی۔

عرفان نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں! میں خیریت سے ہوں سر! میں نے صورتِ حال سنبھال لی تھی، وہ بھی بظاہر پُرسکون ہو گیا تھا... لیکن اچانک اس پر پھر وہی وحشیانہ جنون سوار ہو گیا۔ خود کو بھی گولی مار لی اور بیوی کو بھی ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ وہ شروع میں ہمیں اسی بات کی دھمکی دے رہا تھا۔"

انسپکٹر مراد کے چہرے پر پریشانی اور تاسف کے تاثرات تھے پھر وہ بڑبڑایا۔

"شاید یہی ہونا تھا۔ رشید جیسے مجرم بالآخر یہی حرکت کرتے ہیں۔"

"سر! میں سخت اعصاب زدہ ہو رہا ہوں، کیا میں ذرا دیر کے لیے نیچے جا سکتا ہوں؟" عرفان نے کہا۔

"ضرور... ضرور۔" مراد شاہ نے کہا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات تھے۔ عرفان کمرے سے نکلا، ابھی زینے تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک اندر سے اے ایس آئی آصف علی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

"سر! یہ عورت زندہ ہے... یہ... یہ... کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

عرفان نے یہ سنا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے اور چہرہ فق ہو گیا۔ وہ بدحواس ہو کر جلدی جلدی زینے طے کرنے لگا۔ دفعتاً اس کا پاؤں ایک قدمچے پر رپٹ گیا اور وہ سر کے بل نیچے آ رہا۔ اس کی گردن ٹوٹ کر ایک عجیب زاویے سے مڑ گئی۔ وہ مر چکا تھا۔

ادھر انسپکٹر مراد اپنے ماتحت آصف علی کی طرف متوجہ ہوا جو رشید کی زخمی بیوی پر جھکا ہوا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سر! اب یہ مر چکی ہے۔" وہ بولا۔

"موت نے اسے مہلت ہی نہیں دی۔ بے چاری بڑی شدت کے ساتھ کسی کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی... مگر..."

# کہانی در کہانی

سرور اکرام

درست راہ پر قدم آگے نہ بڑھے تو منزل نہیں ملتی۔ اگر ایک غلطی کا محاسبہ نہ کیا جائے تو بے شمار غلطیوں اور مصائب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں گزرے کل سے دامن چھڑانا کچھ آسان نہیں۔ پیچھا چھڑانا بھی چاہیں تو ماضی کی بازگشت چین سے نہیں رہنے دیتی۔ اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا... وہ بیتے کل سے دامن چھڑانے کے لیے سو جتن کر رہا تھا۔ طرح طرح کے روپ بدل رہا تھا مگر اس کا باطن بہروپ کے اصل سے دامن گیر تھا... ریگزار ستم پہ چلتے چلتے اس کے پاؤں پہ چھالے پڑ چکے تھے۔ دامن خاروں سے تار تار تھا...

**ایک غلطی سے شروع ہونے والے اس سفر کی داستان جس کا مسافر تھک کر بیٹھنا چاہتا تھا**

کہتے ہیں کہ بارش ہو اور رات بھیانک ہونے کے ساتھ ساتھ سرد بھی ہو جائے تو اس وقت یا تو آسمان سے بلائیں نازل ہوتی ہیں یا نئی کہانیوں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ رات بھیانک اور سرد تھی اور میں اس وقت ایک ایسی سڑک سے گزر رہا تھا۔ جس کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے تھے لیکن شاید بجلی نہیں تھی تھی۔ اس لیے بارش کی بوچھاڑ میں وہ مکانات بہت پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔

اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے دفتر سے باہر آ کر حماقت کی ہے۔ دفتر کا چپراسی نبی بخش مجھ سے بار بار یہی کہہ رہا تھا "صاحب اس موسم میں گھر نہ جائیں۔ یہ آپ ہی کا دفتر ہے۔ یہیں رہ جائیں اور خدمت کے لیے میں موجود ہوں۔ رات بھر آپ کے لیے چائے اور کافی بناتا رہوں گا۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ دفتر میں مجھے آرام نہیں ملے گا۔ بعض لوگوں کو اپنے گھر کے سوا اور کہیں سکون نہیں ملتا۔ اتفاق سے میں بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔

میں نے نبی بخش کو تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ میں خیریت سے گھر پہنچ جاؤں گا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا حالانکہ گھر پر میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں تھا لیکن میں پھر بھی باہر نکل آیا اور اچانک ہی مجھے بریک لگانا پڑے۔

وہ آدمی سڑک کے درمیان اس طرح کھڑا تھا کہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے نکلنا مشکل تھا۔ میں نے گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔

وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ جسم پر لباس بھی اچھا تھا لیکن اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ شاید بارش اور سردی نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس طرح سڑک کے درمیان آ کر کسی گاڑی کو روک لے۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ گراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"کہیں بھی۔" اس نے کہا۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ "میں سخت اذیت میں ہوں... پلیز۔"

"چلیں بیٹھ جائیں۔" میں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کے کپڑے پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔

میں نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں اور اس کے کپڑے تبدیل کروا کے اسے کافی پلا دوں تاکہ اس کی حالت سنبھل سکے۔

میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی منزل کہاں ہے کس طرف جانا ہے۔ اس نے بھی کچھ نہیں کہا۔ جیسے اس پہ بے حسی طاری ہو یا اس کے اوسان اس کے قابو میں نہ ہوں۔



میں نے جب اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس وقت بھی اس کی وہی کیفیت تھی۔

میں کچھ دیر بعد اس کے لیے انڈے بوائل کر کے اور کافی بنا کر لایا تو وہ صوفے پر ہی سو چکا تھا۔ اس وقت میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔

میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ کوئی پڑھا لکھا مہذب انسان ہے اور وقت نے شاید اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔

بہر حال وہ بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ اگر اس طرح رہتا تو اس کے بیمار ہونے کا خدشہ تھا۔ اس لیے میں نے اسے ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے خجالت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا "معاف کرنا بھائی، میں اسی طرح سو گیا تھا لیکن بری طرح تھکا ہوا تھا۔ اس لیے نیند آ گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب آپ اپنا لباس تبدیل کر لیں۔ آپ بری طرح بھیگے ہوئے ہیں۔"

"نہیں بیٹا، اب مجھے جانے کی اجازت دو۔" اس نے کہا۔

"اس وقت کہاں جائیں گے آپ... بارش ابھی تک نہیں رکی ہے۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ بہر حال میں نے اس کو کپڑے دے دیے تھے پھر اسے انڈے کھلائے اور کافی پلائی آہستہ آہستہ اس میں زندگی کی حرارت آ گئی۔ "معاف کرنا بیٹے، میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی۔" اس نے کہا۔

"کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ یہ بتائیں آپ کو کہاں جانا ہے تاکہ میں آپ کو پہنچا دوں۔"

"میری تو کوئی منزل ہی نہیں ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "بس ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہوں۔"

"کیا آپ کا کوئی گھر نہیں ہے؟"

"نہیں، کوئی گھر نہیں ہے۔" اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"پھر کہاں رہتے ہیں؟"

"بیٹے، بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کے جواب نہیں ہوتے۔" اس نے کہا۔ "ویسے تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اتنا ساتھ دیا۔ اب مجھے جانا چاہیے۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کہاں جائیں گے؟"

اس سوال کا شاید اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا پھر وہ میرے سے بولا۔ "تم میری وجہ سے پریشان نہ ہو میں کہیں نہ کہیں چلا ہی جاؤں گا۔"

نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے اس سے کہہ دیا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہیں رہ جائیں؟"

"کیا...!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں، کیا ہوں... پھر تم نے مجھ پر اتنا بھروسا کیسے کر لیا؟ ہو سکتا ہے کہ میری ذات سے تمہیں نقصان پہنچ جائے۔ نہیں بیٹا، کسی پر اتنا اعتماد نہیں کرتے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا "زمانہ ہی ایسا ہے کہ کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن آپ پر اعتماد کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں ایک تنہا انسان ہوں۔ آپ کی صورت میں ایک بزرگ تو مل جائے گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بہت دیر بعد اس نے کہا "چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن تم مجھ سے میرا بیک گراؤنڈ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کروگے۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کے بیک گراؤنڈ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ جو کچھ بھی ہیں بس میرے ساتھ رہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں رہ سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہوگی کہ میں یوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہوں گا بلکہ تمہارے لیے بہت مفید ثابت ہوں گا۔ ویسے اب میں بتادوں کہ میرا نام منصور ہے۔"

"اور میں ریحان ہوں۔" میں نے اپنا تعارف کروایا، ہم دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

میں نے اسے ایک کمرا دے دیا اور اس طرح وہ میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میرے لیے مفید ثابت ہوگا اور وہ مفید اس طرح ثابت ہوا کہ اس نے گھریلو کام کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔

کچن کی ذمے داری بھی ان کی ہوگئی تھی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ایک عرصے بعد مجھے گھر کے کھانے نصیب ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انہوں نے خود بھی تنہائی میں زندگی گزاری ہے۔ جہاں وہ خود کھانے بناتے ہوں گے لیکن انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ان کے پس منظر کے بارے میں کوئی بات بھی نہیں کروں گا اس لیے میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔

سچ تو یہ ہے کہ منصور صاحب کے آنے کے بعد زندگی بہت آسان ہوگئی تھی۔ وہ اس طرح میرا خیال رکھتے تھے جیسے، کوئی باپ اپنی اولاد کا خیال رکھتا ہے۔

ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ وہ بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔ خاص طور پر فلسفے، تصوف اور ادب پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔

ایک شام میں اپنے وقت سے کچھ پہلے دفتر سے گھر آ گیا۔ میں نے دور ہی سے منصور صاحب کو دیکھ لیا۔ وہ تیز قدموں سے ایک طرف چلے جا رہے تھے۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ میں نے انہیں گھر سے باہر جاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ باہر جا رہے تھے۔

میں نے ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ کرلیا۔ صرف اس لیے کہ کمزور آدمی ہیں۔ ایسا نہ ہو آگے جا کر ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوجائے۔ ان کی حفاظت کے خیال سے ان کے پیچھے چل دیا۔

منصور صاحب محلے سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ وہ ہوٹل کچھ بدنام قسم کا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہاں لوفر قسم کے لوگ آتے ہیں۔

میں اس ہوٹل میں جانا نہیں چاہتا تھا ورنہ منصور صاحب مجھے دیکھ لیتے۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد منصور صاحب ہوٹل سے باہر آئے لیکن وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک منحوس صورت شخص اور ایک عورت تھی۔ وہ عورت غیر مہذب دکھائی دے رہی تھی جس طرح کی آوارہ عورتیں ہوتی ہیں۔

میں منصور صاحب کا یہ رویہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کا ایسے لوگوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے... انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے میں ایک طرف کھڑا ہوکر ان تینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

منصور صاحب اس آدمی سے کچھ کہہ رہے تھے پھر وہ دونوں ہوٹل میں واپس چلے گئے اور منصور صاحب نے میرے گھر کی طرف چلنا شروع کردیا۔

شاید وہ واپس جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس منحوس صورت انسان سے ملاقات کرلوں لیکن میں اس سے کیا کہتا اس لیے میں نے یہ ارادہ ترک کیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

میں گھر پہنچا تو منصور صاحب گھر میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے میرے لیے چائے بنا کر رکھتے ہوئے کہا۔ "خیریت تو ہے بیٹا۔ آج تم دیر سے آئے؟"

"جی منصور صاحب، میں کسی کام سے چلا گیا تھا۔"

"میں بھی باہر نکلا ہوا تھا۔" منصور صاحب نے بتایا۔ "یہاں اسی علاقے میں ایک ہوٹل ہے، بہت پرانا۔ میں کسی زمانے میں اسی ہوٹل میں بیٹھتا تھا۔ آج دل چاہا کہ جا کر دیکھوں تو سہی کہ اس کا مالک مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔"

"اوہ۔" میں نے گہری سانس لی۔ "پھر کیا ہوا منصور صاحب، اس نے پہچانا؟"

"نہیں بیٹا، اس نے تو نہیں پہچانا لیکن اس ہوٹل میں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوگئی جس نے مجھے پہچان لیا۔ ہاں، وہ شخص کسی زمانے میں بدمعاش قسم کا ہوتا تھا۔ میں نے اپنے کاروباری معاملات میں ایک دوبار اس سے مدد لی تھی۔ اس کم بخت نے مجھے پہچان لیا۔ وہ کسی عورت کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔"

میں غور سے منصور صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں





نے تو پوری کہانی سنا کر میرے شبہات دور کردیے تھے۔ جو کچھ وہ بتا رہے تھے۔ وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

وہ شاید آہستہ آہستہ سامنے آ رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اب پتا چلا کہ اس شہر میں ان کا کاروبار بھی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ خود میں نے بھی ان سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ منصور صاحب شاید واش روم میں تھے جب فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے فون ریسیو کیا تو دوسری طرف سے کوئی منصور صاحب کو پوچھ رہا تھا۔ "منصور صاحب سے بات کرواؤ۔"

"وہ واش روم میں ہیں۔" میں نے بتایا۔ "لیکن تم کون ہو؟" اس نے کوئی جواب دیے بغیر سلسلہ ختم کردیا۔ منصور صاحب کچھ دیر بعد واش روم سے باہر آئے تو میں نے انہیں اس فون کے بارے میں بتادیا۔ ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا پھر وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے کہ یہ وہی ہاشم ہوگا۔"

"کون ہاشم؟"

"میں نے بتایا تھا نا کہ ہوٹل میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔" منصور صاحب نے کہا۔ "میں نے یہاں کا فون نمبر اسے دے دیا تھا۔"

اس کے بعد پھر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس کا ذکر کیا جائے۔ منصور صاحب کا رویہ انتہائی سلجھا ہوا اور مہذبانہ تھا۔ انہوں نے گھر کی طرف سے مجھے بے فکر کردیا تھا۔ گھر کا سارا کام وہ خود کرتے تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ "ریحان میاں اگر میں تمہیں ایک کام دوں تو کیا تم وہ کرسکو گے؟"

"آپ حکم کریں منصور صاحب۔"

"تم کو ایک جگہ جانا ہوگا۔ وہاں میری بیٹی ہے یاسمین اس سے ملنا ہوگا۔"

"آپ کی بیٹی...؟" میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔

"ہاں میری اکلوتی اولاد۔ میری یاسمین... لیکن بہت ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ تم صرف اس سے ملو گے اور اس کو میرا پیغام دو گے کسی اور کو پتا بھی نہ چلے کہ میں تمہارے یہاں ہوں... پھر تم اسے میرے پاس لے آؤ گے۔"

"منصور صاحب آپ یہ فرمائیں کہ آپ کی بیٹی جس گھر میں رہتی ہے، وہ کس کا گھر ہے؟"

"میرے ایک دوست کا لیکن اسے معلوم نہ ہو کہ تمہیں میں نے بھیجا ہے۔ کچھ ایسے معاملات ہیں کہ میں سوائے یاسمین کے اپنے آپ کو کسی اور پر ظاہر نہیں کرسکتا۔ ورنہ میرے حق میں بہت بُرا ہوگا۔"

"منصور صاحب یہ بتائیں کہ میں کس بہانے اس گھر میں جاؤں گا؟"

"تم خود ہی کوئی راستہ نکال لینا۔" منصور صاحب نے کہا۔ "تم ایک ذہین آدمی ہو اور مجھے امید ہے کہ تم کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لو گے۔"

"چلیں ٹھیک ہے، آپ مجھے پتا دیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا پھر ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ "منصور صاحب، آپ یہ بتائیں کیا آپ کے پاس اپنے دوست کا فون نمبر نہیں ہے؟"

"نہیں۔" منصور صاحب نے جواب دیا۔ "خود سوچو اگر فون نمبر یاد بھی ہو تو کیا بارہ سال تک وہی نمبر ہوگا۔ ہوسکتا ہے کچھ اور ہوگیا ہو اسی لیے تمہارا جانا ضروری ہے۔"

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ یہ بوڑھا مجھے پُراسرار حالات میں ملا تھا۔ اس نے پہلے یہ بتایا تھا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے اور اب یہ معلوم ہوا کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے جو اس کے کسی دوست کے ساتھ رہتی ہے۔

میں نے منصور صاحب سے پتا لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "منصور صاحب کیا ضروری ہے کہ آپ کی صاحبزادی مجھ پر بھروسا کر کے میرے ساتھ چلی آئے کیونکہ میں تو ان کے لیے اجنبی ہوں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" منصور صاحب سوچنے لگے۔ "یہ واقعی ایک اہم سوال ہے۔ یاسمین کیوں آنے لگی تمہارے ساتھ۔"

"یا پھر کوئی ایسی بات بتائیں جو ان کے اور آپ کے سوا کوئی نہ جانتا ہو تاکہ میں اس کا حوالہ دے سکوں۔"

"ہاں یہ ہوسکتا ہے۔" منصور صاحب سوچنے لگے پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔ "ہاں تم اس سے کہنا کہ گڑیا کے نوٹوں کا ہار کہاں رکھا ہوا ہے تو وہ سمجھ جائے گی کہ پیغام میری طرف سے ہے پھر اسے کوئی تردد نہیں ہوگا۔"

"فرض کریں اگر اس نے یہ پوچھ لیا کہ چلو یہ بتاؤ کہ اس جملے کا پس منظر کیا ہے تو پھر کیا جواب دوں گا...؟"

"میں سمجھ گیا۔" منصور صاحب مسکرا دیے۔ "تم ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوکر اس کے پاس جانا چاہتے ہو۔"

"جی ہاں اور اب میں جا رہا ہوں میرے لیے دعا فرمائیں۔" لیکن میں اس کے گھر تک نہیں جاسکا۔

میں نے گاڑی باہر نکالی ہی تھی کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ میں نے گاڑی روک دی۔ ایک شخص تیز رفتاری سے میری طرف آرہا تھا۔

ابتدا میں اسے پہچاننے میں دشواری ہوئی لیکن پھر یاد آ گیا کہ وہ میرا کالج کے زمانے کا ساتھی اختر رضا ہے۔ میں ایک عرصے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ ہم بہت گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ملے۔ ”ریحان تم تو بالکل بدل گئے ہو۔“ اس نے کہا۔

”میری جان اگر میں بدل گیا ہوں تو پھر تم نے کیسے پہچان لیا؟“

”اس لیے کہ تم اپنے مکان سے باہر نکلے ہو۔“ اس نے بتایا۔ ”اور میں تمہارا پتا تلاش کر کے تمہارے ہی پاس آیا تھا۔“

”تو پھر آؤ... مکان سامنے ہی ہے۔“

”میں نے اپنی گاڑی اس طرف کھڑی کی ہے۔“ اختر رضا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”اس کو وہیں رہنے دو۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“

میں نے گاڑی بیک کی اور اسے اپنے ساتھ مکان میں لے آیا۔ منصور صاحب مجھے واپس آتے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے۔ ”یہ میرے دوست ہیں اختر رضا۔“ میں نے اختر رضا کی طرف اشارہ کیا۔ ”کئی برس بعد ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ میرا پتا تلاش کرتے ہوئے یہیں آرہے تھے اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو میں نکل چکا ہوتا۔“

منصور صاحب نے مسکراتے ہوئے اختر رضا کا خیر مقدم کیا اور دھیرے سے بولے۔ ”میں چائے لے کر آتا ہوں۔“ پھر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

”ریحان یہ کون بزرگ ہیں؟“ اختر نے منصور صاحب کے جانے کے بعد پوچھا۔

”ان کی ایک عجیب کہانی ہے۔ بہر حال اتنا سمجھ لو کہ آج کل یہ میرے ساتھ ہی رہ رہے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے میں انہیں جانتا ہوں۔“ اختر رضا نے کہا۔ ”ان کو کہیں دیکھا ہے... کہاں دیکھا ہے اس وقت یاد نہیں آرہا۔“

اس دوران میں منصور صاحب چائے بنا کر لے آئے۔ چائے پینے کے دوران اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد منصور صاحب نے بھی وہی بات کی۔

”بیٹے تمہارا یہ دوست مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا ہے۔“

”یہی بات وہ آپ کے لیے بھی کہہ رہا تھا۔ بہر حال اب میں پھر سے اپنے مشن پر جا رہا ہوں۔“

”ضرور جاؤ۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔“

☆☆☆

وہ بہت خوبصورت اور شاندار مکان تھا۔ بہت سے بھید تھے۔ اگر وہ شاندار مکان منصور صاحب کا تھا تو پھر وہ در بدر کیوں بھٹک رہے تھے اور ان کی بیٹی اس مکان میں کیا کر رہی تھی۔ کیا ان کے ساتھ کوئی ایسی مجبوری تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے ملنے نہیں آسکتے تھے۔ اگر یاسمین ان کے کسی دوست کے پاس رہ رہی تھی تو کس حیثیت سے... غرضیکہ بے شمار سوالات تھے اور میرے پاس فی الحال ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔

بہر حال میں نے اپنی گاڑی اسی مکان کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ گیٹ کھولنے والا کوئی ملازم تھا جو سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”مجھے یاسمین صاحبہ سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ گھر پر ہیں؟“

”جی ہاں۔“ اس نے گردن ہلا دی۔ ”آئیں اندر آجائیں۔“ اس نے مجھے شاندار لاؤنج میں بٹھا دیا۔ لاؤنج کی ہر چیز گواہی دے رہی تھی کہ یہ کسی دولت مند شخص کا مکان ہے۔

کچھ دیر بعد ایک خوبصورت نوجوان میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے بہت سلیقے سے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ اس نوجوان میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بچی اور معصوم سی مسکراہٹ۔ جیسی مسکراہٹ بچوں کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔

”میں یاسمین صاحبہ سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔

”آں... آں۔“ اس نے اشارے سے بتایا کہ یاسمین ابھی آرہی ہے اور اس وقت پتا چلا کہ وہ ایک گونگا نوجوان ہے۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اتنا خوبصورت اور معصوم صورت نوجوان گونگا ہے۔

میں ابھی اس کی حالت پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے دریافت کیا۔ ”جی





فرمائیں، آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

میں نے جواب دینے سے پہلے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ یاسمین سمجھ گئی کہ میں اس نوجوان کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے کچھ اشارہ کیا اور وہ نوجوان انتہائی فرمانبرداری سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

”معاف کیجیے گا، یہ بول نہیں سکتا۔“ یاسمین نے اس کے جانے کے بعد بتایا۔ ”اب فرمائیں آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”آپ کو میرے ساتھ کہیں چلنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کے ساتھ؟“ اس کی بھویں تن گئیں۔ ”کہاں لے جانا چاہ رہے ہو مجھے؟“

”ناراض نہ ہوں کسی شخص سے ملنا ہے آپ کو۔“ میں نے کہا۔ ”میں انہی کا پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ سے یہ پوچھوں کہ گڑیا کے نوٹوں کا ہار کہاں رکھا ہوا ہے۔“

”کیا...؟“ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ”یہ کہا تھا انہوں نے... کیا نام ہے ان صاحب کا؟“ اس کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔

”منصور۔“ میں نے بتایا۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ وہ رو رہی تھی پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”منصور میرے ابو کا نام ہے کہاں ملے تھے تمہیں؟“

میں نے اسے اب تک کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ بہت بے چین ہو رہی تھی۔

”خدا کے لیے مجھے لے چلو ان کے پاس۔“ اس نے کہا۔ ”میں ان کے لیے برسوں سے تڑپ رہی ہوں۔“

”انہوں نے بھی یہی کہا تھا لیکن انہوں نے یہ ہدایت کی ہے کہ آپ کو بہت خاموشی سے لایا جائے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے کہ آپ میرے ساتھ آئی ہیں یا کسی سے ملنے گئی ہیں۔“

”ہاں، یہ انہوں نے ٹھیک کہا ہے۔ ایسا کرو کہ تم پہلے چلے جاؤ اور کینٹ لبرٹی کے پاس مجھ سے مل لو۔ میں وہیں آرہی ہوں۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔ تم ایک گھنٹے بعد پہنچ جانا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہاں کیا بہانہ کرو گی کہ میں کون ہوں اور کس لیے آیا تھا؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔ میں کچھ نہ کچھ کہہ دوں گی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میں نکل رہا ہوں۔“ میں اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ برآمدے میں وہی نوجوان کھڑا تھا جس نے اپنی معصوم مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تھا۔

کینٹ لبرٹی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ یاسمین کو وہاں آنے میں ابھی کافی وقت لگتا۔ میں نے ایک جگہ گاڑی پارک کی اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

یاسمین ٹھیک ایک گھنٹے بعد اپنی شاندار گاڑی میں وہاں آگئی۔ وہ گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں نے اشارہ کیا کہ وہ میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلی آئے۔

میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے سارے بدن پر جیسے لرزہ سا طاری تھا۔

منصور صاحب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منصور صاحب یاسمین کو دیکھ کر بے ساختہ کھڑے ہو گئے جبکہ یاسمین نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہیں ابو... پلیز تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

”یہی تو ہیں۔“ میں نے منصور صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ...“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”نہیں... یہ میرے ابو نہیں ہیں۔ میں تو ان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“ اس وقت میری جو حالت تھی وہ صرف میں ہی جان سکتا ہوں۔

یاسمین کی یہ بات سن کر منصور صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر یاسمین کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹا کیا ہو گیا ہے تمہیں، تم اپنے ابو کے لیے یہ کہہ رہی ہو۔ خود سوچو تمہاری اس بات سے مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔“

”تو پھر کیا کہوں میں؟“ یاسمین پھٹ پڑی۔ ”کیا باپ ایسا ہوتا ہے جو اپنی اولاد کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جائے۔ جسے یہ احساس تک نہ ہو کہ اس کے جانے کے بعد اس کی بیٹی پر کیا گزر رہی ہو گی۔“

”مجھے احساس ہے بیٹا۔“ منصور صاحب رونے لگے۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں سکون سے رہا ہوں۔ ایک ایک لمحہ تڑپتا رہا ہوں میں، میرا سب کچھ تم ہی تو ہو۔“

”تو پھر مجھے چھوڑا کیوں؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے بیٹا۔“ منصور صاحب نے کہا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا گزری اور میں کیوں غائب ہوا تھا۔“

”تم یہ بتاؤ... یہ تمہارے ابو ہیں یا نہیں؟“ میں نے یاسمین سے پوچھا۔

"ہاں، یہی میرے ابو ہیں۔" یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "وہ بات غصے میں کہہ دی تھی۔"

اتنا مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یاسمین نے وہ بات غصے میں کہی ہوگی پھر دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر بہت دیر تک روتے رہے۔ میں نے اتنی دیر میں دونوں کے لیے چائے تیار کر دی۔ جب ماحول سازگار ہوا تو منصور صاحب نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"یہ کہانی اب سے بارہ تیرہ سال پہلے کی ہے۔ ہم تین دوست تھے۔ میں، ساجد اور وقار... میری بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک اولاد تھی، یاسمین۔ ساجد کا ایک بیٹا تھا جبکہ وقار بے اولاد تھا۔ ہم تینوں کے پاس تھوڑی بہت رقم تھی۔ اس سے ہم تینوں نے کاروبار شروع کر دیا، مشترکہ کاروبار۔ اس وقت یاسمین صرف آٹھ یا نو برس کی تھی۔ مجھے دنیا کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں یہ سب کچھ یاسمین کے لیے کر رہا تھا۔"

منصور صاحب بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔ جیسے گزرے ہوئے تکلیف دہ واقعات کو اپنے ذہن میں جمع کر رہے ہوں پھر بتانا شروع کیا۔ "پھر یہ ہوا کہ ایک دن وقار سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ یہ ایک کاروباری اور اصولی قسم کی جنگ تھی۔ جو اس دن نہیں تو دوسرے دن ختم ہو جاتی لیکن ہوا یہ کہ اسی رات وقار کا خون کر دیا گیا۔"

"کیا..." میں اور یاسمین دونوں ہی ساکت ہو گئے۔

"ہاں بیٹا، قتل کر دیا گیا اس کو۔ بہت سے لوگ اس جھگڑے کے گواہ تھے۔ سارے ثبوت میرے خلاف جا رہے تھے۔ میرا تو حال برا ہی تھا لیکن مجھ سے زیادہ برا حال ساجد کا ہو رہا تھا اور مجھے یہ خوف تھا کہ اگر میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر میرا کیا ہوگا... یاسمین کا کیا ہوگا۔ یہ تو ایک قاتل کی بیٹی کہلائے گی۔ کون اسے اپنائے گا۔ اس قسم کے خدشات اور خیالات نے مجھے پریشان کر دیا اور میں روپوش ہو گیا لیکن روپوش ہونے سے پہلے میں نے یاسمین کی پرورش کی ذمے داری ساجد کے حوالے کر دی۔"

"اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ساجد انکل نے ایک باپ ہی کی طرح میری پرورش کی ہے۔"

"مجھے اس سے یہی امید تھی۔" منصور صاحب نے کہا۔ "بہرحال میں فرار ہو گیا۔ یہ میری حماقت تھی یا میرا خوف۔ بہرحال بارہ برس تک میں کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے پھر یہ ہوا کہ چار سال کے بعد ایک سانحے نے مجھے ہلاک کر دیا یعنی یہ سمجھ لیا گیا کہ میں مر چکا ہوں۔"

"ہاں ابو یاد ہے مجھے۔ میں نے ہوٹل میں آگ لگنے کی خبر سنی تھی۔" یاسمین نے بتایا۔ "بہت سے لوگ جل کر مر گئے تھے اور اس میں آپ کی لاش بھی تھی۔"

"ہاں سمجھا یہی گیا تھا یہ اتفاق تھا کہ سانحے سے صرف آدھے گھنٹے قبل میں کسی کام کے لیے ہوٹل سے باہر چلا گیا تھا۔ میرا سامان جل گیا تھا لیکن کچھ ایسی چیزیں باقی رہ گئی ہیں جس سے یہ اندازہ لگا لیا گیا کہ میں جل کر ہلاک ہو چکا ہوں۔"

"یہ خبر مجھے ساجد انکل نے سنائی تھی۔" یاسمین جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ "بلکہ مجھے خود معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی تھی۔ شاید آپ کے مرنے کی خبر تھی۔ روتے روتے میرا برا حال ہو گیا تھا پھر ساجد انکل نے بھی اس خبر کی تصدیق کر دی۔ اس کے بعد میرے لیے جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا لیکن ابو یہ سب کس طرح ہوا... وہ کون تھا جس کی لاش کو آپ کی لاش سمجھ لیا گیا کیونکہ وہ لاش آپ ہی کے کمرے سے ملی تھی؟"

"ہاں یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا۔" منصور صاحب نے گہری سانس لی۔ "وہ ایک ایجنٹ تھا میں نے خود اس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ مجھے ملک سے باہر بھجوانے کی پلاننگ کرنے آیا تھا۔"

"کیا آپ ملک سے باہر جانا چاہتے تھے...؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹے کیونکہ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی حل نہیں تھا۔" منصور صاحب نے بتایا۔ "یہاں رہتا تو قانون کی گرفت میں آ جاتا۔ اسی لیے میں نے سوچا چند برس باہر گزار لوں۔ بدقسمتی سے وہ ایجنٹ مجھ سے ملنے آ گیا۔ اس کو کمرے میں بٹھا کر میں کسی کام سے ہوٹل سے باہر آیا ہی تھا کہ اچانک ہوٹل میں آگ بھڑک اٹھی اور وہ ایجنٹ بے چارہ اس آگ کی نذر ہو گیا۔"

"سمجھ گیا۔" میں نے اپنی گردن ہلائی۔ "آپ کا پاسپورٹ کسی طرح محفوظ رہ گیا ہوگا اور وہی تصویر اخبار میں چھپی ہوگی؟"

"بالکل یہی بات تھی اور ہاں اب یاد آیا ہے کہ میں نے تمہارے دوست کو کہاں دیکھا تھا۔ وہ اسی ہوٹل میں تھا اسی لیے کئی بار اس پر نظر پڑتی رہتی تھی۔"

☆☆☆

کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ بہت عجیب داستان تھی۔ ایک ایسا شخص جس پر کسی کے قتل کا الزام تھا وہ میرے گھر میں موجود تھا۔

"منصور صاحب ایک بات بتائیں۔ آپ نے یاسمین کو اتنی خاموشی کے ساتھ کیوں بلایا۔ آپ اپنے دوست کے پاس کیوں نہیں گئے؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ساجد تو میرا دوست ہے۔ مجھے اس پر بھروسا ہے لیکن اس کے اردگرد جو لوگ ہیں وہ میرے دشمن ہو سکتے ہیں اور یہ وہی کاروباری لوگ ہیں۔ تم انہیں اسٹاف کے ممبر سمجھ سکتے ہو۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ پہلے اپنی بیٹی سے ملاقات کر لوں۔ اس کے بعد خاموشی کے ساتھ ساجد کو بھی بلا لوں گا۔"

"لیکن ابو کیا آپ زندگی بھر اسی طرح روپوشی کی زندگی گزارتے رہیں گے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے، میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مجھ پر لگا ہوا الزام ختم ہو جائے۔"

"اور اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تم یہ بتاؤ، کیا تم میری مدد کرنے کے لیے سنجیدہ ہو؟"

"جناب، میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پوچھنے کی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی طرف سے جو کر سکتا ہوں، وہ ضرور کروں گا۔"

"تو پھر تم کسی طرح راجا سے جا کر ملو۔" منصور صاحب نے بتایا۔ "راجا وہ پولیس آفیسر ہے جس کے ہاتھ میں یہ کیس تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ کس عہدے پر ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال اس کے بارے میں اس کے ساتھی پولیس والوں سے معلوم ہو جائے گا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہی تفتیش کر رہا تھا۔ اسے آمادہ کرو کہ وہ پھر سے اس قتل کی فائل کھولے اور اپنی تفتیش کا آغاز کرے۔"

"لیکن میں کس حیثیت سے یہ بات کہوں گا؟"

"میں تمہیں مرنے والے کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔" منصور صاحب نے کہا۔ "وہ بے اولاد تھا لیکن اس کا ایک بھتیجا تھا ابراہیم نام تھا اس کا۔ وہ اب پتا نہیں کہاں ہے تم خود کو مرنے والے کا بھتیجا ظاہر کر کے یہ کہہ سکتے ہو کہ تمہیں اپنے چاچا کے کیس کے بارے میں چھان بین کرنی ہے اور یہ تمہارا حق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح بات بن جائے۔"

"بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے مرنے والے کے بارے میں سب کچھ بتا دیں۔"



"اور ابو میں کیا کروں؟" یاسمین نے پوچھا۔ "کیا میں ساجد انکل کو آپ کے بارے میں بتا دوں؟"

"میرا خیال ہے کہ تم ابھی نہ بتاؤ۔" منصور صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بلکہ ہو سکے تو ریحان کو بھی وقار کا بھتیجا ظاہر کر کے ساجد سے ملوا دو۔ ہو سکتا ہے کہ ساجد کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہوں جو اس کیس پر روشنی ڈال سکیں۔"

"کیا ساجد انکل کو یہ اندازہ نہیں ہو جائے گا کہ میں وقار کا بھتیجا نہیں ہوں؟"

"نہیں اسے کوئی اندازہ نہیں ہوگا کیونکہ میں تمہیں وقار اور اس کے خاندان کے بارے میں اتنی باتیں بتا سکتا ہوں کہ تم اس کے ہر سوال کا جواب دیتے چلے جاؤ گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" یاسمین نے بھی تائید کی۔

یاسمین کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد منصور صاحب نے مجھے وقار اور اس کے پس منظر کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد میں اتنا جان چکا تھا کہ اپنے آپ کو بے دھڑک مرنے والے کا بھتیجا ظاہر کر سکتا۔

☆☆☆

وہ تھانہ پرنسٹن کا تھا۔ ویسی ہی قدیم عمارت جو انگریزوں کے زمانے میں بنوائی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ہر تھانے کا ماحول ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ بے رحم، سرد دیواریں اور خوف دلاتے ہوئے بے تاثر چہرے۔

اس پولیس انسپکٹر کا نام راجا ندیم تھا۔ میں نے محرر سے جب اس کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے بھائی کب کی بات کر رہے ہو یہاں تو کوئی راجا ندیم نام کا انسپکٹر نہیں ہوتا۔"

"جناب یہ بات دس بارہ سال پہلے کی ہے۔" میں نے بتایا۔

"دس بارہ سال...!" وہ حیران رہ گیا۔ "خیر تو ہے، دس بارہ سال بعد راجا ندیم کی یاد کیوں آ رہی ہے؟"

"ان سے بہت ضروری کام ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "میں ملک سے باہر تھا کئی برس بعد وطن واپس آیا ہوں اس لیے مجھے ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔"

"نہیں بھائی، یہاں اس نام کا کوئی انسپکٹر نہیں ہے۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔ ہو سکتا ہے کہ تم کو انہی کی تلاش ہو۔ اب سے بہت پہلے راجا ندیم انسپکٹر تھے لیکن اب... ہاں اب تو وہ ایس پی ہو گئے ہیں۔ بڑے صاحب... ہو سکتا ہے کہ تمہیں انہی کی تلاش ہو۔"

"کیا وہ اسی تھانے میں ہوتے تھے؟"

''یہ میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر اندر چلا گیا کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''مبارک ہو جی، تمہارا کام ہو گیا۔ یہ وہی راجا ندیم ہیں اور آج کل ایس پی ہیں۔''

''ان سے میری ملاقات کہاں ہو سکے گی؟''

''تمہیں ان کے دفتر جانا ہوگا۔'' اس نے مجھے پتا سمجھا دیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے تھانے سے باہر آ گیا۔ دوسرے دن میں ایس پی راجا ندیم کے دفتر پہنچ گیا۔ دنیا بھر کے سوالات کیے گئے۔ کیا کام ہے، کیوں ملنا چاہتے ہو، کون ہو...؟ بہرحال بڑی مشکلوں سے ایس پی صاحب تک رسائی ہو سکی۔

وہ ایک بارعب شخص تھا اور اس کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک ایماندار اور فرض شناس شخص ہے۔ بعض چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کردار کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس کا چہرہ بھی یہی کہہ رہا تھا اور اس کی تصدیق کچھ اس طرح ہو گئی کہ جب اس نے مجھے مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں ایسی نرمی اور تہذیب تھی جو عام طور پر پولیس والوں میں نہیں پائی جاتی۔

''جی فرمائیں، آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جناب، میں اب سے دس بارہ سال پہلے کے ایک کیس کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''اوہو۔'' راجا ندیم نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''کس کیس کی بات کر رہے ہو؟''

''وقار نام تھا مرنے والے کا۔'' میں نے بتایا پھر پوری تفصیل بتا دی۔

''اور تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟''

''میں مرنے والے کا بھتیجا ہوں۔ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ مجھے یہ پتا چلا تھا کہ ان کا قاتل منصور فرار ہو گیا ہے؟''

''ہاں منصور نام کا وہ شخص فرار تو ہو گیا تھا۔'' راجا ندیم نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے تو یہ کیس اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اس کو پکڑنے کے لیے بہت محنت کی تھی لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا... جبکہ وقار کا اصل قاتل ہاتھ آ گیا تھا۔''

''کیا...؟'' اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ ''اصل قاتل... میں سمجھا نہیں...؟''

''ہاں، اس کا اصل قاتل اور عدالت میں اس کو سزا بھی ہو چکی ہے۔'' راجا ندیم نے بتایا۔

''میرے خدا، یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کون تھا وہ؟''

''انہی کے دفتر میں کام کرنے والا ایک شخص۔'' راجا ندیم نے بتایا۔ ''بے چارہ منصور خواہ مخواہ خوفزدہ ہو کر فرار ہو گیا تھا۔''

''خدا کا شکر ہے کہ ایک بے گناہ سے الزام ہٹ گیا۔''

''حیرت ہے کہ یہ بات تمہیں نہیں معلوم اور نہ ہی منصور کو معلوم ہو سکی۔ ورنہ وہ ضرور سامنے آ جاتا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہرحال آپ نے کہہ دیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ منصور سامنے آ جائے۔''

''کیا تمہارا ان سے کوئی رابطہ رہتا ہے؟''

''جی نہیں، بس کبھی کبھی ان کا فون آ جاتا ہے اور وہ بھی مختلف مقامات سے۔''

''بہرحال اب فون آئے تو بتا دینا کہ اب اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔'' راجا ندیم نے کہا۔ ''اصل قاتل پکڑا گیا تھا اور اسے سزا بھی ہو گئی تھی۔''

''بہت بہت شکریہ جناب۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''آپ نے میرے سینے پر سے ایک بوجھ اتار دیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' راجا ندیم مسکرا دیا۔ ''یہ اطلاع دینا تو میرا فرض تھا۔ ویسے آپ اتنی جلدی کہاں جا رہے ہیں؟''

''اب میں واپس جاؤں گا جناب۔'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے میری غیر موجودگی میں منصور صاحب کا فون آ جائے۔''

''کچھ دیر تو بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔'' میرے انکار کرنے کے باوجود اس نے چائے کے لیے انٹرکام پر کہہ دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا یہ بتائیں ابراہیم صاحب کہ آپ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟''

اب میرا اصل امتحان شروع ہو چکا تھا لیکن میں پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس لیے میں نے بے تکان بولنا شروع کر دیا کہ میں کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔

میری باتوں کے دوران بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہی۔ وہی مسکراہٹ جو اس کے مزاج کا حصہ بن





چکی تھی۔ اس دوران میں چائے آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے ایک ایسی بات کی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ ''جناب، اب میں آپ کو یہ بتا دوں کہ پولیس میں نوکری کرتے ہوئے مجھے کئی برس ہو چکے ہیں۔''

''جی ہاں، یہ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔''

''کمال ہے... اس کے باوجود تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''دھ... دھوکا...؟'' میرے اب ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

''ہاں دھوکا کیونکہ میں وقار کے بھتیجے ابراہیم سے مل چکا ہوں اور تم ابراہیم نہیں ہو۔''

''میرے خدا۔'' میری آنکھوں کے آگے ستارے رقص کرنے لگے۔ ''آپ اس سے مل چکے ہیں؟''

''ہاں، اسی لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے بارے میں صاف صاف بتا دو کہ کون ہو تم، منصور سے تمہارا کیا تعلق ہے اور تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟''

''ٹھیک ہے جناب۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''واقعی میرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میں آپ کو سب کچھ بتا ہی دوں۔'' پھر میں نے اسے پوری کہانی بتا دی کہ منصور صاحب سے کن حالات میں ملاقات ہوئی اور کس طرح میں انہیں اپنے گھر لایا تھا اور کیا کیا ہو چکا ہے۔ سب بتا دیا۔

''اور اب منصور صاحب کہاں ہیں...؟'' اس نے پوچھا۔ ''تمہارے گھر پر؟''

''نہیں جناب، وہ وہاں سے بھی جا چکے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں آپ کو وقار کے قتل کی فائل کھولنے کے لیے راضی کر لوں پھر وہ مجھ سے خود ہی رابطہ کرتے رہیں گے۔''

''تم نے بہت اچھا کیا جو سچ سچ بتا دیا۔ اب تم جا سکتے ہو۔'' میں جان بچی تو لاکھوں پائے کی گردان کرتا ہوا راجا ندیم کے کمرے سے باہر آ گیا۔

میں یہ خبر لے کر جب گھر پہنچا تو یاسمین بھی ملنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ دونوں باپ بیٹی یہ خبر سن کر خوشی سے جیسے بے حال ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں خود بھی ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت کچھ عجیب سے جذبات ہو رہے تھے۔

''ابو... اب تو آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اب تو آپ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔'' یاسمین نے کہا۔

اچانک دروازے پر ہونے والی گھنٹی نے ہم سب کو چونکا دیا۔ دروازہ کھولنے کے لیے میں ہی گیا تھا اور دروازہ کھولتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔

ایس پی راجا ندیم کئی پولیس والوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''ایس پی صاحب۔ آ... آپ؟'' میں بری طرح بوکھلا گیا۔

''ہاں۔ میں منصور کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ جو اس وقت تمہارے گھر میں ہیں۔'' راجا ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راجا ندیم اس طرح میرے گھر تک پہنچ جائے گا۔ وہ مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر آ گیا۔ یاسمین اور منصور صاحب اس کے سامنے تھے۔

''تم۔'' منصور صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''شرم نہیں آئی مجھے دھوکا دیتے ہوئے۔ تم نے پولیس کو یہ بتا دیا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔''

''نہیں منصور صاحب، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' راجا ندیم نے کہا۔ ''اس بے چارے نے تو خود کو وقار کا بھتیجا ظاہر کیا تھا جبکہ میں یہ جانتا تھا کہ اس کا صرف ایک بھتیجا تھا۔ جس کا انتقال ہو چکا ہے۔ جس وقت یہ تمہاری کہانی لے کر میرے پاس آیا، اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اسے تم نے ہی بھیجا ہوگا تاکہ کسی طرح اپنی پوزیشن صاف کر سکو اور یہ جان سکو کہ پولیس اس کیس میں اب بھی دلچسپی لے رہی ہے یا نہیں۔ اس لیے میں نے اسے یہ بتا دیا کہ وقار کا قاتل گرفتار ہو چکا ہے اور عدالت سے اسے سزا بھی ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب، کیا ایسی کوئی بات نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس کا قتل اب تک میرے لیے چیلنج بنا ہوا ہے۔'' راجا ندیم نے کہا ''پھر جب تم تھانے سے نکلے تو میرے آدمی بہت ہوشیاری سے تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے اور پھر مجھے اطلاع دی گئی۔ میں اپنے اندازے سے یہاں آ گیا ہوں اور میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔''

''راجا ندیم، میں قاتل نہیں ہوں۔'' منصور صاحب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر میں قاتل ہوتا تو ریحان کو تمہاری طرف نہیں بھیجتا۔ تم سے یہ نہیں کہتا کہ اس کیس کی فائل ری اوپن کی جائے کیونکہ میں تو تمہارے ریکارڈ کے مطابق مر ہی چکا تھا لیکن میں اپنی ذات پر الزام

لیے ہوئے اس دنیا سے نہیں جانا چاہتا۔"
"تمہاری اس حرکت نے مجھے تمہارے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔" راجا ندیم نے کہا۔ "شاید اس کا قاتل کوئی اور ہے اور یہ بات میں یہاں آنے کے بعد دعوے سے کہہ رہا ہوں۔"
"وہ کس طرح۔" میں نے پوچھا۔
"پولیس والوں کی نگاہیں۔ اس کے علاوہ منصور کی بے گناہی کا ایک واضح ثبوت مل گیا ہے۔" راجا ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ان پولیس آفیسرز میں سے نہیں ہوں جو بغیر سوچے سمجھے ہر شخص کو مجرم سمجھنا شروع کردیتے ہیں۔ میں ہر کیس کے حل کے لیے اپنی ذہانت سے کام لیتا ہوں اور خدا کے فضل سے یہاں بھی میری ذہانت نے مجھے راستہ دکھادیا ہے۔"
"خدا کے لیے بتائیں سر۔ آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" یاسمین نے پریشان ہوکر پوچھا۔
"اس لیے کہ جس شخص کا قتل ہوا ہے۔ اس کا قاتل دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوگیا تھا کہ گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے اور کس ہاتھ سے چلائی گئی ہے۔ یہ بات ابتدائی تفتیش میں ہی معلوم ہوگئی تھی جبکہ منصور صاحب بائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ میں نے یہاں آنے کے بعد یہی بات نوٹ کی ہے اور اسی بنیاد پر میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیا۔"
"خدایا تیرا شکر ہے۔" منصور صاحب نے گہری سانس لی۔ "راجا ندیم صاحب آپ نے مجھے نئی زندگی دے دی ہے۔"
"سوال یہ ہے کہ پھر وقار کا قتل کس نے کیا؟" راجا ندیم نے کہا۔ "بہر حال، اب میں اس کیس کی فائل ری اوپن کروں گا اور نئے سرے سے تفتیش کروں گا اور اس سلسلے میں آپ کی مدد کی ضرورت بھی ہوگی۔" یہ بات اس نے منصور صاحب سے کہی۔
"میں ہر طرح سے تعاون کے لیے حاضر ہوں۔"
"سب سے پہلے آپ کو عدالت سے بری کرانا ہوگا۔" راجا ندیم نے کہا۔ "آپ اپنی گرفتاری دیں گے۔ ویسے تو آپ کی موت کی جھوٹی خبر نے یہ باب بند ہی کردیا ہے لیکن اب چونکہ آپ سامنے آچکے ہیں اس لیے یہ قدم اٹھانا بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد آپ مکمل طور پر آزاد ہوجائیں گے۔"
"اور اگر عدالت میں کچھ اور ہوگیا تو؟"
"کچھ بھی نہیں ہوگا کیونکہ میں تفتیشی آفیسر ہوں اور میرا بیان آپ کے حق میں جائے گا۔ اس لیے اس کیس کو ختم ہی سمجھیں۔ بس تھوڑی سی ضابطے کی کارروائی ہوگی جو بہت ضروری ہے۔ آپ کی رہائی کے بعد اصل قاتل کو تلاش کیا جائے گا۔"
"راجا ندیم صاحب مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔" منصور صاحب نے کہا۔ "آپ جو مناسب سمجھیں وہ کرسکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"
"ریحان میاں۔" منصور صاحب نے میری طرف دیکھا۔ "تم اگر چاہو تو یاسمین کے ساتھ ساجد کے پاس جاکر اس کو میرے بارے میں بتاسکتے ہو۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور محسن بھی ہے۔ اس نے یاسمین کی پرورش کی ہے۔ اس سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہیے۔"
"ٹھیک ہے، آپ بے فکر رہیں۔ میں یاسمین کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔"
"ابو...!" یاسمین کچھ پریشان ہونے لگی۔ "آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟"
"ارے نہیں اب کیسا مسئلہ۔" منصور صاحب ہنس دیے۔ "مسئلہ تو اب ختم ہونے جارہا ہے۔"
راجا ندیم منصور صاحب کو لے کر چلا گیا یعنی ضابطے کے مطابق ان کی گرفتاری عمل میں آچکی تھی۔ یاسمین اس وقت بہت پریشان ہورہی تھی۔
میں اس کو بہت دیر تک دلاسے دیتا رہا۔ اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ اب کوئی پریشان کن بات نہیں ہے۔ اب اس کے ابو کے معاملات سلجھ گئے ہیں۔
اس وقت پہلی بار میں نے یاسمین پر دھیان دیا۔ وہ واقعی ایک اچھی لڑکی تھی۔ اس دوران میں اس سے کئی ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ اس لیے احساس ہونے لگا کہ وہ آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر طاری ہوتی جارہی ہے۔
وہ اس لیے میرے قریب آرہی تھی کہ میں نے اس کے والد کو پناہ دے کر اس پر احسان کیا تھا اور وہ کئی بار اس کا شکریہ بھی ادا کرچکی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ساجد صاحب کے پاس چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "انہیں بھی یہ سن کر خوشی ہوگی کہ منصور صاحب لوٹ آئے ہیں اور ان کا کیس تقریباً ختم ہوچکا





ہے۔"
"یہ تو ہے، انکل بھی ابو کی طرف سے بہت پریشان رہتے تھے۔ انہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔" یاسمین اپنی گاڑی پر آئی تھی۔ میں اس کے ساتھ... گاڑی میں اس کے گھر پہنچا اور اتفاق سے ساجد صاحب گھر میں موجود تھے۔
ایک ادھیڑ عمر انسان، ان کی شخصیت بہت خوبصورت تھی۔ لہجے میں نرمی۔ پہلی نگاہ میں اس کا تاثر بہت اچھا تھا۔ یاسمین نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "انکل، یہ ریحان ہیں۔ یہ کون ہیں، کیا ہیں۔ یہ اپنے بارے میں آپ کو خود بتائیں گے۔"
"جی ریحان میاں، چلو اپنا تعارف ہی کروادو۔" یاسمین نے تو بات ادھوری چھوڑ دی۔"
"جناب، میں آج کل ایک مشن پر ہوں۔" میں نے بتایا۔
"کیسا مشن...؟"
"اب سے کئی سال پہلے آپ کے ایک دوست وقار کا قتل ہوگیا تھا۔ جس کے قتل کا الزام آپ کے دوسرے دوست منصور صاحب پر لگایا گیا تھا۔"
"میرے خدا، تم اتنی پرانی بات کہاں سے لے کر بیٹھ گئے۔ وہ کہانی تو اب ختم ہوچکی ہے۔"
"ختم نہیں ہوئی جناب، شروع ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "منصور صاحب نے پولیس کو اپنی گرفتاری دے دی ہے اور پولیس نئے سرے سے اس کیس کی تفتیش کررہی ہے۔"
"کیا بکواس ہے یہ۔ بے چارے منصور کا تو انتقال ہوچکا ہے۔"
"نہیں انکل، ابو زندہ ہیں۔" یاسمین نے بتایا۔ "میں خود ان سے کئی بار مل چکی ہوں۔"
"حیرت ہے... مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ آخر یہ سب کس طرح ہوا؟" پھر میں نے منصور صاحب کے ملنے سے لے کر اب تک کی ساری کہانی ان کو سنادی۔ ہر لمحے ساجد صاحب کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ "میرے خدا، یہ اس نے کیا حماقت کردی۔" میرے خاموش ہوجانے کے بعد انہوں نے کہا "اور تم بھی پاگل ہو تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔ راجا ندیم انتہائی چالاک انسان ہے۔ وہ بہانے سے منصور کو اپنے ساتھ لے گیا ہے اور اب اسے سزا دلا کر رہے گا۔ حد ہوگئی... جب منصور کامیابی کے ساتھ روپوش ہوہی گیا تھا تو پھر سامنے آنے کی کیا ضرورت تھی اور سامنے آنے کے بعد پرانے کیس کو زندہ کرنے کی کیا پڑگئی تھی۔ راجا ندیم اسے بہانے سے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"
"ہم نے... ہم نے تو اس پہلو پر سوچا ہی نہیں تھا۔" یاسمین نے پریشان ہوکر کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔
"مشورہ نہ کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔" ساجد صاحب نے کہا۔
اب خود میں بھی چکرا گیا تھا۔ ساجد صاحب کی باتیں ایسی تھیں جو آسانی سے نظر انداز نہیں ہوسکتی تھیں۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ہم سب نے اس طرح خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔
"انکل اب کیا ہوگا؟" یاسمین تقریباً رونے لگی۔
"اب کیا ہوسکتا ہے۔" ساجد صاحب بے حد پریشان تھے۔ "منصور کو سزا ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔" یاسمین آہستہ آہستہ رونے لگی۔
"جناب، کیا آپ کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے؟" میں نے ساجد سے پوچھا۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے وقوف کے لیے کیا کیا جائے۔ بہر حال تم راجا ندیم کے پاس جاؤ اور تازہ صورت حال معلوم کرو جب تک میں کسی اچھے وکیل کو ہائر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
"میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" یاسمین نے مجھ سے کہا۔ یاسمین نے ایک بار پھر اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک گونگا نوجوان دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس آگیا۔ اس نے میرا بازو تھام کر مجھ سے آں آں کرنا شروع کردیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا یا بتانا چاہ رہا تھا لیکن اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔
یاسمین بھی اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ "کیا ہوا رمیز، کیا کہنا چاہتے ہو؟" یاسمین نے پوچھا۔
اس نوجوان نے اشاروں سے کچھ بتانا شروع کردیا۔ یاسمین بھی اس کے اشاروں کا اسی انداز سے جواب دے رہی تھی پھر رمیز کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ نمودار ہوگئی... وہی انتہائی معصوم اور خوبصورت مسکراہٹ۔ ایک ایسا پاکیزہ چہرہ سامنے آجاتا۔ جس کو دنیا کی ہوا چھو کر بھی نہ گزری ہو پھر اس نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ یاسمین پھر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔
"کیا سمجھا دیا اس کو؟" میں نے پوچھا۔

"بے وقوف ہے۔" یاسمین دھیرے سے بولی "اصل میں ہم ایک عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ میرے علاوہ اس بے چارے کا اور کوئی دوست نہیں ہے۔ اس لیے مجھ سے اتنا مانوس ہو گیا ہے۔"

"یہ تو فطری بات ہے۔" میں نے تبصرہ کیا "مجھے خود بھی یہ نوجوان بہت اچھا لگتا ہے۔"

"بہت اچھا ہے۔ بہت ہی پیار کرنے والا اور خیال کرنے والا۔" ہم اس طرح کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک وہ ہو گیا جو ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا۔ ایک بڑی سی وین نے سامنے سے آ کر گاڑی کا راستہ روک لیا اور اس میں سے تین افراد نیچے اترے۔ دیکھنے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔

"خدا کی پناہ... یہ کون لوگ ہیں؟" یاسمین نے گھبرا کر پوچھا۔ میں اسے کیا بتا سکتا تھا۔ اس دوران میں وہ تینوں گاڑی کے پاس آ گئے۔

"خاموشی سے گاڑی چھوڑ کر وین میں آ کر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ ہم لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک نے ریوالور بھی نکال لیا اور وہ بھی اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ آنے جانے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہم اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے کہ ان کی بات مان لیں۔

ہم ان کی وین میں جا کر بیٹھ گئے جن کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے لیے بالکل اجنبی تھے۔

یاسمین کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس پریشانی کے عالم میں بھی اس کے ہاتھ کا لمس بہت خوش گوار محسوس ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر بھی ایک رنگ سا آ گیا پھر ہم اس افتاد میں گم ہو کر رہ گئے۔ وین بہت تیزی سے ایک طرف جا رہی تھی۔ راستے کا اندازہ اس لیے نہ ہو سکا کہ ہم دونوں کی آنکھوں پر رومال باندھ دیے گئے تھے۔

میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھا۔ "کون ہو تم لوگ، ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

"جہنم میں۔" ایک نے غرا کر جواب دیا "کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آواز نہیں نکلنی چاہیے۔"

اس کے بعد کچھ پوچھنے کی گنجائش کہاں رہ گئی۔ بہرحال آدھا گھنٹے بعد وین رک گئی۔ ہمیں وین سے اتار لیا گیا اور ہماری آنکھوں سے رومال ہٹا لیے گئے۔

ہم کسی بڑے مکان کے احاطے میں کھڑے تھے۔ وین کو گیٹ کے اندر ہی لایا گیا تھا لہٰذا ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔

ہم سے کہا گیا کہ ہم مکان کے اندر داخل ہو جائیں۔ ہم مکان میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک بڑا اور خوبصورت مکان تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ وہ بھی ہمارے لیے اجنبی تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس آدمی نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو اور ہمیں اس طرح کیوں لائے ہو؟" یاسمین نے پوچھا۔

"پریشان مت ہو۔ ہمیں دو چار باتیں پوچھنی ہیں۔ اس کے بعد تمہیں جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"وقار کے قتل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" یاسمین نے بتایا۔ "کیونکہ اس آدمی کا قتل اس وقت ہوا جب میں.... چھوٹی تھی اس لیے کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم سے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہارے ابو نے تمہیں کیا بتایا ہے؟"

"آخر تم کون ہو اور تمہیں کیا دلچسپی ہے؟"

"مجھ سے سوال نہ کرو بلکہ سوال کا جواب دو۔ کیا بتایا ہے تمہارے ابو نے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ انہیں پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتی۔"

"یہ تو بتایا ہوگا کہ وہ اتنے دنوں تک کہاں رہے۔ کیا کرتے رہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ کن حالات میں وقار کا قتل ہوا تھا؟"

"نہیں... میں بتا رہی ہوں نا۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا۔" یاسمین نے کہا۔ "ان کا ماضی میری نگاہوں سے چھپا ہوا ہے۔"

"ہوں۔" وہ آدمی گہری ہنکارا لے کر رہ گیا۔

"دیکھو۔ اب تو میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ اب مجھے جانے دو۔"

"ابھی نہیں جب تک یہ معاملہ صاف نہ ہو جائے تمہیں





یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم نے بہت دنوں تک منصور صاحب کی خدمت کی ہے۔ تمہیں تو بہت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا؟"

"نہیں بھائی، مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کوئی کہانی بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ کسی کا قتل ہوا تھا۔ الزام ان پر آ رہا تھا اور وہ پولیس کے خوف سے فرار ہو گئے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا ضروری ہے کہ میں تمہاری بات کا یقین کر ہی لوں؟"

"مت کرو یقین۔" میں جھلا کر بولا۔ "جو کچھ میں جانتا تھا وہ تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"خیر، دو چار دن بعد خود ہی سچ بولنے لگو گے۔" اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ "ان دونوں کو کونے والے کمرے میں لے جا کر بند کر دو۔"

اس کے حکم کے مطابق ہم دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ ایک خوبصورت کمرا تھا۔ اس میں دو آرام دہ مسہریاں اور دو کرسیاں تھیں۔ ملحقہ واش روم تھا۔ غرض یہ کہ وہ کمرا وی آئی پی قسم کا قید خانہ تھا اور میں یاسمین کے ساتھ اس قید خانے کا قیدی بن گیا تھا جبکہ مجھے صورتِ حال کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے، یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔

"آخر ہم کیوں مصیبت میں پھنس گئے ہیں؟" یاسمین نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ان لوگوں سے ہمارا کیا تعلق ہے جب ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو ہم انہیں کیا بتائیں۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اور تمہارے ساجد انکل بھی تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"ابو بھی پریشان ہو جائیں گے جب ساجد انکل انہیں جا کر بتائیں گے کہ ہم ان سے ملنے کے لیے گھر سے نکلے تھے لیکن نہ جانے کہاں چلے گئے۔"

میں کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس سے مکان کا پچھلا حصہ دیکھا جا سکتا تھا جہاں ایک اونچی دیوار تھی۔

"کیا تم ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتیں؟" میں نے یاسمین سے پوچھا۔

"نہیں، میں انہیں بالکل بھی نہیں جانتی۔"

"یہ لوگ کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو شاید تمہارے ابو نے تمہیں بتائی ہے۔"

"لیکن ابو نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں نا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ معاملہ بہت پُراسرار سا لگ رہا ہے۔ ایک قتل... تمہارے ابو کا فرار۔ اب ہم دونوں کو نامعلوم لوگ اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔ آخر کیوں...؟ ایسا کون سا راز ہے جو تمہارے ابو جانتے ہیں اور اغوا کرنے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ راز ہمیں بھی معلوم ہو چکا ہے۔"

"ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

"ان کم بختوں نے راستے میں ہم سے موبائل بھی چھین لیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ کم از کم اطلاع دینے کی کوشش تو کرتے۔"

یاسمین نے کچھ نہیں کہا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔ بس مایوسی اور بیزاری مسلط ہوتی جا رہی تھی۔

کم از کم میں تو بہت بیزار ہو رہا تھا۔ آخر ان معاملات سے میرا کیا واسطہ تھا، کچھ بھی نہیں۔ میں صرف ہمدردی میں مارا گیا تھا لیکن نہیں... شاید ان معاملات سے میرا ایک واسطہ نکل ہی آیا تھا اور وہ تھا یاسمین کا حوالہ۔ اس خوبصورت لڑکی کا حوصلہ میری وجہ سے ہی بندھا ہوا تھا۔ اگر میں نہیں ہوتا تو خدا جانے ان حالات میں اس پر کیا گزرتی۔

یاسمین کی خاموش نگاہیں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان میں گرم جوشی بھی تھی اور اپنائیت بھی۔ وہ نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں کہ میں اس کا ساتھ دیتا رہوں۔ وہ مجھ پر بھروسا کرنے لگی ہے کیونکہ وہ بے سہارا لڑکی ہے۔ اس کی ماں کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ باپ ایک قتل کے الزام میں فرار ہو گیا۔ اس کی پرورش باپ کے ایک دوست نے کی تھی یعنی اس کے پاس سوائے تلخ یادوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اب کئی برس بعد اس نے اپنے باپ کی صورت بھی دیکھی تو اس طرح کہ وہ پولیس کے قبضے میں چلا گیا۔ پتا نہیں کچھ لوگوں کی زندگی میں اتنے الٹ پھیر کیوں ہوتے ہیں؟

صورتِ حال تو بہت تشویش ناک تھی لیکن اتنے دنوں کے بعد پہلی بار یاسمین سے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ یہ قربت شاید غیر یقینی صورتِ حال کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔

وہ میرے بازوؤں میں سمٹ کر کسی بچی کی طرح، دل

رہی اور میں اسے دلاسا دیتا رہا پھر دروازے پر ہونے والی دستک نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ وہ جلدی سے میرے بازوؤں سے الگ ہوگئی۔

آنے والا انہی میں سے ایک تھا۔ وہ یاسمین کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔

”نہیں، یہ اکیلی نہیں جائے گی۔“ میں یاسمین کے سامنے آگیا۔ ”اس کے ساتھ میں بھی جاؤں گا۔“

”گھبراؤ نہیں۔ اس کے بعد تمہاری باری ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہم اس سے کچھ پوچھ کر اسے واپس بھیج دیں گے۔“

”جو کچھ پوچھنا ہے یہیں پوچھ لو۔“

اس آدمی نے اچانک اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ اس وقت یاسمین زور سے چیخ اٹھی۔ ”نہیں میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔ پلیز انہیں کچھ مت کہو۔“

”اوہ یہ بات ہے۔“ وہ آدمی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔ چھوڑ دیا اس کو۔ تم آؤ۔“ یاسمین اس آدمی کے ساتھ چلی گئی۔ باہر سے دروازہ پھر بند ہوگیا۔

میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آرہے تھے جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ مجھ سے باہر تھا۔ یاسمین کی واپسی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہوئی۔

وہ بہت نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے آتے ہی بستر پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ میں تڑپ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”کیا ہوا یاسمین بتاؤ۔ کیا ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے؟“

”نہیں کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ وہ مجھ سے یہی پوچھتے رہے کہ ابو نے ہمیں کیا بتایا ہے۔“

”پھر تم رو کیوں رہی ہو؟“

”اس لیے کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ میرے لیے برداشت کے قابل نہیں ہے۔“

”ایسا کیا دیکھ لیا تم نے؟“

”جس کمرے میں مجھے لے جایا گیا وہاں دیوار پر ایک بڑے فریم میں ایک خوبصورت تصویر لگی ہوئی ہے اور وہ تصویر میرے ابو کی ہے۔“ اس نے بتایا۔

☆☆☆

یہ ایک اور موڑ تھا۔ انتہائی سنسنی خیز۔ حیرت انگیز۔ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ بارش سے، اندھیرے سے، ایک بیمار بوڑھے سے جس کو میں نے پناہ دی تھی۔

پھر پولیس آفیسر اور نہ جانے کیا کیا اور اب ہمیں اغوا کر کے ایک ایسے مکان میں لایا گیا جہاں خود یاسمین کے ابو کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

کیسی پیچیدگی تھی۔ اغوا کرنے والے آخر کیا چاہتے تھے۔ وہ کیا معلوم کرنا چاہتے تھے کم از کم میں تو کوئی بات نہیں جانتا تھا۔ میں تو خوامخواہ اس کہانی کا ایک کردار بنتا جا رہا تھا جبکہ میرا اس پوری کہانی سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

ویسے منصور صاحب کی شخصیت بھی کچھ کم پُراسرار نہیں تھی۔ خیر اب تو وہ پولیس کی گرفت میں تھے اور پولیس سچائی معلوم کر ہی لیتی ہے۔

مجھے یاسمین پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس بے چاری کے ساتھ پے در پے کیسے حادثے ہو رہے تھے۔ ایک مسئلہ سلجھ نہیں پاتا کہ دوسرا سامنے آجاتا۔

ایک تو ہمارا اغوا ہی تشویش ناک تھا پھر مکان میں منصور صاحب کی تصویر کا ہونا یہ اور بھی الجھا ہوا معاملہ تھا۔

”دیکھو یاسمین، اس طرح بدحواس ہونے سے کام نہیں چلے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سارے معاملات بہت الجھے ہوئے ہیں۔ ہمیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔“

دروازہ کھلا اور اسی آدمی کی صورت دکھائی دی۔ ”اب تم چلو میرے ساتھ۔“ اس نے مجھ سے کہا۔

”دیکھو بھائی، تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے یہیں پوچھ لو۔“

”بکواس مت کرو، چلو ہمارے ساتھ۔“

میں نے یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کر دیا کہ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں۔ وہ آدمی مجھے لے کر اسی کمرے میں آگیا جہاں یاسمین کو لایا گیا تھا۔ اس کمرے میں واقعی منصور صاحب کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔

وہاں ایک سخت چہرے والا آدمی بھی موجود تھا۔ اس نے مجھ سے وہی سوال کیا۔ ”یہ بتاؤ کہ منصور صاحب نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

”تم یہ بتاؤ کہ یہاں منصور صاحب کی تصویر کیوں لگی ہوئی ہے؟“ میں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ۔“ وہ مسکرایا۔ ”اس لیے کہ یہ مکان منصور صاحب کا ہے۔“ اس نے بتایا۔

اب شاید میں پاگل ہونے ہی والا تھا۔ نہ جانے کیسی کیسی باتیں سامنے آرہی تھیں۔

”جو میں پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔“

”میرا خیال ہے کہ تم جو کچھ پوچھ رہے ہو اس کا جواب





میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ منصور صاحب نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے۔“

”تو اتنے دنوں تک وہ تمہارے گھر میں کیا کرتے رہے؟“

”ارے بھئی میں بتا چکا ہوں کہ میں نے انہیں پناہ دی تھی۔ نیکی کی تھی ان کے ساتھ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ نیکی میرے گلے پڑ جائے گی۔“

وہ آدمی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے اپنے آدمی کو حکم دیا کہ مجھے دوبارہ کمرے میں لے جا کر بند کر دیا جائے۔ یاسمین بستر پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آگئی۔

”کیا ہوا، کیا پوچھ رہے تھے؟“

”وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ منصور صاحب نے ہمیں کیا بتایا ہے۔“

”ان لوگوں کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔“ یاسمین بڑبڑا کر رہ گئی۔

میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ مکان منصور صاحب کا ہی ہے۔ میں دو باتیں سوچ رہا تھا ایک تو اس مکان سے نکلنے کا کوئی طریقہ اور دوسری بات یہ کہ ان لوگوں نے اتنی جلدی ہم پر رسائی کیسے حاصل کر لی۔ ہم تو ساجد صاحب کے گھر سے منصور صاحب سے ملنے کے لیے نکلے تھے اور راستے ہی میں ہمیں اغوا کر لیا گیا۔ آخر کیوں، وہ کون سی بات تھی جو یہ لوگ معلوم کرنا چاہتے تھے۔

”یاسمین، یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”وہ کیسے؟“

”تم کسی کو آواز دو۔ میں دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو جاتا ہوں اور جیسے ہی کوئی اندر آئے گا میں اس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔“

”یہ خطرے والی بات تو نہیں ہوگی؟“

”خطرہ تو ہے لیکن یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ناکام ہوگئے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اور سختی ہو جائے گی۔ ویسے میں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ اس مکان میں اس وقت ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ چلو ہمت کرو شاباش۔“

”ٹھیک ہے۔“ یاسمین آمادہ ہوگئی۔ ”میں آواز دیتی ہوں۔“

## بوجھ بجھکّڑ

”ان کی شاعری تو اچھی بھلی ہے، پھر انہیں دیوانہ کیوں کہا جاتا ہے؟“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”ارے وہی، اپنے مرزا اسداللہ خان غالب!“ پہلا دانشور بولا۔

”کون ان کو دیوانہ کہتا ہے؟“ دوسرے نے غصے سے پوچھا۔

”میں جس محفل، مذاکرے یا کانفرنس میں جاتا ہوں، وہاں بار بار دیوانے غالب کا ذکر سننے میں آتا ہے، اگر وہ دیوانے بھی تھے تو ان لوگوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ غالب کی وفات کے صدیوں بعد بھی ان کی عیب جوئی میں لگے رہیں۔“

”قارون کنجا تھا، ہر جگہ گنجے قارون کا تذکرہ ملے گا۔ تم اسی طرح دیوانے غالب سنتے اور سمجھتے ہو مگر یہ ان کی لکھی ہوئی ”کتاب“ دیوانِ غالب کا ذکر ہوتا ہے۔“ دوسرے نے بھویں چڑھا کر نہایت دانش ورانہ انداز میں اپنے ساتھی کو سمجھایا۔

دوسرا یہ سنتے ہی زور سے ہنس دیا اور اپنے ساتھی کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”چلو، حساب برابر ہوگیا۔ کہیں میں کورا کہیں تم... قارون گنجا نہیں تھا۔ گنج قارون اس کے خزانے کو کہتے ہیں۔“

(منڈی بہاؤالدین سے سعدیہ رحمان کی نگارشات)

میں نے کمرے میں موجود میز پر رکھی ہوئی وزنی ایش ٹرے اٹھائی۔ اس وقت میرے پاس بس یہی ہتھیار تھا۔ میں دروازے کے ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا [illegible]۔ یاسمین نے زور زور سے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔

ردِعمل وہی ہوا جو ہم نے سوچا تھا۔ دروازہ کھلا [illegible] ایک آدمی اندر آگیا جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا [illegible] نے اس کے سر پر ایش ٹرے دے ماری۔ وہ ایک کراہ [illegible] ساتھ ڈھیر ہوگیا۔

اس کا سر پھٹ چکا تھا اور سرخ خون نے اس [illegible] چہرے کو رنگین کر دیا تھا۔ یاسمین سکتے کے عالم میں [illegible] گئی۔

”جلدی کرو۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام [illegible] کوئی اور بھی آسکتا ہے۔ ویسے اس وقت [illegible] ہے۔“

"تمہیں کیسے معلوم؟"
"سامنے کی بات ہے۔ اس کی چیخ سن کر ابھی تک کوئی نہیں آیا ہے۔"

ہم دونوں محتاط انداز میں کمرے سے باہر نکلے۔ میرا اندازہ شاید درست ہی تھا۔ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ اب رات ہو چکی تھی یعنی ہم بہت دیر سے اس مکان میں قید تھے۔

ہم بڑی آسانی سے اس مکان سے باہر نکل آئے۔ کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ باہر آ کر اندازہ ہو گیا کہ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ اور یہاں سے ساجد کا مکان زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ پہلے ہمیں پولیس کو رپورٹ دینی چاہیے لیکن یاسمین کا خیال تھا کہ پہلے ہم ساجد کے پاس چلیں۔

یاسمین کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ ہم نے ایک ٹیکسی رکوائی اور ساجد کے گھر پہنچ گئے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی جس چیز نے ہمیں چونکایا وہ یاسمین کی وہ کار تھی جس پر ہم اس گھر سے روانہ ہوئے تھے اور اغوا کرنے والوں نے ہمیں اسی کار سے اتار کر وین میں بٹھایا تھا۔

ساجد صاحب گھر میں ہی موجود تھے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی وہ حیران رہ گئے۔ "خدا کی پناہ کہاں چلے گئے تھے تم دونوں، ہم پورے شہر میں تمہیں تلاش کرتے رہے۔ تمہاری گاڑی ایک جگہ کھڑی ہوئی مل گئی تھی لیکن تم دونوں کا کوئی پتا نہیں تھا۔"

"انکل، ہمیں اغوا کر لیا گیا تھا۔" یاسمین نے بتایا۔ "ہم بڑی مشکلوں سے وہاں سے فرار ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "کس کم بخت نے اغوا کیا تھا؟"

"یہ نہیں معلوم لیکن ہمیں جس مکان میں رکھا گیا تھا۔ وہاں میں نے ابو کی تصویر دیکھی ہے۔"

"اور وہ شرف آباد کا ایک مکان ہے جناب۔" میں نے بتایا۔ "میں نے وہاں ایک آدمی کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ شاید ابھی تک وہیں پڑا ہوگا۔"

"لیکن کیوں... تمہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟"

"وہ پوچھ رہے تھے کہ منصور صاحب نے ہمیں کوئی خاص بات تو نہیں بتائی۔" میں نے کہا۔ "جبکہ انہوں نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ اس کے باوجود انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔"

"کمال ہے آخر وہ کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے؟"

"یہی تو نہیں معلوم۔" یاسمین نے کہا۔ "مجھے تو ابھی تک حیرت ہے کہ اچانک یہ سب کیا شروع ہو گیا ہے۔"

"اس پر ہم بعد میں سوچیں گے۔ مجھے اب اس مکان کی فکر ہو گئی ہے۔ وہاں کیا ہے؟"

"ساجد صاحب مجھے وہ مکان اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے بتایا۔

"تو ہم پہلے اسی مکان میں چلتے ہیں۔" ساجد نے کہا۔ "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کیس کے ڈانڈے کہاں مل رہے ہیں۔" ہم سب ایک ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد ہم اسی مکان کے سامنے تھے جہاں ہمیں لے جایا گیا تھا۔

ساجد نے اس مکان کو دیکھ کر پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ کچھ بتائیں گے لیکن وہ خاموش رہے۔

گیٹ کھلا ہوا تھا ہم کھلے ہوئے گیٹ سے اندر آ گئے۔ یہ ایک بڑا مکان تھا اور ہمیں اب اس مکان کا جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔

کئی کمرے میں تھے۔ ہم اس کمرے میں گئے۔ جہاں میں نے ایک آدمی کو ایش ٹرے مار کر بے ہوش کیا تھا لیکن اس کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ شخص ہوش میں آ کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل گیا ہو۔ ہم پھر اس کمرے میں آئے جہاں میں نے اور یاسمین نے منصور صاحب کی تصویر دیکھی تھی۔ ساجد اس تصویر کو دیکھ کر کچھ بے قرار ہو گئے۔

"یاد آ رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "منصور نے یہ تصویر میرے سامنے اتروائی تھی۔"

"اس تصویر کا یہاں ہونا میری سمجھ میں نہیں آ رہا انکل۔" یاسمین نے کہا۔

"ہاں خود میں بھی حیران ہوں۔" ساجد صاحب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔ پھر جیسے انہیں کوئی چیز نظر آ گئی۔ وہ تیزی سے ایک کونے کی طرف بڑھے۔ جہاں ایک چھوٹی سی میز تھی اور اس میز پر ایک موبائل رکھا ہوا تھا۔

"یہ موبائل۔" انہوں نے موبائل اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کس کا ہو سکتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ یہ کس کا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ موبائل میں اس کرخت چہرے والے کے ہاتھ میں دیکھ چکا ہوں جو مجھ سے سوالات کر رہا تھا۔"





"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنا موبائل یہاں بھول گیا ہے۔" یاسمین نے تبصرہ کیا۔

"ہاں... اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" ساجد نے کہا۔ "لیکن اس موبائل کی وجہ سے ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ میرے بھی کچھ تعلقات ہیں۔ میں سم کے ذریعے موبائل کے مالک کا پتا چلا سکتا ہوں۔"

"انکل کیوں نہ یہ کام پولیس پر چھوڑ دیا جائے۔" یاسمین، ساجد سے بولی۔

"نہیں بیٹا، پولیس سے نہیں۔ ہم اپنے طور پر تفتیش کر کے پولیس کو بتائیں گے۔" ساجد نے کہا۔

"تو پھر چلیں اس گھر سے نکلیں۔" ہم اس گھر سے باہر آ گئے۔ ابھی تک اس گھر میں کوئی نہیں آیا تھا۔ ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ نہ جانے اس گھر کے مکین کہاں تھے۔

ساجد صاحب ہمیں اپنے ساتھ پی ٹی سی ایل کے دفتر میں لے آئے یہاں ان کی جان پہچان کے لوگ تھے۔ ذرا سی دیر میں موبائل کے مالک کا پتا چل گیا۔

اکرم خان، ہاؤس نمبر ایف نو۔ ایف بی اے، یا۔

ہم معلومات فراہم کرنے والے کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"ظاہر ہے ہم نے جو کام شروع کیا ہے اس کو ادھورا تو نہیں چھوڑ سکتے۔" ساجد نے کہا۔ "ہمیں اس سم کے مالک کا پتا مل گیا ہے اب ہم سیدھے اسی کے پاس جا رہے ہیں۔"

تھوڑی کوشش کے بعد وہ پتا مل گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس علاقے میں اسی قسم کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ دروازے کی گھنٹی کے جواب میں جس آدمی نے دروازہ کھولا وہ ایک ادھیڑ عمر شریف انسان لگ رہا تھا۔

"جی فرمائیں؟" اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ساجد نے اپنی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے اسے دکھایا۔ "کیا آپ اس موبائل کو پہچانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ تو کل ہی چھینا گیا ہے۔ یہ آپ کو کہاں سے ملا؟"

"کیا آپ نے اس کی رپورٹ کروائی ہے؟"

"جی جناب، باقاعدہ رپورٹ ہوئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "پھر سم بھی بلاک ہوئی ہے لیکن آپ لوگ کون ہیں اور آپ کو میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ موبائل ہمیں ایک جگہ ملا تھا۔" ساجد نے کہا۔

"اس کی سم کے ذریعے ہم نے آپ کا پتا معلوم کیا ہے؟"

"کہیں یہ کسی غیر قانونی کام میں تو استعمال نہیں ہوا؟"

"نہیں ابھی تک تو نہیں ہوا۔ یہ لیں اپنا موبائل سنبھالیں۔" ساجد نے موبائل اس کے حوالے کر دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دونوں باقاعدہ کرمنل تھے۔" میں نے راستے میں تبصرہ کیا۔

"ظاہر ہے لیکن ان دونوں کا تمہیں اغوا کرنا یا منصور کے بارے میں سوال پوچھنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت ساجد کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے فون سننے کے بعد یاسمین کی طرف دیکھا۔ "یاسمین بیٹا تمہارے لیے ایک اور بری خبر ہے ذرا ہمت سے سننا۔"

"جی انکل بتائیں۔ اب کیا ہوا؟"

"تمہارے ابو پولیس کی تحویل [illegible]" ساجد نے [illegible]

[illegible]

اور پریشان کرنے والی [illegible]

یاسمین تو یہ سن کر پاگل ہو گئی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ابو کیوں بھاگ گئے، انہوں نے ایسا کیوں کیا، کیا انہوں نے وہ قتل کیا تھا، وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں، آخر ابو کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ ان کو تو راجا ندیم جیسا آدمی اپنے ساتھ لے گیا تھا پھر وہ اس کے پاس سے کیسے بھاگ گئے۔ کہاں چلے گئے؟"

اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات جو وہ جنونی کیفیت میں کرتی چلی گئی اور شاید ہم میں سے کسی کے پاس بھی ان سوالات کے جواب نہیں تھے۔ دوبارہ اس طرح فرار ہو کر منصور صاحب نے اپنے آپ کو مجرم ثابت کر دیا تھا۔

ساجد نے منصور صاحب کے فرار کی تفصیل کچھ یوں بتائی تھی۔ راجا ندیم ان کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہا تھا کہ راستے میں منصور صاحب ایک سگنل پر گاڑی سے اتر کر بھاگ لیے اور اب پورے شہر کی پولیس انہیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا انکل کہ میرے ابو واقعی قاتل ہیں؟"

"اس بے وقوف شخص نے اپنے اس عمل سے ایسا

ثابت کر دیا ہے۔" یاسمین نے پھر رونا شروع کر دیا۔ اس بے چاری کے ساتھ دھوپ چھاؤں جیسا کچھ ہو رہا تھا کبھی امید، کبھی مایوسی۔

"اب منصور صاحب کے لیے کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔ میرا خیال ہے کہ اب اس کی تلاش فضول ہی ہے۔ وہ یہاں سے واقعی چلا گیا ہے۔ فرار کا مطلب یہی ہے کہ اسے واپس نہیں آنا لیکن کم از کم دوسرا معاملہ تو سلجھ جائے۔ تم لوگوں کے اغوا کا مسئلہ دیکھا تو جائے کہ وہ کون لوگ ہیں؟"

"اب تو ابو کی کہانی ہی ختم ہو چکی ہے۔" یاسمین نے کہا۔ روتے روتے اس کی خوبصورت آنکھوں پر ورم آ گیا تھا۔ ساجد اس کمرے سے چلے گئے۔ یاسمین میرے سامنے بیٹھی رہ گئی۔ وہ اب ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس بدنصیب لڑکی کے لیے کیا کروں، پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "یاسمین ہمیں راجا ندیم سے ملنا چاہیے۔"

"کیا کریں گے اس سے مل کر؟"

"کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ منصور صاحب کس سگنل پر گاڑی سے اتر کر بھاگے تھے اور اس سے بڑی بات یہ کہ جب ان کے معاملات ٹھیک ہونے والے تھے تو پھر وہ کیوں فرار ہوئے۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔" یاسمین بے بسی سے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں نئے سرے سے حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آؤ، راجا ندیم کے پاس چلتے ہیں۔ ہم وہیں سے اپنی تفتیش کا آغاز کریں گے۔"

☆☆☆

راجا ندیم بہت غصے میں تھا۔

"خدا جانے کیا ہوا تھا اس شخص کو۔ ایک سگنل پر گاڑی رکی اور وہ اتر کر بھاگ گیا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے راجا صاحب؟"

"اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود منصور ہی اس آدمی کا قاتل ہے۔" راجا نے بے رحمی سے کہا۔ "ورنہ اسے اس طرح فرار ہونے کی کیا ضرورت نہیں تھی۔"

میں نے پھر اسے یہ بتایا کہ کس طرح ہمیں اغوا کیا گیا اور ہم نے اس مکان میں منصور صاحب کی تصویر دیکھی۔ یہ سن کر وہ حیران رہ گیا۔

"ارے یہ تو واقعی حیرت کی بات ہے۔ بہرحال اب تم دونوں یہ معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں دیکھ لیتا ہوں اور ہاں اس دوران میں اگر منصور تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے تو مجھے ضرور بتا دینا۔ میں اس کا ہمدرد ہوں۔ اس کو اس بحران سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔" ہم اس کے دفتر سے باہر آ گئے۔

یاسمین بہت بددل ہو رہی تھی۔ "کچھ بھی پتا نہیں چلا۔" اس نے کہا۔

"اب ہم پاکستان کے سب سے بڑے اخبار کے کرائم رپورٹر کے پاس جا رہے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔ "اس کا نام فیاض ہے اور اتفاق سے وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"نہ جانے کیوں مجھے کچھ کھٹکا سا ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ان معاملات میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ہے جو غیر فطری ہے۔ فیاض کے تعلقات کئی پولیس والوں سے ہیں وہ شخص ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔"

فیاض سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ پتا چلا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ ہم بہت مایوس ہو کر اس کے دفتر سے باہر آئے تھے۔

"اب تو میں بالکل اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔" یاسمین نے کہا۔ "میرا سر چکرا رہا ہے۔"

"اگر تم مناسب سمجھو تو میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ کافی پی کر چلی جانا پھر ہمیں آیندہ کے لیے بہت کچھ سوچنا بھی ہے۔" لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں وہ کرخت چہرے والا دکھائی دے گیا۔ وہی آدمی جس نے منصور صاحب کے حوالے سے سوالات کیے تھے۔ وہ کسی میڈیکل اسٹور سے باہر نکل رہا تھا۔

یاسمین نے بھی پہلی نظر میں اس آدمی کو پہچان لیا۔ "ریحان۔" وہ پُرجوش ہو کر بولی۔ "یہ تو وہی آدمی ہے اور اس وقت پیدل جا رہا ہے۔"

"تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"ہمیں اگر سارے بھید کا پتا لگانا ہے تو اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "ورنہ ہم اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے۔"

"تو چلو۔ میں گاڑی ایک طرف کھڑی کر دیتا ہوں۔"

"لیکن اس نے ہمیں پہچان لیا تو؟"



"پہچان تو لے گا لیکن ہمیں یہ رسک لینا ہوگا اور اس وقت ہم پولیس کو بھی نہیں بتا سکتے کیونکہ پولیس کے آنے تک یہ نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"تو چلو۔ خدا کا نام لے کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔"

وہ آدمی پیدل ہی ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کے اطمینان سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کسی طرف سے کوئی خدشہ نہیں تھا اسی لیے وہ آرام سے ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔

ہم نے مناسب فاصلہ رکھ کے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد وہ آدمی ریستوران میں داخل ہو گیا۔ میں اور یاسمین ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"اب بتاؤ کیا کیا جائے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"یوں اس کے سامنے جانا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ جرائم پیشہ شخص ہے اور ہم خالی ہاتھ ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ساجد انکل کو بلا لیتے ہیں۔" یاسمین نے تجویز پیش کی۔

"نہیں، میں ابھی ان کو اس معاملے میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "چلو اللہ کا نام لے کر خود ہی چلتے ہیں۔ یہ کوئی ویران مقام تو ہے نہیں بھرا ہوا ریستوران ہے۔ وہ یہاں کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر چلتے ہیں۔" ہم دونوں ریستوران میں داخل ہو گئے۔ وہ کرخت چہرے والا سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہم بڑی بے پروائی سے اس کے سامنے پہنچ گئے۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"کیا ہم تمہارے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں...؟"

"تم سے کچھ حساب چکانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور بے فکر رہو ہم اکیلے نہیں ہیں۔ پولیس کی گاڑی ہمارے ساتھ ہے۔ پولیس بہت دور سے تمہارا پیچھا کرتی ہوئی آ رہی ہے۔"

"کیا چاہتے ہو تم دونوں؟" اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

اس کے چہرے کی ساری کرختگی ختم ہو چکی تھی۔ ہم دونوں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"دیکھو دوست، تم سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم صرف یہ بتا دو کہ تم نے کس کے کہنے پر یہ حرکت کی تھی؟"

"یہ بتاؤ، کیا ہم نے تمہیں کوئی تکلیف دی؟" اس نے پوچھا۔ "لیکن تم ہمارے آدمی کو زخمی کر کے بھاگ گئے۔"

"تو اور کیا کرتے۔ تم نے ہمیں اغوا کیوں کیا تھا؟" یاسمین نے پوچھا۔

"ہمیں حکم ملا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم دونوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔"

"کس نے دیا تھا یہ حکم؟"

"یہ نہیں بتا سکتا یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔" اس نے کہا۔ "ویسے ہمیں اس کام کے لیے پچیس ہزار دیے گئے تھے۔"

"اور وہ مکان... وہ کس کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم یہ بھی نہیں جانتے۔" اس نے بتایا۔ "بس اس مکان کا پتا بتایا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ مکان خالی ہے۔ ہم تم دونوں کو وہاں لے آئے اور وہ مکان ہمیں خالی ملا تھا اور یہ

## سرداریاں

"سردار جی! معاف کرنا، مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔" ڈاکٹر نے آپریشن کے چوتھے دن مریض کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ڈسٹر تمہارے پیٹ میں بھول گیا تھا، اسے نکالنے کے لیے اب دوبارہ تمہارا آپریشن کرنا پڑے گا۔"

سردار جی نے برا سامنہ بنا کر اپنی جیب سے بیس روپے نکالے اور میز پر تقریباً پھینکتے ہوئے غرائے۔ "یہ پکڑو اور بازار سے اپنے لیے دوسرا ڈسٹر لے لو... دو ٹکے کی چیز کے لیے میری چیر پھاڑ کی کیا ضرورت ہے!"

شائستہ شاہ، سرگودھا

☆☆☆

"تاج محل کس نے بنایا؟" سکھ بچوں کے اسکول میں استاد نے جماعت سے سوال کیا۔

"مزدوروں نے!" پوری جماعت نے بیک آواز جواب دیا۔

استاد نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ارے پگلو... میرا مطلب ہے کہ کس نے بنوایا؟"

"ٹھیکے دار نے!" اس بار بھی سب بچے ہم زبان تھے۔

میمونہ عزیز، کراچی

بھی کہا گیا تھا کہ تم سے پوچھتے رہیں کہ منصور صاحب نے تمہیں کیا بتایا ہے؟"

"کیا یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ کھیل کس نے رچایا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو اب تو یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"اب کیوں کرید رہے ہو؟"

"تاکہ پتا تو چلے کہ ہمارا ایسا کون ہمدرد ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"دیکھو میں یہ نہیں جانتا کہ اس آدمی سے تمہارا کیا تعلق ہے اور وہ کیوں تمہارے پیچھے پڑ گیا تھا لیکن تم دونوں مجھے اچھے لگے ہو، اس لیے اس کا نام بتا رہا ہوں۔"

"اب بتا بھی دو کون ہے وہ؟"

"ساجد... ساجد نام ہے ان کا۔" اس نے بتا دیا۔

☆☆☆

اب ایک اور شاک ایک اور حیرت انگیز انکشاف... ساجد کا نام سن کر یاسمین تو دنگ رہ گئی۔ ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ اس آدمی کو ہم نے وہیں چھوڑ دیا۔

اب اس سے کیا لینا تھا ہمیں۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ معلوم کر چکے تھے۔ یہ سارا کھیل ساجد کا تھا لیکن کیوں...؟

"ریحان اب بتاؤ، اب کیا کرنا ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"کم از کم ایک بار تمہارے ساجد انکل سے تو پوچھ لیا جائے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ بتا دیں گے؟"

"بتائیں گے تو نہیں لیکن کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ کوئی بات ضرور سامنے آئے گی۔"

"تو پھر چلو۔" پھر ہم ساجد کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

"تم دونوں کس مہم پر چلے گئے تھے؟" ساجد نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"ساجد صاحب ہم یہ بھی بتا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ہم دونوں کو اغوا کیوں کرایا تھا؟"

"میں نے...!" ساجد نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔ "کیسی بات کر رہے ہو میں کیوں اغوا کروانے لگا؟"

"ہمیں سب معلوم ہو گیا ہے ساجد انکل۔" یاسمین نے کہا۔ اس کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ "آپ ہی نے ہمیں اغوا کروا کے اس مکان میں پہنچایا تھا۔"

"یہ غلط ہے بیٹا۔" ساجد نے کہا۔ "میں ایسا کیوں کرنے لگا۔ اوہ... ایسا لگتا ہے کسی نے میرے خلاف کوئی سازش کی ہے۔ میرے اردگرد جال بنا جا رہا ہے اور تم دونوں کو اس لیے اس میں شریک کیا گیا ہے کہ تم دونوں میرے خلاف ہو جاؤ۔"

"لیکن کیوں... ساجد صاحب کوئی ایسا کیوں کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"منصور۔"

"انکل یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابو ایسا کیوں کرنے لگے؟"

"اس سوال کا جواب بھی وہی دے سکتے ہیں۔" ساجد نے کہا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ منصور تمہارے ہی گھر میں ہے؟" ساجد نے یہ بات مجھ سے پوچھی تھی۔

"پولیس سے فرار ہونے کے بعد ان کا ملنا اور بھی مشکل ہو گیا ہے نہ جانے وہ کہاں ہوں گے؟"

"بیٹا تلاش کرو منصور کو۔" ساجد نے کہا۔ "جب تک منصور کا پتا نہ چلے۔ اس وقت تک یہ معاملہ حل نہیں ہو گا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں لیکن امید کم ہے۔"

"انکل...!" یاسمین نے ساجد کو مخاطب کیا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھی ریحان صاحب کے ساتھ جاؤں؟"

ساجد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اجازت دے دی۔ ہم گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ وہی گونگا ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ اشاروں میں یاسمین سے کچھ کہہ رہا تھا اور یاسمین اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔

پھر اس گونگے نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے آں اوں کرتے ہوئے کچھ کہا۔

"جانتے ہیں یہ آپ سے کیا کہہ رہا ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"نہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ سکا ہے۔"

"یہ آپ سے کہہ رہا ہے کہ آپ میرا خیال رکھیں۔" مجھے اس گونگے پر واقعی بہت افسوس ہونے لگا۔

"ریحان صاحب اب ابو کو کہاں تلاش کیا جائے؟" یاسمین نے راستے میں پوچھا۔

"منصور صاحب نے پولیس کی تحویل سے فرار ہو کر حماقت کی ہے۔" میں نے کہا لیکن جب ہم گھر پہنچے تو منصور صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔

☆☆☆

یاسمین، منصور صاحب کو دیکھ کر چپ نہ رہ سکی۔ "خدا کے لیے ابو۔ آپ نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔"

"دیکھو بیٹا، اب جو بات میرے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ میں شروع سے اندھیرے میں تھا۔" منصور صاحب نے کہا۔ "وقار کا قاتل میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا اور میں الٹا خود کو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا رہا۔"

"کون ہے اس کا قاتل؟"

"ساجد۔" منصور صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"کیا... ساجد انکل؟" یاسمین کو شاک سا لگا۔ "یہ نہیں ہوسکتا۔"

"ہاں بیٹا یہی بات ہے۔ وقار جس طرح میرا پارٹنر تھا اسی طرح ساجد کا بھی تھا۔ اب تمام واقعات کی کڑیاں ملائی جائیں تو سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ اکاؤنٹ کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ مجھے یہ پتا چلا کہ اس میں کروڑوں کا فراڈ کیا گیا ہے۔ میں نے وقار سے بات کی۔ ہم دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی پھر جب میں نے ساجد کو بتایا تو اس نے مجھے خاموش رہ جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے یہ کہا کہ وہ خود خاموشی کے ساتھ ان معاملات کی چھان بین کرے گا اور اس رات اس نے وقار کا قتل کردیا پھر اس نے مجھے اتنا خوفزدہ کیا کہ میں فرار ہوگیا۔ اس طرح اس نے ایک تیر سے دو شکار کرلیے۔ ایک تو وقار کو راستے سے ہٹا دیا پھر مجھے فرار کروادیا اور اس طرح پورا بزنس اس کے پاس چلا گیا۔"

"اور وہ راجا ندیم۔" میں نے پوچھا۔ "اس کا کیا کردار ہے؟"

"اس کا کردار تو اب سامنے آیا ہے۔" منصور صاحب نے بتایا۔ "میں نے اس شخص پر اعتبار کرلیا تھا حالانکہ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ وہ ساجد کا پرانا دوست ہے۔ اس کے پاس سب معلومات تھیں۔ ان سب باتوں کا اندازہ مجھے آج ہوا ہے۔ جب اس نے مجھ سے فرار ہونے کے لیے کہا۔"

"کیا... آپ خود سے فرار نہیں ہوئے؟"

"نہیں مجھے تم لوگوں کے سامنے وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہوگیا تھا لیکن راستے میں اس نے مجھے پھر خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ کہا کہ مجھے پھانسی ہوجائے گی کیونکہ اس کے خیال میں اصل قاتل خود میں ہوں پھر اس نے کہا کہ اسے مجھ سے ہمدردی ہے۔ اس لیے فرار ہونے کا موقع دے رہا ہوں۔ سگنل پر اس نے مجھے فرار کروادیا۔ اس وقت میں نے جان لیا کہ سارا چکر کس کا چلایا ہوا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک بات مجھے بھی کھٹک رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ساجد کو ساری صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ہم راجا ندیم کے پاس جارہے ہیں۔ اس وقت سوائے ہم دونوں اور ساجد کے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ آپ واپس آچکے ہیں پھر راستے میں ہمیں اغوا کرلیا جاتا ہے اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب صاف ہے، اس نے فوری طور پر اپنے آدمیوں کو تمہارے پیچھے لگا دیا ہوگا۔"

"ابو... پھر ہمیں ایک ایسے مکان میں لے جایا گیا جہاں آپ کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔" یاسمین نے بتایا۔

"وہ مکان میرا ہی ہے۔ میں جس وقت فرار ہوا اس وقت وہ مکان کرائے پر تھا اور چونکہ تم بہت چھوٹی تھیں اسی لیے تمہیں نہیں معلوم۔ اس مکان پر بعد میں ساجد نے قبضہ کرلیا ہوگا کیونکہ اس کا علم صرف ساجد کو ہی تھا۔"

"میرے خدا... اب سمجھ میں آرہا ہے۔" یاسمین نے گہری سانس لی۔

"سوال یہ ہے کہ اب اس معاملے کو کیسے نمٹایا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"اس معاملے کو تو اب میں نمٹاؤں گا۔" یہ آواز ساجد کی تھی اور ہمیں اس کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا... وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ تین آدمی تھے اور وہ سب کے سب مسلح تھے۔

"ساجد۔" منصور صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت ہی بے وقوف آدمی ہو تم۔" ساجد نے کہا۔ "جب پولیس کے خوف سے فرار ہوگئے تھے تو پھر مفرور ہی رہتے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی ساجد... میں خود پر لگے ہوئے قتل کے الزام کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتا تھا جو تمہارے پاس پرورش پا رہی تھی۔" منصور صاحب نے کہا۔ "جس کو تم نے میری ہمدردی میں سینے سے لگا کر نہیں رکھا بلکہ اس لیے رکھا تھا کہ اپنے گونگے بیٹے کی شادی اس سے کردو۔ تمہیں یہ اندازہ تھا کہ یاسمین تمہارے گونگے بیٹے کو سنبھال لے گی۔"

"ابو...!" یاسمین نے تڑپ کر منصور صاحب کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹے، اس شخص کی محبت میں اپنے بیٹے کے لیے اس کی خودغرضی شامل تھی۔"

"بہرحال جو کچھ ہوا وہ پرانی بات ہے۔" ساجد نے کہا۔ "کہانی تو اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب تم راجا ندیم کی گاڑی سے نکل کر فرار ہوئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ تم اس وقت شہر سے باہر نہیں جاؤ گے کیونکہ تم پر اصل قاتل تک پہنچنے کا بھوت سوار ہوچکا ہے۔ یہ بھی اندازہ تھا کہ پورے شہر میں اگر تم کہیں پناہ لے سکتے ہو تو وہ یہی بے وقوف نوجوان ہے۔" اس نے میری طرف اشارہ کردیا۔

"اور تم بڑی ہوشیاری سے یہاں تک پہنچ گئے۔"

"ہاں۔" ساجد مسکرا دیا۔ "کیونکہ مجرم چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو اس سے حماقت ضرور سرزد ہوتی ہے۔"

"ساجد انکل...!"

"ہاں بیٹا، اصل مجرم تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا باپ۔" ساجد نے کہا۔

"جھوٹ ہے یہ، بکواس کررہے ہو تم۔"

"ثبوت میرے پاس ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"تمہاری وڈیوز۔"

"کیسی وڈیوز؟"

"مختلف پارٹیز کی، شادی کی، دوستوں کے درمیان، بزنس میٹنگز کی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم ایک ساتھ وڈیوز بنوایا کرتے تھے۔"

"تو اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟"

"اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم لیفٹ ہینڈر نہیں ہو ہر کام دائیں ہاتھ سے کرتے تھے۔"

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بہت افسوس ناک اور حیرت انگیز تھا۔ منصور صاحب کو پھر گرفتار کرلیا گیا۔

انہوں نے اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کرلیا۔ بزنس میں ہیرا پھیری خود انہوں نے کی تھی۔ اس کا اندازہ مقتول کو ہوگیا تھا اس نے منصور صاحب سے بازپرس کی تو انہوں نے طیش میں آکر اسے قتل کردیا اور خوفزدہ ہوکر فرار ہوگئے۔ جبکہ فرار ہونے کا مشورہ کسی نے نہیں دیا تھا۔ وہ دس بارہ سال تک روپوش رہے اس دوران میں انہوں نے ایک بہت زبردست کام یہ کیا کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی پریکٹس کرتے رہے اور جب اس میں ماہر ہوگئے تو وہ واپس آگئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح اپنے آپ کو صاف بچالیں گے لیکن انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ ان کی وڈیوز ساجد کے پاس محفوظ ہیں۔

میرا اور یاسمین کا اغوا انہوں نے ایک خاص مقصد سے کیا تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ ساجد کو مشتبہ ٹھہرایا جائے اس لیے ہمیں وہاں کوئی تکلیف نہیں دی گئی اور عام سے سوال پوچھتے رہے۔

ساجد کا کردار اس سلسلے میں بہت اچھا تھا۔ اس نے یاسمین کی پرورش کی۔ اسے بے پناہ محبت دی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے گونگے بیٹے کی شادی یاسمین سے ہوجائے اس کے سوا اسے اور کوئی غرض نہیں تھی لیکن جب حالات ایسے ہونے لگے کہ الزام خود اس پر آنے لگا تو وہ منصور صاحب کے خلاف ہوگیا۔ یہ تھی کل کہانی۔

جس وقت منصور صاحب کو گرفتار کیا گیا اس وقت انہوں نے یاسمین سے کہا۔ "ہاں بیٹا، انسان سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ مجھ سے بھی ہوگئی تھیں اور اس غلطی کو ختم کرنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ طرح طرح کی منصوبہ بندی کی صرف اس لیے کہ تمہیں اپنے قریب کرسکوں۔ مجھ پر سے خون کا الزام ختم ہوجائے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ آستین کا لہو پکار پکار کر اعلان کرتا ہے اور مجرم کو جانے نہیں دیتا۔ میں بھی کہیں نہیں جاسکا۔ بہرحال زندگی میں ایک اطمینان تو ہوگیا ہے کہ تمہیں ریحان جیسا ساتھی مل گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ریحان تمہارا بہت خیال رکھے گا۔"

یاسمین روتی رہ گئی اور منصور صاحب چلے گئے۔ ان کی زندگی کا باب ختم ہوچکا تھا۔ انسان چاہے کتنا بھی بھاگ دوڑ کرلے، اسے لوٹ کر اپنے انجام کی طرف جانا ہی ہوتا ہے۔

میں نے یاسمین سے کہا۔ "یاسمین، یہ ٹھیک ہے کہ تم سے اس وقت شاید یہ کہنا مناسب نہ ہو لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں زندگی بھر تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"ریحان تم نے میرا جتنا ساتھ دیا ہے اس کے لیے میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی لیکن میں زندگی کے [illegible] میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ایک تو یہ کہ ساجد انکل [illegible] باپ بن کر میری پرورش کی ہے اور میں رمیز کا دل [illegible] سکتی۔ تم خود سوچو تمہیں تو اور لڑکیاں بھی مل جائیں گی اور [illegible] بھی کوئی اور مل جائے گا لیکن اس کی دنیا تو صرف میں [illegible] وہ بے چارہ کہاں جائے گا۔" تو یہ کہانی اس طرح ختم ہو[illegible]

آج بھی جب بارش ہوتی ہے اور راستے نظر نہیں آ[illegible] باہر نہیں نکلتا کیونکہ اب مجھ میں کسی اور کہانی کا [illegible] ہمت نہیں ہے۔

# دیوانگی

احمد اقبال

جنونِ عشق میں حد سے گزرجانا کسی شاعرکا عمدہ خیال تو ہوسکتا ہے مگر اہلِ عقل اس سے متفق نہیں... سچ ہے کہ دیوانگی کا سودا سر میں سمائے پھرتے رہنا منفعت کا سودا نہیں... ہوش مندوں کے نزدیک دنیا میں دیوانگی خلل ہے دماغ کا مگر حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر ناصح خود شکار ہیں اس خلل کا... دل کی آنکھ سے دنیا کے کرداروں کو دیکھو تو ہر جگہ دیوانگی کا نشاں ملتا ہے۔ دولت، محبت، عزت، شہرت، تن آسانیاں اور زر کی روانیاں... خوابوں کی دنیا خواہشوں سے بھری ہوتی ہے۔

**خوابوں کی دنیا بسانے والوں کا فسوں خیز ماجرا، جس کا ہر کردار دیوانگی کی حد سے گزر رہا تھا**

اس نے بن مانس کو دور سے آتا دیکھا۔ وہ ساٹھ فٹ طویل کوریڈور کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر چکا تھا اور اپنی پرہوس نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے غلیظ بدنما دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ شمائلہ نے بے بسی سے لفٹ کے بند دروازے کو اور پھر اوپر بڑی سست رفتاری سے باری باری روشن ہوتے ہندسوں کو دیکھا۔ گراؤنڈ فلور سے روانہ ہونے والی لفٹ نے ابھی صرف دو منزلوں کا سفر طے کیا تھا۔ اسے ساتویں فلور تک پہنچنے کے لیے کم سے کم بھی تین چار منٹ درکار تھے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کسی نے درمیانی منزل پر اترنے یا سوار ہونے کے لیے نہ روکا۔ لفٹ سے بہت پہلے بن مانس اسے دبوچ لے گا۔ اس کے ہاتھوں نے اضطراری کیفیت میں بٹن کو بار بار دبایا حالانکہ اس سے لفٹ کی رفتار بڑھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے پرخوف نظروں سے بن مانس کو دیکھا جو اب اس سے چند قدم دور تھا۔ اس کا جسم سرد پڑنے لگا... اس نے لفٹ کو چھوڑ کے زینے کی طرف بھاگنے کا بھی سوچا مگر اسے معلوم تھا کہ یہ کوشش، نیچے والے فلور کا نصف فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی ناکام ہو جائے گی۔ لمبے قدموں سے دوڑتا بن مانس اسے زینے میں ہی پکڑ لے گا جہاں نہ کوئی دیکھنے والا ہوگا اور نہ اس کی سننے والا۔

اچانک لفٹ کا دروازہ کھل گیا... ایک جست میں اندر جا کے اس نے بٹن دبا دیا۔ دروازے کے دونوں پٹ آپس میں ملنے کے لیے تیزی سے قریب آئے۔ شمائلہ کا دل اتنی قوت سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی دھمک وہ اپنے کانوں میں سن سکتی تھی۔ اس کا پسینے میں شرابور جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ ایک انچ کی جھری میں سے اس کو بن مانس کا مشتعل چہرہ نظر آیا۔ ناکامی کے خیال نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ بن مانس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور وہ بری طرح غرا رہا تھا۔ عین اس وقت جب شمائلہ خود کو محفوظ سمجھنے لگی تھی، بن مانس نے اپنا پنجہ دروازے میں ڈال دیا۔ اپنی وحشیانہ قوت کے ساتھ دہاڑ کے اس نے زور لگایا اور دروازے کے دونوں پٹ ہٹا دیے۔ شمائلہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بن مانس نے اندر آتے ہی اسے دبوچ لیا۔ لفٹ پھر بند ہوگئی۔ وہ بن مانس کے بازوؤں میں تڑپی مگر بن مانس نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کے ہونٹ شمائلہ کے ہونٹوں کی طرف بڑھے۔ بدبو سے شمائلہ کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ بڑھا کے اس نے بیڈ سائڈ لیمپ کو روشن کیا۔

اس کے بیڈ کے قریب ہی فرش پر سوئی ہوئی خالہ ایک دم اٹھ بیٹھیں۔ ”کیا ہوا بٹیا... کوئی برا خواب دیکھا ہے؟“

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ”نئی جگہ ہے نا۔ آپ سو جائیں۔“

”اب کیا سو جاؤں۔ نماز کا وقت ہے۔“ خالہ نے اٹھ کر اپنا بستر سمیٹا۔

شمائلہ نے محسوس کیا کہ اب اس کے لیے بھی سونا مشکل ہوگا۔ کچھ دیر خاموشی سے چھت کو گھورنے کے بعد اس نے واش روم کا رخ کیا۔ ہاتھ منہ دھو کے اس نے کھڑکی کے





پردے ہٹا کے باہر جھانکا۔ صبح کا اجالا باغ میں اتر آیا تھا۔ گھر والے شاید ابھی سو رہے تھے۔ خالہ کو نماز میں مصروف پا کے اس نے کچن کا رخ کیا۔ وہ یہاں مہمان تھی لیکن اپنے رویے سے گھر کی ایک فرد بنتا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اپنے گھر میں وہ صبح بیڈ ٹی کی عادی نہیں تھی۔ وہ باتھ روم سے نکل کے سیدھی کچن ٹیبل پر جاتی اور ناشتا کر لیتی تھی لیکن آج اسے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

ملازمت کے ابتدائی چند ماہ نے اسے کافی کا عادی بنا دیا تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد شمائلہ نے کافی کی شیشی تلاش کر لی۔ چولہے پر پانی رکھ کے وہ اس کے ابلنے کا انتظار کرنے لگی۔ مگ میں ایک چمچہ کافی ڈال کے چینی اور ملک پاؤڈر کے ڈبے کھولتے ہوئے شمائلہ نے اپنے ہاتھوں کی لرزش اور کمزوری کو واضح طور پر محسوس کیا۔ واپس اپنے کمرے میں آ کے اس نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھا اور دھم سے بستر پر بیٹھ گئی۔ کچن تک جا کے کافی بنانا کوئی پہاڑ کھودنا نہیں تھا مگر اس کے جسم کی ساری توانائی جیسے بالکل ختم ہو گئی تھی۔

اس نے پریشان بالوں کو پیچھے کیا اور خود کو سنبھالنے کے لیے کئی بار گہری سانس لی۔ آخر یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے... واضح طور پر یہ سب نروس بریک ڈاؤن کی علامات تھیں۔ اسے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا... آخر وہ کیا کرے... نوکری چھوڑ دے۔ اگلے ہی دن سے کسی دوسری نوکری کی تلاش شروع کر دے... کہاں ملے گی ایسی دوسری نوکری۔ ہر جگہ حالات ایسے ہی ہوں گے۔ شاید اس سے بھی بدتر... کم سے کم اس کے ساتھ کام کرنے والی دوسری سب لڑکیوں کا یہی خیال تھا۔ اس نے سب کی باتیں سنی تھیں۔ کچھ پیٹھ پیچھے... کچھ منہ پر اور کچھ وہ جوان کبھی ہیں نگران کی نظر کہتی تھیں... اگر وہ دوسری چار لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ حسین تھی تو کیا یہ اس کا قصور تھا؟ لیکن حسد کرنے والوں کی زبان اس کے سوا کچھ نہیں کہتی تھی کہ شمائلہ اپنے حسن و شباب بہتر کاروباری انداز میں کیش کرا رہی ہے۔ اگر بڑے چودھری صاحب اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے تو یہ بھی پرانے تعلق کی وجہ سے نہیں تھا، ناجائز تعلق کا نتیجہ تھا۔ چھوٹے چودھری صاحب کی مہربانی بھی بے سبب تو نہیں تھی۔ یہ شمائلہ کا کمال تھا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہی تھی۔ بیک وقت باپ کو بھی پھانس رکھا تھا اور بیٹے پر بھی ڈورے ڈال رہی تھی۔ باپ قابو آ گیا تو سب اپنا اور اکلوتا بیٹا پھنس گیا تب بھی... حد ہوتی ہے بے حیائی کی بھی...

شمائلہ نے سب برداشت کیا تھا۔ حقیقت خدا جانتا ہے یا خود اسے معلوم ہے۔ بھونکنے والے کتے بھونکتے رہیں۔

شمائلہ نے کچھ عرصے کے لیے چھٹی لے کر بیٹھ جانے کا بھی سوچا مگر یہ مسئلے کا حل نہ تھا۔ وہ جب بھی واپس جاتی یہ مخالف زہریلا پروپیگنڈا پھر اتنی ہی شدت کے ساتھ شروع ہو جاتا۔ شمائلہ نے ان سب کا مقابلہ بڑی سمجھ بوجھ اور ہمت کے ساتھ کیا تھا۔ اصل مسئلہ تھا چھوٹے چودھری صاحب کی جارحانہ پیش قدمی کا جس کے سامنے شمائلہ کی تمام قوت مدافعت اور ہوش مندی سے کام لینے کی صلاحیت جواب دے چکی تھی۔

یہ برداشت کا حوصلہ ختم ہونے کا نتیجہ ہی تھا کہ اس نے انعام کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ اس بات کو دس دن ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کیبن میں تنہا بیکار بیٹھی رہتی تھی... انعام کے کمرے میں اس کی کرسی خالی تھی۔ اصل بات کسی کے علم میں نہ تھی اور نہ اس سے کسی کو فرق پڑا تھا۔ کام بھی اسی طرح چل رہا تھا اور لوگوں کی زبانیں بھی... بڑے چودھری صاحب آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی شمائلہ سے نہیں پوچھا تھا اور نہ

اسے بتانا ضروری سمجھا تھا کہ چودھری انعام الحق ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر صاحب دفتر کیوں تشریف نہیں لا رہے ہیں۔ انہیں ایسی کون سی مصروفیات درپیش ہیں۔ وہ کہیں بیرونِ شہر یا بیرونِ ملک تشریف لے گئے ہیں۔ گھر پر استراحت فرما رہے ہیں یا علالت سے شوق فرما رہے ہیں۔ اور ان دس دنوں میں بالکل فارغ بیٹھ کے صرف سوچتے رہنے سے شائلہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ یہ انتہا تھی۔

سات بجے خالہ نے پھر اندر جھانکا۔ ”اے لو... تم کافی سامنے رکھی بیٹھی ہو۔“

شائلہ چونکی۔ اس کے سامنے رکھی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس کے اوپر براؤن رنگ کی جھلی سی آ گئی تھی۔ باہر صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ خالہ کی بات کا جواب دیے بغیر وہ چپل پہن کر باہر آ گئی اور گھاس پر ٹہلتی رہی۔ پھر کامران چائے کے دو مگ لیے نمودار ہوا۔

”مجھے لگتا ہے کہ آپ کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں۔“ کامران نے ایک مگ اسے تھما دیا۔

”میں نے طے کر لیا ہے کامران۔ آج آفس میں میرا آخری دن ہوگا۔“

پھر وہ اسے اپنے آفس میں پہلے دن کے بارے میں بتانے لگی۔

☆☆☆

آفس کے لاؤنج میں بائیں طرف دو ہی کمرے تھے... باقی اسٹاف کے لیے دائیں طرف چھوٹے چھوٹے کیبن سے بنا دیے گئے تھے۔ تیسری سمت میں بالکل سامنے ہال تھا جس میں کلریکل اسٹاف کے لیے میزوں اور کرسیوں کی دو قطاریں تھیں۔ ایک کمرا بڑے چودھری صاحب کے لیے تھا اور اس کے باہر اکرام الحق، ایم ڈی کی تختی چمکتی نظر آتی تھی۔ دوسرا اتنا ہی بڑا کمرا ان کے بیٹے انعام الحق کے لیے تھا جس کے باہر ڈپٹی ایم ڈی لکھا ہوا تھا۔ کمرے کے اندر ایک تہائی حصہ انعام کی سیکریٹری کے لیے تھا اور یہ انعام کے آفس سے بالکل الگ تھا۔ اس حصے میں سے گزرے بغیر کوئی انعام کے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ خود شائلہ باہر لاؤنج میں منتظر کسی ملاقاتی کو خود بلا کے اندر بھیجے۔

بڑے چودھری صاحب کے والد کی بسنت روڈ پر بجلی کے سامان کی دکان تھی۔ ذاتی محبت اور قسمت کی یاوری سے وہ پہلے سپلائی کے کنٹریکٹر بنے اور پھر انسٹالیشن کے ٹھیکے بھی لینے لگے۔ انہوں نے لاہور میں تعمیر ہونے والی بہت سی کاروباری اور تجارتی مراکز کی کثیر المنزلہ عمارات میں الیکٹرک فٹنگ کے ٹھیکے لیے۔ ان کی کامیابی کے بہت سے اسباب تھے۔ چودھری صاحب بڑی دوستانہ فراخ دلی سے سب کو ان کا حصہ پیشگی ادا کرتے تھے۔ اپنے دونوں بیٹوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجا تھا۔ ایک تو لوٹ کے ہی نہیں آیا اور ولایت میں ہی کسی گوری کا گورا بن گیا... دوسرا الیکٹریکل انجینئرنگ کے بجائے الیکٹرانکس میں ایم ایس کر کے لوٹا تو اس نے باپ کا ٹھیکے داری والا بزنس سنبھالنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مال روڈ پر الیکٹرانکس کی شاندار فرم قائم کر لی تھی۔

چودھری اکرام بھی ولایت سے لوٹتے وقت اپنے ساتھ ایک بدیسی بیوی لے آئے تھے۔ اس کے والدین سکھ تھے مگر ان کی بیٹی ان کے ساتھ کینیا میں نہیں رہتی تھی۔ وہ لندن میں اکیلی رہتی تھی اور اسی یونیورسٹی میں ملازمت کرتی تھی جہاں چودھری اکرام نے تعلیم حاصل کی۔ وہ مذہب کے معاملے میں بھی خودمختار تھی اور کسی عقیدے پر بھی سختی سے کاربند رہنے کی قائل نہ تھی۔ چودھری صاحب سے شادی کے لیے مسلمان ہونے کی شرط اس نے بلا تامل پوری کر دی مگر لندن سے لاہور آ کے بھی اس نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے تو خاندان والوں نے چودھری صاحب کا بائیکاٹ کر دیا۔ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود وہ عورت لاہور میں نہ رہ سکی۔ اس نے انعام کی پیدائش کے دو سال بعد اکرام کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ اپنا کاروبار لاہور سے اٹھا کے لندن لے جائے مگر اکرام کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کی پہلی اور سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ جمے جمائے اور بڑھتے ہوئے کاروبار کو سمیٹ کر لندن میں نئے سرے سے سیٹ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ دوسری اہم وجہ اس کا باپ تھا جو بہت بیمار تھا مگر جب تک زندہ تھا، وہی قانونی طور پر سارے کاروبار کا مالک تھا۔ ایک بار بہو نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تو وہ سخت ناراض ہوا۔ اس نے کہا۔ ”ایسی بات نہ سوچنا اور نہ پھر منہ سے نکالنا۔ ہم نے اتنی غلامی کی ذلت اٹھا کے ان بندر جیسے منہ والوں کو نکالا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں پھر غلام بن کے انہی کے ملک میں جا کر مروں۔ مجھے پاکستان کی مٹی بھی نصیب نہ ہو۔“

بہو نے دلیل کے لیے کہا۔ ”آپ نے اکرام کو تعلیم کے لیے بھی تو وہیں بھیجا تھا۔“





بڈھا چلانے لگا۔ ”وہ تو ہمارے علامہ اقبال صاحب اور قائداعظم صاحب بھی پڑھنے کے لیے ولایت گئے تھے۔ انہوں نے انگریز کی غلامی تو قبول نہیں کی تھی۔ بالآخر نکالا بھی تو انہوں نے ہی تھا... اور تعلیم کے لیے تو حدیث شریف ہے کہ چین بھی جاؤ۔ تم کو جانا ہے تو نکلو ابھی۔ دفع ہو جاؤ۔ تمہارا نہ مذہب نہ وطن۔ ماں باپ سکھ تھے۔ تو کینیا میں پیدا ہوئی۔ شادی کے لیے مسلمان ہوئی تو پاکستان آ گئی۔“

اکرام اپنی بیوی کو کھینچ کے لے گیا اور اس پر سخت گرم ہوا۔ ”کس الو کے پٹھے نے تم سے کہا تھا کہ اباجی سے بحث کرو۔ ان کی عمر دیکھو۔ وہ بیمار ہیں، اکیلے ہیں... ایک بیٹا پہلے ہی چھوڑ کے جا چکا ہے... اب کیا میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ کے تمہارے ساتھ چلا جاؤں... ایسے ہی خالی ہاتھ... تم ان کو نہیں جانتیں... ساری عمر انہوں نے کتنی محنت کی تھی اس کاروبار کو سیٹ کرنے کے لیے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنے ضدی ہیں۔ وہ سب کچھ کسی خیراتی ادارے کو دے کر مجھے عاق کر دیں گے۔“

اکرام کی بیوی سینے پر صبر کا پتھر رکھ کے خاموش ہو گئی اور بڈھے کے مرنے کا انتظار کرنے لگی مگر وہ تھا کہ توبے کا ہونے کے باوجود جی رہا تھا۔ اگلے تین سالوں میں وہ تین بار لندن گئے۔ وہ خود وہاں پوری گرمیاں گزارنے کے لیے ٹھہری۔ اکرام اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث دس، بارہ دن سے زیادہ نہ رکا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی اپنے شوہر کی طرف سے تھی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ کاروبار کی مصروفیت میں الجھتا جا رہا تھا اور ایسا نظر آتا تھا کہ باپ کی موت کے بعد بھی وہ لاہور نہیں چھوڑے گا۔ بالآخر ایسا ہی ہوا۔ بڈھا ایک دن بیٹھے بیٹھے مر گیا۔

اس کے مرنے کے بعد اکرام کو سارے کاروبار اور جائداد کی قانونی ملکیت لینے میں کچھ وقت لگا۔ انعام اس وقت تک پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ اکرام نے اسے لاہور کے سب سے اچھے کانوینٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس کی بیوی کی خواہش تھی کہ اس کی تعلیم کا سلسلہ لندن جا کے شروع ہو لیکن اس نے یہ بات اکرام سے کی تو اکرام نے صاف کہہ دیا کہ وہ جما جمایا کاروبار بیچ کے لندن جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اس معاملے میں آئندہ بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اکرام کی بیوی کو سخت مایوسی ہوئی۔ اکرام سے اس کا نکاح اسلامی طریقے سے ہوا۔ اس کا حق مہر ایک لاکھ روپے رکھا گیا تھا۔ اگر وہ برطانیہ میں ہوتی تو طلاق کے ساتھ ہی شوہر کی نصف جائداد منقولہ وغیر منقولہ کی مالک بھی ہو جاتی۔

یہاں وہ شاہانہ زندگی گزار رہی تھی۔ نوکر چاکر... شان دار گاڑیاں... لاہور اور کراچی کے علاوہ مری میں کوٹھیاں... یہ سب وہ کیسے چھوڑتی؟ اب تو کینیا میں اس کے ماں باپ بھی نہیں تھے اور ہوتے تو اسے قبول نہ کرتے۔ وہ ایک مسئلے کے ساتھ پانچ سال رہ چکی تھی۔ جیسے تیسے کر کے اس نے پانچ سال اور گزارے۔ بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اگلے سال وہ گرمیاں گزارنے مری گئی تو اکرام اس کے ساتھ نہیں تھا۔ انعام کو اس نے ایبٹ آباد کے برن ہال اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ وہ ہاسٹل میں رہتا تھا اور اسے دسمبر جنوری میں سردیوں کی چھٹی ملتی تھی۔ خلافِ معمول وہ گرمیوں کے بعد بھی لوٹ کے نہیں آئی اور اکرام کو مختلف حیلے بہانوں سے ٹالتی رہی تو وہ متفکر ہوا اور جب اس نے شوہر کی کال ریسیو کرنا بھی چھوڑ دی تو اکرام کے شکوک بھی یقین میں بدلنے لگے۔ وہ لندن پہنچا تو اس پر صدمات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اب کسی اور کی بیوی ہے۔ اکرام کو چھوڑ کے اس نے کسی سکھ تاجر کی کاروباری فرم میں پارٹنر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی تھی۔ یہ سب اکرام کا پیسا تھا جو وہ یہاں آنے سے پہلے ہی ٹرانسفر کر چکی تھی۔ باقی اس کے اپنے اثاثے تھے۔ وہ اسی سکھ کے فلیٹ میں اس کی داشتہ کے طور پر رہتی تھی جو وہاں اخلاقی اور معاشرتی طور پر ذرا بھی قابلِ اعتراض نہ تھا۔ تاہم اس نے اکرام کو بتایا کہ وہ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ وہ طلاق دے یا نہ دے۔ نہ پاکستان کے عائلی قوانین اس پر لاگو ہوتے ہیں کیونکہ وہ پھر سکھ ہو گئی ہے۔ اور نہ وہ کسی بھی برطانوی شہری کو اس کی مرضی کے خلاف واپس پاکستان لے جا سکتا ہے۔

ایک عام پاکستانی شوہر اور مرد کی حیثیت سے یہ طمانچہ منہ پر کھا کے اکرام کے دماغ کا فیوز بھی اڑ گیا۔ اس کی غیرت کے ابال نے اکرام کو بہت سے امکانات پر اکسایا جن میں قانونی اور غیر قانونی ہر طرح کے اقدامات کی گنجائش تھی لیکن اتفاق سے اس کی ملاقات شاہد علی سے ہو گئی۔ وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جس میں اکرام نے قیام کیا تھا۔ شاہد علی پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا اور لندن سے بار ایٹ لاء کرنے کے بعد واپس پاکستان جا کے اپنی لاء فرم بنانا چاہتا تھا۔ لنچ پر وہ اتفاق سے ایک ٹیبل پر ملے تو ان کے درمیان رسمی سلام دعا ہوئی جو دیارِ غیر میں کسی بھی ہم وطن کے لیے خیر سگالی کے جذبات کا رسمی اظہار ہوتی ہے۔

اکرام سخت پریشان، رنجیدہ اور مشتعل تھا۔ اس کے

دماغ میں آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ وہ اپنی بے وفا اور بے حیا بیوی کو عبرت ناک سزا دینے کے تمام قانونی اور غیر قانونی طریقے اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاہد علی کو اس کی صورت سے اس کی پریشان حالی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے شاہد علی کے ایک دورسمی سوالات کا جواب بھی اس لیے نہیں دیا کہ وہ اپنے خیالات کے جنگل میں تنہا بھٹک رہا تھا۔ لندن اور تمام ترقی یافتہ کہلانے والے مغربی ممالک میں... کسی کے ذاتی معاملات میں دلچسپی کا اظہار بدتمیزی سمجھا جاتا ہے، کون کیا کر رہا ہے اور کیوں۔ اس کی پروا کسی کو نہیں ہوتی۔

شاہد علی نے اپنے وطن کی اخلاقی ذمے داری کو نبھایا اور پوچھا۔ ”آپ بہت زیادہ اپ سیٹ ہیں۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟ میں ایک وکیل ہوں۔“

اکرام نے سنبھل کے کہا۔ ”میرا مسئلہ بھی قانونی ہے۔ مگر پتا نہیں کیسے حل ہوگا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے... مجھے واپس پاکستان جانا ہے۔“

”اگر مسئلہ اتنا ذاتی نہ ہو اور آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہوں تو مجھے بتا دیں۔ فیس کے لیے متفکر نہ ہوں کیونکہ خود مجھے بھی پاکستان جانا ہے۔ میں یہاں بیرسٹری کی ڈگری لینے آیا تھا، میرا مشورہ بالکل مفت ہوگا۔“ شاہد علی مسکرا کے بولا۔ ”میرا نام شاہد علی ہے اور میں لاہور سے آیا۔“

”اکرام الحق۔ میں ایک بزنس مین ہوں۔“ انہوں نے رسماً ہاتھ ملائے۔ پھر اکرام نے اسے مختصراً اپنی بیوی کے بارے میں بتا دیا۔

شاہد علی نے غور سے سب سنا۔ ”اب کیا کرنا چاہتے ہیں آپ؟“

”سچ تو یہ ہے کہ میں اس عورت کے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈالنا چاہتا ہوں۔“

شاہد علی ہنسا۔ ”ایک غیرت مند پاکستانی شوہر ایسا ہی سوچے گا مگر یہاں کتوں کو انسانی گوشت کھلانا ایک اضافی جرم شمار ہوگا۔ قتل کا آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟“

اکرام نے خفگی سے کہا۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں؟“

”کیا آپ نے جو بات کہی تھی، مذاق کیا تھا میرے ساتھ؟ آپ نے تو اسے سچ کہا تھا۔ مسٹر اکرام! یہ پاکستان نہیں ہے جہاں کسی بھی دولت مند کے لیے قتل کرانا اور قانون کی گرفت سے صاف بچ جانا بہت آسان ہو گیا ہے۔“

اکرام نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہی مسئلہ ہے۔“

”قتل یہاں بھی ہوتے ہیں اور پروفیشنل قاتل بھی مل جاتے ہیں لیکن انہیں تلاش کرنا آسان نہیں اور وہ معاوضہ بھی ٹھیک ٹھاک لیتے ہیں۔“

”معاوضہ میں ادا کر سکتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کسی کو؟“

”میں کہہ سکتا ہوں کہ پیشہ ور قاتل بھی مل جائے گا... لیکن زیادہ اہم یہ ہے اکرام صاحب کہ کیا اس کی ضرورت ہے؟ یا ضرورت اتنی اہم ہے کہ اتنا خرچ کیا جائے اور یہ رسک لیا جائے؟“

”تمہارے لیے نہیں ہوگی... کیونکہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔“

”بیوی کیا ہوتی ہے؟ صرف ایک عورت۔ جیسے شوہر بھی بس ایک مرد ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کو چھوڑا اور دوسرا پکڑ لیا مگر آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ کو دوسری عورت نہ نظر آتی ہے، نہ سمجھ آتی ہے۔ رائٹ؟ اور ایسا صرف اس لیے ہے کہ آپ کا دماغ اس واقعے۔ میں اسے سانحہ نہیں کہوں گا۔ اس واقعے کے بعد آف ہو گیا ہے۔ جذبات کی سیلابی رو سے شارٹ ہو کے کام نہیں کر رہا۔ محاورے کے مطابق آپ پر خون سوار ہے۔ ایسے میں آپ میرا مشورہ کہاں قبول کریں گے۔ میں نہ آپ کا دوست نہ کوئی اختیار رکھنے والا... میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔ وش یو گڈ لک۔“ شاہد علی اٹھا۔ ”آپ کا یہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔“

”پلیز! اتنی جلدی نہ کریں۔ میں بالکل اکیلا ہوں یہاں۔ میں سنوں گا آپ کی بات۔ مجھے ایک مخلص دوست اور مشیر کی اشد ضرورت ہے۔“

شاہد علی پھر بیٹھ گیا۔ اس کو اکرام سے ایسے ہی ردِعمل کی توقع تھی۔ چند جملوں میں وہ اس کے جذبات کے سیلابی دھارے کا رخ بدلنے اور اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اندھیرے میں بھٹکنے والے کو روشنی کی ایک کرن کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ ”اب ہم اجنبی نہیں دوست ہیں۔ کافی منگوائیے۔“

اکرام نے کافی کا آرڈر دیا۔ ”کیا کرنا چاہیے مجھے شاہد صاحب، دوسری شادی کے علاوہ۔“

”وہ بعد کی بات ہے۔ پاکستان جا کے آپ ایک نہیں چار کریں۔ فوری طور پر تو آپ کو پہلی فلائٹ سے پاکستان بھاگ جانا چاہیے۔ ورنہ آپ مشکل میں پڑ جائیں گے۔“

”میں مشکل میں پڑ جاؤں گا؟ وہ کیوں؟“

”دیکھیے، آپ اپنی سابقہ بیوی سے مل چکے ہیں۔ میرا خیال ہے غصے میں اسے گالیاں، دھمکیاں سب دے چکے ہوں





گے۔ اس کا جواب کیا تھا، یہ بتا سکتا ہوں۔ مرد ہوتا اس کی جگہ تو جواب میں زیادہ شاندار گالیاں دیتا مثلاً وہ سکھ جس کے ساتھ رہتی ہے۔ آپ کی لاہوری گالیوں کا جواب امرتسری گالیاں ہوتیں... مگر وہ عورت تھی... اسے ڈر ہوگا کہ آپ اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔ کیا پتا گلا گھونٹ دیں یا گر پھاڑ دیں چنانچہ اس نے آپ کو غصہ نہیں دلایا ہوگا بلکہ کوشش کی ہوگی کہ آپ کو ٹھنڈا رکھے۔ کسی طرح ٹال دے۔ رائٹ؟“

”جی، اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے جو سنا غلط سنا ہے لیکن میری معلومات مکمل تھیں اور میں غصے میں تھا۔ اس نے آرام سے بات کی اور مجھے سمجھایا کہ زندگی کسی کے ساتھ بھی زبردستی نہیں گزاری جا سکتی۔ اگر میں لندن آ جاؤں تو وہ پہلے کی طرح میری بیوی بن کے رہے گی۔ وہ ہمیشہ ایسا چاہتی تھی کیونکہ پاکستان میں رہنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہاں بہت زیادہ دہشت گردی ہو رہی ہے اور انتہا پسندی بڑھتی جا رہی ہے... وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ذہانت سے اس لمحے کو گزار دیا جب وہ میرے ہاتھوں قتل ہو سکتی تھی۔ جب بحث ہوئی تو دونوں طرف سے دلائل کی جنگ چھڑ گئی۔ اس نے کہا کہ تم بیٹھو، میں کافی بنا کے لاتی ہوں۔ مگر میں اسے کہیں جانے کا موقع دیتا تو وہ پولیس کو فون کر دیتی۔ میں اس کے ساتھ ہی کچن میں گیا اور اسے سمجھاتا رہا۔ وہ سنتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ آخر میں اس نے کہا کہ تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو... ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے بچے کی خاطر کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں پھر آؤں گا لیکن جیسے ہی میں باہر نکلا اس نے دروازے میں زنجیر لگا دی اور اس کے بعد وہ سب کہا جو انتہائی اشتعال انگیز تھا اور ناقابلِ برداشت تھا۔“

”اس نے یہ بھی کہا ہوگا کہ دفع ہو جاؤ اور مجھے اپنی شکل پھر مت دکھانا ورنہ بند کرا دوں گی؟“

اکرام نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”یہ دھمکی بھی دی تھی اس نے۔“

”تم پھر بھی دفع نہیں ہوئے۔ ابھی تک یہاں بیٹھے قتل کے منصوبے بنا رہے ہو؟ یہ نہیں معلوم کہ وہ اب تک کیا قدم اٹھا چکی ہے۔ سب سے پہلے اس نے بتایا ہوگا اس سکھ کو جس نے اسے پھر سکھنی بننے پر مجبور کیا۔ اور اس نے بھی کہا ہوگا کہ فوراً رپورٹ کرو کہ میرا شوہر لندن میں ہے اور مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے۔ وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔ اکرام صاحب! تم کیا کیس کرو گے اس پر... خود پھنس جاؤ گے پولیس کیس میں... پھر پاکستان نہیں جیل جاؤ گے... آئی بات کچھ سمجھ میں؟ تمہیں یہاں ایک منٹ نہیں رکنا چاہیے۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“ اکرام الحق نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں یہاں پھنس گیا تو بڑی خرابی ہوگی۔ پاکستان میں میرا کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ مگر میں اس عورت کو ایسے ہی چھوڑ دوں؟“

”وہ پہلے ہی تمہیں چھوڑ چکی ہے اور حقیقت یہ ہے اکرام صاحب کہ تم بہت سستے میں چھوٹ گئے۔ وہ یہاں تم سے طلاق لیتی تو تمہارے آدھے اثاثے اس کے ہو جاتے۔“

اکرام الحق کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ”تھینک یو شاہد علی... شاید خدا نے بروقت تمہیں بھیج کے مجھے بچا لیا۔ اب ایک وعدہ کرو، جب تم پاکستان آؤ گے تو مجھ سے ضرور ملو گے۔“

”مجھے کچھ وقت لگے گا۔ آنا مجھے لاہور ہے... میرا گھر وہیں ہے۔“

”میں تمہیں اپنے کاروبار کا قانونی مشیر رکھنا چاہتا ہوں۔“

شاہد علی مسکرانے لگا...... ”تم پھر جذباتی ہو رہے ہو۔“

”لیکن میں کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں۔ تمہاری فیس مجھ پر واجب الادا ہے، یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہوگا... میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں۔“

اور یوں اکرام الحق کی شاہد علی سے دوستی کے سفر کا آغاز ہوا۔ اکرام الحق اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے برطانیہ سے فرار ہوا۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ بھی نہیں کیا۔ وہ خالی ہاتھ سیدھا ائرپورٹ پہنچا اور پہلی دستیاب فلائٹ سے پاکستان روانہ ہو گیا... جیسا کہ اسے بعد میں شاہد علی نے بتایا۔ اس کے جانے کے چند گھنٹے بعد ہی اس کی سابق سکھ بیوی پولیس اور اپنے سکھ آقا کے ساتھ ہوٹل پہنچی تھی اور اس کے خلاف مجرمانہ نیت کے ساتھ زبردستی کسی کے گھر میں گھسنے... قتل کی دھمکیاں دینے اور اسی نوعیت کے دیگر جرائم پر مقدمات درج ہو چکے تھے۔ بعد میں یہ مقدمات واپس لینے پر خارج کر دیے گئے۔ بعد کی اطلاعات کے مطابق اکرام الحق کی سابق بیوی نے اس سکھ کو قتل کر دیا تھا جس کے ساتھ وہ رہتی تھی کیونکہ اس نے شادی سے انکار کے بعد اس عورت کو گھر سے بھی رخصت کر دیا تھا اور اب وہ بڑے گھر

میں عمر قید کی سزا کاٹ رہی تھی۔

شاہد علی نے لاہور واپس آجانے کے بعد اکرام الحق کی خواہش اور اصرار پر اس کے ادارے میں قانونی مشیر کی ذمے داری سنبھال لی اور ان کے درمیان دوستی کے اس رشتے کی بنیاد پڑی جو تمام عمر قائم رہا۔ اکرام الحق کو سب سے زیادہ اعتماد اسی پر تھا اور کاروباری معاملات سے الگ بھی وہ نجی زندگی میں اس کے مشورے قبول کرتا تھا۔ وہ سمن آباد میں رہنے والے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا اور دودھ دہی کی دکان کرتا تھا لیکن اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس سے بڑا...... ..... یونیورسٹی میں لیکچرار ہوا۔ دوسرا ڈاکٹر بن گیا اور سب سے چھوٹا شاہد علی بیرسٹر ہوا۔ اسی دکان کی آمدنی سے اس نے تین بیٹیوں کو بھی بی اے تک پڑھایا اور ان کے رشتے خاندان سے باہر پڑھے لکھے نوجوانوں سے کیے۔ وہ آج بھی اپنی پرانی دودھ دہی کی دکان پر بیٹھتا تھا جہاں پر رات کو اس کے تیس چالیس سال پرانے دوست اسی طرح محفل جماتے تھے۔

ماں باپ کے درمیان تعلق ختم ہو جانے کا علم انعام الحق کو بہت دیر سے اس وقت ہوا جب اس کے باپ نے دوسری شادی کی۔ اپنے دوست شاہد علی کے کہنے پر باپ نے بیٹے کو اس کی دلچسپی کے تمام اسباب فراہم کردیے تھے۔

شاہد علی نے ایک معاون خاتون وکیل سے شادی کا فیصلہ کیا تو اس کے ماں باپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس کے دوسرے بیٹوں نے بھی اچھی تعلیم یافتہ لڑکیاں پسند کی تھیں۔ اس شادی کے موقع پر شاہد کے باپ نے اکرام کو گھیر لیا۔ شاہد اسے بتا چکا تھا کہ پہلی شادی کے ناکام ہو جانے سے اکرام کتنا دل برداشتہ تھا۔ اس نے دوبارہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر اس فیصلے کے نتیجے میں اس کی اپنی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ لاشعوری طور پر ایک عورت کے جرم کی سزا وہ دوسری سب عورتوں کو دے رہا تھا۔ ان کو وہ اپنی دولت کے بل پر عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپناتا تھا اور جب چاہتا تھا انہیں اپنی زندگی سے بے دخل کر کے ان کی جگہ کسی دوسری عورت کو دے دیتا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ انتقام لے رہا تھا مگر سزا خود کاٹ رہا تھا۔ اس کی اپنی زندگی بے راہ روی کا شکار تھی۔ جب وہ کسی سے تعلق استوار کرتا تو اپنے رویے اور سلوک سے ہر لڑکی کے دل میں جذبات کی ہلچل پیدا کر دیتا تھا۔ وہ جائز طور پر یہ سمجھنے لگتی تھی کہ یہ رشتہ محض جسم کی ضرورت کا نہیں اور جب اسے یقین آجاتا کہ اکرام اسے اپنی زندگی سے الگ کرہی نہیں سکتا تو وہ اچانک اسے عرش سے فرش پر گرا کے اس کی جگہ دوسری لڑکی کو دے دیتا تھا۔

ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک لڑکی کو اپنی زندگی سے نکال کے خود اکرام بھی جذباتی بحران کا شکار ہو گیا اور اس سے نکلنے کے لیے جو راستہ اکرام نے اختیار کیا، وہ مزید خرابی کا تھا۔ اس نے دن رات شراب پی کر بازاری قسم کی عورتوں سے مراسم استوار کرلیے۔ شاہد علی کے سمجھانے کا اثر الٹا ہوا۔ وہ ایک ماڈل ایکٹریس سے شادی کرنے پر تل گیا۔ کاروبار تو اس سے متاثر ہو ہی رہا تھا، شاہد علی کوشش نہ کرتا تو اس کا دوست تباہ ہو جاتا۔ اس نے بڑی محنت اور جوڑ توڑ سے اس ایکٹریس کی کچھ عریاں تصاویر حاصل کرلیں اور بالآخر اس کی ایک پرائیویٹ ویڈیو فلم بھی چوری کرانے میں کامیاب رہا۔ چور اندر کا آدمی تھا اور فلم میں ایکٹریس کے ساتھ جو شخص تھا، وہ ایک مشہور سیاست داں ہونے کے ساتھ بہت بڑا بدمعاش بھی تھا۔ شاہد علی نے سارے رسک لے کر تصاویر کے ساتھ ویڈیو فلم ایسے وقت میں اکرام کو پہنچادیں جب وہ ہوش میں تھا۔ فلم کی کاپی بنوا کے شاہد علی نے اصل فلم واپس اس سیاست داں ..... کی ''لائبریری'' میں رکھوا دی تھی۔ اکرام کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس ایکٹریس کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھانے والا اس کا دوست شاہد علی تھا مگر اس ایکٹریس اور ماڈل سے اکرام کا تعلق ختم ہو گیا۔

شاہد علی کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا کہ اس کے دوست کی زندگی کسی سہارا دینے اور سنبھالنے والی شریکِ حیات کی عدم موجودگی میں کتنی غیر محفوظ ہے۔ کرتب دکھانے کے لیے سائیکل کو ایک پہیے پر ضرور چلایا جا سکتا ہے مگر وسیلۂ سفر کے لیے اس کا دوسرا پہیا ہونا ضروری ہے۔ اکرام الحق بھی کرتب دکھا رہا تھا۔ دنیا کے سامنے ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ زندگی کسی بیوی کے بغیر بھی کامیابی سے گزاری جا سکتی ہے کیونکہ بیوی کیا ہوتی ہے؟ صرف ایک عورت! یہ منفی سوچ اسے اندر باہر سے کمزور کررہی تھی۔ ایک بار وہ مکمل تباہی سے بچ گیا تھا۔ دوسری بار کی گارنٹی کون دے سکتا تھا۔

شاہد علی کی شادی میں اس کے والد نے دیکھا کہ اکرام مہمانوں سے بھرے ہوئے شادی لان کے ایک کنارے پر اکیلا کھڑا کچھ پی رہا ہے۔

''اکرام! یہاں میرے پاس آ کے بیٹھو۔'' انہوں نے ایک کرسی الگ رکھ کے کہا۔ ''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اکرام کو اندازہ تھا کہ بات کیا ہوگی مگر وہ انکار کی





بداخلاقی نہیں کرسکتا تھا۔ ''فرمایئے۔''

''دیکھو، میں ایک بہت سیدھا سادہ اَن پڑھ گوالا ہوں۔ ملاوٹ والا دودھ ضرور بیچتا ہوں لیکن بات کھری کرتا ہوں۔ تم جتنے کامیاب بزنس مین ہو، میں اس سے زیادہ کامیاب باپ ہوں۔''

''اس میں کیا شک ہے چچا۔'' اکرام ہنسنے لگا۔

''یہ چچا کہنا صرف رسمی اخلاق ہے یا مجھے چچا جیسے حقوق بھی حاصل ہیں؟''

''حقوق سے آپ کی مراد ہے شادی کرانے کا حق؟''

''ہاں، یہ آخری ذمے داری تھی... سوچ رہا تھا... اب کیا کروں۔ پھر تمہارا خیال آگیا کہ قربانی کا ایک بکرا باقی ہے۔ مجھے شاہد نے بتایا تھا کہ قربانی کے لیے تو تم راضی تھے مگر وہ قربانی نہ ہوتی... جھٹکا ہوتا... تم بچ گئے حرام موت سے۔''

''یہ شاہد نے آپ کو بتایا؟'' اکرام حیران ہوا۔

''ہاں اور اس نے کہا کہ اباجی اس کو بھی باندھو کسی کھونٹے سے ورنہ پھر کوئی گوا پچی گاں اسے ٹکر جائے گی۔ پھر کیا خیال ہے۔ یہی ہال بک کرالیا جائے؟''

اکرام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''اگر آپ نے انتخاب اور فیصلہ کرلیا ہے تو پھر دیر کیسی۔ ذرا یہ بھیڑ چھٹ جائے تو دوسرا شو۔''

''انتخاب میں تو چالیس سال پہلے کر چکا، اب اسے چھوڑ کے تم جس پر انگلی رکھ دو وہ تمہاری۔''

''خواہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہو۔'' اکرام ہنسنے لگا۔

''ہاں، اس کے شوہر سے بات کرلیں گے... زیادہ تر تو ہنسی خوشی اپنے لیے دوسری تلاش کرنے لگ جائیں گے اسی وقت۔ دیکھو یہ مذاق کی بات نہیں۔ جب آدمی کوئی کام خود نہ کر سکے تو اسے دوسروں کی مدد لینی چاہیے۔ چونکہ تم خود ایک لائف ٹائم گارنٹی والی شریکِ حیات نہیں تلاش کر سکے اتنی بڑی دنیا میں... تو اب یہ کام مجھے کرنے دو۔ مجھے بڑا تجربہ ہے۔''

''آپ گارنٹی کیسے دیں گے لائف ٹائم کے لیے؟''

''جیسے سب دیتے ہیں... اپنے گھر اور خاندان میں... محلے میں اور شہر میں دور دور تک دیکھو۔ ننانوے فیصد سے بھی زیادہ شادیاں لائف ٹائم گارنٹی پر پوری اترتی ہیں۔ خرابی ہوتی ہے غلط چوائس سے یا غلط استعمال سے ورنہ... بیوی ہو یا ٹی وی... سب چلتے رہتے ہیں۔''

اس روز تو اکرام طرح دے گیا مگر شاہد علی کے ابا کے ڈر دن حملے جاری رہے اور بالآخر اکرام مارا گیا۔ وہ قائل ہوتا چلا گیا کیونکہ اندرونی طور پر اس کا دفاع بہت کمزور پڑ چکا تھا۔ شاہد کے کہنے پر اس نے شادی سے پہلے اپنے بیٹے انعام سے بات کرنے کا فیصلہ کیا جو کچھ دن بعد موسم سرما کی چھٹیوں میں گھر آنے والا تھا۔ انعام اب تیرہ سال کا ہو گیا تھا اور سینئر کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا۔

ایک رات اکرام نے موقع دیکھ کے اس سے بات کی۔ ''انعام! یہ تیسرا سال ہے کہ تم چھٹی میں آئے ہو تو تمہاری ملاقات اپنی ماں سے نہیں ہوئی... وہ لندن میں ہوتی ہیں۔''

''لندن کی ایک جیل میں۔'' انعام نے کہا۔

اکرام دم بخود رہ گیا۔ ''تمہیں معلوم ہے، ہماری علیحدگی کے بارے میں؟''

''مجھے سب معلوم ہے... وہ لندن واپس جانا چاہتی تھیں۔ آپ کے لیے ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ آپ کو چھوڑ گئیں۔ انہوں نے پھر اپنا آبائی مذہب اختیار کرلیا اور کسی سکھ سے شادی بھی کرلی۔''

اکرام نے تصحیح ضروری نہیں سمجھی کہ شادی والی بات درست نہیں۔ ''یہ سب کس نے بتایا تمہیں؟''

''خود ماما نے۔ فون پر۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اور کیا بتایا تھا۔''

انعام نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ پاپا؟''

''میرے بارے میں انہوں نے کیا کہا تھا؟''

''بہت کچھ... مگر ظاہر ہے وہ سب درست نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات میں نے ان سے بھی کہہ دی تھی کہ اگر وہ مجھے سچ نہیں بتا سکتیں تو جھوٹ سے قائل نہ کریں۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اکرام نے کہا۔ ''تمہیں واقعی مجھ سے کوئی شکایت نہیں؟''

''نہیں، آپ ایک اچھے اور کامیاب انسان ہیں، سب جانتے ہیں اور میں یقیناً بہت خوش قسمت ہوں کہ برن ہال میں پڑھ رہا ہوں... کسی گورنمنٹ اسکول میں نہیں... اور آپ کا بیٹا ہوں۔''

اکرام نے اٹھ کر اسے چوم لیا۔ ''تھینک یو مائی سن... تم نے مجھے بہت اعتماد دیا ہے۔ اب میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے پھر شادی کا فیصلہ کیا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ فیصلہ آپ کو بہت پہلے

کر لینا چاہیے تھا پاپا!"

"اس شادی سے تمہارے میرے رشتے کا اعتماد برقرار رہے گا۔ کبھی تم محسوس کرو کہ میرا رویہ بدلا ہے تو مجھے ضرور بتا دینا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا پاپا... میں جانتا ہوں آپ کو۔"

اکرام نے انعام سے اپنی گفتگو کے بارے میں شاہد علی کو بتایا تو اس نے کہا۔ "یو آر لکی۔ تمہاری شادی کی راہ میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی تھی جو اب تمہاری سپورٹ بن گئی ہے۔"

اکرام اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش اور کامیاب رہا۔ اس کی سب سے زیادہ خوشی شاید شاہد علی کے باپ کو تھی جس نے اکرام کے لیے شریکِ حیات کا انتخاب کیا تھا۔ اکرام کی بیوی ہر لحاظ سے مثالی رفیقِ حیات تھی اور اکرام اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا کہ شاہد علی کے باپ نے اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جس نے اس کی زندگی ہی بدل ڈالی تھی۔ اکرام یہ بات لطیفے کے طور پر سب سے کہتا تھا کہ لوگ عشق کرتے ہیں اور پھر شادی... میرے ساتھ معاملہ برعکس ہوا۔ میں نے پہلے شادی کر لی اور عشق اس کے بعد کیا۔ خرابی چند سال بعد سامنے آئی جب تمام ڈاکٹرز اور ماہرین نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ اکرام الحق نے اس کو ذرا بھی محسوس نہیں کیا اور ہمیشہ اپنی بیوی کو یقین دلاتا رہا کہ اب وہ اس سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

☆☆☆

شائلہ نے اپنی نئی نویلی دلہن جیسی سرخ مہران کو اس کے لیے مخصوص جگہ پارک کیا۔ بائیں جانب شیڈ کے پارکنگ ایریا میں صرف چھ گاڑیوں کے لیے گنجائش تھی۔ ایم ڈی اکرام الحق کے ساتھ ان کے ولی عہد انعام الحق ڈپٹی ایم ڈی کی گاڑی کھڑی ہوتی تھی۔ تیسری اضافی آفیشل کار تھی جو ایمرجنسی میں باپ، بیٹا استعمال کرتے تھے یا کسی مہمانِ خاص کو لانے کے لیے جاتی تھی۔ چوتھی کار اکرام صاحب کی نک چڑھی سیکریٹری کی ہوتی تھی جو کسی طرح بھی خود کو ایم ڈی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ یہ جگہ اکرام صاحب کے حکم پر شائلہ کی گاڑی کے لیے مخصوص کی گئی تو ایک جذباتی مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ زارا نے اس پر سخت احتجاج کیا اور کہا کہ وہ اپنی گاڑی باہر سڑک پر نہیں کھڑی کرے گی۔ اکرام صاحب کی خصوصی توجہ نے شائلہ کو بھی وی آئی پی بنا دیا تھا۔ جنرل منیجر اور مارکیٹنگ منیجر کی گاڑی باہر نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سیکیورٹی کے نگراں نے زارا سے کہا کہ وہ ایم ڈی صاحب کے حکم کا پابند ہے اور زارا چاہے تو ان سے بات کر سکتی ہے۔

یہ زارا کی پہلی شکست تھی جس کو اس نے شائلہ سے عداوت کا ایک سبب بنا لیا تھا۔ ممکن ہے اس نے اکرام صاحب سے شکایت بھی کی ہو لیکن صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ اس سے دفتر کے دوسرے ماتحت عملے کو بھی احساس ہو گیا کہ ڈپٹی ایم ڈی صاحب کی نئی سیکریٹری بالحاظ اہمیت تیسرے نمبر پر ہے اور زارا اب پانچویں پوزیشن پر آگئی ہے۔ قیاس آرائیوں کو شائلہ نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان کا سلسلہ تو اسی روز شروع ہوگیا تھا جب وہ اکرام صاحب کے ساتھ پہلی بار آفس آئی تھی۔ اس کے حسن سے زیادہ سب کی نظر اس کی سادگی پر گئی تھی۔ تجارتی دفاتر یا کاروباری اداروں میں کام کرنے والی لڑکیاں اپنے ناز نخرے اور فیشن میں کسی ماڈل گرل کی طرح نظر آتی ہیں۔ اس کا ایک نمونہ زارا تھی جس کی عمر کا اندازہ پینتیس سے چالیس سال کے درمیان لگایا جاتا تھا مگر وہ پچیس سے کم نظر آنے کی کوشش میں کامیاب تھی۔ اس کے لیے وہ بیوٹی پارلرز اور بوتیکس کی ممنون تھی مگر خود بھی ڈائٹ اور ایکسرسائز سے فٹ رہنا جانتی تھی۔ اس کا شوہر کوئی گمنام سا پراپرٹی ڈیلر تھا جس کا بزنس اب چوپٹ ہو چکا تھا چنانچہ اکرام صاحب نے زارا کی تنخواہ میں اضافہ کیا تو اسے ایم ڈی صاحب کی نیک نیتی نہیں سمجھا گیا۔ اس کی ذمے دار خود زارا بھی تھی جو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی تھی کہ ایم ڈی صاحب سے اس کے خصوصی مراسم ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔

شائلہ کے بارے میں بھی یہ فیصلہ فوراً نشر کر دیا گیا کہ ڈپٹی ایم ڈی صاحب کا تو نام ہے۔ بیٹا کیا کر سکتا ہے جب کرنے کے لیے خود باپ موجود ہے۔ خود زارا نے اپنے اقتدار کو خطرے میں محسوس کیا اور جب ملازمت کے تیسرے دن شائلہ کو دفتر کی طرف سے گاڑی دی گئی... وہ بھی ملکیت کی بنیاد پر تو زارا کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ چوتھے دن اس کی کار کو پارکنگ ایریا سے جلاوطن کر دیا گیا تو اسے یقین آگیا کہ اب اگلا حکم اس کی برطرفی کا ہوگا یا اسے عام ملازمین کے ساتھ کلرکی کرنے بٹھا دیا جائے گا۔ اس کی جگہ شائلہ بیٹھے گی لیکن ان تمام افواہوں نے دم توڑ دیا جب اکرام الحق نے اسے نام کے بجائے بیٹی کہہ کے مخاطب کرنا شروع کیا۔ شائلہ کا درجہ کچھ اور بلند ہوگیا۔ اب وہ ملازموں میں سے نہیں تھی، مالکوں کی صف میں شامل تھی۔

فرسٹ فلور پر جانے کے لیے لفٹ مین اس کے لیے دروازہ کھولے کھڑا تھا مگر شائلہ نے سیڑھیوں سے جانے کو ترجیح دی۔ زینے میں اوپر سے نیچے آنے والے دو افراد نے مسکرا کے "ہیلو مس شائلہ... اور کیسی ہیں آپ" کہا۔ جواب میں اس نے بھی رسمی اخلاق سے یہی جملے دہرائے۔ لاؤنج سے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ہر روز کی طرح زارا نے اس کا استقبال اپنی بنی سنوری طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تم آج پھر لیٹ ہو مگر کیا فرق پڑتا ہے... تمہارے باس تو آج بھی غائب ہیں۔"

شائلہ نے سر ہلایا۔ "صبح ٹریفک زیادہ ہوتا ہے۔"

"وہ تو ہمارے لیے بھی ہوتا ہے مگر ہاں، تم ابھی اناڑی ہو۔ میں تو آٹھ سال سے گاڑی چلا رہی ہوں۔ اس سے پہلے ڈیڈ کی گاڑی تھی۔"

شائلہ نے اپنے کیبن میں کرسی پر گر کے سکون کا سانس لیا۔ زارا طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اس نے کہے بغیر یہ کہہ دیا تھا کہ تمہارے تو باپ نے بھی گاڑی نہیں دیکھی تھی مگر میرے لیے یہ نئی نہیں۔ ایم ڈی صاحب مہربان نہ ہوتے تو آج بھی تم بس پر آتیں... اور وقت پر... بے بسی سے اس نے اندر والے دروازے کو دیکھا۔ اس کے پیچھے انعام کا کیبن آج بھی خالی پڑا تھا مگر وہ طے کر چکی تھی کہ آج وہ ایم ڈی صاحب کے سامنے اپنا استعفا رکھ دے گی... اور گاڑی کی چابیاں بھی۔ وہ یقیناً وجہ جاننا چاہیں گے۔ وہ صاف بتا دے گی کہ ایسے فارغ بیٹھنا اور کام کیے بغیر تنخواہ لینا اسے قبول نہیں۔ ان کے سپوت کا رویہ بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا چنانچہ اس نے غصے میں ان کے تھپڑ رسید کر دیا اور اب وہ نہیں آ رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ لیکن وہ آ جائیں تب بھی ان کے ساتھ کام کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ وہ مجھے اپنی سیکریٹری نہیں داشتہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کار بھی واپس لے لیں کیونکہ لوگوں کی باتیں اور نظریں مجھے خود اپنی نظر میں گرا رہی ہیں۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگایا اور اپنے لیے کافی بنانے لگی۔ اس پر تھکن اور کسل مندی سوار تھی۔ یہ گزشتہ رات کی پریشان خیالی اور بے آرامی کا بھی نتیجہ تھا۔ صرف ڈیڑھ مہینے میں وقت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ شاید اسی کا نام تقدیر تھا۔ پاپا کے چہلم کو آج ایک ہفتہ ہوا تھا۔ کتنی ناقابلِ یقین لگتی تھی یہ بات کہ ڈیڑھ مہینا قبل وہ زندہ تھے اور ان کو کھو دینے کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک سال پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماما نہیں رہیں گی۔ وہ معمول کے مطابق سو کے اٹھیں تو انہوں نے سردرد کی شکایت کی۔



شائلہ انہیں درد کی گولیاں کھلا کے کالج چلی گئی۔ اس کے فرسٹ ایئر کے سالانہ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ نتیجہ ایک دو روز میں آنے والا تھا مگر کلاسیں شروع ہو چکی تھیں۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پاس ہونے والوں میں اپنا نام نوٹس بورڈ پر پڑھ کے وہ گھر پہنچی تو ماں بے ہوش پڑی تھی۔ چند منٹ بعد ہی انہیں ہوش آیا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں چکر سا آیا تھا اور اب ان کے سر میں شدید درد ہے۔ پھر سردرد کے ان دردوں کے ساتھ ان پر اندھے پن کے دورے بھی پڑنے لگے۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا اندھیرے کے سوا۔ اس نے اپنے کالج میں ایک پروفیسر سے ذکر کیا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔ اگلے دن میڈیکل کالج ہاسپٹل میں ماں کے سی ٹی اسکین سے برین ٹیومر کنفرم ہوا۔ سرجری اور کیموتھراپی کے باوجود صرف دو ماہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ شائلہ پہلے ہی جان چکی تھی کہ یہ لاعلاج مرض ہے اور اپنی تمام ترقی کے باوجود یورپ، امریکا میں بھی میڈیکل سائنس میں... مسیحائی کے دعوے دار انہیں بچا نہیں سکتے۔

اس کے پاپا اکرام الحق صاحب کی کمپنی میں کیشیئر تھے اور انتہائی قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ وہ نام کے ہی کیشیئر تھے ورنہ عملاً وہ کیش ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے اور تمام لین دین کے لیے انہیں چیک جاری کرنے کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ یہ اعتماد برسوں کی آزمائش کا نتیجہ تھا کہ اکاؤنٹ اور آڈٹ والوں کو کبھی ایک پیسے کا فرق نہیں ملا۔ اکرام الحق سے ان کے مراسم کی نوعیت تقریباً وہی تھی جو شاہد علی کی۔ وہ کمپنی کے ملازم نہیں مالک کے دوست سمجھے جاتے تھے اور ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ اکرام الحق اکثر کہتے تھے کہ شمو بیٹی۔ اچھا ہے تو جلدی سے ڈاکٹر بن جا۔ ابھی تو ہم ٹھیک ہیں مگر بوڑھے ہوں گے تو بیمار بھی ہوں گے نا... اور وہ کہتی تھی کہ انکل بوڑھے ہوں آپ کے دشمن۔

الیکٹرک کیتل کی سیٹی نے اسے چونکایا۔ ابل ابل کے پانی خشک ہو چکا تھا۔ اس نے کیتل میں مزید پانی ڈالا اور اپنے لیے کافی بنا کے پھر ان یادوں میں گم ہوگئی جو اس کے دل کا روگ بن گئی تھیں۔ ڈاکٹر بننے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ اس کمپنی میں سیکریٹری بنی بیٹھی تھی اور کچھ نہ کرنے کی تنخواہ وصول کر رہی تھی کیونکہ جو اس کے باس چاہتے تھے، وہ شائلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میڈیکل کالج اسے سیکنڈ ایئر پورا ہونے کے بعد چھوڑنا پڑا تھا اور اب یہ طے تھا کہ نوکری بھی آج

چھوٹ جائے گی۔ کل کیا ہوگا؟ یہ سوچنا شاید قبل از وقت تھا یا وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ پاپا ہوتے تو یہ سب کیوں ہوتا۔ انہوں نے تو ماں کے انتقال کے بعد اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔ سات بیٹوں کے برابر میری ایک بیٹی ہے۔ دیکھنا ایک دن تو کتنی بڑی ڈاکٹر بنے گی اور ملک کا نام روشن کرے گی۔ تیرا اپنا اسپتال ہوگا۔ اوہ پاپا... ساتھ چھوڑنا ہی تھا تو میری آنکھوں کو یہ خواب دینے کی کیا ضرورت تھی؟

پاپا کی تنخواہ معقول تھی لیکن ایک تو انہوں نے اپنی ذمے داریاں بڑھا رکھی تھیں۔ وہ اپنی آمدنی میں سے تقریباً ایک تہائی ہر ماہ کراچی میں اپنے بھائی کی فیملی کو بھیج دیتے تھے۔ ان کے اور بڑے بھائی کے درمیان بائیس سال کا فرق تھا۔ انہیں وہ اپنے والد کی جگہ مانتے تھے اور سب کے سامنے اعتراف کرتے تھے کہ آج وہ جو کچھ بھی ہیں مرحوم کی وجہ سے ہیں۔ وہ نہ چاہتے تو میٹرک بھی نہ کراتے اور مجھے کسی ورکشاپ میں اپرنٹس بھرتی کرا دیتے۔ ان کے بچوں کا مجھ پر قرض ہے۔ یہ قرض چکانے کے بعد جو کچھ پس انداز ہوا، اس سے انہوں نے ایک فلیٹ بک کرالیا تھا۔ قبضہ ملنے تک وہ سات سال اس کی قسطیں بھرتے رہے۔ فراغت کا ایک وقفہ آیا تھا جب ان کی آمدنی بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ خوش حالی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے لیزنگ کمپنی سے ایک نئی گاڑی بھی خرید لی تھی جو خود ان سے زیادہ شائلہ کے استعمال میں رہتی تھی۔ انہیں اکرام صاحب نے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ شائلہ کے تعلیمی اخراجات کا کوئی بار نہ تھا مگر وہ اس کے مستقبل کے لیے پس انداز کرنے کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ بھئی دو کام ہیں... ایک تو اسپتال بنوانا ہے تیرے لیے اور دوسرے شادی کرنی ہے تیری۔ بڑی دھوم دھام سے۔ وہ جان بوجھ کے اسے چڑانے کے لیے کہتے تھے اور اس کے چڑنے پر خوب ہنستے تھے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ان کا سارا اندوختہ چند ماہ میں غبار بن کے اڑ گیا۔ قابلِ علاج نہ ہونے کے باوجود ماں کے مرض پر لاکھوں صرف ہو گئے۔ خودی ان کی اتنی تھی کہ علامہ اقبال کا شعر بھی نیچے لگے۔ انہوں نے فلیٹ پر لون لے لیا مگر اپنے دوست اکرام الحق سے یہی کہتے رہے کہ ابھی ضرورت نہیں۔ خدا بندے سے خود پوچھتا کہ بتا تیری رضا کیا ہے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کے کہتے کہ جو تیری رضا مالک!

وہ نئے سال کے پہلے مہینے کی دس تاریخ تھی جب وہ اپنی ذاتی گاڑی میں بینک سے کیش لا رہے تھے۔ افسروں کی تنخواہ ان کے بینک اکاؤنٹ میں جاتی تھی مگر کم آمدنی والے عملے کو کیش ادائیگی ہوتی تھی۔ یہ پرانا معمول تھا جو کسی وجہ کے بغیر چل رہا تھا ورنہ اب تو کوئی بیس ہزار تنخواہ لینے والا تھا تو چپراسی چوکیدار اور ڈرائیور کی کیٹگری کا عملہ۔ کل رقم بھی کوئی اتنی زیادہ نہ تھی۔ ہر ماہ وہ دو ڈھائی کروڑ کی رقم لاتے تھے تو ان کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ ایک گارڈ جاتا تھا۔ چوری، ڈکیتی اور لوٹ مار کے واقعات عام تھے اور اخبارات نے ایسے واقعات بھی رپورٹ کیے تھے جہاں بینکوں کو خود محافظوں نے لوٹا تھا اور باڈی گارڈز نے مالکوں کو قتل کر دیا تھا۔ یہ پاپا کی فطری توکل اور اعتماد کرنے کی عادت تھی جس نے انہیں بھی ایک قبر میں پہنچا کے خبر بنا دیا۔

آدھے راستے میں پیچھے بیٹھے ہوئے مسلح گارڈ نے ڈرائیور کی گردن پر ریوالور رکھ دیا اور اسے گاڑی کا رخ موڑنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے تعمیل کی۔ بابا نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے ڈرائیور کے ساتھ خود ان کی جان جاتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی زندگی کے مقابلے میں یہ رقم کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اکرام الحق بھی دو ڈھائی کروڑ کے نقصان کو اہمیت نہیں دیں گے چنانچہ پاپا اس گارڈ کو صرف یہ سمجھاتے رہے کہ وہ مطمئن رہے اور اپنے اعصاب پر قابو رکھے۔ پیسا لے لے مگر گولی نہ چلائے۔ بس ان کی بدقسمتی تھی کہ ڈرائیور اپنی جان دے کر بھی مالک کو نقصان سے بچانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتا تھا اور خاموشی سے تعمیل کرنے کے باوجود کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ایک نسبتاً خالی سڑک پر اس نے گاڑی کو ایک دم موڑا اور ایک کوٹھی کے گیٹ سے ٹکرا دیا۔ گاڑی گیٹ کو توڑتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ گارڈ اس کے لیے تیار نہ تھا مگر اس سے گولی چل گئی اور ڈرائیور کے سر میں پیوست ہو گئی۔ اس وقت پاپا کے لیے بھی اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے دفاع میں گارڈ کو پھر گولی چلانے سے پہلے قابو کر لیں۔ وہ جھٹکے سے آگے گئے لیکن پھر اسپرنگ کی طرح پلٹ کے پیچھے گارڈ پر جا پڑے۔ انہوں نے گارڈ کو بے بس کر کے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کی۔ مزاحمت کرنے والے گارڈ کی دوسری گولی پاپا کے پیٹ میں لگی مگر انہوں نے جدوجہد جاری رکھی اس کے نتیجے میں گارڈ کی چلائی ہوئی تیسری گولی اس کی اپنی گردن میں پیوست ہو گئی۔ اس کوٹھی میں موجود اکیلی بدحواس خاتون نے پولیس کو فون کیا مگر پولیس کے آنے تک اس کار میں کوئی زندہ نہ بچا۔ اس خاتون نے صرف کار کو گیٹ توڑ کر اندر آتے دیکھا تھا اور فائر سنے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ کون کس کے فائر





سے ہلاک ہوا تھا۔ پولیس نے بڑی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ تمام نقد رقم جائے واردات سے غائب کر دی اور شک میں اس کوٹھی کے ان ملازموں کو پکڑ لیا جو اس وقت وہاں موجود بھی نہ تھے۔ جو کہانی انہوں نے اخبار والوں کو سنائی یہ تھی کہ رقم کی تقسیم کے معاملے پر تینوں ملزمان کا جھگڑا ہوا اور وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے۔ ریوالور صرف گارڈ کے پاس تھا مگر پولیس نے وہاں سے دو ریوالور مزید برآمد کر لیے۔ ان پر ڈرائیور اور پاپا کے فنگر پرنٹ تھے۔

اس حادثے نے شائلہ کی بجی سجائی زندگی کو ایسے تہس نہس کر دیا تھا جیسے زلزلے نے بالاکوٹ کے بجے سجائے آباد شہر کو الٹ پلٹ کے کھنڈر بنا دیا تھا۔ اچانک اس کا گھر خالی اور ویران ہو گیا۔ اس کے معمولات کا رواں دواں چشمۂ حیات یوں رک گیا جیسے پہاڑ ٹوٹ کر گرنے سے دریا رک جاتے ہیں۔ گھر میں ان کی پرانی ملازمہ نہ ہوتی تو شائلہ اس گھر کی دیواروں میں اتنی ہی تنہا اور محبوس ہوتی جتنے قبر میں اس کے پاپا ہوں گے۔ دن رات وحشت ناک خیالوں کے عفریت اس کا پیچھا کرتے تھے اور اسے ڈراتے تھے۔ وہ راتوں کو اپنے بند کمرے میں یوں چکر لگاتی رہتی جیسے ویرانے کھنڈروں میں چمگادڑیں اور قبرستانوں میں بدروحیں گشت کرتی ہیں۔ خوف اس کے اعصاب کو اپنے شکنجے میں دبوچ لیتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے کمرے کی دیواریں ہل رہی ہیں اور اس پر گرنے کے لیے آگے جھک آئی ہیں۔ دروازے کے باہر اور گھر کے چاروں طرف خونی خنجر لہرانے اور آتشیں اسلحہ اٹھاتے ہوئے خوں خوار شکلوں والے قاتل جمع ہیں۔

وہ نفسیاتی مریض بن گئی تھی اور ڈپریشن کی حدوں سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ تعزیت کے لیے آنے والوں سے رسمی جملوں پر انہیں بے عزت کر دیتی تھی اور ہمدردی کے جواب میں برہمی کا اظہار کرنے لگی تھی۔ لوگ اسے صدمے کا اثر سمجھ کے معاف بھی کر دیتے تھے مگر چند دن بعد اس سے بات کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ اگر خالہ دن رات اس کا خیال نہ رکھتیں تو شاید شائلہ ڈپریشن کے کسی انتہائی بے بس کر دینے والے لمحے سے مغلوب ہو کے خودکشی بھی کر لیتی۔ خالہ کسی رشتے سے اس کی خالہ نہیں تھی۔ وہ محض ایک ملازمہ تھی جو گزشتہ بارہ سال سے ان کے گھر میں تھی اور اسے رفتہ رفتہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ خود خالہ کا اس دنیا میں کوئی ہوتا تو وہ پناہ کے لیے در در کیوں بھٹکتی پھرتی۔ کئی گھروں سے ذلیل ہو کر نکلنے کے بعد بالآخر اسے ایک گھر مل گیا تھا جہاں اس کی عزتِ نفس محفوظ تھی اور اسے احترام دیا جاتا تھا۔

خالہ نے ایک لمحے کے لیے بھی شائلہ کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ دن میں وہ شائلہ کے آس پاس موجود رہتی۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی اور خواہ وہ کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو اس کو کچھ نہ کچھ کھلا دیتی تھی۔ رات کو وہ شائلہ کے کمرے میں نیچے بستر بچھا کے سوتی تھی اور ذرا سی آہٹ پر ہی اٹھ بیٹھتی تھی۔ اس لیے شائلہ کی ساری بدمزاجی برداشت کی اور اس کا سارا دباؤ اپنے اعصاب پر لے لیا۔ سوئم کے بعد اکرام صاحب نے ایک فیملی ڈاکٹر کو بھیج دیا تھا۔ جو دوائیں انہوں نے لکھیں، وہ خالہ نے زبردستی باقاعدگی سے شائلہ کو دیں۔ خالہ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ چھ سات دن بعد شائلہ کی حالت تو سنبھل گئی مگر خالہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ان کے بیمار پڑتے ہی شائلہ کو احساس ہوا کہ اب خالہ اس کے لیے کتنی اہم ہیں۔

اکرام صاحب اور ان کی فیملی اس بحران میں بالواسطہ طور پر شائلہ کے ساتھ تھے۔ وہ سوگ میں بھی شریک تھے اور قانونی معاملات بھی نمٹا رہے تھے۔ ایک ہفتے بعد اکرام صاحب رات کے وقت شائلہ سے ملنے آئے۔

شائلہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ رسمی طور پر شائلہ کا حال پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ آج سے پہلے یہ کچھ مناسب نہ تھا۔ تم بہت اپ سیٹ تھیں اور خود مجھے بھی فرصت نہیں ملی۔ کاروباری معاملات سے زیادہ قانونی مسائل میں الجھا رہا۔ ہاؤ ڈو یو فیل ناؤ؟“

”بس انکل! جینا تو پڑتا ہے۔ پہلے بتائیے آپ چائے لیں گے یا کافی؟“

”اگر آسانی سے مل جائے تو کافی۔ میں کچھ عادی ہوں۔“

”میں لاتی ہوں۔ دراصل خالہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ شائلہ اٹھی۔

”تمہاری خالہ۔ تمہارے ساتھ رہتی ہیں یا آئی ہوئی ہیں؟“

”وہ بارہ سال سے ہمارے ساتھ ہیں۔ میں انہیں خالہ کہتی ہوں۔ گھر کے سارے معاملات وہی سنبھالتی ہیں۔“ شائلہ نے انہیں ملازمہ کہنے سے گریز کیا۔

چند منٹ بعد وہ اکرام صاحب کے لیے کافی اور اپنے لیے چائے لے کر آئی اور ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”آپ نے قانونی معاملات کی بات کی تھی؟“

اکرام صاحب نے کافی کا مگ لے لیا۔ ”ہاں، پولیس نے تفتیش کا ڈراما چلا رکھا تھا۔ وہ یہاں تو نہیں آئے تم سے کچھ پوچھنے؟“

شائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ان کی تفتیش کیا کہتی ہے؟“

”کچھ نہیں، انہوں نے ایک کہانی بنالی ہے۔ اگر تم نے اخبارات میں دیکھا ہو۔“

شائلہ نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا تھا۔ خود اخبارات دیکھنے کا نہ موقع ملا اور نہ مجھے ہوش تھا۔ آج ہی میں نے تین چار دن کے اخبار دیکھے تھے۔ وہ سب سچ نہیں ہوسکتا انکل! آپ جانتے ہیں۔“

”میں بہت اچھی طرح جانتا تھا تمہارے پاپا کو... معلوم نہیں نیت کس کی خراب ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی یا کن مین کی... لیکن یہ بات یقینی ہے کہ تمہارے والد ان کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے مارے گئے۔ پولیس نے ڈھائی کروڑ غائب کیے اور بلاوجہ ان غریب ملازمین کو مجرم بنا دیا جو بدقسمتی سے جائے واردات پر موجود تھے۔ حادثہ کوٹھی کے اندر ہوا تھا، وہ کیسے مدد کے لیے نہ دوڑتے۔ ان کی مالکن عورت ذات اتنی بدحواس تھی۔ اس نے فون ضرور کیا مگر ابھی تک وہ نارمل نہیں ہوئی ہے۔ پولیس نے تین دن ان بے گناہ ملازموں کو مار مار کے ان سے اقبالِ جرم بھی حاصل کر لیا تھا کہ حادثے کے بعد کار میں ڈھائی کروڑ دیکھ کر ان کی نیت خراب ہوگئی تھی، رقم انہوں نے غائب کر دی تھی۔ پولیس یہ رقم برآمد کرانے کے لیے تشدد کرتی رہی۔ رقم خود پولیس والوں نے آپس میں تقسیم کی ہوگی، وہ بے چارے ملازم کیا بتاتے کہ کہاں ہے۔ خیر، میں نے بہت دوڑ دھوپ کر کے ان کی گلوخلاصی کرائی۔ ان کے گھر والے میرے پاس پہنچ گئے تھے، بے چارے غریب لوگ۔“

شائلہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یعنی ابو پر جو الزام انہوں نے عائد کیا...“

”دیکھو، وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کسی کو ملزم یا مجرم بنانے کے لیے ان کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے، منشیات سے اسلحے تک۔ انہیں کہاں معلوم تھا کہ تمہارے پاپا کتنے ایمان دار تھے اور ان کے میرے درمیان اعتماد کا رشتہ کتنا پرانا تھا۔ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر انہیں بھی مجرم بنا دیا۔ ایف آئی آر میں بھی ان کا نام ڈال دیا۔ یہ تو غنیمت جانو کہ انہیں قربانی کے بکرے جائے واردات سے ہی مل گئے۔ حادثہ سڑک پر ہوتا تو وہ لوٹ کا مال برآمد کرنے کے لیے مرنے والوں کے اہلِ خانہ کو اٹھا لیتے۔ یہاں بھی آتے، یہ گھر تمہارا ہے؟“

یہ آخری جملہ سوال نہیں تھا مگر اتنا غیر متوقع تھا کہ شائلہ چونک پڑی۔ ”جی، میرے پاپا نے بک کرایا تھا اور انہی کے نام پر ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، اس پر دس لاکھ کا لون تھا۔“

”جی، دراصل ماما کی بیماری پر کافی اخراجات ہوئے تھے۔ لون لینا پڑا تھا۔ ابھی سال بھر پہلے کی بات ہے، میرا خیال ہے یہ فلیٹ تو بینک اپنی تحویل میں لے کر نیلام کرا دے گا۔ قرض کی وصولی صرف اسی طرح ممکن ہے۔“

اکرام صاحب نے کافی کا خالی مگ نیچے رکھا۔ ”مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہارے پاپا نے مجھ پر ٹرسٹ نہیں کیا۔ اتنا قریبی تعلق ہونے کے باوجود۔ خودی کو بلند رکھنا اچھی بات ہے مگر یہ کمپلیکس بن جائے تو نقصان ہی ہوتا ہے۔“

”اب ان کی فطرت ہی ایسی تھی انکل!“ شائلہ نے مرحوم باپ کا واجبی سا دفاع کیا۔

”میں نے ابھی انفارمیشن لی تو مجھے پتا چلا۔ اب تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک بندے کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ لون کلیئر کرا کے تمام اوریجنل ڈاکیومنٹس لائے اور اس کے بعد قانونی ملکیت تمہارے نام منتقل کرانے کی کارروائی مکمل کرے۔ تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، فلیٹ تمہارا ہے اور رہے گا۔“

”میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔“ شائلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”تم پڑھتی ہو میڈیکل کالج میں... تھرڈ ایئر ہے تمہارا؟“

”جی انکل! لیکن اب مشکل ہے۔“

”کیوں مشکل ہے؟ اخراجات کا مسئلہ ہے یا کچھ اور؟“ انہوں نے پوچھا۔

”دراصل، امی کا انتقال ہوا تو میں نے سیکنڈ ایئر کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس وقت میری اسٹڈی کافی ڈسٹرب رہی۔ میری اٹینڈنس شارٹ ہوگئی۔ ویسے بھی مجھے ڈاکٹر بنانا پاپا کا شوق تھا۔ جس دن ابو کی ڈیتھ ہوئی اس روز پہلا پرچہ تھا۔ ایک ہفتے سے میں اتنی اپ سیٹ تھی کہ باقی پرچے نہیں دیے۔ یہ سال نکل گیا، میں اب اتنی بددل ہوگئی ہوں کہ کالج جانا ہی نہیں چاہتی۔“

”پھر کیا کرو گی گھر بیٹھ کے؟ تمہارے کالج والے تمہیں کوئی رعایت نہیں دیں گے؟“

وہ تلخی سے بولی۔ ”رعایت؟ وہ کوئی رعایت نہیں کریں





گے... اور ویسے بھی میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اب کالج نہیں جاؤں گی۔“

”اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تمہاری مرضی۔ گزارہ کیسے ہوگا؟“

”ظاہر ہے نوکری کروں گی۔ چھوٹی موٹی۔“

”کیا کر سکتی ہو تم؟ تمہاری بیسک تعلیم تو صرف انٹر تک ہے۔“

”میں نے او لیول کیا تھا، میں پڑھا سکتی ہوں۔ میری انگلش اچھی ہے۔ کچھ آرٹیکل لکھے تھے جو شائع ہوگئے، کمپیوٹر سے میں نے خود ہی کمپوزنگ کی تھی۔“

”دیٹ از گڈ! اگر میں تمہیں جاب آفر کروں اپنے ساتھ تو...“

”آپ کو میں انکار کیسے کر سکتی ہوں اور اس سے اچھی بات میرے لیے ہو بھی کیا سکتی ہے۔ میں بی اے کر لوں گی اور پھر ایم اے، انگلش میں۔ میرا رجحان لٹریچر کی طرف زیادہ ہے۔“

”بس تو پھر کل آجاؤ۔ باقی باتیں آفس میں ہوں گی۔ صبح آٹھ بجے گاڑی تمہیں پک کرنے آجائے گی۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگلی صبح وہ آفس پہنچی تو سب کچھ تیار تھا۔ اس کے اپائنٹ منٹ لیٹر میں تنخواہ پچاس ہزار اور جاب ”سیکریٹری ٹو ڈپٹی ایم ڈی“ لکھا ہوا تھا۔ دیگر مراعات میں چھ سالانہ بونس، پک اینڈ ڈراپ، میڈیکل وغیرہ سب ملا کے اس کی ماہانہ آمدنی اسی نوے ہزار کے درمیان بنتی تھی۔ وہ سخت الجھن میں پڑ گئی۔ نہ وہ انکار کر سکتی تھی اور نہ یہ سمجھ سکتی تھی کہ اتنی بڑی تنخواہ کی مستحق ہے۔ یہ صرف اکرام الحق صاحب کی ذاتی عنایت تھی اور اس کے پاپا سے مراسم کا نتیجہ۔ اکرام الحق اپنے دوست سے مرنے کے بعد بھی دوستی نبھا رہے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وضع داری کو دوسرے لوگ کس نظر سے دیکھیں گے اور کیا باتیں کریں گے۔ دوسرے اسٹاف کو سینیارٹی کی بنیاد پر کار لون کی سہولت تھی مگر صرف ایک ہفتے بعد ایک نئی مہران کار شائلہ کے نام پر رجسٹر کرا دی گئی تو خاموش احتجاج اور بدگوئی کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس احتجاج کو اکرام الحق صاحب نے یکسر مسترد کر دیا۔ ”تم چپ کر کے اپنا کام کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ کون کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے، اگر کوئی تم سے براہِ راست کہے تو مجھے بتانا۔ پیٹھ پیچھے باتیں کرنے والوں کو بولنے دو۔“

انعام الحق نے ”لمس“ LUMS سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری لی تھی اور اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے وہ جائز طور پر اس کمپنی کا ڈپٹی ایم ڈی تھا۔ کل کو اسے ہی ایم ڈی بھی بننا تھا چنانچہ اس کی حیثیت کسی طرح بھی اکرام صاحب سے کم نہ تھی۔ اصل فرق باپ، بیٹے کی صورت شکل کا ہی نہیں، رویے کا بھی تھا۔ انعام ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا جسے کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ادھر باپ تھا کہ نہ اس سے بازپرس کرتا تھا اور نہ اس پر کسی قسم کی ذمے داری ڈالتا تھا۔ اس کی ہر جائز اور ناجائز فرمائش خود بخود پوری ہو جاتی تھی۔ اب تک اسے کسی پرسنل سیکریٹری کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شائلہ کے لیے یہ عہدہ ہی ایک آزمائش بن گیا۔

پہلے دن ہی شائلہ کو دیکھ کے وہ چونکا اور لوفروں کے انداز میں سیٹی بجائی۔ ”مس شائلہ! واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز... میری سیکریٹری تم ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔“

”اس میں یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے سر! میرا تقرر آپ کے فادر نے کیا ہے۔“

”ڈونٹ کال می سر... اور تم کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہارے والد کی وفات پر میں خود تمہارے گھر تعزیت کرنے نہ آسکا۔ ہی واز اے گریٹ مین۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔“

”تھینک یو۔ ابھی تک مجھے اپنی ڈیوٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔“

”اتنی جلدی کیا ہے شمی۔ چلو جاؤ، پہلے کافی بنا کے لاؤ... اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔“

”میں کافی نہیں پیتی سر! اور میرا نام شائلہ ہے۔“

”اوکے شائلہ! یہ تمہارے باس کا حکم ہے۔ میں نے سنا ہے تم کافی بہت اچھی بناتی ہو... آج پی کے دیکھو۔“

شائلہ نے مجبوراً کڑوی کسیلی کافی پی لی۔ لیکن اس دن کے بعد انعام کا رویہ روز بروز جارحانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی پوزیشن اور شائلہ کی مجبوری کا دہرا فائدہ اٹھاتا تھا۔ کبھی وہ اس کا باس بن جاتا تھا اور اسے انعام کے حکم کی تعمیل کرنی پڑتی۔ کبھی وہ دوستانہ عاجزی کا رویہ اختیار کر لیتا تھا اور وہ اخلاقاً اسے انکار نہیں کر پاتی۔

ظاہر ہے اس کی درخواست یا حکم کے جواب میں شائلہ کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

چند دن بعد اکرام الحق صاحب اس کے پاس آئے۔ ”کیوں بھئی... سب ٹھیک چل رہا ہے؟“

”جی سر!“ وہ بڑی فرماں برداری سے بولی۔

"دیکھو، تم مجھے دہری شخصیت کے چکر میں مت ڈالو۔ میں باہر انکل ہوں تو یہاں سر کیسے ہوسکتا ہوں تمہارے لیے۔ تم نے بتایا تھا مجھے کہ تم نے کچھ آرٹیکل لکھے تھے؟"

"جی... زیادہ تو نہیں۔"

"کس موضوع پر؟" وہ بیٹھ گئے۔ "یہ الّو کا پٹھا نہیں آیا آج؟"

شمائلہ نے اپنے باس کے خالی کیبن کو دیکھا۔ "وہ تھے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پر۔ سماجی رویّوں پر۔"

"گڈ۔ ویری گڈ! دراصل میں بھی اب سوچ رہا ہوں کہ کچھ فلاح و بہبود کے پروجیکٹس پر کام کیا جائے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے فوراً کیتلی کو آن کردیا۔ "بہت اچھا سوچا ہے آپ نے۔"

"سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا، کام تمہیں کرنا ہے۔ تم وہ آرٹیکل دکھاؤ مجھے لاکے اور مجھے کوئی پلان دو۔ اس کی پوری فیزیبلٹی رپورٹ۔"

شمائلہ کو ایک حقیقی روحانی مسرت ہوئی۔ "فائنل لمٹ کیا ہوگی سر۔ انکل!"

"میرا خیال ہے بجٹ پروفٹ کا دس فیصد... فنانس والے تمہیں صحیح فیگر دیں گے۔ مجھے چوائس بھی دینا... کم سے کم دو... ورنہ تین آئیڈیاز پھر ہم بیٹھ کے ڈسکس کریں گے اور جو سب سے بہتر لگے گا..."

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ کافی کا مگ لے کر سڑک کا ویو دینے والی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ کھڑکی چھ فٹ بائی آٹھ فٹ کی تھی جس کے دو سلائڈنگ پٹ تھے مگر وہ بند رہتے تھے اور اس کے سامنے المونیم کی پٹی کے اوپر لگے بلائنڈز کو ایک ڈوری کھینچ کر برابر کیا جاتا تھا تو شفاف روشن شیشے کی جگہ ایک خوب صورت لینڈ اسکیپ کا منظر سامنے آجاتا تھا جس میں کسی آبشار کا جھاگ اڑاتا منظر... سرسبز پہاڑ اور آسمان کی شوخ نیلاہٹ میں دھنک کے رنگ نظر آتے تھے۔

شمائلہ نے بھی بس ایک چھناکا سنا پھر کرچی کرچی ہو جانے والا شیشہ اس کے چاروں طرف ٹیبل پر اور قالین پر... کرسی پر اور بک شیلف پر پھیل گیا۔ تیز دھار والے چند ٹکڑے شمائلہ کے بازو پر اور گردن پر لگے۔ وہ اٹھ کے کھڑکی کی طرف دوڑی۔ پیچھے پڑے ہوئے اکرام صاحب نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا اور چلّا کے کہا۔ "بے وقوف! مرنا ہے... یہ فائر تھا۔"

وہ نیچے گر گئی۔ دہشت سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور بدن کانپنے لگا... اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں... میں نے... دیکھ لیا اسے انکل۔"

"کیسے دیکھ لیا؟" اکرام الحق نے اٹھ کے احتیاط سے شیشے کے ذرات کو جھٹکا اور پھر دروازہ کھول کے سیکیورٹی گارڈز کو آواز دی۔

"وہ... ایک سلور گرے شیراڈ تھی۔ اس میں بیٹھ کے فرار ہو رہا تھا۔"

"سلور گرے شیراڈ؟ تمہیں کیسے معلوم کہ فائر اس نے کیا تھا؟"

"میری نظر پڑ گئی تھی... پھر آپ نے مجھے کھینچ لیا... میرا خیال ہے اس نے اپنی رائفل پیچھے پھینکی تھی۔"

اکرام صاحب نے شیشے کے خلا سے باہر دیکھا۔ "تم اتنے یقین سے تو نہیں کہہ سکتیں۔"

"وہ گاڑی... روز نظر آتی تھی مجھے... آپ دیکھ لیں... سامنے دکانوں کی پوری قطار ہے مگر بیچ میں ایک خالی پلاٹ ہے۔ اس کی دیوار کے عین سامنے یہ کھڑکی ہے۔ مگر وہ کون ہوسکتا ہے انکل!"

"کوئی مجھے یا تمہیں کیوں شوٹ کرنا چاہے گا؟" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ "ایسا تو میرا کوئی دشمن نہیں... تمہارا ہے؟"

"میرا... نہیں انکل!" اس نے گھبرا کے جواب دیا۔

"او کے۔ پھر کسی سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ سیکیورٹی والے خود دیکھ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تم گھر جاؤ۔" وہ باہر نکل کے سیکیورٹی اسٹاف کے انچارج سے بات کرنے لگے۔ حیرت انگیز طور پر نہ وہ نروس تھے اور نہ غصے میں۔ وہ نارمل لہجے میں بات کر رہے تھے جیسے وہ خود پر قاتلانہ حملے کی بات نہیں کر رہے ہوں، یہ بتا رہے ہوں کہ کسی شریر بچے نے پتھر پھینک کے شیشہ توڑ دیا ہے۔ "اسے بدلوا دو لیکن اب جو شیشہ لگایا جائے بلٹ پروف ہونا چاہیے۔"

وہ دو دن زارا کے ساتھ بیٹھی کیونکہ اس کا اپنا کیبن تفتیش کا مرکز بنا ہوا تھا اور سیکیورٹی والے باہر کی طرف... بلٹ پروف شیشے لگانے کا انتظام کر رہے تھے۔ اکرام صاحب نے تفتیش کے لیے آنے والے ایک ڈی ایس پی کے سامنے مختصر سا بیان دیا۔ "میں نے زندگی میں صرف دوست بنائے ہیں۔ دشمن کوئی نہیں میرا۔"

ڈی ایس پی نے روایتی اصرار کیا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے سر! آپ ایسا سمجھتے ہیں۔ ورنہ ذاتی نہ سہی کاروباری دشمنی تو





ضرور ہوتی ہے۔"

"آپ بضد ہیں تو معلوم کرکے بھی بتائیں کہ ایسا کون سا دشمن ہے میرا۔"

"ابھی گزشتہ ماہ آپ کا کیشیئر مارا گیا تھا، گن مین اور ڈرائیور کے ساتھ۔"

اکرام صاحب نے سر ہلایا۔ "وہ کیس تو ابھی کلوز نہیں ہوا۔"

"ہاں مگر تفتیش آپ نے رکوادی۔ ملزم ہم نے پکڑے تھے۔"

اکرام صاحب طنز سے مسکرائے۔ "ملزم... جس پر آپ کو شک تھا کہ ڈھائی کروڑ لے گئے؟ چودہ دن کا فزیکل ریمانڈ لینے کے بعد آپ نے کیا حال کیا تھا ان کا... مگر کیا آپ ایک روپیا بھی برآمد کرسکے؟ میں مداخلت نہ کرتا تو وہ جان سے جاتے۔ آپ کا کیا ہے، وہی خودکشی والی پرانی کہانی سنا دیتے میڈیا کو۔ اگر آپ اس کیس کا اس قاتلانہ حملے کی واردات سے کوئی لنک ثابت کرسکتے ہیں تو بسم اللہ... اپنا شوق پورا کریں۔"

"آپ کا رویّہ عدم تعاون کا ہے اکرام صاحب! یہ کمرا آپ کے ڈپٹی ایم ڈی کا ہے جو اتفاق سے آپ کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ لیکن کھڑکی ان کی سیکریٹری مس شمائلہ کے کمرے کی ہے۔"

"اس روز وہ نہیں آئی تھی اور میں نے اس سے خود پوچھا تھا۔ اس کی کسی سے دشمنی نہیں۔ وہ بچی ہے ابھی۔"

ڈی ایس پی طنز سے مسکرایا۔ "آپ کی نظر میں۔ ورنہ وہ تھرڈ ایئر میڈیکل کی طالبہ تھی۔ اس کی عمر ہے بائیس سال اور وہ بہت خوب صورت ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"رقابت میں قتل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کو کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کے کتنے یار تھے۔"

اکرام صاحب نے برہمی سے کہا۔ "اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہو۔ وہ میری بھتیجی بھی ہے۔ اور ایک بات بتاؤ مجھے۔ تمہاری کوئی بیٹی ہے اس عمر کی؟ اگر ہے تو کیا تم جان سکتے ہو کہ اس کے کتنے یار ہوں گے؟ ایک باپ کے اپنی بیٹی کے بارے میں سارے اندازے غلط ہوتے ہیں۔"

ڈی ایس پی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "اگر آپ نہیں چاہتے کہ تفتیش کی جائے تو پھر رپورٹ کرنے کا مقصد کیا تھا؟"

"اگر کوئی غلطی کی تھی میں نے تو آپ جاسکتے ہیں۔ میں اپنی رپورٹ واپس لے لوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر نتائج کے ذمے دار بھی آپ خود ہوں گے اور خدانخواستہ کل کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے تو میڈیا میں آپ پولیس پر الزام نہیں لگائیں گے کہ انہوں نے دلچسپی نہیں لی اور تفتیش نہیں کی۔"

کیس ختم ہوگیا۔ سیکیورٹی والوں نے باہر کی طرف مزید کیمرے نصب کردیے جو ہر وقت کسی سلور گرے شیراڈ پر نظر رکھتے تھے مگر وہ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ مگر شمائلہ کے باس انعام الحق کو بہانہ مل گیا۔

"آپ ابھی کچھ دن میرے ساتھ بیٹھو' اسی کمرے میں۔"

"نہیں سر! مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ فائر کسی نے کیا تھا تو انکل پر۔"

انعام مایوس نظر آنے لگا۔ "میں نے کہا ہے کہ آپ کو ایک ڈرائیور فراہم کردیا جائے جو سیکیورٹی گارڈ بھی ہو اور چوبیس گھنٹے..."

"مجھ سے پوچھے بغیر آپ کو میرے لیے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں سر!" وہ باہر نکل گئی۔

انعام نے دوسرے دن ہی اپنا رویّہ بدل لیا۔ "تم اتنی خفا کیوں رہتی ہو ہر وقت؟"

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔ میں ہر روز آپ کے ساتھ بیٹھ کے کافی پیتی ہوں... آپ کے حکم پر۔"

"یہی تو خرابی ہے ساری... اپنی مرضی سے تم کبھی کوئی بات کرنے بھی نہیں آئیں۔"

شمائلہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں یہاں کام کرنے آتی ہوں، باتیں کرنے نہیں۔"

انعام کھسیانا ہوگیا۔ "اچھا چھوڑو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم اخباروں میں مضامین بھی لکھتی ہو۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کتنی عالم فاضل ہو تم۔"

"وہ سب آپ کے ڈیڈی کے پاس ہیں۔ وہ پڑھ رہے ہیں۔ آپ ان سے لے سکتے ہیں۔"

شمائلہ محسوس کرتی تھی کہ انعام کی پیش قدمی بڑی ڈھٹائی سے جاری ہے۔ وہ اس کے ساتھ رکھائی سے پیش آسکتی تھی، بداخلاقی یا بدتمیزی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے والد کو یقیناً دکھ ہوتا... شمائلہ نے ایک این جی او بنانے کے لیے جو تجاویز مرتب کی تھیں، ان میں بھی انعام ہی سب کچھ تھا۔ انعام ہر دوسرے تیسرے دن آتا تو اس سے بے تکلفی میں ایک قدم آگے بڑھنے کا نیا بہانہ تلاش کرلیتا تھا۔ پہلے وہ شمائلہ

کے مضامین، اس کی معلومات اور اس کے زورِ بیان کی تعریف کرتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے این جی او کے منصوبے کی فائل اٹھا کے ایک طرف ڈال دی۔

"چھوڑ دیجیے اس منصوبے کو۔ میں ڈیڈی کو بتا دوں گا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔"

شائلہ نے حیرانی سے کہا۔ "کیوں؟ اچانک ایسا کیا ہو گیا؟"

"اچانک کچھ نہیں مس شائلہ! ہم ایک ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ خواہ آپ باس ہوں۔"

"آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔ کہ آپ ایسا سمجھنے لگے ہیں؟"

"اچانک؟ اچانک کچھ نہیں۔ ایک حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں نے بہت کوشش کی تمہیں راضی رکھنے کی۔۔ بلکہ تمہیں خوش کرنے کی مگر تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔"

"بالکل غلط خیال ہے آپ کا۔ میں آپ سے نفرت نہیں کرتی۔"

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "واقعی شائلہ! تمہیں پروا ہے میری؟"

"بالکل ہے۔"

"اچھا۔ میں ایک بات کہوں، مانو گی؟"

"میں آپ کی ہر بات ماننے کی پابند ہوں۔" شائلہ نے محتاط ہو کے کہا۔

"اچھا، یہ جو رنگ آج پہنا ہے تم نے۔ یہ تم پر اتنا اچھا نہیں لگتا، جتنا وہ نیلا رنگ جو تم نے کل پہنا تھا۔ کیا تم کل نیلے رنگ کی ساڑی باندھ کے آ سکتی ہو۔۔ میرے لیے؟"

شائلہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں دفتری معاملات کی بات کر رہی تھی۔ لباس کا انتخاب میرا نجی معاملہ ہے اور میں کسی کی پسند ناپسند کی پابند نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ نہ میں نے کبھی ساڑی باندھی ہے اور نہ میرے پاس نیلی ساڑی ہے۔"

وہ ڈھیٹ بن کے بولا۔ "نو پرابلم... ہم ابھی لبرٹی چلتے ہیں۔ ایک نہیں دس ساڑیاں منتخب کر لو۔ زارا تمہیں باندھنا سکھا دے گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پھر آپ زارا سے ہی اپنا شوق پورا کرا لیں... اسے لے جائیں لبرٹی۔"

دو دن بعد اس نے معافی مانگ لی۔ "آئی ایم سوری... مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دوں۔ پلیز مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ کی ناراضی سے میں بہت اپ سیٹ ہوں۔"

"اٹ از او کے انعام صاحب!"

"چلیے پھر ہم وہ این جی اوز کا منصوبہ مکمل کرتے ہیں۔ ڈیڈی پوچھ رہے تھے کہ کیا پروگریس ہے۔"

شائلہ اکثر غور کرتی تھی کہ آخر وہ نفرت کی حد تک انعام کو ناپسند کیوں کرتی ہے؟ وہ نوجوان ہے، تعلیم یافتہ ہے، دولت مند ہے اور اس پر دیوانگی کی حد تک فریفتہ ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بدصورت ہے۔ اس کے انداز و اطوار میں ایک غیر مہذب وحشیانہ پن ہے۔ وہ عیاش طبع ہے۔ اس کے قرب سے ایسی بو آتی ہے جیسی چڑیا گھر میں ریچھ کے پنجرے سے اٹھتی ہے۔ آخر وہ اکرام صاحب جیسا کیوں نہیں ہے؟

بات بہت جلد شائلہ کی سمجھ میں آ گئی۔ جیسے محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے ایسے ہی نفرت بھی کسی وجہ کے بغیر ہو جاتی ہے اور انعام سے نفرت کو محبت میں بدلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی...

اس ہفتے میں دوسرا واقعہ پیش آیا جس نے ان سب کے اطمینان اور احساسِ تحفظ کی بنیادیں ہلا کے رکھ دیں۔ اس شام وہ اکرام صاحب کے گھر میں تھی اور وہ اپنی شادی کی سالگرہ منا رہے تھے۔ یہ ایک نجی تقریب تھی جس میں شائلہ کے سوا کسی کو بھی مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ جب اکرام صاحب اور ان کی بیگم ایک ساتھ کیک کاٹنے کے لیے تیار تھے اور شائلہ کیک پر لگی ہوئی موم بتی کو روشن کر رہی تھی... ایک ساتھ دو واقعات ہوئے۔

اکرام صاحب کا پالتو بڑے بڑے بالوں والا چھوٹا سا کتا ان سب کے درمیان اِدھر سے اُدھر پھرتا رہتا تھا۔ وہ ایک مہذب کتا تھا جس نے کبھی کوئی غیر شائستہ یا نقصان پہنچانے والی حرکت نہیں کی تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے ایک صوفے کے بازو پر سے جمپ لگائی اور اڑتا ہوا سیدھا کیک پر آ گرا۔ اس ایک لمحے میں اکرام صاحب نے بھی چلا کے کہا۔ "سویٹی۔ آر یو میڈ؟" ان کی بیگم نے چیخ ماری۔ وہ سب ایک لمحے کے لیے بے اختیار اِدھر اُدھر ہوئے اور اسی ایک لمحے میں پہلے فائر کی آواز آئی۔ پھر سویٹی چیخ مار کے اچھلا اور کیک پر گر کے تڑپنے لگا۔ گولی اس کی گردن سے گزر کے سامنے والی دیوار پر آویزاں تصویر کے فریم پر لگی تھی۔ شیشہ بکھر گیا تھا اور فریم نیچے گر گیا تھا۔

دوسرے لمحے اکرام صاحب نے چلا کے کہا۔ "ڈاؤن... ایوری باڈی۔" ان کے ساتھ ہی کمرے میں موجود تمام افراد فرش پر گر گئے۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ مین





گیٹ پر اور چھت پر متعین سیکیورٹی گارڈز حرکت میں آ گئے۔ تمام سرچ لائٹس آن ہو گئیں۔ ہر زاویے پر نصب کلوز سرکٹ کیمرے کی ریکارڈنگ کو مانیٹر پر چلا کے دیکھا گیا۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ کوٹھی کے احاطے کی بیرونی دیوار آٹھ فٹ بلند اور بہت مضبوط ہے۔ اس کے اوپر نصب خاردار تاروں میں رات کو کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے مگر اس میں ایک جگہ دراڑ پڑی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے عین مقابل سال بھر پہلے بم کا دھماکا ہوا تھا۔ سامنے والے گھر کو کسی دہشت گرد نے کرائے پر لیا تھا مگر اسے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ مخبری پر پولیس نے اس کا محاصرہ کر لیا اور جب راہِ فرار نہ رہی تو دہشت گرد نے خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ یہ دراڑ اسی وقت پڑی تھی۔ دھماکے سے آس پاس کے تمام گھروں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ بیرونی دیوار کی دراڑ جو نیچے سے اوپر تک جاتی تھی پوری دیوار پر پھیلی ہوئی خوب صورت سرسبز بیل کے نیچے چھپ گئی تھی۔ فائر کسی نے اسی دراڑ میں سے نشانہ لے کر کیا تھا۔ فائر کرنے والا دراڑ میں سے بیرونی کمرے کے وسیع شیشے سے اندر کا پورا منظر دیکھ رہا تھا اور عین اسی وقت جب گولی اکرام الحق صاحب کے سر یا سینے میں پیوست ہونے والی تھی، اجل کا نادیدہ ہاتھ ایک معصوم بے زبان کتے کو گولی کی راہ میں نہ اچھال دیتا تو وہ قاتل اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا۔

جب صورتِ حال قابو میں آئی تو وہ سب خوف زدہ کشیدہ اعصاب اور دکھی چہرے کے ساتھ میز کے گرد کھڑے اس جاں نثار کتے کی خون آلود لاش کو دیکھتے رہے جس کے لہو کی سرخی نے کیک اور اس پر لکھے ہوئے ہیپی میرج کے الفاظ کو پوری طرح ڈھک لیا تھا۔ اکرام صاحب کی بیگم بے سدھ کھڑی کانپ رہی تھیں۔ پھر وہی ہوا جو لازمی تھا۔ انعام نے پولیس کو طلب کیا اور اکرام صاحب نے دیگر انتظامات کو سنبھالا۔ ملازم کمرے کو صاف کرنے میں لگ گئے اور سالگرہ ایک ایمرجنسی میں بدل گئی۔ دوسروں کو پُرسکون رکھنے کے لیے خود پُرسکون نظر آنے والے اکرام صاحب اندر سے سخت ڈسٹرب تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کون ہے جو ان کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جو ہر شخص کے ذہن میں تھا اور بار بار پوچھا بھی گیا۔ اس سوال سے زیادہ خوفناک یہ خیال تھا کہ دو بار اتفاق سے ناکام ہو جانے والا نامعلوم قاتل تیسری کوشش بھی کرے گا... اور ضروری نہیں کہ وہ پھر ناکام ہو۔

اس بار پولیس نے تفتیش میں زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ خفیہ ایجنسی والوں پر بھی اکرام صاحب نے پورا دباؤ ڈالا۔ اس کے نتیجے میں صرف ایک بات ثابت ہوئی۔ شائلہ نے جو پہلی بار دیکھا تھا وہ غلط نہ تھا۔ ایک کیمرے کی ریکارڈنگ میں ایک نوجوان بھاگتا نظر آیا مگر اس کی صرف پشت دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس کو تفتیشی افسران نے رائفل ثابت کیا۔ وہ ایک کار میں بیٹھا جو سلور گرے شیراڈ تھی۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ نوجوان کی صورت کا عکس تک نظر نہ آیا۔ گاڑی کا نمبر تھا ہی نہیں۔ لائٹ اتنی کم تھی کہ نمبر پلیٹ موجود ہوتی تب بھی نمبر نہ پڑھا جاتا۔ کیمرے نے ایک دھندلا سایہ سا ریکارڈ کیا۔ حفاظتی انتظامات بڑھا دیے گئے۔ تفتیش کئی مہینے جاری رہی مگر زندگی کے معمولات ایک ہفتے بعد پہلے جیسے ہو گئے۔

دو ہفتے بعد شائلہ نے انعام کو بے حد افسردہ دیکھ کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے انعام؟" انعام کے بے حد اصرار پر شائلہ نے اسے سر کہنا چھوڑ اتھا۔ پھر وہ بضد ہوا کہ اسے انعام صاحب نہ کہا جائے کیونکہ وہ ایم ڈی صاحب کو آفس میں بھی انکل کہتی ہے۔

انعام نے ایک آہ بھری۔ "خیریت کسے کہتی ہو تم۔ یہ کہ میں زندہ ہوں؟"

"میرا مطلب تھا' تم بہت غمزدہ نظر آ رہے۔"

"غم کے سوا میری زندگی میں ہے ہی کیا۔ خوشی کیا ہوتی ہے' میں کیسے جان سکتا ہوں۔ جس کی خوشی کو آج تک کسی نے اہم نہیں سمجھا۔ جسے کبھی خوشی کسی نے نہیں دی۔"

"تمہارا ایسا سوچنا بالکل بے سبب ہے۔"

"کیوں؟ تم کیا کرتی ہو میری خوشی کے لیے۔۔ کون سی بات مانتی ہو میری؟ اگر تم نے میری خوشی کے لیے نیلی ساڑی باندھ لی ہوتی تو کون سی قیامت آ جاتی؟ یا تمہاری شان گھٹ جاتی... میری ایک معصوم سی التجا کو مسترد کر کے تم نے جانتے بوجھتے مجھے دکھ پہنچایا۔ سنو، آج تین دن ہو گئے تم نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں نے کہا نہیں تو کافی بھی نہیں پی تم نے میرے ساتھ بیٹھ کے۔ تم جانتے بوجھتے مجھ سے دور رہتی ہو۔ کھانا تمہیں میرے ساتھ کھانا چاہیے۔ میرے ساتھ جانا چاہیے۔"

"انعام! لوگ ایسی باتوں کا غلط مطلب نکالتے ہیں۔"

"ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟ یہاں سب جانتے ہیں کہ میں اور تم کزن ہیں اور کچھ تو ایسا بھی سمجھتے ہیں کہ ایک دن میں اور تم ہی مالک ہوں گے۔ جب

ڈیڈی نہیں ہوں گے۔"

اس کا مطلب سمجھ جانے کے باوجود شمائلہ نے کہا۔ "اس کا کوئی امکان نہیں۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ "ٹھیک کہتی ہو تم۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ ڈیڈی مجھے اپنا جانشین بنائیں۔ وہ بھی نفرت کرتے ہیں مجھ سے دکھاوے کی محبت تو میں سمجھتا ہوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ تم ان کے بیٹے ہو' اکلوتے بیٹے۔"

"اسے وہ اپنی مجبوری سے زیادہ بدقسمتی سمجھتے ہوں گے۔ دوسری شادی سے ان کی توقعات پوری ہو جاتیں تو وہ مجھے اپنے گھر سے بھی بے دخل کر چکے ہوتے۔"

"انعام! ایسا کیوں سوچتے ہو آخر تم؟ سب کچھ کیا ہے انہوں نے تمہارے لیے۔"

"بلاوجہ ان کی وکالت مت کرو۔ قصور ان کا نہیں اس عورت کا ہے جس نے مجھے جنم دیا تھا۔ میری بدبختی کی پہلی علامت خود میری ماں بنی۔ آج اس وقت جب میں یہاں ڈپٹی ایم ڈی بنا بیٹھا ہوں، وہ برطانیہ کی کسی جیل میں پڑی سڑ رہی ہے۔ بیماری جھیل رہی ہے یا نفسیاتی مریض بن چکی ہے۔ نشہ بھی کرتی ہوگی اور جسم کی بھوک مٹانے کے لیے۔"

"پلیز! مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔" شمائلہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"ورنہ کیا تم ڈیڈی سے کہو گی؟ جاؤ، ابھی کہہ دو۔ بہت خوش ہوں گے وہ بھی یہ سب سن کے۔ آخر کیا سوچ کے انہوں نے ایک سکھ عورت سے شادی کی تھی، میری ماں کوئی معزز خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت بھی تو ہو سکتی تھی۔ جیسی کہ ان کی دوسری بیوی ہے۔ میں کیسے اس احساس سے چھٹکارا پاؤں جو میرے لیے دن رات کی اذیت کا سبب ہے؟ میرا وجود خود اپنے لیے قابلِ نفرت ہے تو میرے باپ کے لیے کیوں نہیں ہوگا۔ خود تم بھی مجھ سے اسی لیے نفرت کرتی ہو کہ تمہاری نظر میں اکرام صاحب میرے اصل والد نہیں۔ میں ان کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہوں۔ ان کی کوئی بات بھی نہیں مجھ میں۔ ایسا ہی وہ بھی سمجھتے ہوں گے۔"

شمائلہ نے بہتر سمجھا کہ واک آؤٹ کر جائے۔ مگر وہ شمائلہ کے پیچھے آ گیا۔ "شمائلہ پلیز! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں ناراض کر دیا۔ میں بہت بے وقوف ہوں۔"

شمائلہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ قابلِ رحم تھا۔ ایک نفسیاتی مریض بھی بن چکا تھا۔ اس کو ہمدردی اور توجہ کی ضرورت تھی لیکن وہ خود بھی مجبور تھی۔ انعام اس ہمدردی اور توجہ کا مطلب کچھ اور نکالتا۔ وہ بڑی مشکل صورت حال میں پھنس گئی تھی۔ نہ وہ نوکری چھوڑ سکتی تھی، نہ اکرام صاحب سے شکایت کر سکتی تھی اور نہ انعام کو سمجھا سکتی تھی۔ اس نے اپنے رویے میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ شاید جو بات بے رخی اور نفرت کا اظہار کر کے نہیں سمجھائی جا سکتی، وہ محبت آمیز رویے سے انعام پر واضح ہو جائے۔ جانتے بوجھتے انعام کو نفرت سے دھتکارنے کا نتیجہ الٹا ہوگا۔

اس نے بڑی تلاش کے بعد نیلے رنگ کی ساڑی تلاش کی۔ زارا کی مدد سے اسے باندھنا سیکھا اور تیسرے دن صبح اچانک انعام کے سامنے پہنچ گئی۔ اس پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ دم بخود پلک جھپکائے بغیر شمائلہ کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں کیا بتاؤں شمائلہ! تم کتنی حسین لگ رہی ہو۔"

"دیکھو، میں نے تمہاری خوشی پوری کر دی۔ تمہیں اب مجھ سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ ایک دم اٹھا اور اس کے پاس آ کے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ شمائلہ کا ہاتھ تھام کے اس نے سر جھکا دیا۔ "میری ایک التجا قبول کر دگی؟"

وہ نروس ہو گئی۔ "یہ کیا تماشا ہے انعام! کوئی آ گیا تو کیا سمجھے گا؟"

"جس کا جو دل چاہے سمجھے اور کہے۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔" اس نے شمائلہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا یا۔

شمائلہ کے لیے اٹھنا بھی ممکن نہ رہا اور وہ اپنا ہاتھ چھڑانے سے بھی قاصر تھی۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ "انعام! خدا کے لیے۔ اپنی نہیں تو میری عزت کا ہی کچھ خیال کرو۔"

"میں نے کہا تھا۔ ایک التجا ہے میری... آخری التجا۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"اچھا... اچھا... بولو۔"

"وعدہ کرو تم انکار نہیں کرو گی۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

شمائلہ کو یاد آ گیا کہ اس نے خود سے کیا عہد کیا تھا۔ وہ انعام کے پاگل پن کا علاج نفرت اور بے اعتنائی سے نہیں' توجہ اور محبت سے کرے گی۔ "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

"آج رات تم میرے ساتھ ڈنر کرو گی۔" اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا نام لیا۔ "اس کے چاندنی لاؤنج میں۔"

"او کے... او کے! میں آ جاؤں گی۔ اس شرط پر کہ ایسا پہلی اور آخری بار ہوگا۔"

"میں خود تمہیں لینے آجاؤں گا۔" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "تھینک یو شائلہ!"

شائلہ نے خود کو قائل کیا کہ انعام کوئی غیر نہیں تھا اور اس کے ساتھ ڈنر کے لیے جانے میں خطرے کی بات بھی نہیں۔ وہ باس ہے اس کا مگر اس سے زیادہ وہ اس کے محسن اکرام انکل کا بیٹا ہے۔ باس کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر جانے والی لڑکیوں کے بارے میں ماتحت اسٹاف جو بھی اخلاقی فیصلہ صادر کرے اسے فرق نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ حقیقت صرف وہ جانتی ہے اور جو کچھ وہ کر رہی ہے اس کا مقصد نیک ہے۔

وہ شام کو چھٹی کے بعد گھر پہنچی تو گاڑی سے اترتے وقت اس نے پچھلی سیٹ پر سرخ ربن سے بندھا ہوا ایک پیکٹ دیکھا جو گولڈن پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں جاکے اسے کھولا تو اس کی توقع کے مطابق اندر سے ایک بہت خوب صورت اور بیش قیمت شوخ نیلے رنگ کی ساڑی نکلی جس کے کام میں سنہری رنگ کی جھلمل تھی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ ساڑی بہت بیش قیمت ہے لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ عین اس کے جسم کی ساخت کے مطابق بلاؤز انعام نے کیسے بنوالیا۔ صرف ایک نظر دیکھ کے تو ماہر سے ماہر درزی بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ خالہ سے کچھ معلوم کرنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہوتا۔ وہ خود اپنے جال میں پھنس گئی تھی اور اب اپنے فیصلے پر پچھتا رہی تھی۔ آخر کیوں سوچے وہ انعام کے بارے میں؟ وہ نفسیاتی مریض ہے تو ہوا کرے۔ علاج کرائے اس کا باپ۔ باپ کے احسان کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بیٹے کی ہر زیادتی برداشت کرے۔ خیر آج کے بعد وہ پھر بے اعتنائی کے حصار میں خود کو محفوظ کر لے گی ورنہ انعام کی خوش فہمی سے پیدا ہونے والی پریشانی اس کا عذاب بن جائے گی۔

وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ آٹھ بجے وہ بادل ناخواستہ تیار ہونے کے لیے اٹھی۔ نئی ساڑی اس نے بڑی ناگواری کے ساتھ پہنی مگر جب میک اپ کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود مسحور ہو گئی۔ اس میں بے چارے انعام کا کیا قصور۔ جو بھی اسے دیکھے گا دیوانہ ہو جائے گا۔

کال بیل کی آواز پر وہ چونکی۔ خالہ نے اسے مطلع کیا کہ انعام صاحب آئے ہیں اور ڈرائنگ روم میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آدھے گھنٹے بعد پہنچی تو انعام سراپا اشتیاق اس کا منتظر تھا۔ ایک بار پھر اس کی وارفتگی میں دیوانگی کے آثار نظر آئے۔ شائلہ شرمائی مگر اپنے دل میں پیدا ہونے والے ناپسندیدگی کے جذبات کا وہ کیا کرتی۔ انعام کا وجود ہی اس کے لیے کراہیت کی علامت بن گیا۔ اس کا لباس بہت قیمتی تھا مگر اس نے بڑے بے ڈھب انداز میں پہنا تھا۔ اس کی ٹائی کی ناٹ میں سلیقہ نہ تھا... اس کی آنکھوں میں حیوانیت تھی اور اس کی ہنسی عین دیوانگی۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں دل پر جبر کر کے بیٹھی اور مسکراتی بھی رہی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا اور اس کے حسن، اس کی شخصیت کے جادو اور اس کی ہر ادا کا قصیدہ پڑھ رہا تھا۔

شائلہ کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس کی مہربانی نے انعام کو نیا حوصلہ دے دیا تھا۔ وہ اتنا آگے بڑھ آیا تھا کہ اب اسے پیچھے دھکیلنا آسان نہیں رہا تھا۔ شائلہ کا دل کہتا تھا کہ کچھ ناخوش گوار ہونے والا ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ ویٹر نے انہیں ڈنر کے لیے ریزرو کی جانے والی ٹیبل تک پہنچا دیا جو بہت اچھی جگہ تھی۔ وہاں سے نیچے سارے شہر کی روشنیوں کا بڑا دلفریب نظارہ تھا۔ کچھ متحرک مگر بیشتر ساکت۔ چودھویں کی چاندنی کے طلسم کو برقرار رکھنے کے لیے مدھم روشنیوں کا رخ نیچے کی طرف رکھا گیا تھا اور معقول لوگ اس رومان پرور فضا سے فائدہ بھی اٹھا رہے تھے۔ مگر ایسے بھی تھے جو گلا پھاڑ کے ہنس رہے تھے، باتیں کر رہے تھے اور اس تاثر کو مجروح کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی ڈسٹرب کر رہے تھے۔

انعام نے بیٹھتے ہی اپنی بے ڈھول جیسی آواز میں کہا۔ "شائلہ! تم چاند سے اتری ہوئی آسمانی مخلوق لگ رہی ہو اس چاندنی میں۔"

ایک دو میزوں پر سے لوگوں نے سر گھما کر ناگواری کا اظہار کیا۔ "انعام! پلیز آہستہ بولو، کسی کو ڈسٹرب نہ کرو۔"

"اوکے! مگر تمہیں دوسروں سے زیادہ میرے جذبات کا خیال ہونا چاہیے۔" وہ بُرا مان کے بولا۔

ویٹر نے بروقت نمودار ہو کے شائلہ کو سکون کا سانس لینے کا موقع دیا۔ شائلہ نے مینو کارڈ اٹھا لیا مگر انعام نے غصے سے دور پھینک دیا۔ "آخر جلدی کیا ہے تمہیں۔ تم چاہتے ہو ہم فاسٹ فوڈ کھائیں اور جائیں؟ ٹیبل ریزرویشن کس لیے کرائی ہے ہم نے آخر؟ کیا رش زیادہ ہے؟ کسی اور کو بھی بٹھانا ہے یہاں؟"

ویٹر تو سوری کہہ کے چلا گیا مگر اس بار بہت سے لوگوں نے انہیں گھور کے ناگواری کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا بھی کہ "پلیز ڈونٹ شاؤٹ۔" مگر شائلہ نے انعام کو روک لیا۔ "اگر تم نے اسی طرح بی ہیو کیا..."

"اوکے... اوکے! آئی ایم سوری۔ دراصل مجھے کچھ





اپنے جذبات نے مدہوش کر رکھا ہے۔" وہ عجیب طرح سے مسکرا کے شائلہ کو دیکھنے لگا۔ "اور قصوروار ہو تم۔ تمہارا یہ حسن!"

شائلہ کو اس وقت پہلی بار شک ہوا کہ وہ پی کے آیا ہے۔ "خود کو کنٹرول میں رکھو انعام! ورنہ میں چلی جاؤں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہم پہلے ہی دیر سے آئے ہیں۔ کھانے کا آرڈر دے دینا چاہیے۔"

انعام نے خود کو سنبھال لیا اور کھانے کا آرڈر دینے تک نارمل رہا۔ ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے کچھ دیر خاموشی سے شائلہ کو گھورنے کے بعد کہا۔ "شائلہ! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

شائلہ نے ضبط سے کام لیا۔ "محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔"

"ہاں، جیسے مجھے ہو گئی ہے تم سے۔" اس نے دل پہ ہاتھ رکھ کے ایک گہری سانس لی۔ "بتاؤ میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں انعام صاحب! محبت کوئی ون وے ٹریفک نہیں ہوتی، اس کے علاوہ محبت اور ہوس میں بڑا فرق ہے جسے شاید آپ سمجھتے نہیں۔"

"ایسے مت کہو، بس محبت کے معاملے میں بھی میں انتہائی بے قسمت ہوں۔ میں جس سے محبت کرتا ہوں جواب میں اس سے مجھے نفرت ملتی ہے۔"

"پھر وہی بات۔ محبت کیا نوکری ہے کہ درخواست دی اور کر لی؟"

"یہ فلسفہ مت سمجھاؤ مجھے۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے۔" اس کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ "اور یہ ہوس نہیں ہے شمی۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔"

شائلہ کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ ایک بار پھر لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "تم ہوش میں نہیں ہو انعام! تم پی کے آئے ہو۔"

"کون اُلو کا پٹھا کہتا ہے۔ میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ اور یہ شادی والی بات مذاق نہیں ہے۔ یہ دیکھو، میں انگوٹھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ سات لاکھ روپے کا ہیرا جڑا ہوا ہے اس میں۔ اور یہ میں تمہاری انگلی میں پہناؤں گا۔ اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔" اس کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ "تم انکار نہیں کر سکتیں مجھے۔"

شائلہ کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم پاگل ہو رہے ہو۔"

انعام نے چیخ کے کہا۔ "ہاں... اور مجھے پاگل کس نے کیا ہے... تم نے... تم ایسے مجھے ٹھکرا کے کیسے جا سکتی ہو؟ ادھر لاؤ اپنا ہاتھ۔" اس نے ایک دم شائلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

شائلہ چلائی۔ "چھوڑو میرا ہاتھ... وحشی... جنگلی!"

انعام پر جیسے دیوانگی طاری تھی۔ وہ زبردستی شائلہ کی انگلی میں انگوٹھی چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شائلہ نے ہاتھ چھڑانے کی پوری جدوجہد کی اور اسی کے نتیجے میں میز پر رکھی ہوئی بہت سی چیزیں نیچے گر کر ٹوٹ گئیں۔ اردگرد کی میزوں پر سکوت طاری تھا اور لوگ بے یقینی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اچانک کسی نے انعام کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "چھوڑو خاتون کا ہاتھ..." شائلہ نے ایک سخت لہجہ لیکن متوازن آواز میں سنا۔

"شٹ اپ... تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے؟" انعام نے چیخ کر اسے باسٹرڈ کہا۔

شائلہ نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی جس نے پوری قوت سے انعام کے منہ پر مکا جڑ دیا تھا۔ ہاتھ چھڑاتے ہی وہ لفٹ کی طرف لپکی لیکن لفٹ نیچے جا رہی تھی۔ شائلہ نے مکا پڑتے ہی انعام کو پلٹ کر پیچھے گرتا دیکھ لیا تھا۔ وہ گرا تو اس کے ساتھ کرسیاں بھی اس پر گری تھیں۔ مہمانوں میں ہڑبونگ مچ گئی تھی کیونکہ انعام وحشیانہ انداز میں چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا۔ "آئی ول کل یو باسٹرڈ۔" ویٹر اور منیجر مل کے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے اور مہمانوں سے کہہ رہے تھے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایک معمولی سا جھگڑا تھا جو اب ختم ہو گیا ہے۔ پلیز اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھیے۔ شائلہ نے آوازوں کا شور سنا مگر اس کے قدم خود بخود لفٹ کے بند دروازے سے اس زینے کی طرف لپکے جو اسے نیچے پہنچا سکتا تھا۔ وہ جلد از جلد اس پاگل کر دینے والے شور، اس رسوا کن جگہ اور اس کی ذلت کا تماشا دیکھنے والے ہجوم سے دور جانا چاہتی تھی۔

نیچے پہنچنے تک اس نے کتنے زینے طے کیے، کتنی جگہ وہ لڑکھڑائی، اس نے کیا دیکھا اور کیا سنا، اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔ مگر لابی تک پہنچتے پہنچتے اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ جو ہوا سو ہوا، اب آگے اسے خود کو تماشا بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سنبھل کر چلتی ہوئی لابی سے گزری جہاں درجنوں خوش پوش اور خوش باش افراد آ جا رہے تھے۔ وہ گیٹ سے گزری تو وردی پوش دربان نے اسے مستعدی سے سیلوٹ کیا۔ اس کی نظر نے پارکنگ ایریا اور باہر سڑک پر کھڑی سیکڑوں گاڑیوں

میں کسی ٹیکسی کو تلاش کیا لیکن ایسے فائیو اسٹار ہوٹل میں لوگ اپنی بیش قیمت پرائیویٹ کاروں میں آتے تھے اور ضرورت پڑنے پر دیسی ہی رینٹ اے کار سے فراہم کی جانے والی گاڑی میں چلے جاتے تھے۔

پھر ایک گاڑی اس کے سامنے آرکی۔ کسی نے دروازہ کھول کے اسے بڑی حوصلہ دینے والی شائستگی کے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ ''میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

اس نے انکار سے پہلے ہی لفٹ دینے والے کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے مداخلت کر کے اسے انعام کی دراز دستی سے بچالیا تھا۔ اتنی جلدی وہ نیچے کیسے پہنچا اور اپنی گاڑی کیسے نکال لایا؟ شاید وہ لفٹ سے آیا اور اس کی کار کہیں قریب ہی موجود تھی۔ شائلہ خوف زدہ اور نروس ہونے کے باوجود مدد کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے ہچکچائی۔ ''نو... تھینک یو... میں ٹیکسی لے لوں گی۔'' اس نے جلدی سے کہا اور بیرونی احاطے کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آگئی جہاں سے گاڑیوں کا ایک سیلِ رواں گزر رہا تھا۔ چندھیا دینے والی متحرک روشنی میں یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ ان میں ٹیکسی کون سی ہے اور وہ خالی بھی ہے یا نہیں مگر ایک خالی ٹیکسی خود ہی اس کے سامنے آرکی تو شائلہ نے اسے تائیدِ غیبی جانا اور کوئی سوال جواب کیے بغیر اس میں بیٹھ گئی۔

اپنے گھر پہنچنے تک وہ خاصی پُرسکون ہو گئی تھی اور یہ بھی طے کر چکی تھی کہ اب اس کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ وہ ٹیکسی سے اتر کے کرایہ ادا کر رہی تھی کہ اس نے ایک کار کو کچھ فاصلے پر رکتے دیکھا۔ یہ وہی کار تھی جس کے مالک نے اسے لفٹ کی پیشکش کی تھی۔ وہ دروازہ کھول کے اترا تھا مگر اس سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر دروازہ پکڑے کھڑا تھا۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو وہ بھی کوئی بات کیے بغیر اپنی سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

اندر جاتے جاتے شائلہ مڑی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے کار کو روک لیا۔ ''آپ میرے پیچھے آئے تھے؟'' اس نے کچھ حیرانی سے سوال کیا۔ ''کیوں؟''

اٹھائیس تیس سالہ خوش شکل اور خوش پوش نوجوان کار سے اترا۔ ''بس ایسے ہی... آپ اکیلی تھیں اور اتنی رات گئے ٹیکسی میں سفر کرنا بعض اوقات رسک ہوتا ہے۔''

وہ ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ ''محض مجھے بحفاظت گھر پہنچانے آئے تھے؟ تھینک یو!''

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے شائلہ کے سوال کا جواب دینے سے گریز کیا۔ ''خدا حافظ!''

شائلہ نے کہا۔ ''ہوٹل میں بھی آپ نے بروقت مدد کی تھی۔''

''جی... میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔'' وہ مسکرایا۔

''شب بخیر!'' اس نے عجلت میں کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ شائلہ چند سیکنڈ وہیں کھڑی رہی۔ عجیب شخص تھا۔ نہ کچھ اپنے بارے میں بتایا نہ میرا پوچھا۔ نوجوان تو ایسے مواقع تلاش کرتے ہیں بلکہ پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر اپنے کمرے میں پہنچنے تک سوچتی رہی۔

خالہ سے چائے منگوانے کے بعد بستر پر لیٹ کر اس نے ٹی وی آن کیا اور پھر بند کر دیا۔ اس کا ذہن ابھی تک انتشار کا شکار تھا۔ یہ تو اب طے تھا کہ وہ انعام کے ساتھ اس کی سیکریٹری بن کے نوکری نہیں کرے گی۔ وہ اکرام صاحب کو سب بتا دے گی کہ انعام نے اس کی زندگی کس طرح اجیرن کر رکھی ہے۔ وہ استعفا تو قبول نہیں کریں گے، ہوسکتا ہے اسے کوئی الگ کمرا دے دیں اور این جی او کی ساری ذمے داری اس کے حوالے کر دیں۔

ایک اچانک آنے والے خیال کے شاک سے وہ اٹھ بیٹھی۔ یہ اجنبی جس نے ہوٹل میں اس کو انعام کی زبردستی سے بچایا اور پھر بحفاظت گھر تک پہنچانے کے لیے آیا، اس کا چہرہ کچھ دیکھا بھالا تھا۔ اور کیسی عجیب بات ہے کہ یہ احساس اب ہوا تھا جب وہ سامنے بھی نہیں۔ مگر کیوں؟ ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں پہلے بھی اس سے مل چکی ہوں؟ پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ شاید اس لیے کہ میں اپ سیٹ تھی۔

یکلخت اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اس کی کار... او مائی گاڈ... میرا تو واقعی دماغ آؤٹ ہو رہا تھا۔ ابھی تک یہ خیال نہیں آیا کہ کار تو وہی تھی۔ سلور گرے شیراڈ! اور وہ چہرہ جس کی ایک دھندلی سی جھلک دیکھی تھی، واضح طور پر یہ وہی چہرہ تھا۔ نہیں... میں اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہوں... سلور گرے شیراڈ تو اس شہر میں نہ جانے کتنی ہیں۔ میں خوامخواہ ایک قاتل کے چہرے کو اس شریف آدمی کے چہرے سے ملا رہی ہوں۔

ابھی شائلہ نے یہ نہیں سوچا تھا کہ آخر وہ ایک اجنبی کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہی ہے کہ خالہ نے دروازے سے جھانکا۔ ''بیٹی! انعام صاحب آئے ہیں۔''

اس کے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا۔ ''انعام صاحب؟ ان سے کہہ دو، میں نہیں مل سکتی۔''

''میں...... میں نے تو بیٹی... ان کو بٹھا دیا ہے ڈرائنگ روم میں۔'' خالہ نے کہا۔

''بٹھا دیا ہے تو جا کے کہہ دو بی بی سو گئیں۔'' وہ برہمی سے بولی۔

خالہ نے روتی صورت بنالی۔ ''ہائے بیٹا! انہوں نے پوچھا تھا... میں نے کہا جاگ رہی ہیں۔ ابھی چائے دی ہے۔''

شائلہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''حد کرتی ہو تم بھی خالہ۔'' وہ پیر پٹختی ہوئی ڈرائنگ روم میں گئی۔

انعام ایک صوفے کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا اور اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ ''مس شائلہ!''

''کیوں آئے ہو تم یہاں؟'' شائلہ پھٹ پڑی۔ ''کیا میری کچھ ذلت باقی رہ گئی تھی ذلیل آدمی۔ تم پاگل ہو۔ خطرناک قسم کے نفسیاتی مریض۔ تمہارے ساتھ کام کرنا تو کیا میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ محبت کیا تم نفرت کے قابل بھی نہیں ہو۔'' وہ بولتی گئی۔

انعام کا چہرہ فق تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو شائلہ! میں بہت ذلیل ہوں، شیطان ہوں، نفرت کے قابل ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا ناقابلِ معافی ہے لیکن پلیز! ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ میرے باپ سے میری شکایت نہیں کرو گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے... میں خود کو شوٹ کر لوں گا اور یہ تحریر چھوڑ جاؤں گا کہ میری موت کی ذمے دار تم ہو۔''

شائلہ کا دل ڈوبنے لگا۔ ''اچھا اچھا... بس کرو یہ رونا دھونا۔ میں ایک موقع دیتی ہوں تمہیں۔ میں کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گی۔ لیکن یاد رکھو تم نے پھر کوئی بدتمیزی کی میرے ساتھ تو میں انکل کو اپنے ساتھ اس ہوٹل میں لے جاؤں گی۔ وہاں ایک نہیں دس گواہ انہیں خود بتا دیں گے کہ تم نے کیا بےہودگی کی تھی نشے میں۔ اب جاؤ۔''

وہ آگے بڑھا۔ ''تھینک یو شائلہ!'' شاید وہ اس کا ہاتھ چومنا چاہتا تھا مگر شائلہ نے اسے دور دھکیل دیا۔ وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح دُم دبا کے باہر نکل گیا۔ شائلہ نے ایک گہری سانس لی۔ کیا واقعی یہ شخص اپنے کیے پر نادم ہے؟ ضمانت کوئی نہیں کہ وہ سدھر جائے گا اور آئندہ میرے ساتھ شرافت سے رہے گا۔ کوئی پاگل یا نفسیاتی مریض آسانی سے اتنی جلدی ٹھیک کہاں ہوتا ہے۔ خیر، اللہ مالک ہے۔ ایک چانس لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں۔

معاملات میں بہتری لانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ کچھ عرصہ انعام سے اور دفتر سے بھی دور رہے اور انگریزی محاورے کے مطابق گرد کو بیٹھنے کا وقت دے۔ شائلہ نے ایک ہفتے کے لیے علالت کے بہانے سے چھٹی لی اور یہ تمام وقت گھر میں ہی آرام کرتے گزار دیا۔ اکرام صاحب اسے دیکھنے صرف ایک بار آئے اور مطمئن ہو کے چلے گئے۔ اس عرصے میں شائلہ کو بارہا اس اجنبی کا خیال آیا جس کے دو روپ اسے کنفیوز کرتے تھے۔ وہ ایک مہذب اور شریف آدمی نہ ہوتا تو ایک اخلاقی ذمے داری پوری کرنے کے بعد اسے یوں نہ بھول جاتا۔ شائلہ جانتی تھی کہ اس کے حسن کی قوتِ تسخیر کیا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھنے والا مجبور ہو جاتا ہے کہ نظر بھر کے دیکھے۔ ان دل پھینک نوجوانوں سے اس کا واسطہ بارہا پڑ چکا تھا جو مختلف حیلوں بہانوں سے اس کی توجہ اور نظرِ کرم کے لیے بہانے تلاش کرتے تھے۔ یہ نوجوان یقیناً ان میں سے نہیں تھا۔ اس کا دوسرا روپ شائلہ کو پریشان کرتا رہا تھا۔

ایک ہفتے بعد وہ آفس گئی تو اس کا خیال شائلہ کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ شائلہ نے اپنی ساری توجہ اس کام پر مرکوز رکھی جو اکرام صاحب نے اس کے سپرد کیا تھا۔ انعام کو اس نے عمداً نظر انداز کیے رکھا۔ وہ پہلے خاموش رہا۔ پھر اس کی خاموشی احساسِ جرم و ندامت کی جھلاہٹ میں بدل گئی۔ وہ شائلہ کی طرف سے بے رخی پر مشتعل تھا۔ شائلہ کو یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی روز وہ اچانک نہ پھٹ پڑے اور اس کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔

اکرام صاحب ہر مہینے کے آخری سنیچر کو اسٹاف کی تنخواہ ادا کرتے تھے اور ایک پرانے دستور کے مطابق تنخواہ لینے والے آدھے دن کی چھٹی پر چلے جاتے تھے۔ اس روز شائلہ اپنے کام میں اتنی مگن تھی کہ اسے انعام کے ساتھ اپنے تنہا رہ جانے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور انعام اندر آ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی کرسی سامنے کر لی۔ شائلہ کی چھٹی حس نے اسے کسی خطرے کی خبر دی مگر اس نے خود پر کنٹرول رکھا۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں انعام صاحب؟'' اس نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، میں اس رویّے کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں شائلہ! تم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہو؟''

''میں آپ سے نفرت نہیں کرتی۔''

"یہ نفرت نہیں ہے تو اور کیا ہے... محبت ہے؟" وہ چلا کے بولا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر مجھ میں خرابی کیا ہے؟ میں پہلے دن سے تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ تمہارے عشق میں مبتلا ہوں، تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"دیکھیے، میں ایک بار بتا چکی ہوں..."

وہ چلایا۔ "کیا بتا چکی ہو؟ سب بکواس تھی وہ۔ جھوٹ بولا تھا تم نے۔ میں جوان ہوں، دولت مند ہوں... میرے ساتھ تم زندگی بھر عیش آرام سے رہ سکتی ہو۔"

شمائلہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "تم سچ جانتے ہو انعام۔ میں نے تمہیں انکار کردیا تھا۔ اس کی وجہ بھی سن لو، زندگی میں خوشی صرف دولت سے نہیں ملتی اور محبت زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ تم ایک احمق، غیر ذمے دار اور بے ضمیر آدمی ہو۔ تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ شاید پہلے کچھ لڑکیاں تمہارے چکر میں آگئی ہوں گی۔ تم نے اپنی دولت اور پوزیشن سے انہیں خرید لیا ہوگا مگر میں ایسی نہیں ہوں۔ تم نے کبھی اپنا چہرہ دیکھا ہے آئینے میں... اپنی بدصورتی پر غور کیا ہے؟ تمہارے منہ سے اور جسم سے تعفن اٹھتا ہے۔ تمہارا لباس، چال ڈھال، کردار سب مضحکہ خیز اور قابلِ نفرت ہے۔"

اس نے ہاتھ مار کے میز پر سے ہر چیز گرا دی۔ "بکواس بند کرو۔ تم محبت کرتی ہو مجھ سے... مجھے معلوم ہے۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو انعام! تم نے آج بہت پی لی ہے۔" وہ اپنے دفاع کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"تمہیں مجھ سے شادی کرنی پڑے گی... ورنہ میں قتل کردوں گا تمہیں۔ سمجھ میں آئی میری بات۔ میں مار ڈالوں گا تمہیں۔ تم میری ہو۔" وہ میز کے گرد گھوم کے شمائلہ پر جھپٹا۔

شمائلہ نے ایک چیخ ماری۔ "گارڈ!" اور گھوم کے دوسری طرف چلی گئی۔

انعام ایک جست میں میز کے اوپر سے کود کے اس پر گرا۔ اس کے بازوؤں نے شمائلہ کو جکڑ لیا۔ شمائلہ نے اس کا مکروہ چہرہ اپنے اوپر جھکتا محسوس کیا۔ اس کے جسم کی بو کے بعد انعام کے منہ کی بو سے شمائلہ کو متلی ہونے لگی۔ شمائلہ نے پھر چلا کے گارڈ کو آواز دی مگر اس کی آواز کمرے سے بہت دور نیچے سیکیورٹی گارڈ تک نہ پہنچ سکی۔ آخری وقت میں اپنی ساری قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے شمائلہ نے انعام کے منہ پر تھپڑ مارا۔ پھر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ صدمے اور غصے نے انعام کو ایک لمحے کے لیے سُن کردیا۔ شمائلہ نے اسی ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دھکا دیا اور جست لگا کے نکل گئی۔ اس نے کرسی کو دھکیل کر بیچ میں لڑھکا دیا اور ایک سیکنڈ میں بند دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

انعام وحشی اور زخم خوردہ درندے کی طرح چند سیکنڈ کے وقفے سے اس کے پیچھے دہاڑتا ہوا آیا۔ رات کے وقت لاؤنج سنسان تھا۔ افسروں کے کیبن اور ماتحتوں والا ہال بھی خالی پڑا تھا۔ وہ سیدھی لفٹ کی طرف بھاگی۔ اس نے بٹن دبایا تو اس کا دل سینے کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا کہ تعاقب میں آنے والا حیوان اس کے ساتھ لفٹ میں پہنچ گیا تو اس بند پنجرے میں کیا ہوگا۔ شاید اسی ناقابلِ شکست فولادی کمرے کے حصار میں اس کے نازک وجود کی آبرو کا پیراہن اس ہوس کے بھیڑیے کے ہاتھوں تار تار ہوجائے گا۔ نہ وہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکے گی اور نہ کوئی اسے بچانے پہنچ پائے گا۔

آخری وقت میں جب لفٹ کے دروازے بند ہونے کو تھے شمائلہ نے ایک جھری میں سے انعام کا جنونی چہرہ دیکھا۔ "شمائلہ! رک جاؤ۔" وہ چلایا اور اس نے لفٹ کے دروازوں کو ملنے سے روکنے کے لیے دیوانہ وار اپنا ہاتھ بیچ میں ڈالا۔ الیکٹرک موٹر کی طاقت سے دھکیلے جانے والے دروازوں نے اس کی انگلیوں کو کچل دیا۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک کراہ نکلی اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی لفٹ گراؤنڈ فلور کی طرف چل پڑی۔ وہ روشن ہوتے حروف کو دیکھتی رہی۔ "جی" کا حرف جلتے ہی دروازہ کھلا، وہ باہر بھاگی۔ اس کے کان اوپر سے دوڑ کر آنے والے انعام کی آوازیں سن رہے تھے۔ وہ چلا رہا تھا۔ شمائلہ... شمائلہ... شمائلہ... میری بات سنو۔ مگر وہ بھاگتی گئی۔ گیٹ پر کھڑے گارڈ کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ باہر جاچکی تھی۔

گیٹ کے سامنے والا کمپاؤنڈ خالی پڑا تھا جس میں دن کے وقت کاریں بھری ہوتی تھیں۔ اس کی اپنی چھوٹی سی مہران بائیں جانب کے شیڈ میں انعام کی لمبی سیاہ کار کے ساتھ کھڑی تھی مگر ادھر جانے کا مطلب تھا کہ وہ انعام کو مہلت دے۔ جتنی دیر میں وہ کار کو کھول کے اگنیشن سوئچ میں چابی لگاتی۔ اور اسے اسٹارٹ کرتی، انعام پہنچ جاتا۔

وہ بھاگتی ہوئی مین گیٹ تک گئی اور دم بخود گارڈ کی طرف دیکھے بغیر چھوٹے گیٹ سے باہر سڑک پر پہنچ گئی۔ سڑک پر ٹریفک ایک ہی سمت میں رواں تھا۔ گاڑیوں کی چندھیا دینے والی روشنی تھی جس میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کسی





روشن آنکھوں والے چوپائے کی طرح ایک دوڑتی ہوئی مشین اس سے ٹکرا گئی۔ شمائلہ ایک چیخ کے ساتھ فضا میں بلند ہوئی اور اسی کار کے بونٹ پر گرنے تک ہوش میں رہی۔

عین فلموں کے مناظر کی طرح اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سامنے ایک اجنبی منظر کسی خواب کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ایک بار اس نے آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں تو خواب بدلا نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کس کے بیڈ پر ایک ان دیکھے بیڈ روم میں تھی۔ بستر صاف ستھرا تھا اور کمرا خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ عین مقابل کی دیوار کے ساتھ ٹی وی خاموش تھا۔ بائیں جانب کی کھڑکی پر پردہ تھا۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر تھیں اور دائیں طرف کے دروازے کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی لہر اس کے پورے جسم میں پھیل گئی۔ اس نے بے بسی سے کراہ کے کہا۔ "ہیلو... کوئی ہے؟"

ایک دم دروازے میں ایک عورت کا سایہ نمودار ہوا۔ اس نے دیوار کی طرف ہاتھ بڑھا کے لائٹس آن کردیں۔ شمائلہ نے دیکھا کہ وہ سادہ سفید شلوار قمیص اور دوپٹے میں سفید بالوں والی ایک دبلی پتلی عورت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آئی اور شمائلہ کے قریب پہنچ کے اس پر جھک گئی۔ "اب کیسی ہو تم بیٹی!" وہ شفقت سے مسکرائی۔

شمائلہ نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہوں... جسم میں بہت درد ہے۔"

"وہ تو ہوگا... خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری ہڈیاں سلامت ہیں۔ جس کار سے تم ٹکرائی تھیں، اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔" بڑی بی نے کہا۔

"وہ کس کی کار تھی؟"

"پتا نہیں... ٹکر مارنے والا تو بھاگ گیا۔ میرا بیٹا تمہیں اٹھا کے اسپتال لے گیا تھا چیک اپ کے لیے۔ انہوں نے کہا کہ سب ٹھیک ہے... شاک سے بے ہوش ہیں۔ داخل کرانے کے بجائے وہ تمہیں گھر لے آیا۔"

"آپ کا بیٹا؟"

"ہاں، کامران علی... اور کیا کرتا وہ؟ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ تمہارا کوئی بیگ ملتا تو اس میں سے کوئی پتا مل جاتا۔ کوئی موبائل فون ہوتا تو کسی کا نمبر مل جاتا۔ وہ تو خود پھنس جاتا مگر ڈاکٹر اس کا دوست تھا۔ اس نے کہا کہ اسے گھر پہنچا دو ورنہ خوامخواہ پولیس کیس بن جائے گا۔ وہ تمہیں گھر لے آیا۔ تم سڑک پر ایسے کیوں بھاگ رہی تھیں؟"

"کوئی میرے پیچھے لگا ہوا تھا جس سے مجھے جان کا خطرہ تھا۔"

بڑی بی نے صرف سر ہلایا۔ "اچھا یہ بتاؤ اٹھ سکتی ہو؟ واش روم جاؤ گی یا میں کچھ لاؤں؟ کل رات سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ میں رات بھر تمہارے بیڈ کے پاس بیٹھی رہی۔ اور ہاں، نام کیا ہے تمہارا؟"

"شمائلہ... اس وقت کیا بجا ہے؟ میری گھڑی تو شاید گر گئی کہیں۔"

"دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ کچھ کھالو پھر میں دوا دوں گی۔" اس نے شفقت سے شمائلہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اگر بلیک کافی مل جائے تو؟"

"نہ بیٹی۔ خالی پیٹ یہ زہر پیٹ میں مت انڈیلو۔ میں گرم دودھ لاتی ہوں۔ اس کے ساتھ ابلے ہوئے انڈے لے لو... اور چاہو تو مکھن سلائس۔ دوا اس کے بعد دوں گی... شاباش... ہمت کرو۔"

"وہ... آپ کا بیٹا کامران... کہاں ہے؟"

"وہ گیا ہے مارکیٹ تک۔ آنے ہی والا ہوگا۔ یہاں ہم دونوں رہتے ہیں اس چھوٹے سے گھر میں۔ باہر ہمارا فروٹ فارم ہے۔ اسی کی بات کرنے گیا ہے۔"

وہ بے بسی سے لیٹی رہی۔ بڑی بی کے واپس آنے تک اس نے پھر ہمت کی اور اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب رہی۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کے دیکھا۔ شفاف شیشے کے باہر ہریالی تھی۔ دور دور تک قد آدم درخت شوخ نارنجی پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ یہ سب کینو کے درخت تھے۔ سردیوں کا موسم رخصت ہو رہا تھا۔ دن میں اچھی خاصی گرمی ہوجاتی تھی۔ اس نے نکھرے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھا اور بے حد سکون محسوس کیا۔ نہ جانے یہ فارم کہاں تھا لیکن وہ محفوظ تھی۔ اس درندے کی رسائی سے دور تھی جو اس کی آبرو پر اپنے دانت لگائے بیٹھا تھا۔

بادل ناخواستہ گرم دودھ پی کے اس نے بڑی بی کے اصرار پر دو ابلے ہوئے انڈے بھی کھائے۔ وہ فوراً ہی دوا بھی لے آئیں۔ ایک کیپسول، ایک سفید رنگ کی گولی، ایک زرد اور ایک سرخ۔ اس نے سوال کیے بغیر آخری گھونٹ سے سب اتارلیں۔

"آپ کا یہ گھر کہاں ہے آنٹی؟ شہر سے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں۔ تم نے اپنا نہیں بتایا... کہاں رہتی

ہو اور کس کے ساتھ؟''

''میں اکیلی رہتی ہوں آنٹی... ایک ملازمہ کے ساتھ جسے میں خالہ کہتی ہوں۔ انہوں نے پالا ہے مجھے۔ میرے اپنے ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک کمپنی میں نوکری کرتی ہوں۔ رشتے دار کوئی نہیں۔'' شائلہ نے تمام ضروری معلومات ایک سانس میں فراہم کر دیں۔

''ایسا ہی کچھ ہمارا بھی معاملہ ہے۔ بس ہم دو ماں بیٹا ہیں۔ اس کا باپ مر چکا ہے، یہ زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ بی اے کیا تھا کہ حالات خراب ہو گئے۔ بڑا سخت وقت گزارا ہم نے۔ اب یہ فارم ہاؤس ہے۔ یہ دوسرا سال ہے کہ اس کی فصل اچھی ہوئی ہے اور ٹھیکے سے اتنی آمدنی ہو گئی ہے کہ ہم نے یہ چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے۔ پہلے تو واقعی جھونپڑا تھا۔ تختوں اور گھاس پھوس سے بنا ہوا۔ میرے بیٹے نے گاڑی بھی لے لی ہے ایک پرانی۔ میرا خیال ہے کہ وہ آ گیا۔'' بڑی بی نے کار کی آواز سن لی تھی جس کا انجن غرا کے چپ ہو گیا تھا۔ کامران ایک منٹ بعد اندر آ گیا۔

وہ بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ ''تم؟''

وہ سکون سے آگے آیا اور کرسی قریب گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔ ''یہ اتفاق تو نہیں ہو سکتا کہ آپ نے مجھے پھر بچایا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی... آپ کو تو معلوم تھا کہ میں کہاں رہتی ہوں؟''

اس نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ''میں چاہتا تھا کہ آپ کو وہیں پہنچا دوں... لیکن اس رات میں ٹیکسی کے پیچھے پیچھے گیا تھا کل رات خود گیا تو راستہ بھول گیا۔ شاید گلی وہ نہیں تھی... یا دائیں کے بجائے میں بائیں مڑ گیا تھا۔ اس وقت میں آپ کو ساتھ لے کر کہاں بھٹکتا پھرتا۔ لوگوں کے دروازے کھٹکھٹا کے پوچھتا تو خواہ مخواہ شک ہوتا۔''

''آپ کیا میرا پیچھا کر رہے تھے کل رات بھی؟''

''بھی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس رات ہوٹل میں آپ کی خاطر نہیں گیا تھا میں۔ مجھے تو آپ کا نام بھی معلوم نہیں۔''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا کامران صاحب!''

''آپ اس سڑک پر دیوانہ وار بھاگتی جا رہی تھیں... حالانکہ آپ کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے آپ کو گر کر گرتا دیکھا تو گاڑی روک لی... اور اسپتال لے گیا۔ میں نے پہچان لیا تھا آپ کو۔ میں نہ اٹھاتا تو وہاں بھیڑ لگ جاتی اور شاید پولیس کیس بن جاتا۔'' وہ شائلہ کے سوال پر خاصا برہم تھا۔

''میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ کا یہ ایک اور احسان ہے مجھ پر... میرا نام شائلہ ہے۔''

''مس شائلہ! آپ کا پیچھا کرنا ہوتا تو میں اگلے روز طبیعت کا حال پوچھنے کے بہانے آپ کے گھر پہنچ جاتا۔ لوگ فون نمبر بڑی آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔''

''میں نے کہا نا کہ غلط بات میرے منہ سے نکل گئی۔''

''چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔'' وہ بدستور سیریس رہا۔

''میرا خیال ہے... آپ کی امی ابھی مجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گی... اور میں خود بھی... جلدی میں نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے ریسٹ اینڈ ریکوری کے لیے اچھی جگہ ہے یہ۔''

وہ ایک دم ریلیکس ہو گیا اور کرسی کی پشت سے کمر لگا کے بیٹھ گیا۔ ''آپ جب تک چاہیں مہمان رہ سکتی ہیں مس شائلہ! یہاں آتا ہی کون ہے۔''

''کیا آپ کے پاس جو کار ہے... وہ سلور گرے شیراڈ ہے؟''

''جی وہی ہے... جو آپ نے اس رات دیکھی تھی۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''ایسے ہی۔'' شائلہ نے جھوٹ بولا۔ ''میں نے بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ آپ نے ابھی لی ہے؟''

''ابھی تو نہیں... دو مہینے ہو گئے۔ امی نے بتایا ہو گا۔''

''ہاں، وہ بڑی مہربان خاتون ہیں۔ مجھے اپنی امی یاد آتی ہیں۔ ان کا اور ابو کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اکیلی رہتی ہوں... گھر میں... ایک ملازمہ ہے... رشتے دار کوئی نہیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''بالکل ہمارے جیسی ہے آپ کی کہانی۔ آپ آرام کریں... میں ذرا فارم ہاؤس کی بات کر لوں۔ کچھ لوگ آئے ہیں۔ فارم ہاؤس آپ کو بعد میں دکھائیں گے۔ آپ کو پسند آئے گا۔''

اس کی اچانک آفس سے غیر حاضری اور گھر سے لاپتا ہونا غلط فہمیاں پیدا کر سکتا تھا۔ اکرام صاحب تو دو چار دن یہی سمجھتے کہ وہ طبیعت کی خرابی کے باعث دفتر نہیں آئی ہے مگر اپنے گھر سے ایک رات خالہ کو بغیر بتائے غائب رہنے سے مسائل پیدا ہو سکتے تھے چنانچہ اس نے سب سے پہلے تو اپنے گھر فون کیا۔ خالہ اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کو بتا چکی تھیں کہ شائلہ کل آفس سے گھر نہیں آئی۔ خود اکرام صاحب سے بات کر کے کوئی وضاحت پیش کرنے سے شائلہ نے یہ



بہتر سمجھا کہ خالہ ہی ان سے پھر بات کر لیں اور انہیں مطمئن کر دیں کہ وہ آفس سے کسی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے اسلام آباد چلی گئی تھی اور دو چار دن میں لوٹ آئے گی۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہو گا کہ انعام کے دل سے شائلہ کا خوف دور ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ پہلے اس نے معافی مانگ کے شائلہ کو روک لیا تھا مگر اس بار وہ خود ہی ڈر گئی ہے چنانچہ اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

شام کو ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا۔ یہ کامران کا وہی دوست تھا جس نے گزشتہ رات اسپتال میں اس کا معائنہ کیا تھا۔ اس نے براہ راست شائلہ سے کوئی سوال نہیں کیا کہ اس کے ساتھ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ اس کے اور کامران کے درمیان اچھی بے تکلفی تھی۔ وہ دونوں باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کرتے ہوئے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ کھلی کھڑکی سے ان کی گفتگو شائلہ تک پہنچ رہی ہے۔ وہ گفتگو میں اپنا نام سن کر چونکی اور خاموشی سے کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''بیٹے! کہانی کچھ اور لگتی ہے مجھے... یہ ماسٹر پیس تیرے ہاتھ کیسے لگا؟''

''یار! تو بے وجہ شک مت کر۔ میں اسے واقعی نہیں جانتا۔''

''کیا مطلب... تو اسے سڑک پر سے اٹھا لایا تھا، ایسی خوب صورت چیز کسی اور کو دکھائی نہیں دی؟''

''میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا الو کے پٹھے۔''

''حالانکہ کام یہ وہیں کرتی ہے... تیرے اسی دشمن کے ساتھ۔ تو نے پہلے بھی دیکھا ہو گا اسے۔''

شائلہ چونکی۔ ڈاکٹر نے کسے کامران کا دشمن قرار دیا تھا؟ اکرام صاحب کو یا انعام کو؟

''دیکھا ضرور تھا ایک بار۔''

اچانک ہی خالہ کی آواز آئی۔ ''لو، میں نے بیڈ خالی دیکھا تو سمجھی تم باتھ روم میں ہو۔ تم یہاں کھڑی ہو... سوپ لائی تھی میں تمہارے لیے۔''

شائلہ کھڑکی سے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ ''آپ کیوں اتنی تکلیف کر رہی ہیں؟''

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ ''تم نے اپنے گھر والوں کو خبر کی؟''

''میں بتا چکی ہوں کہ ایک خادمہ کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''کیا بتاؤں بیٹی!



زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ فیصل آباد میں ہماری زمین تھی۔ میرا شوہر اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کی وہاں ٹیکسٹائل مل بھی تھی۔ کامران کا باپ حویلی کا منتظم بھی تھا۔ چودھری کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ وہ انتہائی ایماندار اور فرض شناس تھا۔ اس کی رسائی حویلی کے اندر تک تھی اور چودھری ان معاملات میں بھی اس پر بھروسا کرتا تھا جو انتہائی رازداری کے ہوتے تھے۔ بہت سے لوگ اسی وجہ سے اس سے حسد کرتے تھے اور اس کے خلاف چودھری کے کان بھرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے مگر پھر ایک بات ایسی ہو گئی کہ حاسدوں کو موقع مل گیا۔ اصل بات کا تو مجھے علم نہیں لیکن چودھری نے اس پر نمک حرام اور غدار ہونے کا الزام لگایا۔ یہ کہا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں بک گیا ہے۔ اس کی وجہ سے چودھری کی بڑی بے عزتی ہوئی اور اس کے گھر میں بھی تعلقات خراب ہوئے۔ اس کی ایک بیوی اسے چھوڑ کے چلی گئی اور لوگوں میں اس کی بدنامی ہوئی۔ کامران کے باپ نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے مسجد میں حلف بھی اٹھایا لیکن چودھری کو اس پر یقین نہ آیا۔ اس نے میرے شوہر کی ساری خدمت کو بھلا دیا اور اس کو بڑی اذیت دی۔ مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ بس ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ حویلی سے لوٹ کے نہیں آیا تو میں نے پوچھا۔ انہوں نے جھوٹ بولا کہ وہ آج حویلی بھی نہیں پہنچا۔ میں نے ہر جگہ معلوم کیا، اس کے رشتے داروں کو اطلاع دی۔ ہم نے پولیس میں بھی رپورٹ لکھوا دی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ڈیڑھ مہینے بعد اس کی لاش رات کے وقت ہمارے آنگن میں پھینک دی گئی۔ میں صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھی تو اسے صحن میں پڑا دیکھا۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا اور اس کے جسم کی ہڈیاں بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہڈیوں پر باقی رہ جانے والی کھال کو بھی جلایا گیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اسے اغوا کرنے والوں نے اس پر کتنا تشدد کیا تھا۔ وہ چاہتے تو اس کی لاش کو کہیں غائب کر دیتے، کسی قبر میں دفنا دیتے، دریا میں بہا دیتے یا جلا دیتے لیکن انہوں نے مجھے اور کامران کو بھی سزا دی اور اسے درس عبرت بنایا۔''

اس بوڑھی عورت کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے شائلہ کے دل کو دکھ سے پگھلا دیا۔ ''لیکن آپ کو معلوم تھا کہ یہ سب ظلم چودھری نے کیا ہے۔ تو آپ نے اس کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی؟''

اس نے اپنے آنسو دوپٹے سے صاف کیے۔ ''تم شہر میں پلی بڑھی ہو بیٹی۔ تمہیں گاؤں دیہات کے وڈیروں،

زمینداروں کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اگر میں چودھری کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتی تو میرا اس سے بھی بُرا حشر ہوتا کیونکہ میں عورت ہوں۔ میرے شوہر کو اس وحشیانہ ظلم کا نشانہ بنانے والے طاقتور لوگ تھے... میں ان کا نام لیتی تو وہ میری بیٹیوں کو بھی اٹھا لاتے اور انہیں پولیس سے اٹھواتے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ چودھری کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس بندے کے ساتھ چودھری یہ وحشیانہ ظلم کر سکتا ہے جس پر اسے سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ میں تو اسی کے پاس فریاد لے کر گئی تھی۔ اس نے بہت افسوس کیا۔ پولیس میں رپورٹ لکھوائی اور مجھے تسلی دی کہ قاتلوں کو بخشا نہیں جائے گا۔ میں کیا کرتی، صبر کر کے خاموش بیٹھ گئی۔"

"کامران کو معلوم ہے کہ اس کے باپ کا قاتل کون ہے؟" شائلہ نے پوچھا۔

"نہیں، وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ اسے اغوا کر لیا گیا تھا اور جب ہم تاوان کی رقم ادا کرنے میں ناکام رہے تو قتل کر دیا گیا۔"

"اگر آج اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو وہ کیا کرے گا؟"

بڑی بی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا کرے گا بیچارہ... اب اتنا وقت گزر چکا ہے۔ وہ چاہے بھی تو میں اسے کچھ نہیں کرنے دوں گی۔ اس کے سوا میرا کون ہے؟"

"میں آپ کے صبر اور حوصلے کی داد دیتی ہوں۔"

رات کو کھانے کے بعد شائلہ نے انہیں بتایا کہ اس کی ماں کا انتقال کیسے ہوا تھا اور بعد میں اس کے والد کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ "میں اسی کمپنی میں ملازم ہوں جہاں میرے والد کیشیئر تھے۔ کمپنی کے مالک میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور مجھے بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔"

کامران نے تلخی سے کہا۔ "تمہاری یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی کسی دن۔"

"تم اسے غلط فہمی کیوں سمجھتے ہو؟"

"یہ سب دولت مند اور جاگیردار، صنعت کار اور وڈیرے... سب ایک جیسے خودغرض، سفاک اور مطلب پرست ہوتے ہیں۔"

"نہ سو فیصد لوگ بُرے ہوتے ہیں اور نہ اچھے۔"

"اچھائی کہاں نظر آتی ہے تمہیں۔ اپنے چاروں طرف نظر ڈالو۔ کہاں جا رہا ہے یہ معاشرہ۔"

کامران کی ماں نے انہیں روکا۔ "ارے یہ آپس کی بحث چھوڑو۔ شائلہ کو آرام کرنے دو۔"

اگلی صبح شائلہ اس حد تک بہتر تھی کہ وہ چاہتی تو گھر جا سکتی تھی۔ ابھی آفس جانے کے بارے میں تو اس نے سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا مگر صبح آفس جانے کے لیے جلدی اٹھنا اس کا ایک معمول بن چکا تھا۔ آنکھ کھلی تو اس کے کانوں میں پرندوں کے چہچہانے کی آواز آئی۔ اس نے پردہ ہٹایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چمکیلی نکھری ہوئی بہار کی صبح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک اس منظر کی خوب صورتی کو اپنے رگ و پے میں ایک مسرت بخش احساس کی طرح اترتا محسوس کرتی رہی۔

پھر وہ کسی شریر بچے کی طرح کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھی اور باہر اتر گئی۔ وہ ننگے پاؤں روش پر سے گزر کے لان میں آگئی جو شبنم سے بھیگی ہوئی تھی اور سرد ہو رہی تھی۔ مارچ میں بھی رات آخری پہر تک اتنی ہی سرد ہو جاتی تھی جتنی جنوری کی شام۔ اس کے تلوے سن ہونے لگے مگر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی پھولوں کی کیاری تک آگئی۔

اچانک اسے بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ "اوئے لڑکی۔ باؤلی ہوئی ہے کیا۔ ننگے پاؤں صبح صبح باہر نکل گئی۔ سردی لگ جائے گی۔"

اس نے مسکرا کے پیچھے دیکھا۔ کھڑکی میں سے کامران کی ماں کا متوحش چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو ایک ہاتھ میں گرم دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔ ان کی ڈانٹ سے شائلہ کو اپنی ماں یاد آئی جو بالکل اسی شفقت آمیز سخت لہجے میں چلاتی تھیں۔ شاید ساری مائیں اندر سے بالکل ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور واپس چل پڑی۔ "میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اتنی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی کھڑکی سے باہر کود گئیں۔ وہ تو کامران نے دیکھا تو کہا کہ جا کے اپنی "مہمان" کو سنبھالیے۔ باہر چہل قدمی فرما رہی ہیں اور وہ بھی ننگے پاؤں۔"

ناشتے کے بعد اس نے کامران اور اس کی ماں کے ساتھ فارم کا دورہ کیا۔ کامران اسے زرعی اعداد و شمار بتاتا رہا۔

شائلہ نے ایک کینو توڑ لیا۔ "اگر میں یہ کھا لوں تو کتنے ڈالر کا نقصان ہوگا؟"

کامران نے اسے دوسرا توڑ کے دیا۔ "آپ اس سے شوق فرمائیں۔ وہ کچا ہے... کھٹا ہوگا۔"

اس نے معصومیت سے پہلا کینو آگے بڑھا دیا۔





"سوری... اسے واپس لگا دیں۔"

"پہلی سے۔" وہ ہنسا۔ "ویسے لڑکیاں ہر کھٹی چیز کو ترجیح دیتی ہیں۔"

"اوہ۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔" اس نے پہلا کینو واپس لے لیا۔

"یہ کہ آپ ایک لڑکی ہیں؟" وہ بولا اور دوسرے کینو کو چھیل کر کھانے لگا۔ ساتھ ہی اسے پورے فارم ہاؤس میں گھماتا رہا۔

تھک ہار کر دونوں لکڑی کی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ بھدے تختوں سے بنی کرسیاں دھوپ اور بارش کی مار کھا کھا کے بے رنگ ہو گئی تھیں۔ درمیان میں رکھی میز بھی ایسی ہی تھی۔

"یہ کس اناڑی کارپینٹر نے بنائی ہیں؟" شائلہ نے کہا۔

"سچ پوچھو تو وہ کارپینٹر تھا ہی نہیں۔"

"پھر کون تھا؟"

"میں تھا۔" وہ بولا تو شائلہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"کیا اب آپ کچھ بتائیں گی۔ اگر کوئی حرج نہ ہو کہ اس رات آپ سڑک پر دوڑ کیوں لگا رہی تھیں، کاروں کے ساتھ؟" کامران نے کہا۔

"اس لیے کہ..." شائلہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ "وہاں گدھے گھوڑے خرگوش جو نہیں تھے۔"

وہ ہنسا۔ "گدھے تھے مگر کاروں میں سوار تھے۔"

شائلہ نے کہا۔ "میں ایک بن مانس کی گرفت سے آزاد ہو کے بھاگی تھی۔ دیکھنے میں وہ آدمی تھا۔ اس نے سوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ تم اس سے پہلے بھی مل چکے ہو۔ ایک رات ہوٹل میں تم نے اسے ایک مکا مار کے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔"

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ "وہ... اس سے کیا تعلق ہے تمہارا؟ کون ہے وہ؟"

"تم واقعی نہیں جانتے؟ وہ باس ہے میرا... انعام الحق۔ اب میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ تھا۔"

"آئی سی... امی نے بتایا تھا کہ تم وہاں کام کرتی ہو۔ اس کمپنی میں تمہارے ابا کیشیئر تھے۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ ان کی موت بڑے افسوسناک حالات میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تمہاری امی کی۔"

"اب میں نے طے کر لیا ہے کہ وہ نوکری چھوڑ دوں گی... میں اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔"

"تم میرے ساتھ کام کر سکتی ہو۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"تمہارے ساتھ؟" وہ ہنسی۔

اس دوران میں کامران کی ماں نے چائے کے مگ میز پر لا کر رکھے۔ "ہنسنے کی کون سی بات ہے اس میں؟"

"اگر مجھے کہیں نوکری نہ ملی تو آ جاؤں گی یہاں کھیتی باڑی کرنے۔ میں پرندے اڑا سکتی ہوں، کینو توڑ سکتی ہوں، کھانے کے لیے... مٹر کے دانے نکال لوں گی۔ تنخواہ کیا ملے گی؟" شائلہ نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"تم ایک پارٹنر بن سکتی ہو۔"

وہ کچھ بھی...... کہتے کہتے رک گئی۔ لائف پارٹنر کہنا اس سے بھی زیادہ غلط ہوتا۔

"یہ بہت پروفیشنل بزنس ہے۔ کام تو مالی کرتے ہیں، میں مارکیٹنگ کرتا ہوں۔ اس میں زیادہ سرمائے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم نے جو بھی پس انداز کیا ہے..."

"آئی ایم سوری کامران! نہ سرمایہ ہے میرے پاس اور نہ مجھے اس کام میں کوئی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ حالات خراب نہ ہوتے تو میں پڑھتی رہتی اور ڈاکٹر بھی بن جاتی۔ مجھے آنٹی نے تمہارے فادر کی ڈیتھ کے بارے میں بتایا۔"

اچانک کامران کی آنکھوں میں وحشت سی اتر آئی۔ "کیا بتایا ہے انہوں نے؟ یہی نا کہ انہیں ڈاکو اغوا کر کے لے گئے تھے؟ انہوں نے تاوان نہ ادا کرنے پر ابا کو مار ڈالا۔ یہ جھوٹ وہ مجھے بھی سناتی رہتی ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے؟"

"اول تا آخر تمام جھوٹ۔ مائیں بہت سادہ لوح اور بے وقوف ہوتی ہیں۔ جوان بیٹوں کو بھی ننھا بچہ سمجھتی ہیں۔ جب تک میں بچہ تھا، میں نے اس جھوٹ کو مانا... مگر پھر مجھے سچ کا پتا چل گیا۔"

خاموشی کا ایک بوجھل وقفہ گزرا پھر شائلہ نے کہا۔ "آدمی تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹا سکتا۔"

اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "کون سا آدمی؟ وہ جو مر گیا؟ مگر میں تو زندہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ شخص بھی زندہ ہے جو میرے باپ کا قاتل تھا۔ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے، شاید وہ نہیں جانتا مگر میں جانتا ہوں۔"

شائلہ نے خوف کی ایک سرد لہر اپنے جسم میں محسوس کی۔ "تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود اس کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا؟"

"یہ عین انصاف ہوگا۔"

''میں تم سے بحث نہیں کروں گی۔ کیا تم یہ بات ہر ایک سے کہتے پھرتے ہو... کہ تمہارے عزائم کیا ہیں؟''

''ہر ایک کون؟ اگر کل کو تم میرے خلاف رپورٹ لکھوانے چلی جاؤ تو میرے لیے اپنے بیان سے صاف مکر جانا بھی جائز ہوگا کیونکہ پہل تمہاری طرف سے ہوگی جب تم میرے اعتماد کو دھوکا دوگی۔''

شائلہ نے بہتر سمجھا کہ وہ اس موضوع پر کوئی اور بات نہ کرے۔ شام کو اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے گھر پہنچا دیا جائے۔ ''خالہ بہت پریشان ہیں۔''

''تم نے تو انہیں بتا دیا تھا کہ تم یہاں ہو۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں مگر کوئی ایسی بات ہے جو وہ مجھ سے بھی فون پر کرنا نہیں چاہتیں۔'' شائلہ نے جواب دیا۔

اور فی الحقیقت ایسا ہی تھا جب شائلہ گھر پہنچی تو اس نے اپنے سامنے خالہ کا ایک ایسا خوف زدہ چہرہ دیکھا جو کسی غیر معمولی صورتِ حال کی عکاسی کرتا تھا۔ ''کیا بات ہے خالہ! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''

''کیا بتاؤں بیٹا... تم کچھ بتائے بغیر کہاں چلی گئی تھیں؟''

''میں تو پہلے بھی مری چلی گئی تھی اور تین دن بعد لوٹی تھی۔'' شائلہ نے کہا۔

''کل رات کوئی پہلے کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کرتا رہا... تمہارے کمرے میں۔ میں نے ادھر جا کے لائٹ جلائی تو بھاگ گیا۔''

''آپ کا وہم ہوگا خالہ۔''

''مجھے پتا تھا کہ تم یہی کہوگی۔ وہ نہ میرا وہم تھا اور نہ تیز ہوا۔ تم کھڑکی کو ہلا کے دیکھو، کوئی آواز نہیں آتی۔ میں تو جن بھوت سے بھی ڈرنے والی نہیں، آیت الکرسی پڑھتی ہوں اور سب ڈر دور۔ میں واپس اپنے کمرے میں جا کے سو گئی۔ نیند نہیں آئی تھی... دوسری بار باورچی خانے کی کھڑکی بولی۔ میں اٹھ کر گئی اور لائٹ جلائی تو باہر کوئی تھا، ایک دم سامنے سے ہٹ گیا۔ تم ذرا جا کے دیکھو، کسی نے تمہارے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جو قلم ہوتا ہے شیشہ کاٹنے والا... باہر سے صاف پتا چلتا ہے ہاتھ مارتا تو شیشہ نکل جاتا، وہ کنڈی کھول کے اندر آجاتا۔''

شائلہ نے تصدیق کے لیے باہر جا کے دیکھا خالہ کی پریشانی سو فیصد جائز تھی۔ کسی نے رات کو اندر آنا چاہا تھا۔ یہ کارروائی کسی چور ڈاکو سے منسوب کرنا مشکل تھا جو آج کل اسلحہ لے کر دندناتے ہوئے آتے ہیں اور جان و مال میں سے کچھ ضرور لے کر جاتے ہیں۔ جس گھر میں ایک اکیلی بڑھیا ہو وہاں سے صرف لائٹ دیکھ کر فرار نہیں ہوتے۔ شائلہ سخت متفکر ہوگئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنے اندیشے کا اظہار پولیس کے سامنے کرے یا نہ کرے۔ اسے معلوم تھا کہ سوائے خواری کے اسے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔

اس کا شک بار بار انعام کی طرف جاتا تھا۔ اپنی دیوانگی میں وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتا تھا۔ اس کی انا کے منہ پر جو تھپڑ پڑا تھا، وہ اس کے احساسِ ذلت کو انتقام کی خواہش میں بدلنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن وہ بزدل تھا۔ اس کے برعکس کامران کی بہادری یا بے خوفی بھی دیوانگی سے کم نہ تھی۔ وہ کچھ کرنے سے پہلے ہی اپنے عزائم کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔ اس دیوانگی کے کتنے بھیانک روپ تھے۔ کامران کا باپ طاقت اور غرور کی دیوانگی کا نشانہ بنا تھا تو شائلہ کے باپ کی زندگی ایک شخص کے ہوسِ زر نے لے لی تھی۔ خود اس کا باپ خاموش تماشائی بن کے اپنی جان بچا سکتا تھا مگر اس پر فرض شناسی اور جاں نثاری کی دیوانگی غالب آچکی تھی۔

''اب کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟'' خالہ کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے کھینچ لائی۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ رات یہاں کوئی آیا تھا لیکن وہ چور ڈاکو نہیں تھا۔'' شائلہ نے کہا۔

''پھر کون تھا۔ کیا چاہتا تھا؟''

''آپ سامان پیک کریں۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔'' شائلہ نے فیصلہ کرلیا۔

''ہم کہاں جائیں گے؟'' خالہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''آپ سوالات مت کریں۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا ہی کریں۔''

رات اس شہر پر اپنا دامن پھیلا چکی تھی جب شائلہ نے ایک بار پھر اسی پناہ گاہ کا رخ کیا جہاں وہ دن گزار کے آئی تھی۔ کامران کی حیرانی سے زیادہ اس کی ماں کی خوشی دیدنی تھی۔ خالہ اور کامران کی امی تقریباً ہم عمر تھیں۔ وہ ایسے ملیں جیسے گردشِ حالات میں بچھڑی ہوئی بہنیں۔ ان کے سامنے شائلہ نے صرف اتنا بتایا کہ گزشتہ رات ان کے گھر میں ڈاکو آئے تھے لیکن شک کی بنا پر پڑوسیوں نے پولیس کو طلب کرلیا تو وہ بھاگ گئے۔

☆☆☆

''فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے۔'' کامران نے کہا۔





''اور وہ میں کرچکی ہوں۔'' شائلہ مسکرائی۔ ''یہ نوکری چھوڑنے کے بعد میں تمہارے بزنس پروپوزل کو قبول کرلوں۔''

''یہ بڑی خوشی بلکہ اعزاز کی بات ہوگی میرے لیے۔''

''کچھ میرے والد کا چھوڑا ہوا پیسا ہے، کچھ رقم میں نے پس انداز کی تھی۔ اگر میں اپنا گھر بھی بیچ دوں اور کرائے پر رہوں تو میرے پاس تقریباً پچاس لاکھ ہوں گے اس فارم ہاؤس میں انویسٹ کرنے کے لیے۔ لیکن کام تم ہی کرو گے۔''

کامران نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''اٹ از اے ڈیل۔''

شائلہ نے اسے نظر انداز کردیا۔ ''نہیں، ابھی ہم نے صرف ڈیل کی بات کی ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے لیکن ابھی بہت سی شرائط کا طے ہونا باقی ہیں۔''

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔''

''کاروباری معاملات میں ایسی جذباتیت' دیوانگی نہیں چلتی۔ آج میں اپنے آفس جا کے تمام دفتری معاملات کو لپیٹ دوں گی اور اپنا استعفا منظور کرالوں گی۔ میں انکل اکرام الحق کو صاف صاف بتا دوں گی کہ انعام کے ساتھ میں کام نہیں کرسکتی اور اس کی موجودگی میرے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔'' شائلہ نے کہا اور پھر کامران کو گزشتہ رات کے واقعات سے پہلے پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بھی تفصیل سے بتا دیا۔

''ایسے شخص کو تو گولی ماردینی چاہیے۔'' کامران نے کہا۔ ''اس کی دیوانگی کا یہی علاج ہے۔''

''اور کیا یہ دیوانگی نہیں ہے مسٹر کامران کہ آپ ہر شخص کی غلطی یا خامی کا علاج اسے گولی مارنا ہی سمجھتے ہیں۔ پرانا محاورہ ہے کہ جو گڑ سے مرے اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی مچھر کو چٹکی سے مسل دینے کے بجائے اس پر مشین گن کا فائر کھول دے تو کیا یہ اس کی دیوانگی نہیں ہے؟''

''تم ایک جبلی فلسفی ہو۔ دنیا بڑی گنجلک جگہ ہے۔''

''ہاں... مگر عمل کی دیوانگی اور دیوانگی کے عمل کا فرق اپنی جگہ ہے۔ سائیکلوں کی مرمت کرنے والے رائٹ برادران نے اپنی جان خطرے میں ڈال کے جو تجربات کیے، انہوں نے انسان کو اڑنے کی طاقت دی جو اس کا سب سے بڑا خواب تھا لیکن اس جہاز سے جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرایا گیا تو وہ دیوانگی کچھ اور تھی۔ خیر، اب تم مجھے آفس چھوڑو گے یا میں ٹیکسی سے جاؤں؟''

''مجھے آج کہیں جانا نہیں ہے۔ تم میری گاڑی لے جا سکتی ہو۔'' کامران نے کہا۔

یہ مزید بہتر ہوا۔ شائلہ گاڑی لے کر نکلی تو اسے اندازہ ہوگیا کہ اپنے آبائی گھر سے اس کی یہ عارضی پناہ گاہ کتنی دور ہے۔ آس پاس ایسے ہی بہت سے فارم ہاؤس تھے۔ کچھ کے احاطے بنے ہوئے تھے اور باقی کامران کے فارم ہاؤس کی طرح تھے جن کے گرد صرف خاردار تاریں لگا دی گئی تھیں۔ اس نے کامران کے سامنے یہ بات تو کہہ دی تھی کہ وہ کرائے کا مکان لے کر رہ سکتی ہے لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ قرب و جوار میں چھوٹے مکان کہیں بھی نہیں تھے۔ بہت سے معاملات کی خبر اسے چھٹی حس دے رہی تھی۔ کامران کی نظروں کے پیغام کو سمجھنا تو کوئی مشکل نہیں تھا کیونکہ خود اس کا اپنا دل شرارت پر آمادہ تھا اور عقل کے مشورے دینے والا دماغ ازخود پیچھے ہٹتا جارہا تھا۔ وہ یہاں بہت ایزی رہی تھی۔ کامران کی ماں کا رویّہ بھی مہربانی اور میزبانی کی حد سے بہت آگے کا تھا۔ اب شائلہ دوسری بار اپنی مرضی سے خالہ کے ساتھ آئی تھی تو صورتِ حال میں ایک خوش گوار ڈرامائی تبدیلی نے جنم لیا تھا جو شائلہ کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

آفس جانے سے پہلے شائلہ نے اپنے گھر کی طرف چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔ اسے وہاں سے کپڑے، جوتے اور ضرورت کا سامان اٹھانے کے ساتھ یہ بھی دیکھنا تھا کہ اس کی غیر حاضری کے وقفے میں گھر پر کیا بیتی۔ گاڑی کو باہر ہی روک کے اس نے سنسان اور اداس گھر کے گرد آلود فرش کو دیکھا جس کے در و دیوار اس کی بے وفائی کا شکوہ کرتے محسوس ہوتے تھے۔ اسے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ معلوم نہیں اس پر کس چیز سے ضرب لگائی گئی تھی کہ دوسرے پٹ کے شیشے میں نیچے سے اوپر تک ایک بہت چوڑی درز نمودار ہوگئی تھی۔

کھڑکی کے اندر جو کاغذ ڈالا گیا تھا وہ درز کے نیچے قالین پر پڑا تھا۔ شائلہ نے اس بھدے سرخ حروف کی تحریر والے کاغذ کو اٹھا لیا۔ اسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اس کے ہاتھوں میں انعام الحق کا وہ محبت نامہ اور معافی نامہ ہے جو اس نے اپنے خون سے لکھا ہے... خوف اور دہشت کی سرد سنسنی شائلہ کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے گر گیا جس میں انعام نے لکھا تھا۔ ''آخری بار مجھے معاف کردو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرایا تو میں خودکشی کرلوں گا۔''

شائلہ کو۔۔۔ چکر سا آیا اور وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پانی پی کے اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے وہ کاغذ پھر اٹھایا۔ شک کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ رنگ لہو کا تھا۔ خون کاغذ میں جذب ہو کے جم گیا تھا۔ شائلہ نے احتیاط سے ایک شیشے کا ٹکڑا اٹھایا۔ اس پر بھی انعام کا خون تھا۔ یہ صریحاً بلیک میلنگ تھی۔ انعام اس پر جذباتی دباؤ بڑھا رہا تھا۔ یہ محبت نہیں، دیوانگی تھی۔ وہ دیوانگی جس میں انعام اپنی ہی نہیں اس کی جان بھی لے سکتا تھا۔ اس صورتِ حال کو مزید نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

آفس پہنچ کے شائلہ نے اپنی گاڑی کو بیرونی احاطے کے باہر سڑک پر کھڑا کیا اور پورے اعتماد کے ساتھ چلتی ہوئی گیٹ سے اوپر تک گئی۔ اس نے لاؤنج کو آخری بار طے کیا اور مسکرا کے جواب دیتے ہوئے کسی کی معنی خیز مسکراہٹ کا نوٹس نہیں لیا۔ انعام کا کمرا اسی طرح خالی اور بند پڑا تھا۔ اس نے معلوم کیا کہ بڑے چودھری صاحب آفس میں موجود ہیں۔

اکرام صاحب نے اس کا استقبال اپنی پُرشفقت مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔ ”بھئی کہاں ہو تم آج کل۔ درشن ہی نہیں ہوتے تمہارے۔ کیسی ہو؟“

وہ مسکرا کے ان کے سامنے بیٹھ گئی اور ایک کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔ ”آپ کیسے ہیں انکل؟“

”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے پُرتجسس انداز میں وہ کاغذ لے لیا۔

”میرا استعفا۔ میں اب مزید نوکری نہیں کر سکتی یہاں۔۔۔ آپ اسے منظور کریں یا نہ کریں۔“

انہوں نے کاغذ پر سرسری نظر ڈال کے اسے میز پر رکھ دیا۔ ”کیا ہوا ہے آخر؟“

”اسباب میں نے لکھے نہیں ہیں۔ میں خود آپ کو بتانا چاہتی تھی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے صاحبزادے چودھری انعام الحق ڈپٹی ایم ڈی اس وقت کہاں ہیں۔ گزشتہ دس دن سے کہاں ہیں؟“

وہ مسکرائے۔ ”مجھے اس کے معمولات کا علم نہیں ہوتا اور اسے میرے۔“

”وہ دفتر نہیں آرہے ہیں۔“

”ہاں، یہ بات مجھے معلوم ہوئی تھی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”کیا آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے؟“

”اس سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی خاص وجہ ہے تو تم بتادو۔“

”میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ مجبوراً۔ اس سے پہلے ہوٹل میں بھی ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جہاں وہ مجھے ڈنر کے لیے لے گیا تھا۔ اس نے یقیناً آپ کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔“

”کیا بیٹے ایسی باتیں اپنے باپ کو بتاتے ہیں۔۔ مسئلہ کیا ہے آخر؟“

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔۔ کیونکہ وہ مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے۔“

”ایسے دعوے اس عمر میں سب ہی کرتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑے۔ ”خود اس کا باپ کیا کسی سے کم تھا اور تم تو خیر ہو بھی خوب صورت۔“

”آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ کتنا بدتمیز اور بداخلاق ہے۔ اس کی وجہ سے میری کتنی بے عزتی ہو چکی ہے۔ لوگ کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔“

”یہ سب ہوتا ہے لڑکی، جوانی میں۔ اگر تم کسی اور کو چاہتی ہو تو بات مختلف ہے ورنہ اس سے شادی کرلو۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بعد میں وہ ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ وہ اتنا بُرا بھی نہیں ہے۔ ڈگری ضرور ہے اس کے پاس لیکن عقل نہیں ہے۔ ایسے مردوں کو تم جیسی لڑکی ہی نکیل ڈال کے چلا سکتی ہے۔ میرا یہ کاروبار وہ کیسے چلائے گا اگر اسے تم جیسی لڑکی نے سپورٹ نہ کیا؟“

شائلہ پھٹ پڑی۔ ”وہ ناقابلِ برداشت ہے میرے لیے۔ کسی جانور کی طرح۔ اس کی عادات و اطوار، اس کا مزاج، طور طریقے، سب میں ایک وحشیانہ انداز ہے۔ اس کے جسم سے ایسی بو آتی ہے جیسے چڑیا گھر میں ریچھ کے پنجرے سے۔“

اکرام صاحب کا چہرہ اتر گیا۔ ”میں جانتا ہوں۔ یہ ایک بیماری ہے مگر اس کا علاج ہے۔ میں نے انگلینڈ سے معلوم کیا تھا۔ یہ ایک غدود کی خرابی سے ہوتا ہے۔ پہلے اس کا علاج نہیں تھا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آئی ایم سوری انکل! آپ کی محبت اور مہربانی کا بدلہ میں کسی اور طرح سے نہیں چکا سکتی۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے جو آپ چاہتے ہیں۔ پلیز! مجھے معاف کردیں۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس کی سرخ مہران اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھی مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سڑک پر آگئی جہاں وہ سلور گرے کلر کی شیراڈ موجود تھی۔ آگے والا دروازہ چابی سے نہیں کھل رہا تھا۔ اس نے پیچھے والے دروازے کو دیکھا، وہ غلطی سے کھلا





رہ گیا تھا۔ شائلہ نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کے آگے کا دروازہ اندر سے کھولا اور اس وقت وہ رائفل دیکھی جو اگلی اور پچھلی نشست کے درمیان نیچے فرش پر پڑی تھی۔ شاک اور دہشت نے ایک لمحے کے لیے اسے مفلوج کر دیا۔ وہ رائفل کو ایسے دیکھتی رہی جیسے وہ کوئی سویا ہوا اژدہا ہے جو اس کے ہاتھ لگاتے ہی اٹھ بیٹھے گا اور اپنی آتش بار زہریلی پھنکار سے اسے بھسم کر دے گا۔

تو یہی تھی وہ سلور گرے شیراڈ جس سے کسی نے ایک بار نہیں دو بار انکل اکرام الحق پر گولی چلائی تھی۔ ایک ساتھ اس کے ذہن میں دو تصویریں نقش تھیں، ایک میں کافی کا مگ، انکل اکرام اور شیشے کے بے ترتیب ٹکڑے اس کے آفس میں قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ دوسری میں بڑے بڑے بالوں والا ننھا منا پوڈل، پائن ایپل کیک کی جھاگ جیسی ٹھنڈی سفیدی کے درمیان اپنے لہو کی سرخی پھیلائے کھلی آنکھوں سے سوال کر رہا تھا کہ آخر تم انسانوں کی یہ کیا دیوانگی ہے۔ اگر میں بھی سالگرہ کے کیک کی اس مٹھاس کا ذائقہ چکھ لیتا تو تمہیں کیا فرق پڑ جاتا۔ ایک بار اس کی آنکھوں نے جو دھندلا سا متحرک سایہ دیکھا تھا، اس میں گولی چلا کے ناکام فرار ہونے والا وہی تھا جو فارم ہاؤس میں کھلے ہوئے پھولوں، درختوں پر روشن کینو کے نارنجی بلبوں اور مٹر کے نیلے کاسنی پھولوں کے درمیان اس کے ساتھ تھا۔ جو اسے فارم ہاؤس کی اور درحقیقت اپنی زندگی کی پارٹنرشپ آفر کر چکا تھا۔ دوسری بار کیمرے کی آنکھ اسے پہچان نہ پائی تھی لیکن اپنی سلور گرے شیراڈ میں وہ کامران ہی تھا۔ ایک سیدھی سادی بیوہ ماں کا وہ اکلوتا بیٹا جو انتقام کی دیوانگی کے ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا تھا، اس سے محبت کیسے کی جاسکتی تھی؟

گاڑی کا رخ اس نے پھر اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔

اس نے اپنے بیڈ روم میں پڑے ہوئے اس محبت نامے کو اٹھایا جو ایک اور دیوانگی کے شکار مجنوں نے اپنی لیلیٰ کو لکھا تھا۔ وہ بدصورت تھا، بداطوار تھا اور بدتہذیب تھا لیکن اس کی محبت اس شفاف فطری آب کی طرح خالص اور پاک تھی جو بھاپ بن کر اٹھتی ہے تو کبھی پھول اور سبزے پر شبنم کا موتی بن کے اترتی ہے اور کبھی پیاسی دھرتی پر بارش بن کر۔ وہ خون سے لکھے ہوئے معافی نامے اور محبت نامے میں اس کے جذبات کی تمام سادگی، صداقت اور شدت کو محسوس کرسکتی تھی۔

موبائل فون پر پیغام دے کر شائلہ نے کامران کو اپنے گھر بلالیا۔ ”تمہاری گاڑی یہاں خراب ہو گئی ہے۔ تم آکے مجھے لے جاؤ۔“

وہ ایک گھنٹے بعد پہنچا اور سیدھا اندر آگیا۔ ”شائلہ! کہاں ہو تم؟“ اس نے آواز دے کر کہا۔

شائلہ نے کہا۔ ”دروازہ کھول کے اندر آجاؤ۔ میں یہاں ہوں۔“

اندر قدم رکھتے ہی اس نے شائلہ کو کرسی پر سیدھا بیٹھا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کا رخ سامنے کی طرف تھا۔ اس نے اپنی رائفل کو پہچان لیا۔ ”شائلہ! یہ کیا دیوانگی ہے؟“

”دیوار کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے رہو۔ مجھے ذرا بھی شک ہوا تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“ اس نے کہا۔

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ سب میری بھول کا نتیجہ ہے۔ تمہیں گاڑی دینے سے پہلے میں رائفل نکال لیتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ تمہیں کچھ پتا نہ چلتا۔“

”حقائق پر سے وقت پر پردہ اٹھتا ہے کامران! شک تو مجھے ہو گیا تھا مگر اس شہر میں ایک نہیں درجنوں سلور گرے شیراڈ ہوں گی۔ مجھے تمہاری بیوہ، سادہ دل ماں کی زندگی کا المیہ جان کے بھی شک نہ ہوا کہ یہ چودھری کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بن کر ہلاک ہونے والے کا بیٹا ہی ہے جو اکرام الحق کی زندگی کا چراغ گل کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتا ہے۔“

”پہلے میں تمہارے انکل اکرام کو نہیں۔۔۔ ان کے بیٹے کو مارنا چاہتا ہوں۔“

”گویا اس رات ہوٹل میں اور پھر اس جگہ جہاں میں اپنی دیوانگی میں سڑک پر دوڑتے ہوئے ایک گاڑی سے ٹکرا گئی تھی، دونوں جگہ تمہاری موجودگی بے سبب اور اتفاقیہ نہیں تھی؟“

کامران نے ایک شعر پڑھا۔ ”وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔۔۔ حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔“

”تم اپنے باپ کے قتل کا ذمے دار انعام کو سمجھتے ہو؟“

”نہیں۔۔۔ اسے میں اپنی محبت کا قاتل سمجھتا ہوں۔ اس نے مجھ سے زارا کو چھینا۔“

شائلہ نے کہا۔ ”زارا۔۔۔ وہ جو اکرام صاحب کی پی اے ہے؟“

وہ نفرت سے بولا۔ ”پی اے کو اردو زبان میں کیا کہتے ہیں، زبانِ خلق کیا کہتی ہے؟ وہ سب کیا سمجھتے ہیں جو اس دفتر میں کام کرتے ہیں اور خود تم کیا سمجھتی تھیں؟ یہ زارا ایک بہت سیدھی سادی غریب لڑکی تھی جس نے سوتیلی ماں کے سارے مظالم سہے تھے لیکن پڑھنا نہیں چھوڑا۔ جب باپ بھی نہ رہا تو وہ ایک یتیم خانے میں رہی تھی۔ وہ مجھ سے کیسے ملی۔۔۔ اور اس نے مجھ سے محبت کے کیا عہد و پیمان کیے، یہ بھی

کہانی ہے۔ بعد میں وہ انعام الحق سے ملی۔ انعام نے اسے انعام میں وہ نوکری دے دی جو اس غربت زدہ احساسِ محرومی کی ماری لڑکی کے لیے خوش نصیبی کی لاٹری تھی۔ بہت بڑی تنخواہ، رہنے کے لیے شان دار گھر اور ایک کار۔ اس نے زارا کو خرید لیا، وہ مجھے بھول گئی۔"

"اس کا قصوروار تم انعام کو کیوں سمجھتے ہو، زارا کو کیوں نہیں؟"

"اپنی بدبختی اور محرومی کی ذمے دار زارا نہیں تھی۔ اس کے احساسِ محرومی سے فائدہ اٹھانے کا مجرم انعام ہے۔ اگر وہ اسے صرف نوکری دیتا اور اتنی ہی تنخواہ جتنی کسی بھی سیکریٹری کو ملتی ہے... تو زارا کو خرید نہیں سکتا تھا۔"

"کیا یہ دیوانگی نہیں ہے کہ تم زارا کی بے وفائی کو الزام نہیں دے رہے؟"

"وہ ایک کمزور لڑکی تھی۔ کمزور ہم سب ہوتے ہیں۔ مجرم وہ ہے جو اس کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا لیتا ہے۔ روٹی سے بھوکے کو خریدا جا سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے قحط پڑا تھا تو بنگال میں ایک مٹھی چاول کے بدلے عورت مل جاتی تھی۔ قصوروار کون تھا؟ اس عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والا۔"

"یہ عجیب منطق ہے... تم چاول کو قصوروار کہو، قحط کو یا خریدار کو۔"

"انعام نے صرف یہی ظلم نہیں کیا۔ اس نے زارا کو اپنے ساتھ رکھا۔ دن میں بھی اور رات میں بھی۔ وہ گھر اس کے باپ نے زارا کے نام کر دیا تھا۔ ازراہِ بندہ پروری۔ انعام اس سودے کو محبت کا نام دیتا تھا لیکن پھر ایک دن یہ محبت کا اسٹاک ختم ہو گیا۔ اس نے زارا کو دوسری دکان میں رکھوا دیا جو زیادہ بڑی دکان تھی۔ اپنے باپ کی دکان میں۔ تم نے تو سب دیکھا ہے۔"

شائلہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تمہاری دیوانگی کا واقعی کوئی علاج نہیں۔ تم اس عورت کو مظلوم قرار دے کر معاف کر رہے ہو جو خود اپنی مرضی سے اپنی قیمت وصول کر رہی ہے۔ جس کے لیے بیٹے کے بعد باپ بھی محض ایک اسامی ہے، خریدار ہے، کمائی کا ذریعہ ہے۔"

"تم نے شاید سنا نہیں۔ میں نے کہا تھا پہلے میں انعام کو قتل کروں گا۔ اس کے باپ کی باری بعد میں آئے گی۔"

"اور اس کے بعد... جہاں بھی زارا اپنی قیمت وصول کرنے جائے گی۔"

"زارا کا اب میرے نزدیک کوئی وجود نہیں رہا، وہ میرے لیے مر چکی ہے۔ خواہ اپنی غلطی سے مری یا کسی نے اسے شکار کیا۔ اکرام الحق میرے باپ کا بھی قاتل ہے۔"

شائلہ نے بے یقینی سے کہا۔ "تمہارے باپ کا قاتل چودھری تھا۔"

"ہاں، ایسا میری ماں سمجھتی ہے اور وہ اب زندہ بھی نہیں ہے۔"

"کیا وہ چودھری کا دوست تھا؟ اس جرم میں شریک تھا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے... کیا میں بیٹھ جاؤں؟"

"بیٹھ جاؤ لیکن کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ نہ دینا۔ سیلف ڈیفنس کے عذر پر میں تمہیں شوٹ کر دوں گی اور بعد میں سزا سے بھی بچ جاؤں گی۔ قانون میں اس کی گنجائش ہے اور نہ ہو تب بھی پیسا ہر قانون میں گنجائش نکال سکتا ہے۔ اگر میں پچاس لاکھ فارم ہاؤس کے بزنس میں لگانے کے لیے نکال سکتی ہوں تو کیا اپنی زندگی بچانے پر خرچ نہیں کر سکتی؟"

"پھر تمہارے انکل اکرام کی دولت اور ان کا اثر رسوخ بھی ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"رائٹ۔ کیا تم جانتے ہو کہ اپنی تمام تر دیوانگی کے باوجود انعام مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے؟ یہ دیکھو، یہ اس کے خون کی سرخی ہے جس سے اس نے معافی نامہ بھی تحریر کیا ہے اور اپنی محبت کا اقرار بھی کیا ہے۔ وہی خون جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ جینوئن خون۔ اس کی یہ دیوانگی بھی جینوئن ہے۔ میں اس سے شادی کر لوں تو زارا سے زیادہ اس کا استحصال کر سکتی ہوں۔ میرے صرف ایک اقرار کی بات ہے پھر وہ باپ بیٹا میری طاقت بن جائیں گے۔ زارا میں اور مجھ میں فرق ہے کامران! میں برائے فروخت نہیں ہوں اور وہ مجھے خریدنا بھی نہیں چاہتا... اپنانا چاہتا ہے۔"

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "ایک لڑکی تم سے کہیں زیادہ ہوشیار، سودے باز اور حسین تھی۔ جب اس کی اپنی محبت کرنے والی بیوی، انعام کی ماں اسے ٹھکرا کے واپس چلی گئی تھی تو اکرام الحق صدمے سے پاگل ہو گیا تھا۔ وہ سکھ تھی اور اکرام الحق کی محبت میں لندن سے پاکستان آ گئی تھی۔ اس نے اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا تھا مگر اکرام اس کے لیے اپنا بزنس چھوڑ کے لندن نہ جا سکا۔ گزشتہ مہینے وہ جیل میں مر گئی... وہ انعام کی ماں تھی۔ اس نے واپس جا کے اپنا مذہب اختیار کر لیا تھا اور ایک سکھ سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس سکھ نے اسے دھوکا دیا اور وہ قتل کر کے جیل پہنچ گئی۔ زارا جیل میں تو نہیں مگر کیا وہ آزاد ہے؟ اس نے خود کو سونے کے پنجرے میں بند کر لیا ہے۔ ایک دن آئے





گا جب وہ انعام کی ماں کی طرح تنہا رہ جائے گی۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

"تم مجھے بتا رہے تھے کہ تمہارے باپ کا قاتل بھی انعام کا باپ ہے؟"

"ہاں، انعام کی ماں کی بے وفائی نے اسے شدید ذہنی اور جذباتی صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ اسے واپس لانے کے لیے لندن بھی گیا تھا مگر اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ الٹا اکرام کو وہاں سے جان بچا کے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وقتی طور پر وہ نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ اس نے اپنا غم بھلانے کے لیے خود کو شراب میں ڈبو دیا اور ایک عورت کی بے وفائی کا انتقام ہر عورت سے لے رہا تھا۔ اسی زمانے میں وہ ایک معروف ماڈل اور فلمی اداکارہ کے چنگل میں پھنس گیا تھا... وہ نہ صرف یہ کہ حسن و شباب میں قدرت کی صناعی کا شاہکار تھی بلکہ ذہانت اور عقل میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اپنے حسن اور معصومیت کے انداز سے اس نے اکرام کے سارے جارحانہ عزائم کو خاک میں ملا دیا اور اس کی مردانگی کے غرور کو ایسی شکستِ فاش دی کہ وہ انتقام وغیرہ بھول کے اس کا بندہ بے دام بن گیا۔ وہ اس سے شادی کر کے اپنا سب کچھ اس اداکارہ کے حوالے کر دیتا مگر اسے بروقت ایک دو[illegible] بچا لیا... وہ ایک سابق چیف منسٹر کے بھائی کی [illegible] بھی [illegible] تھی۔ اکرام کے اس دوست نے اداکارہ کی کچھ پرانی تصاویر اور ایک ویڈیو فلم حاصل کر لی۔ اس کے لیے اکرام کے دوست نے اندر کے ایک آدمی کو خریدا اور اس اداکارہ کے ماضی کو اکرام کے سامنے پیش کر دیا۔ تصویریں اور ویڈیو فلم دیکھ کے اکرام کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے اداکارہ کو الگ کر کے اپنے گھر اور دل سے نکال دیا۔ ویڈیو فلم بھی کاپی تھی اور تصاویر کی بھی نقل بنوائی گئی تھی۔ اصل اسی چیف منسٹر کے بھائی کی تجوری میں محفوظ تھیں مگر اس اداکارہ نے اپنے سابق [illegible] کے سامنے بڑا واویلا کیا۔ اکرام نے بڑی چالاکی سے اصل مجرم کو بچا لیا جو اس کے لیے محسن ثابت ہوا تھا اور اس محسن کے [illegible] دوسرے شخص کو مجرم بنا دیا جس کے ساتھ اس کے [illegible] تھی۔ سزا اسے ملی جس نے کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ اکرام کے مددگار اور معاون کو ایک ساتھ دو فائدے حاصل [illegible] اکرام نے پہنچایا اور اس کے راستے [illegible] منسٹر کے بھائی نے ہٹا دیا۔ جو شخص بے گناہ مارا گیا... وہ [illegible] باپ تھا۔ اس کو قربانی کا بکرا اکرام نے بنایا تھا۔"

"اگر مجرم اکرام [illegible] اب وہ دوست بھی ہے جس نے اداکارہ کی تصاویر اور ویڈیو فلم چوری کرائی تھیں۔ وہ اداکارہ اور اس کی تصویریں اور فلمیں چرانے والا بھی ہے۔ تم کس کس کو سزا دو گے؟"

"سب کو۔ میں نے اس اداکارہ کو مار دیا ہے۔ اس کی تصویریں اور ویڈیو فلمیں چوری کر کے الزام میرے باپ پر عائد کرنے والا بھی اب زندہ نہیں ہے۔ میرے باپ کی موت کے بعد وہ اس چیف منسٹر کے بھائی کا معتمدِ خاص بن گیا تھا۔ وہ ایک عرس کی تقریبات سے لوٹ رہا تھا کہ رات کے وقت ایک ٹریکٹر ٹرالر نے سامنے سے اس کی گاڑی کو ٹکر مار دی۔ وہ وہیں مر گیا۔"

"یہ کارنامہ بھی تم نے سرانجام دیا تھا؟"

"جانتی ہو، میرا مجرم کون تھا؟" کامران نے کہا۔ "اکرام الحق کا وہ دوست جس نے اسے بچانے کے لیے اس اداکارہ کی شرمناک تصاویر اور ویڈیو چوری کرائیں اور اپنے دوست کو دکھائیں۔ نام اس کے قانونی مشیر شاہد علی کا لیا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ کام تمہارے والد کا تھا۔"

شائلہ نے بے اختیار کہا۔ "بکواس کرتے ہو تم۔ ساری دنیا جانتی ہے وہ کتنے شریف آدمی تھے۔"

"جو ساری دنیا نہیں جانتی، میں جانتا ہوں کہ تصویریں اور فلمیں چوری کرنے والا اور تمہارے والد دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے۔ اس نے پیر صاحب کی فرمائش پر اداکارہ کو ان کے حجرے میں پہنچایا اور اس کے لیے بلیک میلنگ کا نسخہ استعمال کیا تھا۔ اس نے اداکارہ کو آسان راستہ بتا دیا تھا کہ وہ جائے اور پیر صاحب کے دستِ مبارک پر بیعت کر لے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو۔ لیکن اداکارہ نے انکار نہیں کیا تھا۔ جب ضرورت پڑی تو تمہارے والد نے انہی پیر صاحب کے ذریعے اس مرید کو پھر استعمال کیا۔"

"کیا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے ہی میرے والد کو بھی قتل کرایا تھا؟" شائلہ چلائی۔

"وہ تو ایک حادثے میں ہلاک ہوئے تھے۔" کامران معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"ہر قتل جو تم نے کیا، ایک حادثہ ہی تھا۔" شائلہ نے کہا۔ کامران کو شوٹ کرنے کی خواہش پر قابو رکھنا اس کے لیے مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

"کوئی عدالت مجھے سزا نہیں دے سکتی۔ کوئی مجھ پر قتل کا جرم ثابت کرنے کے لیے ثبوت، گواہ کچھ بھی پیش نہیں کر سکتا... جو کچھ میں نے تمہیں بتایا، صرف تم نے سنا ہے۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

اچانک شمائلہ کے کانوں نے ایک آواز سنی۔ یوں جیسے کوئی کار اس کے گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کی کھڑکی کے ساتھ رکی ہو پھر اس نے کھڑکی پر ایک سایہ سا دیکھا۔ کھڑکی عین اس کے سامنے تھی۔ کامران اسی کھڑکی کے پیچھے دیوار سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ وہ سر گھمائے بغیر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی درز پر ایک آنکھ نمودار ہوئی۔ گہرے سرمئی رنگ کے ٹنٹڈ (TINTED) گلاس کے پیچھے باقی چہرہ اب بھی صرف ایک متحرک سایہ ہی تھا۔ شمائلہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا مگر اس نے اپنے اعصاب پر قابو... رکھا۔ وہ آنکھ اور... چہرے کا دھندلا نقش اب شیشے کے پیچھے سے غائب ہو چکا تھا۔

''آخر تم کب تک ایسے بندوق کا نشانہ لیے بیٹھی رہو گی؟ یہاں کون آنے والا ہے اور آ بھی جائے تو اسے بتانے کے لیے تمہارے پاس کیا ہے؟ کون یقین کرے گا تمہاری بات پر؟ سچ نہیں ہوتا وہ سب، جو ثابت نہیں کیا جا سکے۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج بھی صرف مجرم کے اعترافِ جرم کو کافی نہیں سمجھتا ثبوت اور شہادت مانگتا ہے۔''

''لیکن میں وہ مجبور جج نہیں ہوں کامران! میں ایک عورت ہوں۔ تم نے کبھی تریا چلتر کا نام سنا ہے؟ عورت اپنی مکاری، عیاری، فریب کاری اور سازشی فطرت پر کس طرح بے گناہی اور معصومیت کا پردہ ڈالتی ہے، اسی کا نام تریا چلتر ہے۔ تمہیں شوٹ کر دینے کے بعد مجھے بھی تریا چلتر کا ڈراما کرنا پڑے گا۔ دنیا کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ میں نے تمہیں اپنی عزت آبرو بچانے کے لیے قتل کیا۔ تم اسی لیے اپنی گاڑی میں مجھے یہاں لائے تھے کہ مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکو۔ خود کو بچانے کے لیے میں نے تمہیں تمہاری ہی بندوق سے قتل کر دیا۔ رہی ثبوت یا گواہ کی بات تو باقی کام پولیس کرے گی۔ اپنے کپڑے پھاڑنا، اپنے جسم پر تمہارے ہاتھوں کی خراشیں ڈالنا، تمہارے ناخنوں میں اپنے بال الجھانا، رائفل پر سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کرنا، یہ میں خود کر لوں گی۔ میڈیکل رپورٹ، گواہ جو فائر کی آواز یا میری چیخ پکار پر پہنچے جنہوں نے یہ سارا منظر خود دیکھا... ثبوت اور شہادت اور چشم دید گواہ... سب خریدے جا سکتے ہیں۔ ہر عدالت میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ ساری بات قوتِ خرید کی ہے۔ قلاش میں خود بھی نہیں ہوں مگر ایک میرے انکل اکرام ہیں۔ پھر ان کا بیٹا ہے جس کی دیوانگی صرف میرے لیے ہے۔ اگر میں کہوں تو اس قتل کا الزام وہ اپنے سر بھی لے سکتا ہے۔ میرے لیے وہ پھانسی کے تختے پر بھی اپنی زندگی قربان کر سکتا ہے۔ بس میں نے ہی آج تک اس کی قدر نہیں کی... اسے دیوانہ سمجھ کے ٹھکرایا مگر یہ دیکھو۔''

''یہ کیا ہے؟'' کامران کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔

''اس نے اپنے خون سے یہ تحریر لکھی ہے کسی کا خون کرنا وہ کیا جانے... وہ تو ایک بگڑا ہوا معصوم بچہ ہے۔ اس نے شیشے کی دھار سے اپنی کلائی کاٹ کے مجھ سے معافی مانگی ہے اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ ممکن ہے وہ کسی اسپتال میں ہو یا زیادہ خون بہنے سے مر گیا ہو۔ ایسی دیوانگی صرف محبت سکھاتی ہے، نفرت نہیں۔ اس کے پاس کیا نہیں ہے؟ دولت، طاقت، اعلیٰ تعلیم، سماجی رتبہ، شان دار مستقبل لیکن آج تک اس نے ایک چیونٹی کو نہیں مارا۔ اگر کسی کی جان لینے کی کوشش بھی کی تو صرف اپنی۔ قصوروار میری نظر تھی جس نے اس کے پیار میں صرف دیوانگی دیکھی۔ یہ تو محبت کی وہ دیوانگی ہے جو بندے کو خدا تک پہنچا دیتی ہے۔''

کامران ایک دم جست لگا کے اٹھا۔ وہ شمائلہ کو دبوچ لینا چاہتا تھا مگر اس کی اپنی رائفل سے نکلی ہوئی گولی اس سے کہیں زیادہ مستعد تھی۔ اس سے زیادہ مستعد وہ دستِ اجل تھا جس نے گولی کی راہنمائی کی اور اسے سیدھا کامران کے سر تک پہنچایا۔

پہلے دھماکے کے ساتھ ہی دوسرا دھماکا ہوا اور دروازہ کھول کے انعام اندر آ گیا۔ ''شمائلہ!'' وہ دیوانہ وار چلّا کے اس کی طرف لپکا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا؟''

وہ اس کے بازوؤں میں سما گئی۔ ''یہ... یہ درندہ مجھے یہاں لایا تھا... اگر تم بروقت نہ آتے...''

''ایزی... ایزی مائی سویٹ ہارٹ! اب میں آ گیا ہوں نا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ میرا خط تم تک پہنچ گیا ہے یا نہیں... کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے شمائلہ؟''

''اوہ مائی گاڈ... تمہاری دیوانگی کی بھی کوئی انتہا ہے۔'' اس نے انعام کی کلائی تھام کے کہا جس پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ ''بس... میں نے وہ محبت نامہ ابھی دیکھا... تم اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیے۔''

دم توڑتے کامران نے آخری بار حرکت کی اور ساکت ہو گیا۔